سرفراز
لکھنؤ
محرمؐ نمبر
ایڈیٹر
مصطفےٰ احسن رضوی

ٹیلیفون ۲۳۴۳۵ رجسٹرڈ نمبر ایل ۷۰

جلد نمبر ۴۷، ۱ر مارچ سنہ ۱۹۶۹ء مطابق ۲ر ذی الحجہ سنہ ۱۳۸۸ھ نمبر ۱

ایڈیٹر

مصطفیٰ حسن رضوی

قیمت:

ریڈیو سے شام غریباں

مجلس امامباڑہ غفرآنمآب میں ۸ بجے شب شروع ہوکر ۹½ بجے رات میں ختم ہو

ریڈیو سے ۱ بجے سے ۱۰½ بجے تک براڈکاسٹ ہوگی۔

پاکستان کی شام غریباں ہندوستانی ٹائم سے ۸ بجے شب میں شروع ہوکر ۹½ بجے رات میں ختم ہوگی

سیّد انصار حسین پرنٹر پبلشر نے
سرفراز قومی پریس میں واسطے
آل انڈیا شیعہ کانفرنس چھپوا کر
دفتر سرفراز قومی گھر ناداں محل روڈ لکھنؤ سے
شائع کیا

فہرست مضامین

عزاداری کی تاریخ

الحاج مولانا سید سبط الحسن فاضل ہنسوی ظلہ

آہ! یہ زمانے کا کیسا انقلاب تھا کہ نانا کا کلمہ پڑھنے والے "مسلمان" "فرزندِ رسولؐ" کی شہادت و خاندانِ نبوت کی تباہی و بربادی پر جشن منا منا کر خوشی کی تکبیریں بلند کر رہے تھے۔

ویکبرون بان قتلت وانما ... قتلوا بک التکبیر والتہلیلا[1]

وکانما بک یا ابن بنت محمد ... قتلوا جہاراً عامدین رسولا

آخر وہ کیسے مسلمان تھے جنہوں نے قتلِ حسینؑ کے لئے منتیں مانی تھیں اور شہادتِ حسینؑ کے بعد اپنی نذروں کو پورا کر رہے تھے۔ یہی نہیں بلکہ اس فعل کو اپنے "قوم و قبیلے" کے لیے باعثِ صد نازش و افتخار سمجھتے تھے۔

مورخ مسعودی اپنی تاریخ مروج الذہب (جلد ۲ ص ۱۰۳) میں، علامہ ابن ابی الحدید شرح نہج البلاغہ میں اور علامہ محمد بن عقیل العلوی "النصائح الکافیہ" میں ابن الکلبی سے روایت کرتے ہیں کہ عبداللہ بن ہانی الاودی نے حجاج بن یوسف الثقفی سے اپنے مفاخر کے ضمن میں یہ کہا تھا کہ:

فان لنا مناقب لیست لاحد من العرب کانما فینا نسوۃ نذرن ان قتل الحسین بن علی ان تنحر کل واحدۃ قلائص فنعلن (مروج الذہب جلد ۲ ص ۱۰۳ طبع مصر، النصائح الکافیہ ص [illegible]، نہج جلد اول ص ۳۵۶)

اے حجاج! ہم میں وہ فضائل ہیں کہ تمامی عرب میں ایسا صاحبِ شرف کوئی قبیلہ نہ ہوگا۔ سن! ہماری ہی وہ عورتیں ہیں جنہوں نے یہ نذر کی تھی کہ اگر حسین ابن علی قتل کر دیے جائیں تو ہر ایک عورت بہترین قسم کے اونٹ قربانی کرے گی۔ جب مراد پوری ہوئی اور حسین قتل ہو گئے تو منت پوری کی گئی۔

اس طرف تو مسرت و شادمانی کا اظہار کیا جاتا تھا لیکن ستم رسیدوں کو یہ بھی اجازت نہ تھی کہ وہ فریاد کر سکیں، اہلبیت امام مظلوم اور شیعیانِ علی کو زبان بندی کا حکم تھا، تذکرۂ شہداء کی ممانعت تھی، اس کی اجازت نہ تھی کہ چین [illegible] کے بیٹھ کر حسین کی یاد میں مجالس منعقد کر سکیں، لیکن یہ نفسیاتی مسئلہ ہے کہ جذباتِ غم روکے سے رکتے نہیں، باوجود تشدد کے اہلبیت رسولؐ

[1] شہید ظلم! آپ کو قتل کر کے لوگ نعرۂ تکبیر بلند کر رہے ہیں حالانکہ آپ کو قتل کر کے ان لوگوں نے تو اصل تکبیر و کلمۂ توحید کا خاتمہ کر دیا، اے فرزندِ رسول! آپ کو کیا قتل کیا بلکہ ان لوگوں نے تو کھلم کھلا اور جان بوجھ کر آپ کے نانا رسولؐ کو قتل کر

ان مصائب کا تذکرہ فرماتے اور گریہ وزاری کرتے رہے خود مدینہ رسول میں جس وقت اس واقعۂ فاجعہ کی خبر آئی تو بنی ہاشم نے جس بے چینی کے ساتھ صف ماتم بچھائی ہے اس کا اندازہ حاکم مدینہ عمرو بن سعید اموی کے ان حرکات سے کیا جا سکتا ہے کہ جب اُس نے نوحہ و ماتم کی آواز سُنی تو ہنسنے لگا اور جوش مسرت میں کہہ اٹھا:-

وھذہ واعیۃ بواعیۃ عثمان یہ چیخ

پکار تو بدلہ ہے اُس چیخ اور فریاد کا جو عثمان کے لئے بلند ہوئی تھی۔ (تاریخ الطبری جزو دوم جلد ثانیہ صفحہ ۳۵۶ طبع لیڈن)

لیکن حسین کی یہ مظلومیت ہی کا اثر تھا کہ خود ظالم کے عشرت کدے میں صف ماتم بچھائی گئی اور وہ خاموش دیکھتا رہا، یہ تاریخی واقعات ہیں کہ:-

ثم ادخل نساء الحسین علی یزید فصاح نساء آل یزید وبنات معاویۃ وولولن

جب مخدرات عصمت وطہارت دربار یزید میں پیش کئے گئے اور محلسرا میں اس کی اطلاع ہوئی تو خاندان یزید و بنات معاویہ اور دیگر عورتوں نے فریاد کی اور رونا پیٹنا شروع کر دیا اسی کا اثر تھا کہ ظالم نے مجبور ہو کر اپنی زوجہ ہند بنت عبد اللہ بن عامر بن کریز کو گریہ کی اجازت دے دی تھی جس کی وجہ سے:-

فلم تبق من آل معاویۃ امرأۃ الا استقبلتھن تبکی وتنوح علی الحسین فاقاموا علیہ المناحۃ

خاندان معاویہ کی کوئی عورت ایسی نہ تھی جس نے اہل حرم کی خدمت میں آکر گریہ وزاری، نوحہ و فریاد کر کے صف ماتم نہ بچھائی ہو۔

صرف محلسرا کے اندر ہی نہیں بلکہ اموی خاندان کے مشہور افراد بھی دربار عام میں نوحۂ غم پڑھا کرتے تھے اور ظالم یزید کو برداشتہ خاطر ان اشعار کو سننا پڑتا تھا

چنانچہ مروان کے بھائی یحیٰ بن الحکم اموی نے حسینؑ کے مصائب کو سُن کر بھرے دربار میں یزید کے سامنے حُزنیہ انداز ذیل کے دردناک مرثیے کو پڑھنا شروع کر دیا تھا۔

لھامٌ بجنب الطف أدنی قرابۃ
من ابن زیاد العبد ذی الحسب الوغل
سمیۃ أمسی نسلھا عدد الحصی
وبنت رسول اللہ لیس لھا نسل

"ایک لشکر کا لشکر ابن زیاد کے قرابت داروں کا جو کہ کمینہ ہے، صحرائے طف کے قریب موجود ہے۔ سمیہ کی نسل تو شمار میں سنگریزوں کے برابر ہو گئی اور بنت رسول اللہ کی نسل باقی نہ رہی۔"

یہی یحیٰ بن الحکم شامیوں سے مخاطب ہو کر یہ بھی کہا کرتا تھا:- حجبتم عن محمدٍ یوم القیمۃ۔ تم سب قیامت کے دن رسول اللہؐ کے دیدار سے محروم ہو گئے۔

اس کو کہتے ہیں مظلومیت کی فتح، یہ وہ واقعات ہیں جن کو مورخین نے کتابوں میں لکھا ہے، تفصیل کے لئے تاریخ الرسل والملوک ابن جریر الطبری جزو دوم جلد ثانی صفحہ ۳۷۶ تا ۳۸۲ طبع لیڈن، اور تاریخ کامل ابن اثیر جلد چہارم طبع مصر ملاحظہ کی جائے۔

اصل یہ ہے کہ حسینؑ مظلوم نے صبر و استقلال، جہاد و استقرار علی الحق کا ایسا نمونہ عالم کے سامنے پیش کیا تھا کہ دشمن بھی اُس سے متاثر تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ آل زبیر جو علیؑ اور اولاد علیؑ کی عداوت میں مشہور تھے جنھوں نے ایک مدت تک صرف اس وجہ سے رسول اللہؐ پر درود بھیجنا ترک کر دیا تھا کہ اُس میں آل محمدؐ کا بھی ذکر ہے۔

عبد اللہ بن زبیر نے ۴۰ جمعوں تک نماز میں درود نہیں بھیجا صرف اس وجہ سے کہ اسمیں اہلبیتؑ بھی شامل ہیں

دیکھئے نصائح کافیہ محمد بن عقیل المصری صفحہ ۹۳ مروج الذہب مسعودی جلد ۲ صفحہ ۳۵ طبع اول مطبع ازہریہ مصر ۱۳۰۳ھ
جو علیؑ اور اولادِ علیؑ کا نام سُن کر غصے میں کانپنے لگتے تھے اور سخت سُست کہتے تھے یعنی عروہ بن زبیر
شرح ابن ابی الحدید جلد ا صفحہ ۳۶۰ "

لیکن واقعات کربلا کے بعد ان دشمنانِ اہلبیت کی یہ حالت ہوئی کہ جب عبداللہ بن زبیر "شہادتِ مظلوم" کو سنتے ہیں تو منبر پر جا کر "حسین کے فضائل و مصائب بیان کرتے ہیں (طبری جزء دوم جملہ ثانیہ صفحہ ۳۹۲ مطبع لیڈن) اور ان کے دوسرے بھائی مصعب بن زبیر جب عبدالملک بن مروان سے جنگ کرنے کا ارادہ کر لیتے ہیں تو واقعاتِ کربلا و شہادت امام حسینؑ کے حالات سننے کی خواہش کرتے ہیں۔

قال عروۃ بن المغیرۃ بن شعبہ فخرج لیلیر متکیا علی معرفۃ دابتہ ثم تصفح الناس یمیناً و شمالاً فوقعت عینہ علی فقال یا عروۃ الی فدنوت منہ فقال اخبرنی عن الحسین بن علی کیف صنع با بائہ النزول علی حکم ابن زیاد و عزمہ علی الحرب فقال ؎

ان الالی بالطف من آل ھاشم
تاسوا فسنوا للکرام التاسیا

قال فعلمت انہ لا یریم حتی یقتل" الطبری جزء دوم جملہ ثانیہ صفحہ ۸۰۴ طبع لیڈن) عروہ بن مغیرہ بن شعبہ بیان کرتا ہے کہ جب مصعب جنگ کے لئے نکلے تو وہ اپنے گھوڑے کی یال و گردن پر سہارا لئے ہوئے تھے اور دائیں اور بائیں غور سے دیکھتے جاتے تھے کہ مجھ پر نظر پڑی مجھکو قریب بلا کر پوچھا کہ اے عروہ یہ تو بتلاؤ کہ حسین بن علیؑ نے ابن زیاد کی اطاعت سے انکار کر کے اُس سے جنگ کرنے کے لئے اپنے عزم کو کیونکر ظاہر کیا'

اس کے بعد مصعب نے یہ شعر پڑھا جس کا مطلب یہ ہے کہ میرے لیے تاسی اور پیروی کرنا آلِ ہاشم کی جو یوم طف (معرکۂ کربلا) میں شہید ہوئے لازمی ہے کیونکہ ان کی تاسی بزرگانِ ملت و قوم کی پیروی کرنا ہے عروہ کہتا ہے کہ مصعب کی باتوں سے میں سمجھ گیا کہ وہ میدان سے اب نہ جاویں گے جب تک قتل نہ ہو جاویں۔

مورخ محمد بن خاوند شاہ لکھتا ہے:۔

دریں اثنا نظر مصعب بر عروہ بن مغیرہ افتاد گفت مرا خبر دہ کہ امام حسینؑ بعد ازاں کہ قوم او را گفتند کہ بحکم پسر زیاد راضی شود با آں رضا خانہ داد چگونہ جنگ کرد تا کشتہ شد، عروہ بتفصیل حکایت شہادت امیرالمومنین حسینؑ را گفت دانست کہ مصعب دل بمرگ نہادہ (تاریخ روضۃ الصفا جلد سوم صفحہ ۸۰ طبع بمبئی)

ان واقعات سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ واقعات کربلا میں کس قدر اثر تھا کہ دشمن تک ذکر کرنے کے لئے مجبور ہوتے تھے اور اس سے سبق حاصل کرنے کی کوشش کرتے تھے ظاہر ہے کہ جب دشمنوں کی یہ حالت تھی تو دوستوں کی کیا کیفیت رہی ہوگی اس واقعۂ ہائلہ کے بعد شیعیانِ علیؑ سخت مضطرب بے چین تھے کربلا کے مظالم یاد کر کے روتے تھے اور جذبۂ انتقام سے مجبور ہو کر اموی حکومت کے خلاف انقلاب بپا کرنے کی جدوجہد کر رہے تھے گروہ گریہ کن "توابین" کی خون آشام تلوار ہی اس مقصد کے حصول کے لئے نیام سے باہر نکل آئی تھی اور نوحہ خواں سُدیف بن میمون، شاعرِ انقلاب کی حیثیت سے "سفاح" کے دربار میں اسی چیز کی تبلیغ دعوت دے رہا تھا ؎

لا یغرنک ما تری من رجال
ان تحت الضلوع داءً دویّا

فضع السیف وارفع السوط حتیٰ لا تری فوق ظهرها اموییا

امیر! ان لوگوں سے دھوکہ میں نہ آ، یہ بنی امیہ ہیں، ان کے پہلو میں کینہ و عداوت ہے اس لیے تلوار نیام سے نکال اور کوڑے کو اٹھا، دیکھ پشت زمین پر کوئی اموی نظر نہ آئے۔

واقعۂ کربلا کے بعد "عوام" و پردہ نشین عورتیں اس حد تک انقلاب پسند ہوگئی تھیں کہ یزید اور اس کے بیٹے معاویہ کے مرنے کے بعد جب عبید اللہ بن زیاد نے (جو اس زمانے میں بصرہ کا گورنر تھا) اہل بصرہ کے سامنے ایک تقریر کی اور یہ تحریک کی کہ تم لوگوں کو چاہیئے کہ اب تم اپنا امیر کسی کو مقرر کر لو، لوگوں نے عبید اللہ ہی کو اپنا امیر مقرر کیا، اب عبید اللہ بن زیاد نے اپنے ماتحت عمرو بن حریث الخزاعی حاکم کوفہ کو یہ لکھا کہ:۔

ان بایع اهل الکوفة بما دخل اهل البصرة

اہل کوفہ کو حکم دو کہ بصریوں نے جو کیا ہے اس پر وہ کاربند ہوں لیکن کوفہ میں یزید بن رویم الشیبانی نے اس کی مخالفت کی اور یہ کہا کہ:۔

لا حاجة لنا فی بنی امیة ولا فی امارة ابن مرجانة انما البیعة لاهل الحجاز،

ہم کو اب بنی امیہ کی ضرورت نہیں اور نہ ابن مرجانہ کی حکومت ہم چاہتے ہیں، اب تو اہل حجاز کی بیعت ہونی چاہیئے۔ اس کا یہ اثر ہوا کہ:۔

فخلع اهل الکوفة ولایة بنی امیة وامارة ابن زیاد وارادوا ان ینصبوا لهم امیرا الی ان ینظروا فی امرهم فقال جماعة عمر بن سعد بن ابی وقاص یصلح لها فلما هموا بتامیره اقبل نساء من همدان وغیرهم من نساء کهلان والانصار وربیعة والنخع حتی دخلن المسجد الجامع صارخات باکیات معولات یندبن الحسین ویقلن اما رضی عمر بن سعد یقتل الحسین حتی اراد ان یکون امیرا علینا علی الکوفة فبکی الناس واعرضوا عن عمر" (مروج الذهب مسعودی جلد ۲ ص ۹۶)

اہل کوفہ نے بنی امیہ کی حکومت اور ابن زیاد کی امارت قبول کرنے سے انکار کر دیا، اور یہ چاہا کہ اپنا امیر وہ خود منتخب کریں، ایک گروہ نے عمر بن سعد کے بارے میں اپنی رائے ظاہر کی اور یہ کہا کہ وہ اس کے لیے اہل ہے لیکن جب تقریباً طے کر کے یہ لوگ اس کو اپنا امیر بنانا چاہتے ہی تھے کہ (شیعی قبائل ہمدان، کہلان، ربیعہ، نخع اور انصار کی عورتیں امام حسین پر گریہ و زاری اور نوحہ و سینہ کوبی کرتی ہوئی کوفہ کی جامع مسجد (جہاں یہ مجمع تھا) میں داخل ہوئیں اور یہ کہنے لگیں کیا عمر بن سعد حسین مظلوم کو قتل کر کے ابھی راضی نہیں ہوا، جو اب ہم لوگوں کا امیر بننا چاہتا ہے، یہ سن کر مجمع کا رنگ بدل گیا اور لوگ رونے لگے، اور عمر سعد سے پھر گئے۔"

یہ جذبۂ انقلاب صرف عورتوں ہی تک میں محدود نہیں رہا بلکہ ۶۵ھ میں، دوستداران اہلبیت کی ایک جماعت جو تاریخ میں "توابین" کے نام سے مشہور ہے، میدان عمل میں آگئی یہ ہمت کے پورے تھے، اور بات کے دھنی وہ تھے جو یہ ارادہ کر کے نکلے تھے کہ

" لا من قتل قتله او القتل فیه" یعنی قاتلان خاندان نبوت کو قتل کریں گے ورنہ خود اس راہ میں قتل ہو جائیں گے۔

اس مبارک گروہ کا انقلاب پسند شاعر "عبد اللہ بن الاحمر" اپنے کلام سے لوگوں کو اس نیک کام کے لیے

ابھارتا رہتا تھا اور "حسین" کا مرثیہ اس رنگ میں
کہتا تھا کہ جس سے لوگ یحیث فیہ علی الحزن وجم
و یرثی الحسین ومن قتل معہ ویلوم شیعتہ
بتخلفھم عنہ برانگیختہ ہو کر حکومت سے مقابلہ کرنے
کے لیے نکل پڑیں، اور جنہوں نے مدد نہیں کی اُن
کے لیے تازیانۂ ملامت کا کام دے۔

اس کے چند اشعار یہ ہیں :-

صحوت وقد صحوا الصبی والوادیا
وقلت لاصحابی اجیبوا المنادیا
وقولوا لہ اذ قام یدعو الی الھدیٰ
وقبل الدعا لبیک داعیا

مرثیہ کہتا ہے :-

الا ان خیر الناس جدا ووالدا — حسینا لاھل الدین ان کنت ناعیا
لبیک حسینا مرمل ذو خصاصۃ — عدیم وایتام تشکی الموالیا
فاضحیٰ حسین للرماح دریۃ — وغودر مسلوبا لدی الطف ثاویا
فیا لیتنی اذ کان کنت شھدتہ — فضاربت عنہ الشانئین الاعادیا
سقی اللہ قبرا ضمن المجد والتقیٰ — بغربیۃ الطف الغمام الغوادیا

فیا امۃ تاھت وضلت سفاھۃ
انیبوا فارضوا الواحد المتعالیا

(مروج الذہب مسعودی جلد ۲ ص ۹۱)

خود ائمہ اہلبیت علیہم السلام نے بھی واقعات کربلا کی نشر و اشاعت کے جانب خاص توجہ فرمائی ہے عزائے حسین میں خود بھی مصروف رہے اور دوسروں کو بھی دعوت دیتے رہے، مجالس کے قیام کے متعلق مذہبی احکامات و ہدایات صادر فرمائے، اور گریہ و ذکر حسین کے فضائل میں احادیث ارشاد کئے گئے، اگرچہ مروانی اور عباسی حکومتیں اس کی مخالفت کرتی رہیں اور اس امر کی کوشاں رہیں کہ عزادارانِ حسینؑ یعنی سادات و دوستدارانِ علیؑ کا خاتمہ دنیا سے کر دیں اور فضائل و مناقب اہلبیت سے دنیا ناواقف ہو جائے۔

وکان اھل البیت وشیعتھم فی ایام تینک الدولتین وفی امرۃ ابن زبیر فی غایۃ من الاضطھاد والتشرید والقتل والاذی طبق ما اخبر بہ المصطفیٰ فانھم خرجوا من ظلم بنی امیۃ الی ظلم بنی العباس ولئن کان بنو العباس اعداء البنی امیۃ فانھم کذالک اعداء العلویین کارھین ذکر ما فیہ منقبۃ وفضل بنی علی علیہ السلام حتی ان احد ملوکھم ھدم قبر الحسین علیہ السلام وزرع الارض فوقہ وحکم لبعضھم علی العلویین ان لا یرکبوا خیلا ولا یتخذوا خادما وان من کان بینہ وبین احد من العلویین خصومۃ من سائر الناس قبل قول خصمہ فیہ ولم یطالب بینۃ کما ذکر ذالک المقریزی فی الخطط وغیرہ ومات کثیر من اکابرھم فی سجون بنی العباس۔ (النصائح الکافیہ لابن عقیل المصری ص ۱۰۵)

اموی اور عباسی دور میں اور زمانۂ حکومت ابن زبیر میں بھی اہلبیتؑ رسول اور اُن کے دوستوں پر ظلم و جبر کی انتہا تھی۔ رسولؐ کی پیشگوئی کے مطابق اُن کو طرح طرح کی اذیتیں دی جاتیں، شہر بدر کئے جاتے۔ وہ بنی امیہ کے ظلم سے نکل کر بنی عباس کے مظالم میں مبتلا ہو گئے، بنی عباس اگرچہ بنی امیہ کے دشمن تھے لیکن اولاد علیؑ و فاطمہؑ کے سخت ترین دشمن تھے اہلبیت کے فضائل و مناقب کی یہ سخت مخالفت کرتے تھے، ان کی عداوت کی یہ انتہا تھی کہ اُن کے ایک خلیفہ متوکل نے قبر مقدس امام حسینؑ کو منہدم کرا دیا تھا اور اس پر کھیتی کرائی۔ یہ ظلم دو مرتبہ ہوا، ایک مرتبہ بنی امیہ کے زمانے میں اور دوسری مرتبہ متوکل کے عہد میں (حدائق الوردیہ) اور ان کے زمانے میں سادات کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ وہ سواری پر نہ سوار ہوں اور کوئی خادم نہ رکھیں

اور اگر کسی معمولی آدمی کو کسی "سید" سے رنجش و عداوت ہو اور وہ دشمنی میں کوئی الزام لگائے تو وہ الزام بغیر ثبوت کے مان لیا جائے ان واقعات کا مفصل ذکر علامہ مقریزی نے اپنی کتاب خطط الآثار میں کیا ہے، اس کے علاوہ سادات مقید کیے جاتے تھے حتیٰ کہ اکثر سادات قید ہی میں مر گئے (علامہ مقریزی نے علاوہ "خطط" کے ایک دوسری کتاب میں بھی تفصیل کے ساتھ ان مظالم کو لکھا ہے جس کا نام کتاب "النزاع والتخاصم" جو مصر کے مکتبۂ اہرام سے ۱۹۳۷ء میں شائع ہو چکی ہے۔"

لیکن ان مظالم کے باوجود امام حسین علیہ السلام کی تعزیت کو بند نہ کیا جا سکا بلکہ اس میں برابر اضافہ ہوتا رہا، شعراء واقعات کربلا پر مرثیے نظم کرتے تھے۔

چنانچہ مشہور شاعر کمیت بن زید اسدی نے امام محمد باقر علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہو کر مرثیے پڑھے اس سلسلہ میں مورخ مسعودی نے کمیت کے متعلق ایک واقعہ لکھا ہے جس کا تذکرہ ہمارے مقصد تالیف کے لیے بہت ضروری ہے، وہ بیان کرتا ہے کہ ایک مرتبہ کمیت بن زید عرب کے مشہور شاعر، مداح امام زین العابدینؑ "فرزدق" کے پاس گیا اور اپنے قصائد "ہاشمیات" کو سنا کر یہ مشورہ کیا کہ اگر یہ کلام قابل اشاعت ہو تو مشتہر کروں ورنہ پوشیدہ رکھوں، "فرزدق" نے اشعار سننے کے بعد یہ کہا کہ:۔

"للہ درک یا بنی ابیت فاحسنت اذ علت عن الضعانف والاوباش اذ الابصر دسہمک ولا یکذب قولک ثم مر فیھا فقال لہ اظھر ثم اظھر دکذ الاعداء فانت واللہ اشعر من مضی واشعر من بقی۔"

بیٹا۔ خدا تمہارا بھلا کرے، بہت خوب کہا ہے اور کیوں نہ ہو تم نے ذلیل و اوباش لوگوں کی مدح سے روگردانی کر کے ایسے پاکیزہ نفوس کی مدح کی ہے کہ اب تمہارے کلام کی تکذیب نہیں کی جا سکتی ہے تم اپنے ایسے کلام کو مشہور کر کے دشمنوں کو مصیبت و رسوائی میں مبتلا کر دو، بخدا جو شاعر گذر گئے اور جو باقی ہیں تم اُن سے بہتر ہو۔

اب کیا تھا ایک استاد فن کی تحسین و ترغیب کے بعد کمیت، مدینۂ منورہ میں پہونچ کر، ایک شب کو فرزند رسول امام محمد باقر علیہ السلام کی بارگاہ میں حاضر ہوا، اور اس نے ان قصائد و مراثی کو سنانا شروع کیا جب اُس نے مرثیۂ میمیہ کے اس شعر کو سنایا"

وقتیل بالطف غودس منھم
بین غوغاء أمة وطغام

تو حضرت پر گریہ طاری ہوا، اور ارشاد فرمایا کہ

یا کمیت لو کان عندنا مال لاعطیناک
ولکن قلت لک ما قال رسول اللہ صلعم
حسان بن ثابت لا نزالت موٴیدا بروح القدس
ما ذببت عنا اھل البیتؑ،

اے کمیت اگر آج ہمارے پاس مال دنیا سے کچھ ہوتا تو تم کو عطا کرتے۔ لیکن تمہارے لیے بھی وہی کہتا ہوں جو رسول اللہؐ نے حسان بن ثابت سے فرمایا تھا کہ جب تک تم ہم اہلبیتؑ کی مدد (اپنے کلام سے) کرو گے روح القدس (جبرئیلؑ) کی تائید تمہارے ساتھ رہے گی۔

اس کے بعد کمیت جناب عبداللہ بن حسنؑ بن علیؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور اپنے ان قصائد و مراثی کو سنایا، ان بزرگ نے ارشاد فرمایا کہ اے کمیت میں چار ہزار دینار منافع کی جائداد کا مالک ہوں: وہ تمام کی تمام تمھیں ہبہ کرتا ہوں، لو یہ تحریری دستاویز "ہبہ نامہ" مع گواہوں کے موجود ہے، تمھیں یہ مبارک ہو اس دستاویز کو لے لو، کمیت نے عرض کیا میرے ماں باپ

فدا ہوں بخدا میں نے خلوص سے اللہ کے لیئے یہ کیا ہے
جس چیز کو خدا کے لیے میں نے کیا ہے اس کے بدلے میں
مال دنیا نہیں لے سکتا لیکن جناب عبداللہ نے بہت اصرار
کیا، جس کی وجہ سے مجبوراً کمیت کو وہ ہبہ نامہ لے لینا پڑا،
اس کے چند دنوں کے بعد کمیت جناب عبداللہ کی خدمت
میں پھر حاضر ہوئے، اور عرض کیا کہ اے فرزند رسولؐ
میرے ماں باپ فدا ہوں، میری ایک حاجت ہے، فرمایا
کہو، پوری کی جائے گی، کمیت نے عرض کی جو بھی حاجت ہوگی
کیا وہ ضرور پوری ہوگی، فرمایا، ہاں! اس قول و قرار کے
بعد کمیت نے عرض کیا، حضور یہ ہبہ نامہ واپس لے لیں
اور جائداد پر قبضہ فرمالیں یہ کہکر اس دستاویز کو سامنے
رکھدیا، جناب عبداللہ نے ناچار قبول فرمالیا، یہ دیکھ
کر اس خاندان کے ایک دوسرے بزرگ جناب عبداللہ
بن معاویہ بن عبداللہ بن جعفر بن ابی طالب اُٹھ
کھڑے ہوئے۔ اور اپنے چار خدمت گاروں کو طلب
فرما کر ایک کپڑا دیا، اور بنی ہاشم کے گھروں میں تشریف
لے گئے اور فرمایا:۔

یا بنی هاشم هذا الكميت قال فيكم الشعر
حين صمت الناس عن فضلكم و عرض دمه
لبني امية فاثيبوه بما قدرتم

اے بنی ہاشم یہ شاعر خوش گفتار کمیت ہے
جو تمھاری شان میں شعر کہتا ہے، ایسے زمانے میں جب
کہ لوگ تمھارے فضائل کو بیان کرنے سے خاموش
ہو گئے ہیں لیکن اس نے (ہماری مدح و ثنا کرکے) اپنے
خون کو بنی امیہ کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ لہذا
تمھارے امکان میں جو کچھ ہو اس کا بدلہ دو،
پس تمام لوگوں نے درہم و دینار جو کچھ بھی
ہو سکتا تھا، اُس کپڑے میں ڈالنا شروع کر دیا، جب
اندرون خانہ مخدرات و عورات کو اس کی اطلاع ہوئی

تو ان عورتوں نے بھی جو کچھ ہو سکتا تھا بھیجا، یہاں
تک کہ زیورات اتار اتار کر بھیج دیئے نوبت باینجا رسید
کہ فوراً اُسی وقت درہم و دینار، اور زیورات سب ملاکر
تقریباً ایک لاکھ درہم کے اکٹھا ہوگیا اور اس کو لیکر
کمیت کے پاس پیش کر دیا اور فرمایا کہ:۔

اتيناك بجهد المقل ونحن في دولة عدونا
وقد جمعنا هذا المال وفيه حلي النساء كما
ترى فاستعن به على دهرك،

یہ ایک غریب کا ناچیز ہدیہ ہے تم جانتے ہو کہ ہم اپنے
دشمنوں کی حکومت میں کس طرح زندگی بسر کر رہے ہیں،
تھوڑا سا مال جمع ہو گیا ہے جیسا کہ تم دیکھ رہے ہو
اس میں عورتوں کے زیورات بھی ہیں، اس کو قبول
کر لو، اور ناسازگار زمانے میں اپنے کام میں لاؤ۔
یہ دیکھ کر کمیت نے عرض کیا کہ یہ بہت بڑا احسان ہے
لیکن میں آپ حضرات کی خدا و رسولؐ کے لیے
کرتا ہوں، اس لیے دنیا میں اس کی قیمت نہیں چاہتا
اس کو آپ واپس فرما دیجئے، عبداللہ نے بہت
کوشش کی کہ کسی حیلے سے کمیت قبول کر لے لیکن اُس نے
نہ لیا۔ اُس وقت آپ نے کہا کہ:۔

اذ ابيت ان تقبل فاني رأيت ان
تقول شيئاً تغضب به بين الناس لعل
فتنة تحدث فيخرج من بين اصابعها بعض
ما يحب فابتدأ الكميت وقال قصيدته
التي يذكر فيها مناقب قومه من مضر بن
نزار بن معد وربيعة بن نزار وايادو انمار
بني نزار ويكثر فيها من تفضيلهم ويطنب في
وصفهم وانهم افضل من قحطان فغضب
بها اليمانية النزار،

اچھا اگر تم اس کے لینے سے انکار کرتے ہو تو تم میری اس رائے

عمل کرو، ایسے اشعار کہو جس سے حکومت کے خلاف ایک عام ہیجان پیدا ہو جائے، اور اُن کے ہاتھ سے حکومت جاتی رہے۔ کمیت نے اس کو قبول کیا اور ایک معرکۃ الآرا قصیدہ قبائل مضر و ربیعہ کی مدح میں کہا اور ساتھ ہی ساتھ قبائل بنی قحطان کی ہجو اور برائی بیان کی پھر کیا تھا تمام قبائل عرب مثل شعلے کے بھڑک اٹھے (اور آتش فتنہ و فساد سے جل کر اموی حکومت تباہ ہو گئی۔)

و من قول الکمیت فی النزاریۃ والیمانیۃ دا فتخرت الیمن علی نزار و أدلی کل فریق بما لہ من المناقب و تحزبت الناس و ثارت العصبیۃ فی البدو والحضر فنتج بذلک امر مروان بن محمد الجعدی و تعصبہ لقومہ من نزار علی الیمن و انحرفت الیمن عنہ الی الدعوۃ العباسیہ و تغلغل الامر الی انتقال الدولۃ عن بنی امیہ الی بنی ھاشم، (مروج الذھب مسعودی جلد ۲ صفحہ ۱۳۹، ۱۴۰)

کمیت کے اشعار قبائل نزار و یمان میں مشہور ہو کر زبان زد ہو گئے، نزاری یمانی کے مقابلے میں فخر کرنے لگے اور یمانی، نزاریوں پر تفاخر کرنے لگے جس کی وجہ سے ہر جگہ بدوی اور شہری دونوں طبقوں میں شدت کے ساتھ عصبیت ظاہر ہوئی اور اختلافات پیدا ہو گئے خلیفہ اموی مروان حمار نے قبائل یمانی کے خلاف نزاری قبائل کی طرفداری کی جس کی وجہ سے اہل یمن خلیفہ اور امویوں کے مخالف ہو گئے اور عباسیوں کی تحریک میں مدد کرنے لگے، نتیجہ یہ ہوا کہ امویوں کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا اور دولت ہاشمی قائم ہو گئی۔

ولہ قصائد الہاشمیات خمسمایۃ و بضعۃ و سبعون بیتا بذکر فیھا الحسین و قتلہ (حدائق الوردیہ)

کمیت کے قصائد ہاشمیات کے اشعار کی تعداد پانچ سو ستر سے زیادہ ہے جس میں واقعۂ شہادت امام حسینؑ کا تذکرہ کیا ہے۔

تنہا کمیت اسدی ہی نہیں جس نے مجلس امام معصوم میں حاضر ہو کر مرثیہ پڑھا بلکہ ابو عمارہ اور جعفر بن عفان نے بھی امام جعفر صادق علیہ السلام کی مجلس میں حاضر ہو کر اپنے مراثی پڑھے، اسی طرح دعبل خزاعی اور ابراہیم بن عباس نے امام رضا علیہ السلام کے حضور میں مرثیے پڑھے، ظاہر ہے کہ یہ زمانہ دوستداران اہلبیت کے لیے سازگار نہ تھا وہ اپنی جان و مال کے خوف سے علانیہ مناقب و مصائب خاندان رسالت کو نظم نہیں کر سکتے تھے لیکن جب کبھی انھیں موقع ملتا وہ مصائب اہلبیت پر مرثیہ ضرور کہتے تھے، حدائق الوردیہ فی ذکر ائمۃ الزیدیہ میں ہے:-

ولم یجسر احد من شعراء الشیعۃ یرثیہ خیفۃ من بنی امیہ الا الکمیت و ابو ذھل وھب الجمحی و کثیر بن کثیر السھمی و غیرھم،

بنی امیہ کے خوف سے کسی شیعہ شاعر کو یہ جرأت نہیں ہوتی تھی کہ واقعہ کربلا پر علانیہ مرثیہ کہے سوائے کمیت، اور ابو ذھیل وہب جمحی وکثیر بن کثیر سہمی کے۔ (عربی مرثیہ پر تفصیلی بحث کے لیے میری کتاب "عربی مرثیہ کی مختصر تاریخ" شائع کردہ امامیہ مشن لکھنؤ ملاحظہ ہو)

غرضکہ ائمہ اہلبیت علیہم السلام کی ہدایت و ارشاد کی بنا پر دوستداران علیؑ برابر اظہار غم و الم کرتے رہے اور مجالس ذکر حسینؑ منعقد کرنا شیعوں کا ایک مذہبی و دینی شعار ہو گیا، خاص کر عشرۂ محرم دینی حیثیت سے مخصوص یوم غم و الم قرار دیا گیا اس کے برخلاف دشمنان اہلبیت نے اس یوم غم کی اہمیت کو کم کرنے کے لیے جد و جہد شروع کر دی، اس کے لیے راویان حدیث کی خدمات حاصل کی گئیں جعلی و جھوٹی روایات کو

محدثین نے اپنی کتابوں میں جگہ دینی شروع کر دی، فضیلت یوم عاشور کے سلسلہ میں عام طور سے مجہولات روایات کی اشاعت کی جانے لگی یہاں تک عبد الملک بن مروان کے زمانے میں حجاج بن یوسف ثقفی نے عشرۂ محرم کو یوم سرور و عید قرار دے دیا اور اس دن تمام ممالک محروسہ و حدود شام میں خوشی کی جانے لگی، (الخطط والآثار للمقریزی جلد اول صفحہ ۴۹۰ طبع مصر) مگر یہ کوششیں عباسی حکومت تک برابر مسلسل جاری رہیں مگر جب بنی عباس کی حکومت کمزور ہو گئی اور آل بویہ (دیالمہ) کو جو محب خاندان رسالت تھے سطوت و غلبہ حاصل ہوا تو "معز الدولہ دیلمی" نے سنہ ۳۵۲ھ میں دار الخلافت بغداد میں علانیہ "عزائے حسین" برپا کرنے کا حکم دے دیا،

"وفیہا یوم عاشوراء الزم معز الدولۃ اهل بغداد النوح والمأتم علی الحسین وامر بغلق الابواب وغلقت فیہا السوق ومنع الطباخین من عمل الاطعمۃ وخرجت النساء الرافضۃ ناشرات الشعور" (تاریخ مرآۃ الجنان علامہ یافعی وقائع سنہ ۳۵۲ھ وتاریخ ابو الفدا جلد دوم صفحہ ۱۰۳ طبع حسینیہ مصر)

سنہ ۳۵۲ھ میں عشرۂ محرم کو معز الدولہ دیلمی نے اہل بغداد کو امام حسینؑ پر نوحہ و ماتم کرنے کا حکم دیا اور شہر کی رونق و آرائش کو کم کرنے و اظہار غم کے لیے بازار اور دروازے بند کرا دیئے گئے یعنی مکمل ہڑتال کرائی گئی اور باورچیوں کو اس دن کھانا پکانے سے منع کر دیا گیا اور شیعہ عورتیں اظہار غم میں بال کھولے ہوئے نکلیں۔

بغداد میں علانیہ عزائے حسینؑ کے یہ مظاہرات سنہ ۳۵۲ھ سے شروع ہوئے مگر مملکت مصر میں روز عاشور کے یہ مظاہرات غم مورخ مقریزی کے بیان کے مطابق فرمانروائے مملکت مصر و شام ابوبکر محمد بن ابو محمد طغج الاخشید متوفی سنہ ۳۳۴ھ و دیگر ملوک اخشیدیہ کافوریہ کے عہد سے رواج پذیر تھے (الخطط والآثار للمقریزی جلد ۲ صفحہ ۲۸۹) مورخ مقریزی نے یہ وضاحت کی ہے کہ عہد اخشیدی کے مراسم غم حسین جو مصر میں رائج و شائع تھے ان کو "المعز لدین اللہ الفاطمی" نے سنہ ۳۶۳ھ سے بہت زیادہ تقویت پہونچائی جس کے بعد فاطمئین کے ہر دور حکومت میں بڑی شد و مد کے ساتھ عزائے حسینؑ کا رواج علانیہ ہونے لگا، (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو الخطط والآثار للمقریزی جلد دوم صفحہ ۲۸۹ تا ۲۹۱ طبع مصر سنہ ۱۳۲۳ھ)

ان مقامات میں عزائے حسینؑ مظلوم کی سخت مخالفت بھی کی گئی، بغداد میں حسینی یادگار کے مقابلہ میں مخالفین نے سنہ ۳۹۰ھ سے مصعب بن زبیر کے قتل کی یادگار منانا شروع کر دی اور ۱۸ محرم کو مصعب کے واقعۂ قتل پر اظہار غم کرنے لگے جو کچھ دنوں کے بعد خود ہی بند ہو گیا (تاریخ الکامل ابن اثیر جلد ۹ صفحہ ۵۴ طبع مصر)

مصر میں خلفاء فاطمئین کی سطوت سے یہ تو ضرور ہوا کہ اس قسم کی کوئی حرکت نہ کر سکے لیکن جب سلطان صلاح الدین یوسف بن ایوب نے فاطمیوں کی سلطنت کو تباہ و برباد کر دیا تو سب سے پہلے اُس نے عزائے امام مظلوم کے مٹانے کی کوشش کی اور عید عاشور حجاج ثقفی کی بد بدعت کو پھر سے جاری کر دیا (الخطط والآثار للمقریزی) لیکن باوجود اس مخالفت کے عمومی حیثیت سے اس زمانے کے تمام مسلمانوں نے سانحۂ کربلا کو اپنے لیے ایک مصیبت عظیم تصور کیا تھا، چنانچہ ابو محمد القاسم بن علی بن محمد بن عثمان الحریری البصری صاحب المقامات (المتولد سنہ ۴۴۶ھ) نے اپنے ۵۰ ویں مقا

"الرجیہ" میں بطور ضرب المثل کے یہ کہا ہے کہ "کما جل لدی المسلمین رزء الحسینؑ" جس طرح عام مسلمانوں میں حسینؑ کی مصیبت عظیم ہے اس فقرے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُس زمانے میں غم حسینؑ کی کیا اہمیت تھی، فاضل معاصر علی جلال الحسینی الحنفی اپنی تصنیف منیف "الحسین" الکتاب الثانی صفحہ ۱۹۵ طبع قاہرہ ۱۳۴۹ھ پر لکھتے ہیں :-

ویری کثیر من العقلاء ان قتل الحسینؑ کان اعظم مصائب المسلمین قال منصور الثعالبی فی اخر کتاب ثمار القلوب ان الوزیر عبید اللہ بن سلیمان کان رایہ ان قتل الحسین اشد ما کان فی الاسلام علی المسلمین لان المسلمین یئسوا بعد قتلہ من کل فرج یرتجو نہ و عدل ینتظرونہ"

اکثر عقلا کا یہ خیال ہے کہ شہادت حسین مسلمانوں کی سب سے بڑی مصیبت ہے، منصور ثعالبی ثمار القلوب کے آخر کتاب میں کہتے ہیں کہ وزیر عبید اللہ بن سلیمان کی یہ رائے ہے کہ عالم اسلام میں مسلمانوں کے لیے شہادت حسینؑ سے زیادہ سخت غمناک اور کوئی حادثہ نہیں ہے اس لیے کہ حضرت کی شہادت کے بعد مسلمان ہر اُس کشادگی و مسرت سے جس کی وہ امید کرتے تھے نا امید ہو گئے اور جس عدل و انصاف کے انتظار میں تھے اُس سے مایوس ہو گئے۔

عقلاء اسلام ہی نہیں بلکہ عام طور سے مسلمانوں کا یہ خیال تھا کہ "ضحی بنو امیہ بالدین یوم کربلا" بنو امیہ نے اصل دین کو کربلا میں ذبح کر دیا (ابن خلکان جلد ۲ صفحہ ۲۷۲)

بدیع الزماں احمد بن الحسین الہمدانی صاحب المقالات المتوفی ۳۹۸ھ اپنے مرثیہ حسینؑ میں کہتا ہے

لرزیۃ قامت بہا للدین اشراط القیامہ

شہادت حسینؑ ایک عظیم مصیبت ہے جس کی وجہ سے دین میں قیامت برپا ہوگئی (رسالہ بدیع الزماں ہمدانی بر حاشیہ خزانۃ الادب حموی صفحہ ۵۰ طبع مصر، وکشف المعانی والبیان الرسالۃ العاشرہ صفحات ۵۸، ۶۰ طبع بیروت)

یہ تاثرات بعد کے پیدا وار نہیں ہیں جو کسی رد باؤ یا پروپیگنڈا کا نتیجہ کہے جا سکیں، بلکہ واقعۂ کربلا کے بعد ہی دار الخلافت یزید شہر دمشق میں ان تاثرات کا اظہار کیا گیا، چنانچہ خالد بن معدان الطائی متوفی ۱۰۳ھ جو اصحاب امیر المومنینؑ و افاضل تابعین میں سے ہیں وہ شہر دمشق میں اُس وقت موجود رہتے جب سرہائے شہدا نیزوں پر بلند کر کے لائے گئے اور دفعتاً اس طرح امام مظلوم کی شہادت سے یہ آگاہ ہوئے اس وقت غم حسینؑ میں انھوں نے ایک مرثیہ کہا جس کے چند اشعار یہ ہیں :-

جاءوا براسک یا ابن بنت محمد

مترملاً بدمائہ ترمیلا

اے فرزند دختر رسول، یہ ظالم آپ کے سر مبارک کو نیزہ پر چڑھا کر آغشتہ بخوں لائے ہیں۔

قتلوک عطشاناً ولم یترقبوا

فی قتلک التنزیل والتاویلا

ہائے اے فرزند رسول آپ کو پیاسا قتل کیا گیا افسوس آپ کے شہید کرنے میں حدیث و قرآن کا مطلق لحاظ نہیں کیا،

وکانما بک یا ابن بنت محمد

قتلوا جہاراً عامدین رسولا

اے فرزند رسول، در اصل آپ کے قتل کرنے میں ان لوگوں نے تو عمداً اور کھلم کھلا رسول ہی کو قتل کر ڈالا،

لا یوم اعظم حسرۃً من یومہ

واراہ رہناً للمنون قتیلا

روزِ شہادت (یوم عاشورہ) سے زیادہ کوئی دن پُر حسرت وزیادہ مصیبت ناک نہیں ہے کیونکہ اس دن میں اپنے نبی کے فرزند کو رہین موت و قتیل دیکھتا ہوں،

و یکبرون بان قتلت وانما
قتلوا بک التکبیر والتہلیلا

ہائے واویلا یہ کیا اندھیر ہے کہ آپ کو قتل کر کے یہ بدبخت تکبیر کی آواز بلند کرتے ہیں حالانکہ آپ کے قتل کرنے سے ان ظالموں نے اصل تکبیر و تہلیل ہی کو ذبح کر ڈالا۔ (تاریخ الکبیر ابن عساکر جلد ۵ صفحہ ۸۵ و کتاب البدایہ والنہایہ ابن کثیر و روضۃ الندیّہ محمد بن اسمٰعیل الامیر الصنعانی صفحہ ۱۱۷ و الحاکم النیشاپوری والبیہقی وغیرہم)

یہی وہ حقیقی تاثرات ہیں جس کی وجہ سے دین دار مسلمان خصوصاً شیعیان اہلبیت مصروف عزا و بکا ہو گئے ایران جس کا طبعی رجحان تشیع کی طرف ہے وہ نہ صرف عزاداری و سوگواری کی سرزمین بنی بلکہ اس سرزمین نے تعزیہ دار ملت گریہ کن کو پیدا کیا،

آقائی کاظم زادہ (ایران شہر) اپنی کتاب تجلیات روح ایرانی صفحہ ۷۰ طبع برلن میں تحریر فرماتے ہیں:-

"وقوع حادثۂ جگر سوز کربلا و شہادت حضرت حسین و یاران و فرزندان و اسارت باقی ماندگان آن خاندان مطہر و مصائب و بلاہائے کوفہ و شام نہ تنہا دل شیعیان و ایرانیان بلکہ قلوب تمام مسلمین را داغدار کرد و محبت مسلمانان بخصوص ایرانیان را بخاندان آل رسول یک بر ہزار افزود و بہمان درجہ کینہ و عداوت آنان را بر بنی امیہ محکم تر و افزون تر گردانید تا در برانداختن سلطنت آنان ہمدست و ہمداستان شدند۔"

جگر سوز واقعہ کربلا یعنی امام حسینؑ اور حضرت کے اصحاب و انصار، فرزندان و اقارب، کی مظلومانہ شہادت اور خاندان مطہر و یتیم بچوں و اہل حرم کی قید و گرفتاری اور کوفہ و شام کی آزار و مصیبت یہ وہ واقعات ہیں جو نہ صرف شیعوں اور ایرانیوں کے دلوں کو زخمی کرتے ہیں بلکہ تمام مسلمانوں کے قلوب کو داغدار کرتے ہیں اس واقعۂ ہائلہ کے بعد آل رسول کی محبت عموماً مسلمانوں اور خاص کر ایرانیوں کے دلوں میں ایک سے ہزار گونہ زیادہ بڑھ گئی، اسی طرح ان ایرانیوں کے دلوں میں بنی امیہ کی عداوت و کینہ اور زیادہ سے زیادہ بڑھ گیا یہاں تک کہ بنی امیہ کی سلطنت کو تباہ و برباد کر دینے کیلئے باہم ایک دوسرے کے معاون و مددگار ہو گئے۔

یہ تجلیات روح ایرانی کی کارفرمائیاں ہیں کہ مملکت ایران میں ابتدا اسلام ہی سے تشیع کی طرف میلان رہا، جناب مختار جب امام مظلومؑ کا انتقام لینے کے لیے بنی امیہ کے مقابلہ میں شمشیر بکف میدان میں آئے، تقریباً دو ہزار ایرانی سوائی ان کے ہمراہ تھے، یہ ایرانی ہی تھے جنھوں نے اموی حکومت کی بنیادوں کو جڑ سے کھود کر تباہ و برباد کیا، یہی وہ تھے جنھوں نے سرکشان عرب کے ظاہری جبروت کے سامنے جھکنا پسند نہیں کیا بلکہ اپنی بے پناہ تلواروں سے جابرہ بنی امیہ کو زیر کر کے دولت ہاشمی کے قیام کا باعث ہوئے، امام رضا علیہ الصلوٰۃ والسلام کا قیام جب خراسان میں تھا ایرانی مذہب جعفری سے روشناس ہوئے۔ انھوں نے امام رضا علیہ السلام کو عزائے سید الشہداء میں مصروف دیکھا انھیں اس کا موقع ملا کہ ذکر حسینؑ اور مصائب اہلبیت پر سوگوار

رہنے کی دینی اہمیت کو سمجھیں اس لیے ایرانیوں میں عزائے
امام کی کافی اہمیت رہی یہاں تک کہ جب داعی کبیر حسن بن
زید الحسنی (سنہ ۲۵۰ھ) نے طبرستان میں اپنی مستقل حکومت
قائم کی تو اس زمانے سے مذہب امامیہ کو بہت عروج ہوا
اور عزائے امام میں کافی رونق ہوئی، انھیں بزرگ کے
بھائی جو ان کے بعد طبرستان کے بادشاہ ہوئے داعی صغیر
محمد بن زید الحسنی تھے جنھوں نے بعہد خلیفہ معتضد عباسی
سنہ ۲۸۳ھ میں مشہد امام مظلومؑ اور روضۂ جناب امیر
علیہ السلام کو تعمیر کرایا،

"لما قام الداعی الی اللہ محمد بن زید الحسنی
علیہ السلام امر بعمارۃ المشہدین علیہما السلام
وقیل انہ انفق علی عمارتہما الی عشرین
الف درہم وبلغ عضد الدولۃ الغایۃ
تعظیمہما وعمارتہما والانفاق علیہما
وکان یزدر کل سنۃ" (حدائق الوردیہ قلمی،
اعیان الشیعہ جلد ۴ صفحہ ۳۲۰، نزہۃ اہل الحرمین صفحہ ۲۰
فرحۃ الغری ابن طاؤس، تاریخ کربلا دکتور عبدالجواد
صفحہ ۱۵۹)

الداعی الی اللہ محمد بن زید الحسنی نے مرقد منوّر
امیر المومنین اور امام حسینؑ پر قبہ عمارت بنوایا، کہتے ہیں کہ
ان دونوں کی تعمیر پر بیس ہزار درہم خرچ ہوئے (اس
کے بعد) عضد الدولہ دیلمی نے ہر دو مشاہد کی تعمیر و توسیع
میں بہت کافی خرچ کیا ہے اور وہ ہر سال زیارت سے
مشرف ہوتا تھا،

تاریخ ایران کا ہر طالب علم اس سے اچھی طرح
واقف ہے کہ اس سرزمین پر شیعی امارت و حکومت کا
قیام برابر ہوتا رہا ہے۔ امارت بنو طاہر (۲۰۵ھ سے
۲۵۹ھ) حکومت سلاطین دیالمہ (۳۲۱ھ سے ۴۴۷ھ)
بادشاہت فرزندان چنگیز و ایلخانی
(۷۳۶ھ - ۷۹۴ھ) حکومت شاہان جلائری (۷۳۶ھ
۸۱۳ھ) دولت سربداریہ (۷۳۶ھ - ۷۸۴ھ) حکومت
سادات مرعشیہ (۷۶۰ھ - ۹۸۹ھ) دولت صفویہ
(۹۰۵ھ - ۱۱۴۸ھ) یہ تمام شیعی حکومتیں ایسی تھیں
جن سے امام مظلوم کی عزاداری کو تقویت پہونچی، ایران
میں ایام عزا میں سیاہ لباس پہننے کا دستور قدیم سے
ہے اور آج بھی مجالس عزا اور روضہ خوانی میں سیاہ
لباس پہن کر شریک ہونا اور جہاں پر مجالس عزا ہوتی ہیں
وہاں کے در و دیوار پر سیاہ پردے لٹکا دینا ایک عام
دستور ہے، معلوم ہوتا ہے کہ یہ سیہ پوشی نظامی گنجوی
متوفی سنہ ۵۹۹ھ کے زمانہ میں عام طور سے عزاداران حسینؑ
میں رائج تھی وہ اپنی مثنوی کے ایک بیت میں اسی کی
طرف اشارہ کرتا ہے ؎

نام آں شہر شہر مدہوشاں ٭ تعزیت خانۂ سیہ پوشاں

نظامی نے "سیہ پوشاں" سے مراد شیعہ عزاداران حسینؑ کو
لیا ہے اور تعزیت خانہ سے مراد ماتم خانہ و عزاخانہ
(جو ہندوستان میں امام باڑہ کہلاتا ہے) جہاں شیعہ
عشرۂ محرم میں سیہ پوش ہوکر مصروف عزا و بکا ہوتے ہیں
ذبیح اللہ صفا اپنی تاریخ ادبیات ایران میں لکھتے ہیں:-

"مذہب شیعہ در قرن ہفتم و ہشتم بسرعت راہ قوت
می پیمود، تظاہرات عادی اہل تشیع در ایام سوگواری
و ساختن و خواندن اشعارے در مرثیہ امامان و شہیدان
ہم در ہمیں دورہ براوج خود برقرار بود و از نمونہ ہائی
خوب اینگونہ اشعار قصیدہ کوتاہ از سیف فرغانی شاعر
شیعی مذہب اواخر قرن ہفتم و اوائل قرن ہشتم
است کہ برائے کشتہ کربلا ساخت و مسلماً را و از ان
خواندہ شدن در مجلسہائی سوگواری محرم و بگریہ انگندن
شنوندگان و بہ واداشتن آنان و اظہار تاسف
و حزن بر قتل امام بودہ است بہمان نحو کہ ہنوز ہم میان

شیعیان معمول ودر نظر آنان وسیلۂ قاطعی برائے کسب درجات بلند اخرویست "

ساتویں و آٹھویں صدی ہجری میں شیعیت نے بڑی تیزی کے ساتھ ترقی و قوت حاصل کی، اس دور میں ایام عزا کے زمانہ میں شیعوں کے مظاہرات عزاداری مثل ائمۂ معصومین و شہدائے کربلا کے غم میں مرثیہ کہنا اور پڑھنا گذشتہ زمانہ کے رواج کے مطابق اس عہد میں بھی رواج پذیر تھے اس قسم کے اشعار مراثی کا اچھا نمونہ اواخر ساتویں صدی کے و اوائل میں آٹھویں صدی کے عارف و شیعہ شاعر سیف فرغانی کے کلام میں موجود ہے جو شہید کربلا کے غم میں کہا ہے اور کوئی شک نہیں کہ مقصد ان اشعار کے کہنے کا مجلس حسینؑ میں پڑھ کر سامعین کو رلانا اور انتہائی حزن و غم ان پر طاری کر کے آہ و دا ویلا اور گریہ وزاری کی آوازوں کو بلند کرانا ہے بالکل اسی طرح جیسے آج کل شیعوں میں معمول ہے، اور یہ گریہ وزاری رونا رُلانا عزاداروں کے نزدیک آخرت کے بلند درجات کو حاصل کرنے کا ایک قاطع وسیلہ ہے۔"

سیف فرغانی کے متذکرہ اشعار یہ ہیں:۔

اے قوم دریں عزا بگرئید　　بر کشتۂ کربلا بگرئید
با ایں دل مردہ خندہ تا چند　　امروز دریں عزا بگرئید
فرزند رسول را بکشتند　　از بہر خدائے را بگرئید
از خون جگر سرشک سازند　　بہر دل مصطفیٰ بگرئید
وز معدن دل باشک چوں دُر　　بر گوہر مرتضیٰ بگرئید
با نعمت عافیت بصد چشم　　بر اہل چنیں بلا بگرئید
دل خستۂ ماتم حسینؑ اید　　اے خستہ دلا ہلا بگرئید
در ماتم او خموش مباشید　　با نعرہ زنید و با بگرئید
تا [illegible] کہ متصل بجسم ست　　از تن نشود جدا بگرئید
بر جور و جفائے آں جماعت　　یک دم ز سر صفا بگرئید
اشک از پی چیست تا بریزند　　چشم از پے چیست تا بگرئید
در گریہ بصد زبان بنالید　　در پردہ بصد نوا بگرئید

وز بہر نزول غیث رحمت
چون ابر گہ دعا بگرئید

(تاریخ ادبیات ایران ذبیح اللہ صفا جلد ۳ صفحہ ۱۰۳ طبع ایران)

جب دسویں صدی ہجری میں بعہد سلاطین صفویہ مملکت ایران کا رسمی و سرکاری مذہب شیعہ ہو گیا اُس زمانے سے عزاداری امام حسین کو خاطر خواہ بڑی ترقی ہوئی یہاں تک کہ رسوم عزاداری میں صرف شیعہ ہی نہیں بلکہ اہلسنت بھی حصہ لینے لگے، جس کا ثبوت مشہور عالم اہلسنت کمال الدین ملا حسین واعظ کاشفی نقشبندی سبزواری متوفی ۹۱۰ھ صاحب جواہر التفسیر و تفسیر حسینی کی کتاب روضۃ الشہداء ہے جس کو ۹۰۸ھ میں واعظ کاشفی نے فارسی زبان میں مجالس عزا میں پڑھنے کے لیے تالیف کیا، یہ کتاب شیعہ سُنی دونوں فرقوں میں بہت مقبول ہوئی اور دونوں فرقے عرصۂ دراز تک اپنی مجالس عزا میں برابر پڑھتے رہے، اسی وجہ سے آج تک ایران میں ذکر سید الشہداء کرنے والے کو (ذاکر) روضہ خوان، اور ذاکری کرنے کو "روضہ خوانی" کہتے ہیں، رضا زادہ شفق لکھتے ہیں

" روضۃ الشہداء اور ذکر مصائب حضرت امام حسین در ایران اوست و میتوان گفت قدیم ترین کتابیست کہ باین تفصیل مصیبت ائمہ را ذکر کردہ، مدتہا در مجالس عزا ازاں کتاب نقل می کردند و گویا اصطلاح "روضہ خوانی" از نام ہمیں کتاب آمدہ باشد (تاریخ ادبیات ایران رضا زادہ شفق صفحہ ۳۳۲ طبع تہران) مجالس میں روضۃ الشہداء پڑھنے کا رواج صرف ایران ہی میں نہیں بلکہ ہندوستان اور ترکی میں بھی شیعہ اور

شتی دونوں اپنی مجالس میں پڑھا کرتے تھے، ترکی میں عزاداری کرنے والے چونکہ فارسی سے نابلد تھے اس لیے محمد بن سلیمان بغدادی فضولی متوفی سنہ ۹۶۳ھ نے روضۃ الشہدا کا ترکی زبان میں ترجمہ کر دیا اور اس کا نام حدیقۃ السعدا رکھا، جامی قیصری نے سعادت نامہ کے نام سے ایک دوسرا ترجمہ بھی کیا یہ دونوں ترجمے ترکوں کے مجالس عزا میں برابر پڑھے جایا کرتے تھے، اسی طرح ہندوستان کے شیعو گنی عزاداروں نے روضۃ الشہدا کا ترجمہ ہندوستانی زبان میں نظم ونثر دونوں میں کیا؛ اور اس کا تتبع اسلوب و انداز پر "دہ مجلس" لکھی گئیں، اس میں کوئی شک نہیں، ملا حسین واعظ کاشفی کی روضۃ الشہدا سے ایران و ترکستان، افغانستان و ایران میں تذکرۂ شہدائے کربلا کا عام رواج ہوا، ایران میں تذکرۂ شہادت و روضہ خوانی، ماتم داری و سینہ زنی، نوحہ و مرثیہ خوانی، سیہ پوشی و جلوس علم برداری کے ساتھ ہی ساتھ تعزیہ، تمثیل و شبیہ و نمائش مصائب اہلبیت کی رسمیں بھی عوام میں زور پکڑ گئیں، جن کو شرعی حدود میں باقی رکھنے کے لیے علمائے دین و حکومت وقت نے اپنی توجہ کو مبذول کیا، موجودہ ایران عزاداری کو صرف رسمی اہمیت دینا نہیں چاہتا بلکہ اس کے ذریعہ مذہبی، روحانی، اخلاقی، معاشرتی و عمرانی فوائد حاصل کرنا چاہتا ہے، مجتہد ایرانی مرزا ابو عبداللہ زنجانی مرحوم (سابق استاد دانشگاہ تہران و عضو انجمن علمی دمشق) اپنی کتاب "عظمت حسین بن علیؑ" میں تحریر فرماتے ہیں:-

"سیزدہ قرن از این حادثۂ تاریخی می گزرد حادثہ ستم و جور یکہ از امویان بحسین بن علیؑ کہ داعی توحید و امام عادل و بزرگ ترین شخص روحی اسلام بود در رسیدہ چشم مسلمانان بلکہ چشم کسانے را از بشر کہ دارائے عاطفۂ انسانی ہستند گریاں و دلہارا مجروح کردہ و مسلماناں ہیچ وقت فراموش نکردہ و نخواہند کرد کہ ریحانۂ پیغمبر اکرم و سید شباب اہل الجنۃ بشمشیر گروہ بے رحم باآں شکل فظیع کشتہ گشت ولیکن متفکرین و بزرگان اسلام کہ می خواہند حقائق نورانی و اصول سامیہ و مواہب نافعہ اسلام را باہل عالم و پیروان ادیان دیگر معرفی کنند باید صفات نفس و فضائل روحی و شجاعت و شہامت ایں شہید راہ عدل و توحید را کہ روز عاشورا بروز و جلوہ آں بود معرفی کنند تا برآں واسطہ اہل عالم را بحقائق و معنویت ایں دین کہ دین علم و عقل است و چنیں نابغہ را تربیت کردہ آشنا کنند و پیروان دین اسلام و قرآن کہ حسینؑ را شہید راہ عدالت و حق و نہضت او را قوی ترین سبب حفظ معالم دین و قرآن میدانند باید بفضائل و بزرگی نفس او نگریستہ از ارشاد و ہدایت او مستفید و مہتدی باشند نہ اینکہ از روحانیات او دور شدہ و بصرف گریہ قناعت کنند در حالیکہ امروزہ دانستہ از ایں حادثۂ جہاں سوز داریم باید بدیدۂ بصیرت بنگریم کہ شہادت ایں امام عادل برائے زندہ کردن عقیدۂ توحید و عدل و حفظ آں بودہ است و بس" (عظمت حسین بن علیؑ چاپ دوم صفحہ ۱۴، چاپخانۂ فانی تبریز)

اس تاریخی المیہ کو تقریباً تیرہ سو سال گذر رہے، داعی توحید امام معصوم اور عالم اسلام کی بزرگ ترین شخصیت حسین بن علیؑ پر جو مصائب اور ظلم و ستم بنی امیہ کے ہاتھوں گزرے ہیں وہ کچھ ایسے اندوہناک ہیں کہ جس سے صرف مسلمانوں ہی کی آنکھوں سے آنسو نہیں جاری ہوتے بلکہ ہر وہ انسان جس کے پہلو میں دردمند دل ہے اس واقعۂ دردناک کو سنکر بادل مجروح

گریاں ہوتا ہے مسلمان اس واقعہ کو کبھی بھولے نہیں اور نہ آئندہ کبھی بھول سکتے ہیں کہ ریحانۂ رسولؐ جوانانِ جنت کے سردار امام حسینؑ ظلم و ستم کے ساتھ ظالموں کی تلوار سے بہت ہی دردناک طریقہ سے قتل کئے گئے، اگر مفکرین ملت و بزرگان اسلام یہ چاہتے ہیں کہ اسلام کے حقائق نورانی، اصول محکم اور قواعد نافعہ کو اہل عالم اور دوسرے مذاہب کے سامنے ظاہر کریں تو ان کو چاہیئے کہ اس شہید راہ عدل و توحید کی عظمت نفس، فضائل روحی، شہامت و شجاعت کو جن کا اظہار روز عاشور حضرت کی ذات قدسی صفات سے ہوا، دنیا کے سامنے پیش کریں تاکہ حضرت کی ذات مقدس کے ذریعہ سے دین اسلام، جو در اصل دین علم و عقل ہے کے حقائق معنویت کو ثابت کیا جاسکے اور بتلایا جاسکے کہ کس طرح اسلام میں تربیت پانے کی وجہ سے حسینؑ سا شہید اعظم اور انسان کامل دنیا میں جلوہ گر ہوا، پیروان دین اسلام و قرآن جو حسینؑ کو شہید راہ عدالت و حق سمجھتے ہیں اور جن کا یہ خیال ہے کہ حسینی اقدام دین و قرآن کا قوی ترین محافظ ہے انھیں چاہیئے کہ فضائل و بزرگی نفس حسینؑ کو دیکھتے ہوئے حضرت سے رشد و ہدایت کو حاصل کریں نہ یہ کہ حضرت کی روحانیت سے دور رہ کر صرف گریہ اور بکا پر قناعت کریں اگر اس حادثۂ جاں سوز کا صدمہ و اندوہ ہم کو ہے تو نہ صرف آنکھوں سے اشک ہی کو جاری کریں بلکہ دیدۂ بصیرت و نگاہ سے یہ بھی دیکھیں کہ امام معصوم و شہید مظلوم کی شہادت عقیدۂ توحید و عدل کو زندہ کرنے اور اس کی حفاظت کے لیے واقع ہوئی تھی،

غرضکہ قرون وسطیٰ میں تمام ممالک اسلامیہ میں عزاداری امام حسینؑ جاری و ساری تھی یہاں تک کہ اس عہد میں سرزمین شام میں بھی عشرۂ محرم کو کافی اظہار حزن و اندوہ کیا جاتا تھا چنانچہ مولانا جلال الدین رومی متوفی سنہ ۶۷۲ھ مثنوی معنوی کی جلد ششم میں فرماتے ہیں ؎

روز عاشورا ہمہ اہل حلب   باب انطاکیہ اندر تا بہ شب
گرد آید مرد و زن جمعے عظیم   ماتم آں خانداں دارد مقیم
تا بہ شب نوحہ کنند اندر بکا   شیعہ عاشورا برائے کربلا
بشمرند آں ظلمہا با امتحاں   کز یزید و شمر دید آں خانداں
از غریو و نعرہا در سر گذشت   پُر ہمی گردد ہمہ صحرا و دشت
یک غریبے شاعرے از رہ رسید   روز عاشورا و آں افغاں شنید
شہر را بگذاشت آں سو روئے کرد   قصد جستجوئے ہائے ہوئے کرد
پرس پرساں می شد اندر افتقاد   چیست ایں غم بر کہ ایں ماتم فتاد
ایں رئیسے زفت باشد کو بمرد   ایں چنیں مجمع نباشد کار خورد
نام او و القاب او شرحم دہید   کہ غریبم من شما اہل دہید
چیست نام و پیشہ و اوصاف او   تا بگویم مرثیہ الطاف او
مرثیہ سازم کہ مرد شاعرم   تا ازیں جا برگ لالنگی کنم
آں یکے گفتش کہ تو دیوانۂ   تو نۂ شیعہ عدوئے خانۂ
روز عاشورا نمی دانی کہ ہست   یا نمی خوانی ز قرآنی کہ ہست
پیش مومن کے بود ایں قصہ خوار   قدر عشق گوش عشق گوشوار

پیش مومن ماتم آں پاک روح
شہرہ تر باشد ز صد طوفان نوح

(مثنوی مولوی معنوی جلد سادس صفحہ ۵۷۰ و ۵۷۱ طبع بمبئی سنہ ۱۳۰۸ھ)

سات سو اٹھارہ[۷۱۸] برس سے پہلے کا یہ واقعہ ہے کہ شہر حلب سے باہر عزائے حسینؑ کے لیے شیعوں کا اتنا زبردست اجتماع ہوتا رہا جس میں اس شان سے گریہ و زاری، نوحہ و ماتم کا شور بلند کیا جاتا تھا کہ ایک نو وارد شاعر متحیر ہوگیا اور اس کی حیرت پر زادار لوگوں نے اس سے یہ کہا کہ تو اہل بیت کی مصیبت کے دن روز عاشور کو نہیں جانتا، آج وہی ہولناک دن ہے کیا تو نے قرآن میں اہلبیت کی منزلت و منقبت کو نہیں پڑھا

اگر ایسا ہے تو تو اہل ایمان سے نہیں ہے دشمنان خاندان رسالت سے ہے اہل ایمان میں ماتم حسینؑ کی شہرت سیکڑوں طوفان نوح سے بھی زیادہ ہے۔

آج بھی مملکت شام میں عزائے حسین اُسی شان سے ہوتی ہے جس کا تذکرہ غیر ممالک کے سیاحوں کو کرنا پڑا ہے خصوصیت سے دمشق، جبل عامل، صیدا اور بیروت میں عزائے امام بہت ہی اہتمام سے کی جاتی ہے، (تفصیل کے لیے "مجلۃ العرفان" کے خصوصی نمبر ملاحظہ ہوں) یمن خصوصاً صنعا میں ائمہ زیدیہ کے محلات و دیگر بالیان شہر و قریہ کے مساکن ایام عزا میں "عزاخانے" بن جاتے ہیں مملکت سعودی عربیہ میں باشندگان قطیف و احسار عزاداری کرنے میں خاص شہرت رکھتے ہیں اور موت کو ترک عزاداری کے مقابلہ میں قبول کرتے ہیں یہاں تک کہ حجاز میں دوستداران اہلبیت عزاداری کرتے ہیں عاشور محرم کی اہمیت غم تو بہت بڑی ہے زمانۂ ایام حج میدان عرفات میں آٹھویں ذی الحجہ روز شہادت حضرت مسلم بن عقیل حاجیوں کے خیموں سے روضہ خوانی و گریہ و زاری کی آوازیں آج بھی اس زمانہ میں سنی جاسکتی ہیں مدینہ طیبہ میں محلہ بنی نخاولہ آج بھی "عزاخانہ" موجود ہے جہاں نخاولہ عشرۂ محرم میں مجالس عزا برپا کرتے ہیں قسطنطنیہ (اسلامبول ترکی) میں زمان سابق کی طرح محرم میں مجالس کا انعقاد ہوتا رہتا ہے اور امام مظلوم کا ماتم کیا جاتا ہے علامہ شبلی نے وہاں کی عزاداری کا ذکر اپنے "سفرنامہ بلاد اسلامیہ" میں بڑی دلچسپی کے ساتھ کیا ہے، اور آج کا جدید ترکی بھی ذکر حسین و قیام عزا سے خالی نہیں ہے۔ بلخ و بخارا و افغانستان میں بھی عزاداری کافی انہماک کے ساتھ قدیمی زمانہ سے کی جاتی ہے، صرف کابل میں متعدد امام باڑے موجود ہیں جن میں باقاعدہ محرم میں عزاداری ہوتی ہے، آسام و برما، تبت و کشمیر کے باشندے عزاداری و ماتم کے لحاظ سے کافی شہرت رکھتے ہیں اور جہاں جاتے ہیں عزائے حسینؑ کو اپنے ساتھ لیجاتے ہیں۔ جزائر شرق الہند انڈونیشیا کی سرزمین بھی عزاداری سے خالی نہیں ہر جگہ عشرہ محرم میں ذکر حسین و غم اہلبیت کے مظاہرے ملتے ہیں، چینی مسلمان جو اپنی معاشرت و تہذیب کے لحاظ سے دنیائے اسلام کے مسلمانوں سے مختلف نظر آتے ہیں وہ بھی محرم میں ذکر حسینؑ کر کے عام دنیائے اسلام و مسلمانان عالم کے ساتھ یک گونہ یکجہتی پیدا کر لیتے ہیں صرف ایشیا ہی نہیں بلکہ یورپ و امریکہ میں بھی عزائے امام مظلوم نے اپنا رسوخ حاصل کر لیا ہے اور عشرۂ محرم میں وہاں کے بڑے بڑے شہروں میں عزائے حسین ہونے لگی ہے، اس سلسلہ میں لندن اور نیویارک خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

خود ہمارے اس برصغیر ہندوستان (بشمول پاکستان) میں بھی امام مظلوم کی عزاداری مدتہائے دراز سے کی جاتی ہے لیکن ایران، عرب، مصر و شام کی عزاداری سے یہاں کے رسوم عزا میں بہت کافی فرق و امتیاز ہے اُن ممالک میں عزائے حسینؑ صرف "شیعیان علی" سے مخصوص ہے لیکن ہندوستان میں کسی مذہب و فرقہ کی قید نہیں ہے، شیعوں کے دوش بدوش اہلسنت بھی عزائے امام میں کافی حصہ لیتے ہیں اور غیر مسلم برادران ہنود و پارسی بھی تعزیہ داری کرتے ہیں، " استاد عبد المنعم العدوی الحنفی للعربی" اپنے صحیفۂ اخباریہ علمیہ اسبوعیہ "العرب" میں اپنے ایک مخصوص مضمون "کیف یحتفی المسلمون فی الہند بذکری مصرع سید الشہداء" میں تحریر فرماتے ہیں:-

ولیشترك المسلمون کافۃ فی الھند

على اختلاف نحلهم وتعدد مذاهبهم في الاحتفال بهذه الايام العشرة ويشترك كثيرون من الوثنيين ايضًا والفرس المجوس في الاحتفاء بها ولا يقتصر الامر على العامة بل ان بعضًا من مهراجات الهند واصحاب السطوة والنفوذ من كبار الوثنيين يحتفلون ايضا بهذه الايام ــــ ويعتقد بعض الوثنيين والفرس في حضرة الامام ابي عبد الله الحسين اعتقادًا يفوق كل وصف فهم ينذرون له النذور ويوقدون له الشموع ويطلقون على اسمه في مقاصدهم الخاصة انحى انواع الطيب والبخور،
(العرب بمبئی یوم الخمیس ۰ محرم [illegible] العدد ۹۰ السنۃ الثانیہ)

عزاداری امام حسینؑ کے سلسلہ میں تمام مسلمانانِ ہند باوجود اختلاف مذاہب و فرق کے عشرۂ محرم میں مجلس و تعزیہ داری کرکے متحد و مشترک ہو جاتے ہیں، مسلمانوں ہی کے تمام فرقے نہیں، بلکہ بت پرست ہندو اور آتش پرست مجوسی، پارسی، بھی مجالس عزا برپا کرتے ہیں ان اقوام کے صرف عوام ہی عزادار نہیں ہیں بلکہ بڑے بڑے ہندو مہاراجہ اور صاحبان سطوت و اقتدار تعزیہ داری کرتے ہیں۔ــــ ہندو اور پارسی امام حسینؑ کے بہت زیادہ معتقد ہیں ان کے عقیدت کی کیفیت کو بیان نہیں کیا جا سکتا یہ لوگ نذریں مانتے ہیں، عزاخانوں میں تعزیے کے سامنے شمعیں روشن کرتے ہیں اور حضرت کے نام بہترین قسم کی خوشبو اور بخور کو جلاتے ہیں۔"

اگرچہ اہلسنت میں ایک ایسا بھی طبقہ ہے جو خوش عقیدہ اہلسنت کو عزائے حسینؑ مظلوم سے روکنے کی کوشش کرتا ہے اور اپنے خود ساختہ فتووں کے ذریعہ اس کو کفر و بدعت قرار دیتا ہے گو کہ علمائے روحانیین اہلسنت کے نزدیک یہ فتاوے کوئی وقعت نہیں رکھتے ہیں ایسے مفتیوں کے متعلق مولانا شاہ عبد الرحمٰن صاحب لکھنوی مخاطب بمقبول النبی ارشاد فرماتے ہیں:۔

"روزے ارشاد گردید کہ علمائے ظواہر را عجب دین و اسلام است کہ ہر کس را میخواہند کافر می نمایند و ہر کس را میخواہند مومن، چنانچہ اگر کسے ایں لفظ بجانب عالم بگوید کہ جوتی اوتی قائل ایں قول را کافر نوشتہ اند چرا کہ عالم وارث النبی است در حق او ایں کلمہ اہانت سرزد و شمر ملعون کہ نواسۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم را بناحق ذبح کردہ اطلاق کفر بر وے کردن نمی توانند در مجلس تذکرہ می فرمودند کہ ہرگاہ کہ شمر ملعون بر سینۂ مبارک حضرت امام علیہ السلام برائے ذبح کردن سوار بود شخصے ازاں مردود گفت کہ تو رتبہ ایں را نمی شناسی کہ ایں حرکت بجو دگو ارا ساختی آں مردود از عمامۂ خود کاغذ استفتاء بمہر و دستخط صدر علمائے آں وقت پیش انداخت، مولانا صاحب می فرمودند کہ اکثر کتب قدیم ازاں علماء ہستند، حق تعالیٰ از فضل و عنایت خود مارا از ملاحظۂ آں محفوظ داشتہ است۔" (انوار الرحمٰن لتنویر الجنان صفحہ ۱۱۷ طبع مطبع منشی کالی پرشاد [illegible] لکھنؤ)

"ایک دن مولانا نے ارشاد فرمایا کہ علمائے ظاہر کا دین و اسلام عجیب ہے کہ جس کو چاہتے ہیں کافر بنا دیتے ہیں اور جس کو چاہتے مومن کہہ دیتے ہیں، اگر کوئی شخص کسی عالم کی شان میں کوئی اہانت آمیز لفظ جیسے جوتی اوتی کہے تو قائل کو اس دلیل سے کافر قرار دیتے ہیں کہ اس نے عالم کی جو پیغمبر کا وارث ہے

امانت کی، لیکن اس کے خلاف شمر ملعون کو جو جگر گوشہ رسولؐ اور راحت قلب بتولؑ کا قاتل ہے کافر نہیں کہتے بلکہ اس کو مومن سمجھتے ہیں اس سلسلۂ گفتگو میں مولانا نے یہ بھی فرمایا کہ جب شمر بدبخت سینۂ مبارک امام حسینؑ پر ذبح کرنے کے لیے سوار ہوا تو ایک شخص نے پوچھا کہ تو فرزند رسولؐ کے رتبہ سے ناواقف ہے جو یہ ارادہ کر رہا ہے یہ سن کر اس مردود نے اپنے عمامہ کو سر سے اتارا اور اس میں سے ایک فتوے کا کاغذ نکال کر دکھلایا جس میں دو سَو علمائے وقت نے امام مظلوم کے قتل پر فتویٰ دیا تھا ان سب علماء کی اس پر مہریں ثبت تھیں مولانا نے فرمایا کہ اکثر قدیمی کتابیں انھیں علماء کی تصانیف سے ہیں، خداوند عالم نے اپنے فضل و کرم سے ان کتابوں کے مطالعہ سے ہم کو محفوظ رکھا ہے۔"

غرضکہ مسلمانوں کی طرح برادران ہنود بھی باوجود غیر مسلم ہونے کے نہایت خلوص اور جوش و خروش کے ساتھ امام مظلوم کی عزاداری ایک عرصہ دراز سے کرتے چلے آرہے ہیں شاہ عالم بہادر شاہ اول بن اورنگ زیب عالمگیر کے عہد کا مشہور تاریخی واقعہ ہے جس کو مشہور مورخ عالمگیری خافی خان نے مشہور دشمن اسن لٹیرا "پاپ رائے سیندھی" کی غارت گری کے ضمن میں لکھا ہے "شب دہم ماہ محرم ۱۱۲۰ھ کہ مسلمین و ہنود در اشغال و سرانجام شہر گشت تابوت ہا مشغول بودند بادو سہ ہزار پیادہ و چہار صد و پانصد سوار خود را بقلعہ ورنگل رسانده۔"

۱۱۲۰ھ کی دسویں محرم کی شب کو جب کہ تمام مسلمان اور ہندو تابوتوں اور تعزیوں کے گشت میں مصروف تھے اس وقت موقع پاکر پاپ رائے نے دو تین ہزار پیادوں اور چار یا پانچ سو سواروں کو لیکر قلعہ ورنگل پر چھاپہ مارا (منتخب اللباب خافی خان جلد دوم صفحہ ۶۴۳ طبع کلکتہ) ہندو مقررین و شعراء ذاکری کرتے اور نوحہ و مرثیہ کہتے اور پڑھتے ہیں ماتم و گریہ وزاری کرتے ہیں صرف پست اقوام کے ہندو ہی نہیں بلکہ اونچی ذات کے ہندو برہمن، چھتری اور بڑے بڑے راجہ مہاراجہ عزاداری کرتے ہیں بلکہ دت قوم کے برہمنوں میں ایک گروہ ایسا بھی پایا جاتا ہے جو اپنے کو حسینی برہمن کہتے ہیں جن کا دعویٰ ہے کہ ان کے پاس قدیمی ہندی زبان میں لکھی ہوئی "حسین پوتھی" ہے جو واقعات کربلا پر مشتمل ہے اس قوم کے لوگ ایک ہندی کبت جس کی حیثیت مرثیہ کی ہے جس کو وہ لوگ پڑھا کرتے ہیں وہ لوگ یہ ادعا کرتے ہیں کہ یہ نظم سینہ بہ سینہ ہم لوگوں میں محفوظ چلی آرہی ہے (شہادت اعظمی مؤلفہ شاہ محمد نذیر صاحب ہاشمی حنفی) گوالیار، اندور، بھرت پور، بڑودہ، دھولپور، دتیا اور بنارس کے مہاراجگان اور دیگر ہندو حکمراں عزاداری کرنے میں مشہور رہ چکے ہیں، سکھ قوم باوجود اس کے کہ اسلامی آداب و رسوم کی مخالفت کرتے ہیں وہ لوگ بھی تعزیہ داری میں انہماک رکھتے رہے ہیں، مہاراجہ شیر سنگھ کے بڑے تعزیہ کا لاہور میں رکھا جانا اور اس کا گشت کیا جانا ایک تاریخی حقیقت ہے (ملاحظہ ہو تاریخ لاہور مصنفہ خان بہادر محمد لطیف سی، آئی، ای) مشہور سیاح عبداللطیف بن ابوطالب شوستری نے بھی ہندوؤں کی اس والہانہ عقیدت و تعزیہ داری کا تذکرہ اپنی کتاب تحفۃ العالم میں جے نگر اور راجپوتوں کے سلسلۂ حالات میں کیا ہے جو پڑھنے کے قابل ہے (تحفۃ العالم صفحہ ۳۵۹ طبع حیدرآباد ۱۲۴۴ھ) مرہٹے بھی کسی ہندو قوم سے تعزیہ داری کرنے میں پیچھے نہیں ہیں وہ تعزیے کے بہت خلوص کے ساتھ معتقد

رہے ہیں، ان کی خوش اعتقادی کا آنکھوں دیکھا حال ایک انگریزی کتاب میں پڑھا جا سکتا ہے جس کا نام ہے

"رہٹوں کے خیموں سے خطوط" مؤلفہ سر ٹامس ڈیور براڈٹن جیبی نمبر ۷ صفحات ۶۹ تا ۷۲ مطبوعہ لندن ۱۸۱۲ء)

سر والٹر لارنس اپنی کتاب

میں صفحہ ۲۹۳ پر لکھتے ہیں کہ بڑے تعجب کی بات ہے کہ اگر محرم میں ان دونوں قوموں یعنی ہندو مسلمانوں میں فسادات رونما ہوں اس لیے کہ بہت سے ہندو خود عزاداری میں حصہ لیتے ہیں (اس موضوع پر مزید معلومات کے لیے میرا رسالہ "ہندو قوم و عزاداری" مطبوعہ سرفراز قومی پریس لکھنؤ ملاحظہ ہو) اس موقع پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ برصغیر ہندوستان (بشمول موجودہ پاکستان) میں تعزیہ داری کیونکر شروع ہوئی اور اس کی اہمیت کے کیا اسباب ہوئے، ممکن ہے کہ اس برصغیر میں اب بھی بہت سے ایسے مقامات ہوں جہاں نانا کو نہ جانتے ہوں لیکن نواسے کے نام سے وہاں کے رہنے والوں کے کان ضرور آشنا ہوں گے، آج بھی ہمالیہ اور ہماچل پہاڑ کے جنگلوں میں جو غیر مہذب اور وحشی قومیں آباد ہیں جن کو اسلام اور مسلمانوں سے دور دور کا کوئی واسطہ و رابطہ نہیں ہے لیکن دیکھنے والوں نے دیکھا ہے کہ یہ لوگ بھی عاشورِ محرم کو اپنے مخصوص طور و طریقے اور فرسودہ رسم و رواج کے ساتھ امام حسینؑ کی سوگواری کرتے ہیں وہ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں جانتے کہ یہ رسم و رواج سالہا سال سے اُن کے آبا و اجداد کرتے چلے آ رہے ہیں جس کے یہ لوگ پابند ہیں۔ آخر حسینؑ کا نام اور سوگواری کی یہ رسمیں اس سرعت کے ساتھ ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں کیونکر پہونچیں؟ آیئے اس کو معلوم کرنے کے لیے تاریخ کے صفحات سے مدد لیں۔

ہندوستان وہ سرزمین ہے جس کے متعلق امیر المومنین حضرت علیؑ کا یہ ارشاد ہے۔ جس کو علامہ جلال الدین سیوطی نے اپنی تفسیر در منثور میں، ابن جریر، حاکم، بیہقی اور ابن عساکر سے روایت کی ہے:۔

" اطیب ریحاً ارض الھند" سب سے زیادہ خوش ہوا سرزمین ہندوستان کی ہے، اسی زمین خوش ہوا کے کچھ باشندوں نے عراق میں بصرہ کے قریب اپنی ایک نوآبادی بسالی تھی یہ لوگ "جاٹ" قوم کے تھے جنھیں عرب "زط" کہتے تھے انھیں جاٹوں کی ایک جماعت نے سنہ ۱۲ھ و نیز جنگ قادسیہ کے بعد اسلام کو قبول کر لیا تھا، امیر المومنین حضرت علیؑ نے اپنی عہد خلافت ظاہری و دورِ حکومت میں ان نومسلم جاٹوں کو کچھ خدمات سپرد فرما کر عزت بھی بخشی تھی چنانچہ جنگ جمل کے بعد بصرہ کے خزانہ کی حفاظت کے لیے حضرت نے جو محافظ دستہ مقرر فرمایا تھا وہ انھیں جاٹوں (زط) کے افراد پر مشتمل تھا (مقدمہ آئینۂ حقیقت نما جلد اول صفحہ ۵۵ مصنفہ اکبر شاہ خاں مورخ نجیب آبادی) یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جنگ جمل کے بعد انھیں جاٹوں کا ایک گروہ جس کی تعداد ستر بتلائی جاتی ہے حضرت علیؑ کی خدمت میں حاضر ہوا اور والہانہ انداز میں (معاذ اللہ) حضرت کی خدائی و ربوبیت کا اقرار کرنے لگا اور باوجود حضرتؑ کے سمجھانے اور شرعی تعزیر دینے کے یہ گروہ اپنے اس فاسد عقیدہ سے باز نہیں آیا (معرفۃ اخبار الرجال المعروف بہ رجال کشی مطبع مصطفویہ بمبئی) اس طرح خالص ہندی قوموں میں

شیعیت اور غلو دونوں کا بیج پڑ گیا، انھیں نو مسلم جاٹوں میں سے "ثابت" بھی تھے جنھوں نے یوم نوروز امیر المومنین ؑ کے سامنے فالودہ پیش کیا تھا جن کے بیٹے ابو حنیفہ نعمان ہیں جو سواد اعظم اسلام فرقۂ احناف کے امام مانے جاتے ہیں، اس کے علاوہ عہد حکومت امیر المومنین ؑ ۳۹ھ میں حارث بن مرۃ العبدی الشیعی نے جو حضرت کے لشکر کا ایک سپاہی تھا سندھ کو فتوحات اسلامی میں داخل کیا۔ (فتوح البلدان مورخ بلاذری ذکر فتوح السندھ صفحہ ۴۳۸ طبع مصر، تاریخ ابن جریر الطبری، تاریخ کامل ابن اثیر الجزری، تاریخ التمدن الاسلامی جرجی زیدان مسیحی، چچ نامہ) ان حالات میں اطراف و ثغور ہند میں شیعیت کا رواج ہونے لگا تھا آل شنسب جو موالیان و دوستداران اہلبیت سے تھے وہ ہندوستان کے سرحدی اور قریبی مقامات پر قابض و متصرف تھے اس خاندان کا پہلا شخص "شنسب" تھا جس نے اپنے قدیمی ہندی مذہب (غالباً بدھ مت) کو ترک کر کے دست حق پرست امیر المومنین ؑ پر اسلام کو قبول کیا تھا اور حضرت نے اس شخص کو اپنی جانب سے ان اطراف کا حاکم بنایا تھا؛ چنانچہ مورخ ابو عمر منہاج الدین الجوزجانی "شنسب" کے تذکرے میں لکھتا ہے:۔

" او در عہد امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ بر دست علی کرم اللہ وجہہ ایمان آورده از وے عہدے و لوائے بستہ و ہر کہ از خاندان او بہ تخت نشستی آں عہد را کہ امیر المومنین علی نوشتہ بود بدو دادندے و او قبول کردے آں گاہ بادشاہ شدے و ایشاں از جملۂ موالی علی بودند کرم اللہ وجہہ و محبت ائمہ و اہلبیت مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم در اعتقاد ایشاں راسخ بودے رحمہم اللہ۔"

(طبقات ناصری الطبقۃ السابعۃ عشر السلاطین الشنسبانیہ و ملوک الغور صفحہ ۳۹ مطبوعہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال ۱۸۶۴ء)

شنسب امیر المومنین علی ؑ کے زمانہ میں تھا اور آپ کے دست مبارک پر ایمان کو قبول کیا تھا اور ایک عہدنامہ اور علم حضرت نے اس کو عنایت فرمایا تھا اس کے بعد تخت بادشاہت پر اس کی اولاد میں سے وہی بیٹھتا تھا جو حضرت کے لکھے ہوئے عہدنامہ پر عمل کرنے کو قبول کرتا تھا یہ لوگ دوستداران علی ؑ میں سے تھے اور آئمہ اطہار و اہلبیت نبی مختار کی محبت ان کے دلوں میں راسخ تھی، خدا ان سب پر رحمت نازل کرے۔

خلفائے بنی امیہ کے زمانہ میں جس وقت تمام ممالک اسلامی میں امیر المومنین و اہلبیت رسول ؐ کی شان میں بے ادبی کی جاتی تھی اس وقت بھی آرین نسل کے سلاطین غور تھے جنھوں نے اس فعل شنیع کا ارتکاب نہیں کیا تھا جیسا کہ مورخ فرشتہ لکھتا ہے:۔

" و در عہد بنی امیہ در تمام ممالک اسلام حرف بیجا بر خاندان رسالت پناہ کردہ اند الا در مملکت غور بہ ہیچ وجہ مرتکب آں نشدند باین معنی آں مملکت را بر جمیع ممالک فخر است۔"

(تاریخ فرشتہ جلد اول مقالہ اول صفحہ ۲۷ طبع نولکشور)

بنی امیہ کے عہد میں تمام ممالک اسلام میں خاندان رسالت پر گستاخانہ الفاظ استعمال کئے جاتے تھے سوائے مملکت غور کے کسی طرح بھی اس جرم کا ارتکاب یہاں نہیں کیا گیا اس اعتبار سے اس مملکت کو تمام ممالک اسلامی پر فخر ہے۔

اکبر شاہ خان مورخ نجیب آبادی لکھتے ہیں:۔

" شنسب بن حریق جو علاقۂ غور کا رئیس تھا

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے زمانہ میں مسلمان ہوا، اُس کی اولاد افغانستان میں شنسبی کہلائی انھیں میں لودی و سوری وغیرہ پٹھان شامل ہیں محمد بن سوری مذکور اسی شنسب بن حریق کی اولاد میں تھا، عباسیوں اور علویوں نے مل کر جب بنی امیہ کے خلاف سازشیں اور کوششیں کیں تو علاقۂ غور کا یہ شنسبی خاندان جو اس علاقہ میں حکومت و سرداری بھی رکھتا تھا ابو مسلم خراسانی کا شریک کار بن گیا، خلافت عباسیہ کے قائم ہو جانے پر اس خاندان کی عزت افزائی کی گئی اور اس کو علاقۂ غور کی سندِ حکومت خلیفہ کی طرف سے مل گئی چند ہی روز کے بعد جب علویوں نے عباسیوں کے خلاف سرگرمی شروع کی تو غور کا یہ خاندان محب اہلبیتؑ ہونے کی وجہ سے علویوں کی خفیہ سازشوں میں شریک ہو گیا جب قرامطہ نے خراسان و افغانستان میں اپنی تحریک شروع کی تو سب سے پہلے یہی خاندان قرامطہ کا ہمنوا ہوا۔" (آئینۂ حقیقت نما باب سوم صفحہ ۲۰۵)

اس محل پر اس کی طرف توجہ رہنی چاہیے کہ سُنّی مورخین و مصنفین بربنائے عصبیت شیعی تحریک و تبلیغ کو قرامطہ کی طرف منسوب کر دینے کے عادی ہیں مورخ نجیب آبادی اپنی اس عادت کی بنا پر شنسبی خاندان سے نفرت پیدا کرانے کے لیے یہ لکھ رہے ہیں کہ وہ قرامطہ کے ہمنوا ہو گئے، یہ صحیح ہے کہ یہ لوگ محبت اہلبیت کی وجہ سے بنی امیہ کے استیصال کے لیے عباسیوں کے مددگار رہے اور پھر عباسیوں کے مقابلہ میں علویوں کے معین و مددگار رہے اور اسی وجہ سے فاطمیین کی بھی ہمنوائی کی قرامطہ سے ان کا کوئی تعلق نہ تھا، بہرحال سلاطین آل شنسب جس میں شاہان لودی و سوری بھی شامل ہیں یہ دوستداران اہلبیت رسالت سے تھے ان لوگوں کا واقعۂ کربلا سے متاثر ہونا ایک فطری بات ہے، عزائے حسینؑ کے سلسلہ میں ائمہ اطہار کے ارشادات اور سادات بنی فاطمہؑ و اولاد علیؑ کے اعمال حزن و غم سے بے خبر نہ ہوں گے، علاوہ ازیں خلفائے فاطمیین مصر کی ہمنوائی بغیر عزاداری امام مظلوم کے ہو ہی نہیں سکتی اس لیے بعہد سلاطین آل شنسب مملکت غور میں عزاداری امام مظلوم کا وجود ضروری ہے اور چونکہ سلاطین آل شنسب کا تعلق ہندوستان سے علاوہ ہمسایہ ہونے کے قدیمی ہم مذہب ہونے کے بھی رہا ہو گا اس لیے ان کے اثرات ہندوستان پر کافی پڑے ہوں گے، ان امور کے علاوہ خاندان رسالت کو ہندوستان سے ایک نسبی رشتہ بھی ہو جاتا ہے وہ یہ کہ امام زین العابدین علیہ السلام کی ازواج میں ایک سندھی خاتون بھی تھیں جن کے بطن سے حضرت زید شہید پیدا ہوئے (کتاب المعارف ابن قتیبہ صفحہ ۲۷ طبع مصر، زید الشہید عبدالرزاق النجفی صفحہ ۵ طبع نجف)

تاریخ ہمیں اس امر کی طرف بھی متوجہ کرتی ہے کہ اولاد فاطمہؑ و علیؑ کی محبت میں سب سے پہلا جان دینے والا ہندوستانی مجاہد زیاد ہندی ہیں جو جناب زید شہید کے ہمراہ قتل ہو کر مصلوب ہوئے (مقاتل الطالبین ابوالفرج اموی صفحہ ۱۰۵ طبع نجف) اموی و عباسی عہد میں جب ارض اسلام میں سادات کشی کا عام رواج تھا مظلوم اولاد علیؑ و فاطمہؑ ہندوستان کو اپنے لیے جائے امن و امان سمجھتے تھے، چنانچہ عبداللہ الاشتر بن محمد بن عبداللہ بن الحسن المثنیٰ بن امام حسن علیہ السلام اپنے پدر بزرگوار جناب محمد نفس الزکیہ کی شہادت (در ۱۴۵ھ) کے بعد عیسیٰ بن عبداللہ بن مسعدہ شیعی کے ہمراہ سندھ تشریف لائے تھے جن کا کچھ عرصہ یہاں قیام رہا، سرزمین ہند میں دریائے سندھ کے کنارے

خلیفۂ عباسی منصور دوانیقی کے حکم سے اولادِ رسول کا سب سے پہلا خون جو بظلم و ستم بہایا گیا وہ عبد اللہ الاشتر ہی کا ہے جن کی مقدس لاش کو دریائے سندھ میں بہا دیا گیا، انھیں عبد اللہ کے کمسن فرزند محمد جن کی ولادت ہندوستان ہی میں ہوئی تھی وہ اپنے مظلوم باپ کی شہادت کے بعد ایک محب اہلبیت ہندو راجہ کی حمایت و حفاظت میں آگئے یہ ہندو راجہ سادات کی بڑی عزت و توقیر کرتا تھا، جب اس محب خاندان رسالت ہندو راجہ نے یتیم سید کو اپنی سرپرستی و حفاظت میں لے لیا تو اس پاداش میں خلیفہ منصور عباسی نے والیٔ سندھ ہشام بن عمر تغلبی کو ایک عظیم لشکر کے ساتھ مامور کیا کہ محافظ سادات ہندو راجہ سے یتیم سید کا مطالبہ کرے کہ ان کو وہ سادات کے دشمنوں کے سپرد کر دے اور اگر راجہ اس پر راضی نہ ہو تو اس کی راجدھانی پر حملہ کرکے اُس کو قتل کر دیا جائے راجہ کسی طرح بھی سید کو دشمنوں کے سپرد کرنے پر نہیں آمادہ ہوا بلکہ اولادِ رسول کی حفاظت میں وہ خود قتل ہوگیا اور اس کی ریاست کو عباسی حکومت میں شامل کر لیا گیا، (تاریخ الطبری جلد ۹ صفحہ ۲۸۰، ۲۸۱ طبع مصر و تاریخ الکامل ابن اثیر جلد ۵ صفحہ ۲۲۰ طبع مصر)

ظاہر ہے کہ حضرت سید الشہداء کی شہادت کا تذکرہ اور مصائب اہلبیت کا بیان کرنا سادات کا شعار رہا ہے کوئی وجہ نہیں کہ عبد اللہ الاشتر شہادت امام مظلوم کا تذکرہ نہ کرتے رہے ہوں اور ہندو راجہ جو سادات کا محافظ، ہمدرد اور اہلبیتؑ کو دوست رکھنے والا تھا سادات سے ذکر حسینؑ سن کر متاثر نہ ہوتا ہو، منصور دوانیقی ہی کے عہد میں جب سادات کا قتل عام ہو رہا تھا قاسم بن ابراہیم بن اسمٰعیل الدیباج بن ابراہیم الغمر بن الحسن المثنیٰ بن امام حسن علیہ السلام بھی اپنی جان بچا کر ملتان کے قریب مقام "خان" تک تشریف لائے (النزاع والتخاصم علامہ مقریزی صفحہ ۴، طبع مصر)

اسی عہد میں جعفر بن محمد بن عبد اللہ بن محمد بن عمر الاطرف بن امیر المومنین علی علیہ السلام بھی بخوف جان حجاز کو چھوڑ کر ملتان تشریف لائے، جن کے ہمراہ ان کی تیرہ اولادیں بھی تھیں، سید آوارہ وطن ہو کر بے کسی کے عالم میں ملتان پہونچے لیکن یہاں شاہی نے ان کے قدم چومے اور ملتان کی بادشاہی ملی، انھیں جعفر الملک اور ان کی اولاد نے اپنے کردار نیک اور عمل صالح سے بہتوں کو شیعہ بنایا، سادات نے دیسی زبان کو نوازا اور اپنی روزمرہ کی بول چال میں داخل کر لیا (عمدۃ الطالب جمال الدین ابن مہنا داؤدی صفحہ ۳۳۳ بمبئی) ان سادات کے میل جول، یکجہتی اور لسانی تعلقات سے نہ صرف ریختہ اور اُردو زبان کی بنیاد پڑی بلکہ عزائے حسینؑ کو عمومیت حاصل ہونے لگی، اس سلسلے میں ایک خاص چیز اور بھی اپنی جانب خصوصیت سے ہم کو متوجہ کرتی ہے، وہ یہ امام جعفر صادق علیہ السلام کے حلقۂ اصحاب میں جہاں سے فلسفۂ آلِ محمد اور علوم قرآن کی نشر و اشاعت کی جا رہی تھی وہاں ہم کو جہاں اور ملک و قوم کے تشنہ کامان علوم اور طالبان حق دکھائی دیتے ہیں اُن میں چند ہندوستانی بھی موجود ملتے ہیں، فرج سندھی، خلاد سندھی بزاز، ابان بن محمد سندھی، طلحہ بن زید ابو الخزرج ہندی یہ وہ لوگ ہیں جن کا شمار رواۃ و اصحاب امام جعفر صادق علیہ السلام میں ہے (ابو الفہرس الطوسی) ایک ہندوستانی طبیب جو ویدانت اور فلسفہ کا بڑا ماہر تھا اور منصور کے دربار میں ہندوستان سے طلب کیا گیا تھا وہ بھی امام جعفر صادق علیہ السلام سے طبیبانہ مسائل پر بحث و تمحیص کے بعد آپ کے دست حق پرست

پر مسلمان ہوگیا تھا (حدیث البلیلہ و حدیث مفضل بحار
الانوار) اسی طرح صباح بن نصر ہندی بھی قابل ذکر
ہیں جو احکام و مسائل امام رضا علیہ السلام کی تبلیغ
کرتے تھے یقیناً یہی لوگ ہندوستان میں شیعیت
کا سبب ہوسکتے ہیں، بڑھتے بڑھتے شیعی حلقہ اثر
ہندوستان میں اتنا وسیع ہوگیا کہ مورخ المقدسی
کے بیان کی بنا پر ہندوستان میں شیعہ مذہب کا
رسوخ تقریباً تیسری صدی کے اختتام اور چوتھی
صدی ہجری کے آغاز میں بہت زیادہ نمایاں ہوگیا
(احسن التقاسیم فی معرفۃ الاقالیم للمقدسی صفحہ ۴۸۱
مرتبہ ایم۔ جے ڈی گیوجی طبع یورپ ۱۹۰۶ء) بالآخر
شیعی دعوت و تبلیغ کے بڑھتے ہوئے اثرات کو
مٹانے کے لیے سلطان محمود غزنوی متوفی ۴۲۱ھ کو
سندھ و ملتان پر فوج کشی کرنی پڑی اور محبان اہلبیت
کو ملحد و قرمطی کہہ کر اُن کا خون بہایا، یقیناً اس زمانہ میں
عزاداری امام حسینؑ کا وجود کسی نوعیت میں ضرور
رہا ہوگا یہ ضرور ہے کہ تاریخ اس پر تفصیلی روشنی ڈالنے
سے قاصر ہے کہ اس وقت عزائے امام کا کیا عنوان تھا
سادات اور شیعوں میں تذکرہ امام حسینؑ کا ہونا تو بہر حال
ہر عہد میں اس کا وجود ضروری ہے، ہاں چھٹی صدی
کی ابتدا میں اس قدر ضرور پتہ چلتا ہے کہ عشرہ محرم
میں تذکرہ کیا جاتا تھا چنانچہ مورخ منہاج اپنی تاریخ
طبقات ناصری صفحہ ۱۷۵ میں در ذیل تذکرہ سلطان
شمس الدین التمش لکھتا ہے کہ "در تمام عشرہ محرم
تذکیر گفتہ آمد" اسی طرح مورخ مذکور ملوک شمسیہ کے
ذیل میں جہاں ہندو خان مبارک الخازن السلطان کے
حالات بیان کرتا ہے وہاں اس کا اقرار کرتا ہے
کہ "در عشرہ محرم تذکیری گفت" صفحہ ۲۴۹۔ اس
چھٹی صدی ہجری میں شیعوں کا ایک تبلیغی مشن بھی
پایا جاتا ہے جو ہندوستان میں شیعیت کی اشاعت
کر رہا تھا (دیکھئے تاریخ طبرستان محمد بن الحسن بن
اسفندیار، مولفہ ۶۱۳ھ مترجمہ ای جی براؤن
صفحہ ۲۸ اے جی ڈبلو گب ایڈیشن ۱۹۰۵ء)

اسی زمانہ میں ایک شخص فاضل ملا محمد علی نے جن کا مزار
کھمبات میں "پیر پرواز" کے نام سے مشہور ہے
گجرات کے ہندو تاجروں میں شیعیت کو پھیلایا
یہی جماعت بوہرہ کہلائی (ماثر الامراء تالیف
صمصام الدولہ شاہنواز خاں جلد اول بذکر قاضی
القضات قاضی عبد الوہاب صفحہ ۲۳۴ طبع ایشیا
ٹک سوسائٹی بنگال ۱۸۸۸ء) ملا محمد علی نے
مذہب اثنا عشری کی تبلیغ کی مرآت احمدی جو گجرات
کی تاریخ ہے اس میں یہ تصریح ہے کہ "مولانا محمد علی
شیعی مذہب بودہ تمامی برہمان مذہب استقامت
داشتند، داکثر بصلاح و تقوی مذہب شیعہ
اثنا عشری داشتند" (مرآت احمدی صفحہ ۱۰۳ طبع کلکتہ)

ابتدا میں بوہرے اثنا عشری و اسمٰعیلی ہوتے تھے
مخالف کوئی نہ تھا لیکن مظفر شاہ سلطان گجرات
کے عہد سے سنی المذہب بھی ہونے لگے، صرف ہندو
تاجروں ہی نے مذہب شیعہ نہیں اختیار کیا تھا بلکہ
ایک راجپوت راجہ سدھ راج جے سنگھ جو
گجرات کا راجہ تھا وہ بھی شیعہ ہوگیا تھا، اسی عہد
میں شیعوں کی ایک جمعیت (عاضد لدین اللہ آخر
خلیفہ فاطمی کے بعد) سلطان صلاح الدین یوسف
ایوبی کے تشدد و مظالم سے مجبور ہوکر مصر و افریقہ
سے بھاگ کر یمن ہوتی ہوئی ہندوستان پہنچی ہے
اور جس نے دکن میں قیام کیا ہے، ساتویں صدی
ہجری کے اوائل تک ہم کو ایک ایسے قابل احترام
بزرگ "بابا رتن ہندی" المتوفی ۶۱۲ھ کے وجود کا

بھی پتہ ملتا ہے جن کی صحابیت کی توثیق اکثر اکابر اہلسنت نے کی ہے (مثل مجدالدین فیروزآبادی وصلاح الدین صفدی وغیرہم) اور جو محبت اہلبیت اور فضائل گریۂ امام مظلوم کے متعلق براہ راست رسول اللہ صلعم سے حدیث روایت فرماتے ہوئے نظر آتے ہیں، غرضکہ اس زمانے میں ہندوستان مذہب شیعہ کا ایک مشہور مرکز ہو چکا تھا جہاں اس فرقے کے داعی اپنا تبلیغی پروگرام انجام دیتے تھے۔

اسی زمانہ میں سندھ اور پنجاب میں ایک شیعہ نوآبادی ایسی قائم ہو جاتی ہے جہاں کے باشندے مصر کے خلفاء فاطمیین کو احترام و تقدس کی نظر سے دیکھتے تھے اور ان کی بارگاہ میں ہدایا ونذور پیش کرتے اور خراج ادا کرتے تھے ان کے تعلقات براہ راست فاطمیین مصر سے عرصۂ دراز تک قائم رہے یہ لوگ بغیر خلفائے فاطمیین کی منظوری و اجازت کے کوئی کام نہیں کرتے تھے (احسن التقاسیم للمقدسی صفحہ ۴۸۵ لیڈن ایڈیشن ۱۹۰۶ء) ایسی صورت میں کوئی امر مانع نہیں معلوم ہوتا کہ اس زمانے کے سندھ اور پنجاب کے مسلمان جن کو اہلبیتؑ سے عقیدت تھی عزاداری مظلوم نہ کرتے رہے ہوں جب کہ خلفائے فاطمیین کو قیام عزائے امام مظلوم میں خاص شغف و انہماک تھا جیسا کہ علامہ مقریزی نے تفصیل سے "الخطط" میں لکھا ہے۔

اس عہد میں شیعہ اپنے مذہبی عقائد و رسوم کی اشاعت میں کافی جدوجہد کرتے تھے وہ اپنے اعمال مذہبی کو علانیہ بجا لاتے تھے اور اپنے مذہب کی اشاعت کے لیے کتابیں تصنیف کرتے تھے شیعیت کے اس بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنے کیلئے فیروز شاہ تغلق متوفی [illegible] نے شیعی مذہب کے خلاف سخت گیری سے کام لیا شیعوں کو قتل کرنے اُن کے اعمال و رسوم اور مذہبی لٹریچر کو فنا کرنے کی جابرانہ کوششیں کیں۔ (فتوحات فیروز شاہی) عزائے حسینؑ میں گریہ و زاری کرنے کی اہمیت کا اندازہ اس عہد کے لٹریچر اور ادبیات سے بھی لگایا جا سکتا ہے، مثال کے لیے مشہور شاعر و ادیب امیر خسرو متوفی ۷۲۵ھ (زمانہ غیاث الدین بلبن و تغلق شاہ) کے اس لطیف تلمیحی و معنی خیز جملے کو پیش کیا جا سکتا ہے، امیر خسرو لکھتے ہیں:۔

"گریہ قلم بآواز صریر در عشر عاشور و ایام مقتل حسین بود در عزا نامہا نیز گریہ قلم باید نوشت۔"

امیر خسرو کا یہ تلمیحی جملہ اچھی طرح اس امر پر روشنی ڈالتا ہے کہ بلبن و تغلق کے عہد میں عزادار عشرۂ محرم میں ذکر حسینؑ کر کے مصروف گریہ و زاری رہا کرتے تھے، اس کے ساتھ ہی ساتھ امیر خسرو کے دوسرے جملہ کی تلمیح سے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ موجودہ زمانہ کی طرح اس دور میں ایک ایسا گروہ بھی پایا جاتا تھا جو عاشور محرم کو آنکھوں میں سرمہ لگا کر یزیدیوں کی سنت کو بھی ادا کیا کرتا تھا وہ دوسرا جملہ یہ ہے:۔

"و سرمہ کشیدن میل قلم در عین این عریضہ روز عاشورا"

(اعجاز خسروی جلد اول حرف سوم صفحہ ۱۹۵ مطبوعہ نولکشور ۱۸۷۶ء) رہا یہ امر کہ عاشور کے دن سرمہ لگانا یزیدیوں کا شعار اور اہلبیت کے دشمنوں کی سنت ہے اس کے لیے ملک العلماء قاضی شہاب الدین دولت آبادی کی کتاب ہدایۃ السعداء جلوہ سابع قلمی صفحہ ۳۲۰، ۱۲۳۴ کتب خانہ ناصریہ لکھنؤ وما ثبت بالسنۃ شیخ عبدالحق دہلوی و صواعق محرقہ ابن حجر مکی و خطط المقریزی دیکھی جائے تفصیل کے لیے میری کتاب اثبات عزاداری مطبوعہ امامیہ مشن لکھنؤ میری دوسری کتاب عزاداری کی تاریخ پہلا دوسرا ایڈیشن نظامی پریس لکھنؤ ملاحظہ ہو۔

ساتویں و آٹھویں صدی ہجری میں مشائخ کرام و اولیاء عظام

اہل اسلام بھی عزاداری امام مظلوم میں مصروف رہا کرتے تھے جیسا کہ ان حضرات کے کتب ملفوظات و کتب تذکرہ اولیاء سے ظاہر ہوتا ہے شیخ الاسلام بابا فرید گنج شکر متوفی سنہ ۶۶۴ھ عاشور کے دن شہادت امام کا ذکر کرتے اور گریہ و زاری کرنے کے بعد ہائے ہائے کا نعرہ لگا کر بیہوش ہو جاتے تھے۔ سلطان المشائخ نظام الدین اولیاء اپنے شیخ بابا فرید کے ملفوظات "راحت القلوب" میں تحریر فرماتے ہیں:۔

" مشائخ طبقات دریں ماہ ہمہ محنت و عذاب برخود اختیار کردہ اند شیخ الاسلام چشم پر آب گرد و فرمود کہ میدانی نظام الدین دریں دہ روز بر خاندان حضرت خواجہ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم چہ واقع گذشتہ است و فرزندان ایشاں را چگونہ زار زار کشتہ اند و بعضے از تشنگی ہلاک شدہ اند کہ قطرۂ آب آں بدبختاں بداں خاندان زادگان ندادہ اند چوں شیخ الاسلام دریں سخن رسید نعرہ بزد و زار زار بگریست و بیفتاد و بیہوش شد و چوں بہوش آمد فرمود کہ زہے کافراں قساوت و سنگدلاں و زہے بے سعادتاں بے مہر حی و قیوم کہ دانستند کہ ایشاں فرزندان بادشاہ دنیا و آخرت را زار زار بکشتند و ایں قدر در خاطر بداندیشاں نگذشت کہ فردا بخواجۂ عالم صلعم چہ روئے خواہیم نمود "

(راحت القلوب نظام الدین اولیاء صفحہ ۴۰ مطبوعہ مطبع العلوم سنہ ۱۳۰۲ھ)

(بابا فرید گنج شکر ارشاد کرتے ہیں) اس ماہ محترم میں ہر طبقے کے مشائخ کرام غم حسینؑ کی وجہ سے اپنے کو درد و مصیبت و اندوہ و محن میں مبتلا رکھتے تھے یہ کہہ کر شیخ الاسلام بابا فرید آنکھوں میں آنسو بھر لائے اور فرمانے لگے اے نظام الدین جانتے ہو کہ اس مہینہ کے دس دن میں خاندان رسالت و اہلبیت اطہار پر کیا کیا مصائب گذرے ہائے فرزندان رسول کو کس طرح رولا رولا کر شہید کیا ہے ظالموں نے اہلبیت کو ایسا پیاسا مارا کہ ایک قطرہ پانی کا بھی نہ دیا یہ کہہ کر بابا فرید نے ایک نعرہ لگایا اور ہائے ہائے کرکے زار و قطار رونے لگے یہاں تک کہ بیہوش ہو کر گر پڑے جب جوش میں آئے تو کہنے لگے وائے ہو ان سنگدل اور بدبخت کافروں پر خدائے پاک دیکھ رہا تھا کہ یہ ظالم بادشاہ دنیا و آخرت کے فرزندوں کو رولا رولا کر قتل کر رہے ہیں ان بدبختوں نے یہ بھی خیال نہ کیا کہ کل قیامت کے دن رسول اللہ کو کیا منہ دکھائیں گے۔

مخدوم شیخ علاء الحق پنڈوی متوفی سنہ ۸۰۰ھ بھی دس دن محترم میں برابر گریہ و زاری میں مصروف رہا کرتے تھے اور مراسم عزا بجالاتے تھے، قدوۃ الکبریٰ سلطان جہانگیر سمنانی فرماتے ہیں:۔

" حضرت قدوۃ الکبریٰ می فرمودند کہ حضرت پیر روز عاشورا از دہ روز تا انتہائے عاشورہ در گریہ و زاری میگزرانیدند و می فرمودند کہ طرفہ دلے باشد کہ بر ماتم خاندان رسولؐ و جگر گوشگان بتولؑ نگرید و عزا ادرا ندارد سبحان اللہ چہ نیاز است، شعر

کسے کو در چنیں ماتم نہ گرید
دل آں کس مگر از سنگ باشد

(لطائف اشرفی جلد دوم صفحہ ۲۷۰)

ہمارے پیر علاء الحق پنڈوی پہلی محرم سے عاشور محرم تک دس دن برابر گریہ زاری و ماتم داری میں مصروف رہتے تھے اور یہ فرماتے تھے کہ وہ کونسا دل ہوگا جو خاندان رسول و جگر گوشگان بتول کا ماتم کرکے گریہ و زاری و عزا داری نہ کرے، سبحان اللہ کیا ناز و نیاز ہے، (ترجمہ خود):۔

جو شخص اس ماتم میں نہ گریہ کرے اس کا دل پتھر کا ہے۔
سید محمد بندہ نواز گیسو دراز دکنی بھی محرم میں گریہ وزاری میں مصروف رہتے تھے جیسا کہ آپ کے ملفوظات سے ظاہر ہے (غم حسینؑ شاہ حسن میاں پھلواری) یہ بزرگان دین محرم کے دن سادات کرام سے تعزیت و ماتم پرسی کرتے تھے چنانچہ مخدوم شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیری کی بھی یہی حالت تھی جیسا کہ آپ کے ملفوظات مخ المعانی میں ہے:-

"روز عاشور سعادت زمین بوس حاصل شد خلق کثیر بیشتر حاضر بودند جماعتے از سادات نیز به بندگی موجود بودند حضرت مخدوم عظم اللہ روئے مبارک بران سیداں آوردہ فرمودند امروز تعزیت خاندان شما است ما ہمہ طفیل شمائیم بعد ازاں فرمود سبحان اللہ تعزیت خاندان شما ہمہ را واجب است آنگاہ گفت کہ ہمچنیں گویند دراں روز کہ امیرالمومنین حسین رضی اللہ عنہ شہادت خواہند یافت شب آں بزرگے فاطمہ رضی اللہ عنہا را در خواب دید کہ با جملۂ زنان انبیاء دامن مبارک خود در کمر بستہ در دشت کربلا آمدہ است و بجائے کہ امیرالمومنین حسین رضی اللہ عنہ خواہند افتاد جاروب می دہند یا کی می کنند پرسید کہ خاتون روز قیامت ایں چہ مقام است گفت حسین غریب ما سر ایں جا خواہد نہاد آں گاہ گفت کہ نقل است کہ حضرت رسالت مآب صلعم چوں ایں قصہ از جبرئیل شنید پرسید کہ چوں میاں ما کسے نباشد تعزیت ایشاں کہ دارد گفت یا رسول اللہ امتیان تو برائے فرزندان تو تعزیتہا کنند و ماتم دارند کہ صفت آں نتواں کرد۔"

(منقول از غم حسین شاہ حسن میاں پھلواروی صفحہ ۲۸ طبع شیخ بہادر ۱۳۲۲ھ)

روز عاشورا آیا اس روز شہر کی تمام خلقت موجود تھی سادات کا ایک گروہ بھی موجود تھا حضرت مخدوم نے اس وقت سادات کو مخاطب کر کے فرمایا آج کے دن آپ کے خاندان کی تعزیت (مسلمانوں کو) کرنی چاہیئے ہم سب آپ ہی کے طفیل سے ہیں، پھر فرمایا کہ سبحان اللہ آپ کے خاندان کو پرسہ دینا اور تعزیت کرنا سب پر واجب ہے، پھر فرمایا جس روز امام حسینؑ شہید ہونے والے تھے ایک بزرگ نے جناب فاطمہ کو خواب میں دیکھا کہ تمام زنان انبیاء کے ساتھ حجزا من مبارک کو کمر سے باندھے ہوئے اس زمین کربلا پر اس جگہ جہاں امام حسین کی شہادت گاہ ہے جاروب کشی کر رہی ہیں ان بزرگ نے دریافت کیا کہ خاتون محشر یہ کونسی جگہ ہے فرمایا کہ یہی وہ مقام ہے جہاں میرا فرزند ذبح کیا جائے گا، اس کے بعد فرمایا کہ یہ بھی روایت ہے کہ جب رسول اللہؐ نے جبرئیل سے خبر شہادت کو سنا تو جبرئیل سے دریافت کیا کہ جب ہم اہلبیت میں سے کوئی نہ ہوگا تو تعزیت و سوگواری کون کرے گا جبرئیل نے جواب دیا کہ یا رسول اللہ آپ کی امت عزاداری کرے گی اور الیسا ماتم برپا کرے گی جس کو بیان ہی نہیں کیا جا سکتا۔"

اور خود قدوۃ الکبریٰ سلطان جہانگیر اشرف سمنانی متوفی سنہ ۸۰۸ھ کی یہ حالت ہوتی تھی کہ محرم کا چاند دیکھ کر بے قرار ہو کر گریہ وزاری میں مصروف ہو جاتے تھے اور رسم عاشوری برپا کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ تمام اکابر و سادات کا یہی طریقہ ہے اور ذکر شہادت کو ثواب فرماتے تھے جیسا کہ:-

"حضرت قدوۃ الکبریٰ می فرمودند اگر ذکر مقتل ایشاں کہ موجب درد و صاحبدلاں و سبب طرد سرور مقبلان گردد خالی از ثواب نیست۔"

(لطائف اشرفی جلد دوم صفحہ ۲۲۸)

قدوۃ الکبریٰ کا ارشاد ہے ذکر شہادت جو صاحبان

دل کو درد و غم میں مبتلا کرتا ہے اور عیش و آرام میں بسر کرنے والوں کے قلب سے خوشی و مسرت کو دور کر دیتا ہے خالی از ثواب نہیں ہے۔"

اس عہد میں علم برداری اور گشت کرنے کا بھی رواج تھا، اور زنبیل اٹھاتے تھے،

حضرت قدوۃ الکبریٰ می فرمودند کہ اکابران روزگار واماثران دیار بتخصیص سادات صحیح النسب و نقبار عالی حسب در عشرہ عاشور دور می کردند و زنبیل می گردانیدند ہمچناں کہ مذکور شد و در ولایت سبزوار سید علی قلندر کہ مقدمۂ اصحاب صوفیہ و عمدہ ارباب طائفہ علیہ بود در عشرۂ عاشورہ در پائے علم می نشست و اصحاب خود را بدور می فرستاد و احیاناً خود ہم بدور می آمد رسم عزا بر پا می داشت چنانکہ لباس رعونت درین عشرہ نمی پوشیدند و اسباب عیش و شادی ترک می کردند، جامع مقامات شریفہ و مقالات لطیفہ مدت سی سال در سفر و حضر ہمراہ بود حضرت قدوۃ الکبریٰ رسم عاشوری ترک نکردہ اند گاہے خود را در پائے علم می نشست و احیاناً سید علی قلندر کہ از خلص اصحاب و مخلص احباب بود و برا امر می کردند کہ در پائے علم می نشست در دو سہ روز اخیرہ از عشرہ پرہیز از زینت می کردند اصحاب ہم موافقت می نمودند اتفاقاً یک عاشورہ در بلدۂ جونپور مسجد عالی واقع شد بقانون معہودۂ خویش رسم عاشوری بجا آوردند، در عشرہ عاشور چنانکہ ادب ایشاں بود بسر بردند۔

(لطائف اشرفی جلد دوم صفحہ ۳۶۰ مطبوعہ نصرت المطابع دہلی ۱۲۹۸ھ)

قدوۃ الکبریٰ جہانگیر اشرف سمنانی فرمایا کرتے تھے کہ تمام بزرگان کرام اور سادات صحیح النسب اور نقبار عظام عشرہ محرم کو گشت کیا کرتے تھے اور زنبیل اٹھاتے تھے جیسا کہ اس سے قبل ذکر ہو چکا ہے۔ اور سبزوار میں سید علی قلندر جو صوفیائے کرام کے پیشوا اور سرخیل تھے ان کا یہ طریقہ تھا کہ عاشور کے دن علم مبارک نصب کر کے اس کے نیچے بیٹھتے تھے اور اپنے اصحاب و مریدوں کو (علم کے) گشت میں بھیجا کرتے تھے اور کبھی خود بھی گشت میں شریک ہوا کرتے تھے اور عزاداری کی رسموں کو بجا لاتے تھے، ترک زینت کرتے تمام عشرہ اچھے اور عمدہ لباس کو نہیں پہنتے تھے اور راحت و خوشی کے ساز و سامان کو ترک کر دیا کرتے تھے، جامع ملفوظات اشرفی کہتا ہے کہ میں تیس سال تک برابر حضرت جہانگیر اشرف سمنانی کے ہمراہ سفر و حضر میں رہا ہوں میں نے اس مدت میں یہ دیکھا کہ حضرت نے کبھی بھی رسم عاشوری و عزاداری کو ترک نہیں کیا، علم مبارک نصب کر کے اس کے نیچے بیٹھتے تھے اور کبھی سید علی قلندر کو جو خاص اصحاب احباب میں سے تھے ان کو علم شریف کے نیچے بیٹھنے کا حکم دیتے تھے ساتویں محرم سے زینت و لذات سے پرہیز کرتے تھے اور آپ کے اصحاب و مریدین بھی رسوم عزاداری بجا لانے میں آپ کی موافقت کرتے تھے، اتفاق سے ایک سال عشرۂ محرم شہر جونپور کی بڑی مسجد میں پڑا قدوۃ الکبریٰ نے اسی مسجد میں حسب معمول تمام مراسم عزاداری کو ادا فرمایا۔

غرضکہ ساتویں و آٹھویں صدی میں مشائخ صوفیا، اہلسنت بھی شیعوں کے دوش بدوش نہ صرف عزاداری امام مظلوم میں رہا کرتے تھے بلکہ اپنے حلقۂ اثر میں اس کی اشاعت و توسیع کی طرف بھی متوجہ رہتے تھے؛ نویں و دسویں صدی ہجری ہندوستان میں شیعیت کی اشاعت و تبلیغ کے لیے بہت زیادہ سازگار ہوئی۔

۹۲۰ھ میں عراق سے شمس الدین عراقی کشمیر آئے اور یہاں مذہب شیعہ کی تبلیغ کی ان کی کوشش سے علاوہ اہلسنت کے ۲۴ ہزار ہندوؤں نے شیعہ مذہب کو قبول کیا ، (الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند عبدالحی الندوی صفحہ ۲۱۷، ۲۱۸ مطبوعہ دمشق ۱۹۵۸ء) ملتان میں جہاں پر محمود غزنوی نے شیعیت کا استیصال کیا تھا میر شہداد نے بعہد سلطان محمود بن فیروز خاں ۹۰۳ھ سے ۹۳۱ھ کی مدت میں از سر نو پھر مذہب شیعہ کو پھیلایا (مرأۃ العالم بختاور خاں حصہ چہارم صفحہ ۲۰ مخطوطہ نمبر ۲۶۲ فارسیہ اخبار مسلم یونیورسٹی کلکشن علی گڑھ) اس کے بعد سید راجو بن سید حامد بخاری نے کھل کر مذہب شیعہ کی تبلیغ شروع کر دی ۔ اسی دسویں صدی میں جب ایران میں شاہ اسمٰعیل صفوی نے شیعہ مذہب کو عام رواج دیا اور اس مذہب کو حکومت ایران کا رسمی مذہب قرار دے دیا تو اس خبر کو سن کر دکن کی شیعہ سلطنتوں نے بھی علانیہ شیعہ مذہب اور اس کے شعائر کو فروغ دینے کی طرف توجہ کی چنانچہ یوسف عادل شاہ بادشاہ بیجاپور دکن نے شیعہ مذہب کی عام ترویج اور اس مذہب کے شعائر و مراسم کو پھیلانے میں کافی جد و جہد کی ہندوستان میں اسی بادشاہ کے زمانہ میں جمادی الاول ۹۰۸ھ میں سب سے پہلے شیعوں کے طریقہ پر علانیہ نماز جمعہ و جماعت ادا کی گئی خطبہ میں ائمہ اثنا عشر علیہم السلام کے اسمائے سرگرامی لیے جانے لگے اور اذان میں اشہد ان علیاً ولی اللہ بر ملا کہا جانے لگا (بساتین السلاطین تاریخ بیجاپور مرزا ابراہیم زبیری بستان اول صفحہ ۱۰۹ مطبوعہ حیدرآباد طبع اول۔ تاریخ فرشتہ جلد ۲ صفحہ ۱۱) اسی طرح علی عادل شاہ نے بھی اپنے زمانہ حکومت میں مذہب شیعہ اور اس کے شعائر کی اشاعت و ترویج میں سرگرمی سے حصہ لیا (بستان چہارم صفحہ ۱۱۰) ۹۱۸ھ

میں سلطان قلی قطب شاہ جو گولکنڈہ تلنگانہ دکن کا بادشاہ تھا اس نے بھی مذہب شیعہ کی اشاعت میں شہرت حاصل کی (تاریخ فرشتہ جلد ۲ صفحہ ۱۶۸ وحدیقۃ السلاطین) ۹۴۴ھ میں احمد نگر دکن کا بادشاہ برہان نظام شاہ نے بھی مع تین ہزار سنیوں کے مذہب شیعہ کو قبول کر کے شیعیت کی اشاعت کی طرف متوجہ ہوا (تاریخ فرشتہ جلد ۲ صفحات ۱۰۹ تا ۱۱۳ وحدیقۃ السلاطین) متذکرہ شیعہ سلاطین دکن کے عہد میں عزاداری کی بڑی ترقی ہوئی مجالس و ماتم، علم برداری و جلوس عزا، مرثیہ و نوحہ خوانی کا عام رواج ہوا، عاشور خانے تعمیر کرائے گئے، متذکرہ عادل شاہی فرمانروا صرف عشرۂ محرم میں ۵۵ ہزار ہون عزاداری میں خرچ کرتے تھے (لستان پنجم از بساتین السلاطین صفحہ ۲۵۳) قطب شاہی دور کے اخراجات عزاداری اس سے بھی کہیں زیادہ ہیں جس کو حدیقۃ السلاطین میں پڑھا جا سکتا ہے اس عہد میں تبرک، شربت، کھنڈوری اور قسم قسم کے کھانے مجالس میں تقسیم کئے جاتے تھے۔ چھٹی محرم سے علم برآمد ہوتے پانی و شربت کی سبیلیں لگائی جاتیں، ایام عزا میں لباس غم پہنا جاتا تمام ممالک محروسہ میں حکم نافذ ہو جاتا کہ کہیں کوس، نقارہ، طبل یا دمامہ نہ بجے اور گانے بجانے والے بھی اپنے آلات موسیقی کو غلافوں میں رکھ دیتے، مسکرات (شراب اور سیندھی) کی دکانیں بند ہو جاتیں باورچی خانوں میں گوشت کی آمد بند ہو جاتی نہ قصاب گوشت بیچتے اور نہ تنبولی پان اسی طرح شہر کے حماموں میں حجام اپنا کام بند کر دیتے، محمد قلی قطب شاہ نے سب سے پہلے دکنی زبان (اردو) میں مرثیے لکھے جس کے مرثیے اب بھی محفوظ پائے جاتے ہیں، ان سلاطین کے عہد میں نہ صرف شیعہ بلکہ اہلسنت اور ہندوؤں نے بھی عملاً عزاداری کو فروغ دینے میں کافی حصہ لیا

یہاں تک کہ شمالی ہند کے مشائخ صوفیا بھی عزائے حسین میں اپنے سابقین مشائخ کی طرح مصروف عزاداری رہا کرتے تھے، شیخ احمد شیبانی متوفی ۹۲۶ھ اور اُن کے پیر خواجہ حسین ناگوری کی مصروفیت عزا کے متعلق شیخ عبدالحق محدث دہلوی متوفی ۱۰۵۲ھ "اخبار الاخیار فی اسرار الابرار" میں بذکر احمد شیبانی تحریر فرماتے ہیں:۔

" وے بغایت محبت خاندان نبوت علیہ التحیۃ موصوف بود بر طریقۂ پیر خود، گویند کہ در عشرۂ عاشورہ و دوازدہ روز اول ربیع الاول جامۂ نو و جامۂ شستہ نپوشیدے و در لیالی ایں ایام جز بر خاک نخفتے و در مقابر سادات معتکف شدے و ہر روز بقدر امکان بر روح حضرت رسالت صلی اللہ علیہ وسلم و بارواح خاندان مطہر توسیع طعام می کرد و چوں روز عاشورہ شدے کوزہائے نو از شربت پُر کردے و بر سر خود نہادے و بدر خانۂ سادات رفتے و یتیمان و فقیران ایشاں را بخوراندے و دراں ایام چنداں گریستے کہ گویا آں واقعہ در حضور او شدہ است و چوں آواز نالہ و فریاد نساء و دختران کہ در ایام عاشورہ متعارف ایں دیار است بگوشش او رسیدے حالت کردے و خون از چشم باریدے۔" (اخبار الاخیار صفحہ ۱۷۶، طبع مطبع احمدی دہلی ۱۲۸۳ھ)

"خواجہ احمد شیبانی کو خاندان نبوت سے انتہائی محبت تھی اور مثل اپنے پیر خواجہ حسین ناگوری کے عشرۂ محرم کے دس دن اور ربیع الاول کے بارہ دن تک نئے اور دُھلے ہوئے کپڑے نہیں پہنتے تھے اور اس زمانہ میں رات کو زمین پر سوتے تھے اور مقابر سادات میں معتکف رہا کرتے تھے اور اس زمانہ میں ہر روز روح حضرت رسالت پناہ صلعم اور ارواح اہلبیتؑ کے نام پر کھانے کا لنگر جاری رکھتے تھے اور عاشور کے دن نئے کوزوں میں شربت بھر کے اپنے سر پر رکھ کر سادات کے گھر لیجاتے تھے، اور غریب و یتیم سیدوں کو کھانا کھلاتے تھے محرم کے دس دن اس طرح رویا کرتے تھے کہ گویا واقعۂ کربلا آنکھوں کے سامنے گذرا ہے، اور جیسا کہ ان اطراف (یعنی اطراف دہلی و اجمیر و نارنول) میں یہ دستور ہے کہ محرم کے دس دن عورتیں اور لڑکیاں امام حسینؑ پر گریہ وزاری نوحہ و ماتم کرتی رہتی ہیں، ان کی آواز گریہ و نالہ و فریاد کو جب یہ بزرگوار سنتے تو بے حال ہو جاتے اور خون کے آنسو روتے۔"

شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی متذکرہ عبارت سے دو امر واضح طریقے سے ہم پر روشن ہو جاتے ہیں پہلے یہ کہ دسویں صدی میں مشائخ صوفیا اہلسنت عشرۂ محرم میں کیونکر عزائے حسینؑ بجا لاتے تھے، دوسرے یہ کہ اس صدی میں محرم کے دس دن عورتیں اور لڑکیاں بھی عزاداری و سوگواری میں معروف رہ کر نالہ و فریاد کی آوازیں بلند کرتی تھیں، جس کا رواج آج بھی ہے۔ ان صدیوں میں ہندوستان کی عزاداری کے سلسلہ میں متذکرہ تاریخی حقائق کو بیان کرنے کے باوجود "تعزیہ" (جس کی ہندوستان میں مراسم عزاداری کے سلسلہ میں بہت بڑی اہمیت ہے) کا کوئی نشان نہیں ملتا ہے حالانکہ اس زمانہ کے عزادار شیعہ ہوں یا سُنّی سرگرمی کے ساتھ اور دوسرے مراسم عزا بجا لاتے تھے، اواخر آٹھویں صدی اور اوائل نویں صدی کے درمیان میں ایک مشہور عالم اہلسنت ملک العلماء قاضی شہاب الدین بن عمر الزاولی

دولت آبادی متوفی ۸۴۹ھ نے عزائے امام کی نشر و اشاعت میں کافی حصہ لیا ہے موصوف نے اپنی کتاب ہدایۃ السعدا میں محرم کے مراسم عزا کا کافی ذکر کیا ہے جو اس زمانہ میں ہندوستان میں رائج تھے مصنف نے اس کتاب میں بعض عزاداری چند ایسے مشہور شیعی مصنفین کی تصانیف سے حوالہ بھی دیا ہے جو ان سے پہلے ہندوستان میں گذر چکے تھے مگر اس کتاب میں کوئی ذکر تعزیہ کا نہیں ملتا ہے دراصل اس کتاب کا یہ مبحث بھی نہ تھا اس لیے کہ یہ ایک اخلاقی کتاب ہے اس میں تعزیئے کے بار● میں ذکر نہ ہونا تعجب خیز بات نہیں ہے، یہ بدنصیبی ہے کہ ہمارے سامنے ایسی کتابیں بہت کم ہیں (جن کو نہ ہونے کے برابر سمجھنا چاہیئے) جن میں مذہبی زندگی اور رسوم کے متعلق کچھ تذکرہ کیا گیا ہو، عموماً اس کی امید نووارد سیاحوں سے کی جا سکتی ہے جو غیر ممالک آکر ان رسوم کو غور سے دیکھتے ہیں جن کا وجود ان کے وطن میں نہیں ہوتا ہے اور اس کا تذکرہ اپنے سفرنامے میں خصوصیت سے کرتے ہیں، اِس اسی بنا پر ہم کو ابن بطوطہ سے بہت کچھ امید تھی لیکن یہ نہایت ہی افسوس کی بات ہے کہ ابن بطوطہ کا شائع شدہ سفرنامہ ہمارے اس مقصد کے لیے مفید نہیں ثابت ہو رہا ہے اس لیے کہ ابن بطوطہ کا خود نوشتہ مکمل سفرنامہ ہم تک نہیں پہونچ سکا موجودہ سفرنامہ جو ہمارے سامنے ہے اس کے خود نوشتہ سفرنامے کا خلاصہ ہے جس کو سیاح کے شاگرد " ابن جزی الکلبی " نے اس طریقے سے مدوّن کیا ہے کہ صرف وہی باتیں باقی رکھیں جو اس زمانہ کے لحاظ سے خاص دلچسپی کا سبب تھیں، ابن بطوطہ کے سفرنامہ کا دوسرا اختصار " ابن فتح اللہ البیلونی " کا ہے، اختصار طبع نہیں ہوا ہے اور نہ شائع ہے اس کا ایک قلمی نسخہ کیمبرج یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ ہے، ابن بطوطہ سے مایوس ہونے کے بعد یورپ کے سیاحوں پر نظر پڑتی ہے لیکن ان لوگوں نے بھی کوئی کارنامہ ایسا نہیں چھوڑا جو ہماری کچھ رہبری کر سکے "مارکو پولو" کے سفرنامے MARCO POLO'S TRAVELS کے نہایت مختصر اور بے سود حالات پائے جاتے ہیں جن کے پڑھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سیاح خود ہندوستان اور وہاں کے رسوم کے بارے میں بہت کم معلومات رکھتا ہے، زیادہ افسوس اُن یورپ کے سیاحوں پر ہے جو مغل شہنشاہوں کے زمانہ میں ہندوستان آئے ہیں اور وہ بھی رسوم ہند کے بارے میں کچھ نہ لکھ سکے، برنیر، ٹروورنیر، منوکوی وغیرہ (BERMIER TRAVERNIER MANUCCI) تعزیئے کے بارے میں بالکل خاموش ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ دنیائے اسلام کے ہر گوشہ میں عزاداری ہوتی ہے لیکن تعزیہ داری کا رواج صرف برصغیر ہندوستان میں ہے، اب یہ سوال کہ عزاداری امام حسین علیہ السلام کے سلسلہ میں تعزیہ داری کب سے رائج ہوئی اور کس نے رائج کی ؟

اس میں کوئی شک نہیں کہ دنیائے اسلام کے ہر گوشہ میں عزاداری سید الشہدا کسی نہ کسی نوعیت سے ضرور ہوتی ہے لیکن تعزیہ داری کا رواج صرف برصغیر ہندوستان میں ہے اس لیے یہ سوال ہوتا ہے کہ تعزیہ داری کا رواج کب سے ہے اور تعزیہ کا مخترع اور موجد کون ہے ؟

یہ حقیقت ہے کہ عموماً ہندوستان کی کتب تاریخ میں دسویں صدی ہجری تک کے حالات میں تربت، تابوت، علم کا ذکر ملتا ہے "تعزیہ" کا کوئی

تذکرہ نہیں پایا جاتا یہاں تک کہ اس عہد کے نووارد سیاحوں نے بھی جو ہندوستان میں آئے انھوں نے بھی اپنے سیاحت ناموں میں تعزیہ کا ذکر کیا ہے جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں، البتہ تعزیہ کا تذکرہ اُن مورخین نے کیا ہے جنھوں نے عادل شاہی و قطب شاہی سلاطین دکن کے حالات لکھے ہیں، بساتین السلاطین کے بستان ہفتم میں سلطان علی عادل شاہ ثانی جو ۱۰۶۷ھ میں تخت نشین ہوا اس زمانے کے حالات بیان کئے ہیں، اسی کے عہد میں بیجاپور کا مشہور مرثیہ گو شاعر "مرزاں" کا انتقال شب عاشور ہوتا ہے روز عاشور شاعر کا جنازہ تعزیوں کے عقب میں اٹھایا جاتا ہے مورخ لکھتا ہے:—

"از علامت مقبولیت مرزاں یکے آنست کہ موتش در شب شہادت بشہادت حاصل شد مرزاں تمام شب در مرثیہ گذرانیدہ سحرگاہ برائے طہارت در آمدہ بتوضا رفت عدوے ظالم ستمگر کہ بنا حق بہ عداوتش برخواستہ فرصت مجاجت قابو یافتہ زراں حال بہ خنجر جانگیر اورا شہید ساخت و بامداد اں کہ بر رسم دمعنًا اہل دکن علمہا و تعزیہا از مکانہا بیروں آوردہ بر چشمہ آب میر سانند، علی عادل در تمامی شہر حکم داد کہ ہمگی تعزیہ با و علمہائے تمامی شہر از دروازۂ ابراہیم پور کہ فتح دروازہ نام دارد برند بر طبق فرمان بادشاہی مردم شہر جوق جوق با علم و تعزیہ ہا ازاں دروازہ گزشتند- پست تر از ہمہ تعزیہ باجنازہ میرزاں را از عقب تعزیہ ہا برا دروند وشاگردانش پیش پیش جنازۂ مرثیہ گویاں می رفتند۔"

(بساتین السلاطین بستان ہفتم صفحہ ۳۴۳ و ۳۴۴)

میرزاں دکنی شاعر مرثیہ گو کی مقبولیت کی ایک علامت یہ بھی ہے کہ ان کی موت شب عاشور شہادت سے ہوئی، تمام رات میرزان نے مرثیہ گوئی میں گذاری صبح ہوتے رفع حاجت کے لیے گئے ایک دشمن ظالم نے موقع پاکر انھیں خنجر سے شہید کر دیا، صبح عاشور کو اپنے رسم کے مطابق اہل دکن علموں اور تعزیوں کو گھروں اور عزاخانوں سے اٹھا کر دریا پر لیجاتے ہیں اس موقع پر علی عادل بادشاہ نے یہ حکم صادر کیا کہ تمام شہر کے سب تعزیئے اور سب علم فتح دروازہ کی طرف سے دریا پر جائیں، اس حکم شاہی کی بنا پر جوق جوق تمام لوگ علموں اور تعزیوں کو لیکر اس دروازے سے گذرنے لگے سب تعزیوں کے گذر جانے کے بعد میرزاں کا جنازہ تعزیوں کے پیچھے پیچھے نکلا جنازہ کے ساتھ میرزاں کے شاگرد مرثیہ پڑھتے ہوئے جا رہے تھے۔"

اسی طرح حدایقۃ السلاطین میں بعض ذکر عبداللہ قطب شاہ جو ۱۰۳۵ھ میں مسند نشین ہوا تعزیئے کا تذکرہ ملتا ہے، ہندوستان میں ہر خاص وعام کی زبان پر یہ ہے کہ تعزیہ کی ابتدا صاحب قران امیر تیمور سے ہوئی، شاہزادہ میرزا محمد رئیس بخت ظہیرالدین گورگانی حفید ابو ظفر محمد بہادر شاہ ثانی نے اپنی تاریخ موج سلطانی (صفحہ ۳۹۱ طبع لکھنؤ) میں اس کا اقرار کیا ہے کہ ضریح و تعزیہ کی ابتدا امیر تیمور صاحبقران سے ہوئی اس بیان کی تائید نجم الغنی مورخ رامپوری کے اس تحریر سے بھی ہوتی ہے جس کو موصوف نے اپنی تاریخ حیدرآباد حصہ دوم کے بصفحہ ۲۱۲ زیر عنوان "محرم کی تعزیہ داری میں بعض امور کی اصلاح" کے حاشیہ میں لکھا ہے کہ" ظفر نامہ سے جو امیر تیمور کی تاریخ ہے

یہ ظاہر ہوتا ہے کہ امیر تیمور کو آلِ عبا کے بعض تبرکات حاصل ہونے کے بعد محرم میں اُن کا ادب و احترام سے نکالنے کا دستور اُن کے عہد میں قائم ہو چکا تھا اور اسی سے مغلیہ شہنشاہی خاندان میں تعزیہ داری کی بنیاد پڑی تھی۔ شاہزادہ مرزا محمد اختر گورگانی "حیاتِ تیمور" میں تحریر کرتے ہیں:۔

" (دمشق و شام میں) صاحبقران کو فتح و نصرت حاصل ہوئی قتلِ عام کا حکم دیا اور بعوض خونِ جناب امام حسین علیہ السلام کے اہلِ شہر (دمشق) کو قتل کیا تمام شہر جلا کر خاک و سیاہ کر دیا غرۂ شعبان المعظم ۸۰۳ھ کو مسماری شہر کا حکم نافذ کیا صرف جامع مسجد بنی امیہ کا وہ مینار چھوڑ دیا گیا جس پر حضرت عیسیٰ کا نزول ہوگا یعنی جب شہر کو جلایا ہے تو یہ مسجد بھی جل گئی تھی اور یہ مینار بچا لیا گیا بعد اس فتح کے برائے حصول زیارت مزار پُر انوار جناب امیر المومنین امام حسین رضی اللہ عنہ کربلائے معلیٰ میں حاضر ہوئے اور حسب بشارت جناب امام حسین علیہ السلام وہاں سے بہت سے تبرکات ملے جو تا غدر ۱۸۵۷ء دہلی کے قلعہ اور جامع مسجد میں موجود تھے ان میں سے کچھ جامع مسجد دہلی میں اب بھی باقی اور زیارت گاہ خلائق ہیں (حیاتِ تیمور مصنفہ شاہزادہ مرزا محمد اختر گورگانی صفحہ ۴۲ مطبوعہ مطبع صدیقی ۱۸۹۸ء) اس سلسلہ میں حکیم ابو خاں دہلوی اپنی کتاب "کشف الرین" میں "تاریخ کیفیت شاہانِ ہند" کے حوالے سے یہ عبارت نقل کرتے ہیں:۔

" امیر تیمور صاحب قران در عمر بست و پنج سالگی بود کہ از دور فلکی کوکب بلندی طالع و ارجمندی بخت و یاوری اقبال رسید بتعداد و ہفتاد و سہ ہجری بعد فوت میر خود کہ شیریں خاں نام و والی ولایت توران بود در خطۂ دلکشائے بلخ بر سریر فرمانروائی جلوس فرمود و سکہ و خطبہ بنام خود کرد و سمرقند را دار السلطنت قرار داد و دراں زماں بکوفہ رسید کو فوراً قتل نمود و در کربلائے معلیٰ بروضہ حضرت امام حسین علیہ السلام باریاب گردید ارشاد شد و از ہاتف غیب ندا بر آمد کہ بر تربت حضرت حر علیہ الرحمہ رفتہ تبرک بگیر و آنچہ ارشاد شود بجا آر حسب الامر عالی بر تربت آنحضرت رسیدہ و نشان و یک رومال عنایت شد و حکم فرمودند کہ در ہندوستان برو و از غرۂ محرم ایں ہر دو نشان را ایستادہ کردہ بتاریخ دہم محرم سال بسال فاتحہ کردہ باشی فتح ہندوستان بتو بخشیدہ شد، از انجا مرخص گردیدہ در ہندوستان آمد و سکہ و خطبہ بنام خود جاری کرد و بر تخت دہلی نشست ازاں روز رواج تعزیہ مشہور است۔"

"امیر تیمور صاحب قران ابھی ۲۵ سال کا تھا کہ اُس کی بلندیٔ قسمت کا ستارہ چمکا اور اُس کے بخت و اقبال نے اس کی مدد کی ۷۷۳ھ میں شیریں خاں والیِ ولایتِ توران کے فوت کے بعد تختِ سلطنت بلخ پر جلوہ آرا ہوا اور اپنے نام کے سکہ و خطبہ کو جاری کر کے سمرقند کو اپنا پایہ تخت بنایا اُسی زمانہ میں کوفہ گیا اور وہاں کے لوگوں کو قتل کیا اس کے بعد کربلائے معلیٰ میں روضۂ امام حسینؑ کی زیارت سے مشرف ہوا، وہاں اس کو بشارت ہوئی کہ حضرت حر کے مرقد پر جا کر وہاں سے تبرک لو اور جو کچھ تمھیں حکم ہو اس پر عمل کرو یہ حکم پا کر امیر تیمور حضرت حر کے روضہ پر گیا وہاں اس کو ایک رومال اور علم عنایت کیا گیا اور یہ حکم ہوا کہ اب تم ہندوستان جاؤ اور یکم محرم سے ان دونوں تبرکات کو ایستادہ کرو اور دسویں محرم کو ہر سال برابر شہدائے کربلا کا فاتحہ کرتے رہنا اور ہندوستان کی فتح ہم نے تم کو بخشی، وہاں سے رخصت ہو کر امیر تیمور ہندوستان آیا

اور وہاں سکہ وخطبہ اپنے نام کا جاری کیا اور دہلی کے تخت پر بیٹھا، اُس دن سے تعزیہ کا رواج شہرت پذیر ہوا۔"

مولوی محمد عبداللطیف خاں حنفی لوحانی خالصپوری اپنے رسالہ تعزیت حسینؑ میں صفحہ ۱۳ پر لکھتے ہیں:-

"آٹھویں صدی ہجری میں جب امیر تیمور صاحب قرآن کا ملکی اور مذہبی اقتدار قائم ہوا تو اُن کو شاہ کربلا سے خاص عقیدت تھی اس واسطے وہ ہر سال زیارت کے واسطے کربلا معلیٰ جایا کرتے تھے اس میں بہت دن آمد ورفت میں صرف ہو جاتے تھے انتظام سلطنت میں ہرج ہوتا تھا ایک مرتبہ خواب میں بشارت ہوئی کہ تمہارا یہاں آنے جانے میں زیادہ وقت صرف ہو جاتا ہے سلطنت کے کاموں میں نقصان ہوتا ہے لہٰذا تم ہمارے روضے کی نقل وہاں بنوالو اور ہر سال ایام محرم میں زیارت کر لیا کرو۔ چنانچہ حسب اجازت حضرت سید الشہداء شاہ کربلا کے امیر تیمور اول موجد تعزیہ داری کے ہندوستان میں ہوئے ہیں ان سے پیشتر علموں کا رواج تھا جس کو سب سے پہلے معز الدولہ دیلمی نے رسم ماتم عاشورہ کے ساتھ بغداد میں جاری کیا تھا اس کی تقلید ایرانیوں میں برابر چلی آتی تھی، حیدرآباد دکن میں قطب شاہ کا خاندان اول عزادار امام مظلوم کا تھا مگر محض علمداری ہوتی تھی آج تک وہ قطب شاہی علم حیدرآباد میں موجود ہیں وہ پیتل کے ہیں ڈیڑھ گز دو گز اور تین گز تک طول میں ہیں اب بھی محرم میں ان علموں کی زیارت کرائی جاتی ہے۔ امیر تیمور نے اپنے عہد میں تربتوں کا رواج دیا تھا تربتوں کا رواج ہندوستان میں عالمگیر بادشاہ کے عہد حکومت تک عموماً رہا اور محمد شاہ و احمد شاہ بادشاہ کے وقت تک بھی کم و بیش رہا، نواب برہان الملک شجاع الدولہ و آصف الدولہ وغیرہ بھی دیلمی طریقہ کے پابند رہے نواب شجاع الدولہ کی نسبت لکھا ہے کہ وہ عشرۂ محرم میں علم نکالا کرتے تھے اور دہلی میں بادشاہ کے حضور نہیں جاتے تھے، کہتے ہیں کہ جس زمانہ میں احمد شاہ درانی دہلی آئے تھے تو نواب شجاع الدولہ نے حسب دستور قدیم محرم میں علم نکالے اور جب دربار میں گئے تو احمد شاہ نے نواب صاحب کے آنسو اپنے رومال میں لے لیے اور اُن کو نجات کا وسیلہ سمجھا رفتہ رفتہ تربتوں کا رواج بھی روبہ ترقی ہوتا گیا مگر ایرانی حسب دستور قدیم علموں ہی کے رواج کے پابند رہے، دسویں صدی ہجری میں امیر تیمور کے بعد جب ہمایوں شاہ تخت دہلی پر جلوہ افروز ہوئے تو ان کو خاص عقیدت سیدنا امام حسین علیہ السلام کے ساتھ تھی، بیرم خاں نے کربلا جا کر ہمایوں کے واسطے زمرد تراشوا کر نقل ضریح مبارک بنوائی تھی اور یہ اول تعزیہ ہندوستان میں آیا یہ زمردین تعزیہ چھیالیس تولہ وزن میں تھا اور اس کی قبر پر اسم اعظم کندہ تھا اور علموں پر "یا علی یا علی" اور زیر منبر یہ عبارت کندہ تھی "غلام امام بیرم خاں ۹۵۹ھ" تعزیہ کا عام رواج لکھنؤ سے شروع ہوا اور اس کا موجد ایک سبزی فروش تھا (دیکھو حقائق المذاہب مصنفہ اغلب مرہانی ص ۲۰۰) بزمانہ آصف الدولہ بہادر اس سبزی فروش نے کچھ بانس اور سینٹھوں کی بندش سے تعزیہ بنا کر رکھا تھا اُس سبزی فروش کا مکان جہاں امام باڑہ میر باقر کا ہے وہاں پر تھا اب جو تعزیہ داری ہوتی ہے یہ اُسی کی ایجاد کردہ ہے جس قدر زمانہ گزرتا گیا رواج میں ترقی ہوتی گئی اور اس میں زیب وزینت کے لیے طرح طرح کی اختراع کی گئی اب اس وقت ہندوستان میں کروڑوں تعزیے رکھے جاتے ہیں شیعہ عموماً سب رکھتے ہیں اور اہلسنت کم مگر اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ تعزیہ کی ابتدا سُنیوں کی اختراع ہے اور وہی اس کے بانی ہیں۔"

بہر حال بنا بر شہرت عام اور تشریحات بالا امیر تیمور ہی ہندوستان میں تعزیہ داری کے رواج کا سبب ٹھہرتا ہے اس محل پر قیاس سے بھی مدد لی جا سکتی ہے، وہ یہ کہ ہندوستان کے مسلمانوں میں یہ ایک قدیمی دستور تھا کہ وہ زیارت مقامات مقدسہ کے لیے مثل خانۂ کعبہ، مدینہ منورہ، نجف اشرف اور کربلائے معلیٰ جایا کرتے تھے ان زائرین میں اکثر عام طبقے کے لوگ مشاہد متبرکہ کی تصویریں اور روضے کی نقل (جو منقش لکڑی یا کسی دھات کی بنی ہوتی تھیں) اپنے ہمراہ لاتے تھے اور مسلمانوں کو زیارت کراتے تھے بعد میں ایک گروہ ہی ایسا پیدا ہو گیا جس نے اس کو اپنا پیشہ بنا لیا اور ان کی عورتیں ان چیزوں کو زنان خانے میں لے جاتی تھیں اور شائقین کو زیارت کراتی تھیں عقیدت مند مسلمان عورتیں اور مرد اس کے عوض ان کو انعام دیتے تھے اور نذریں چڑھاتے تھے یہ عورتیں جنہوں نے اس کو اپنا پیشہ بنا لیا تھا "روضے والیاں" کہلاتی تھیں، ممکن ہے کہ تعزیے کا رواج اس رسم سے ظہور پذیر ہوا ہو لیکن اس قیاس کو یقین کا درجہ نہیں دیا جا سکتا، خصوصاً اُن تشریحات کی بنا پر جن کا حوالہ اس سے قبل دیا گیا ہے کیونکہ متذکرہ تشریحات کی تائید ایک ایسی کتاب سے ہوتی ہے جس کا نام "علم حیدری" ہے اور جس کا مصنف خاندان تیموریہ کا ایک فصیح المنطق شاہزادہ مرزا حیدر شکوہ بن مرزا کام بخش بن مرزا سلیمان شکوہ بن شاہ عالم دوئم بادشاہ دہلی ہے۔ علم حیدری میں شاہزادے نے اس امر کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ صرف اُن کے جد بہادر شاہ دوئم ہی شیعہ نہ تھے بلکہ ان کے اکثر بزرگ شیعہ تھے جو مصلحتاً تقیہ کے لباس میں تھے، منجملہ دیگر دلائل کے اپنے ثبوت میں "چہل نصائح بہادر شاہی" نامی کتاب سے ایک عبارت (فارسی) نقل کی ہے جس کا مصنف ابو النصر قطب الدین محمد معظم شاہ عالم بہادر شاہ اول ابن اورنگ زیب عالمگیر (متوفی ۱۱۲۴ھ) ہے، "چہل نصائح بہادر شاہی" میں بہادر شاہ اول نے اصلی نسخۂ تزک تیموری سے جو ترکی زبان میں ہے ایسے حوالے دیئے ہیں جن سے "تعزیہ" پر روشنی پڑتی ہے، اس محل پر میں اُس کا اُردو ترجمہ نقل کر رہا ہوں، امیر تیمور اپنی تزک (ترکی) میں لکھتا ہے:-

" [illegible]ھ میں جب کہ میں ۳۵ سال کا تھا میں نے توران کے میدان میں ظالم ازبک کو شکست دی اور میں ماوراء النہر کے تخت پر قابض ہو گیا تمام منبروں پر میرے نام کا خطبہ پڑھا گیا اس وقت سادات و شیوخ و زہاد نے میرے لیے دعائے خیر کی، خواجہ عبد اللہ نے جو اس زمانہ میں اہلسنت کے پیشوا تھے میری سخت مخالفت کی اور لوگوں کو میرے خلاف برانگیختہ کرنے لگا لیکن اُس نے خواب میں پیغمبر خدا کو اس طرح دیکھا کہ میں بھی حضرتؐ کے حضور میں ایستادہ ہوں اس نے چاہا کہ حضرتؐ کو سلام کرے لیکن آنحضرت صلعم نے اُس کی طرف سے روئے مبارک کو پھیر لیا دوبارہ پھر اُس نے حضرت کو سلام کیا اس مرتبہ بھی آنحضرتؐ نے اظہار ناراضی کیا آخر کار خواجہ عبد اللہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہؐ یہ تیمور وہ ہے جو آپ کے ہزاروں اُمتیوں کو تہ تیغ کر چکا ہے اور جس نے اُن کے ممالک کو تاراج کر دیا ہے لیکن اس پر بھی حضور نے دربار میں حاضری کی عزت دی ہے برعکس اس کے میں نے حضور کی اطاعت فرمانبرداری کی ہے اور اعلائے کلمۂ حق میں مصروف رہا ہوں اس پر بھی حضور مجھ سے غضبناک ہیں یہ سُن کر آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا کہ ہاں تیمور سفاک ہے اور اُس نے بہت سے مسلمانوں کو قتل بھی کیا ہے لیکن اب وہ مجھ سے محبت کرتا ہے اور میرے اہلبیت کے ساتھ بھی مروت رکھتا ہے

تو تیمور کے خلاف کیوں آواز بلند کر کے لوگوں کو بھڑکاتا ہے۔ اس خواب کو دیکھنے کے بعد خواجہ عبداللہ جب بیدار ہوا تو فوراً میری خدمت میں حاضر ہوا اور میرا مطیع و فرماں بردار ہوگیا (یہ واقعات ملفوظات تزک تیموری کے اُس اُردو ترجمہ میں بھی ہیں جس کو ۱۸۴۵ء میں دہلی عربک کالج کے پروفیسر مولوی سجان بخش نے کیا ہے دیکھو ترجمۂ مذکور کے صفحات ۱۴۱، ۱۴۲ اور ۲۴۴ مطبوعہ مطبع دہلی اُردو اخبار ۱۸۴۵ء) ۸۰۲ھ میں یہ واقعہ درپیش ہوا کہ سلطان روم نے مجھ پر ایک لشکر جرار کو لیکر چڑھائی کی میں بھی اُس کے مقابلہ کے لیے نکلا آغاز جنگ سے پہلے میں نے سادات کربلائے معلیٰ اور قبیلۂ سبز حرم کے نجفی باشندوں کی فوجیں اپنی کمک کے لیے آتے دیکھیں سید محمد مفتاح ان کے سردار تھے جو ان لوگوں کے آگے آگے علم لیے ہوئے تھے میں اس غیبی مدد پر بہت خوش ہوا سید محمد مفتاح نے مجھ سے یہ بھی بتلایا کہ اُنھوں نے امیرالمومنین حضرت علیؑ کو خواب میں دیکھا ہے جنھوں نے یہ حکم دیا ہے کہ میں (یعنی سید مفتاح) اس علم کو لیکر تیمور کی مدد کو جاؤں جب میں نے سید مفتاح سے اس بشارت کو سُنا تو فوراً سجدۂ شکر ادا کیا اب مجھ کو یقین ہوگیا تھا کہ تائید الٰہی شامل حال ہے اسی اثنا میں میری فوج سے "ادک تیمو" نکل کر سامنے آیا اور فتح کی دعائیں کرنے لگا میں نے علم اُس کے ہاتھ میں دے دیا اور حملہ کرنے کیلئے کہا وہ اپنے اس اعزاز پر جوش مسرت کی وجہ سے رو پڑا اور دلیرانہ حملے کرنے لگا۔ (یہ واقعہ ملفوظات تزک تیموری ترجمہ اُردو کے صفحہ ۱۵۰ پر بھی موجود ہے) دوران جنگ میں ایک مرتبہ میں رسالتمآبؐ کی زیارت سے خواب میں مشرف ہوا حضرت نے ارشاد فرمایا کہ مودت اہلبیتؑ کے صلے میں خداوند عالم نے تیری ستر اولادوں

کو دنیاوی حکومت عطا فرمائی ہے (یہ واقعہ باختلاف الفاظ ملفوظات و تزک تیموری اُردو ترجمہ مترجمہ ۱۸۴۵ء میں دو مقام پر ہے دیکھو صفحہ ۱۸۱، ۱۹۱، ۲۰۲ بصفحہ ۹۸ و ۹۹ مطبوعہ مطبع اُردو اخبار دہلی) اور اسی مناسبت سے آنحضرتؐ نے مجھ کو ستر خرمے کرامت فرمائے میری حیرت کی کوئی انتہا نہ تھی کہ جب بیدار ہونے کے بعد بھی میں نے اپنے دامن میں اُسی تعداد میں ستر خرمے پائے۔ اس خواب کے بعد میں نے اپنی کل اولادوں کو جن کی اُس وقت تعداد ۲۴ تھی الگ الگ ملک تقسیم کر دیئے ایسی عزت جو مجھ کو حاصل ہوئی ہے آدم سے لیکر اب تک کسی بادشاہ کو نہیں حاصل ہوئی ایک مرتبہ کربلائے معلیٰ میں مجھ پر یہ واقعہ بھی گزرا کہ حُر شہید جو گنج شہیداں سے الگ دفن کئے گئے ہیں اور جن کے زخموں کو حضرت امام حسین علیہ السلام نے اپنی مادر گرامی جناب فاطمہ زہراؑ کے رومال سے باندھا تھا اور جو مع اس رومال کے دفن کر دیئے گئے تھے چنانچہ اس رومال کے لیے چند سرداروں نے مجھ کو مجبور کیا کہ میں ایسی نفیس و متبرک یادگار پر قبضہ کرلوں، میں نے اس معاملے میں علماء سے مشورہ کیا لیکن ان لوگوں نے مجکو اس سے منع کیا علاوہ ازیں میں خود بھی اس کو گناہ عظیم سمجھتا تھا؛ اس موقع پر ملا نصاح نے جو مدینے کے ایک سید تھے مجھ سے کہا کہ مدینہ میں زید ہاشمی کے مکان میں ایک متبرک کپڑا ہے جو سیدہ فاطمہ زہراؑ کے دست مبارک کا بنا ہوا ہے اور اکثر اُس کپڑے پر معجزنما تحریریں بھی نظر آتی ہیں، مجکو اس متبرک کپڑے کے حاصل کرنے کی انتہائی خواہش ہوئی اس لیے اُس کے لیے خاص طور پر زید ہاشمی کو مدینہ سے طلب کیا وہ اپنے ساتھ اس متبرک کپڑے کو بھی لائے، اور مجکو بخشش زیادہ عقیدت

اس پر حروف پائے گئے، جب میں نے اس متبرک کپڑے کی زیارت کی تو فرطِ مسرت سے رونے لگا، غرضکہ اپنے قیام کے زمانہ میں برابر قبرِ مطہر امام مظلوم کی زیارت سے مشرف ہوتا رہا وہاں کے باشندوں نے مجھ کو ایک علم بھی دیا تھا جو خاک شفا کا بنا ہوا تھا جس کو میں بعد تعظیم پیشانی اور آنکھوں سے لگایا کرتا تھا ایک مرتبہ اس علم میں میں نے واقعات کربلا کا مشاہدہ کیا تھا جس سے میں متاثر ہو کر رونے لگا تھا اس کا اتنا اثر تھا کہ تین دن اور تین رات تک برابر غمگین و محزون رہا اور کسی کام کی جانب متوجہ نہیں ہوا اس واقعہ کے بعد میرا یہ ارادہ ہوگیا تھا کہ میں اس مقدس سرزمین سے کبھی جدا نہ ہوں گا لیکن بالآخر شہزادوں اور دوسرے فوجی افسروں نے مجھ کو وہاں سے روانہ ہونے کی انتہائی ترغیب دی جس کی وجہ سے وہاں سے کوچ کرنے کے لیے ارادہ ہوگیا اُس وقت کربلا کے باشندوں نے میری تکلیف اور غم کو دور کرنے کے لیے مجھے ایک ایسی ضریح نذر دی جو کہ مزار انوار کے قریب کی خاک پاک سے بنائی گئی تھی جب میں نے اُس ضریح کی زیارت کی تو بالکل بے قابو ہو کر رونے لگا شب کے وقت اُس ضریح مبارک سے نوحہ و ماتم کی غیبی صدائیں آتی تھیں جن کو سننے کے بعد لوگ بے چین ہو جاتے تھے اس معجزے کے ظہور کی وجہ سے لوگ اس کو ضریح معجزہ کہنے لگے تھے یہ ضریح ہر موقع اور موسم میں میرے ساتھ رہی اور اُس کے برکات سے مجھ کو ہر طرح کی کامیابی حاصل ہوئی، ماہ محرم کے عشرۂ اول میں اس متبرک ضریح معجزہ کو دس دن تک خیمے میں رکھتا تھا اور سید مدنی کی ہدایت کے مطابق عزاداری میں مشغول رہتا تھا، سید ممدوح حضرت کے واقعات شہادت مجھ کو سناتے تھے اور میں گریہ و ماتم کرتا تھا اور روٹیاں تقسیم کرتا تھا۔" (ترجمہ عبارت توزک تیموری مذکور در چہل نصائح بہادر شاہی، بحوالہ اعلام حیدری در عقائد سلاطین تیموری صفحہ ۱۵، ۱۶، ۱۷، طبع مطبع سلطان العلوم)

ضریح معجزہ اور تیمور کی دس دن محرم کی عزاداری کا ذکر تزوک کے فارسی ترجمہ میں نہیں ہے، اس کے متعلق بہادر شاہ اول نے چہل نصائح میں خود تحریر کیا ہے کہ اس عبارت کو مترجم نے جنھوں نے شاہجہاں کے حکم سے اصل ترکی سے فارسی میں عمداً چھوڑ دیا ہے تاکہ تیمور کے تشیع کو پوشیدہ کیا جاسکے اس کا اعتراف یورپ کے مستشرقین محققین نے بھی کیا ہے کہ تزک تیموری کے مترجم (محمد افضل بخاری جنھوں نے ابوطالب حسینی کے ترجمہ پر شاہجہاں کے حکم سے نظر ثانی کی تھی اور جس کا ترجمہ آج کل متداول ہے) نے تیمور کو سنی ظاہر کرنے کیلئے ترجمے میں تیمور کی شیعیت کو چھپایا ہے ملاحظہ ہو تنقید

(ELLIOTH AND DAWSON)
VOL III Page 393
By MAJOR STEWART.

حالانکہ امیر تیمور کا محب اہلبیت و شیعہ ہونا ایک ناقابل انکار حقیقت ہے چنانچہ علامہ ابوالولید بن الشحنہ نے اپنی تاریخ "روضۃ المناظر فی اخبار الاوائل والآخر (برحاشیہ مروج الذہب مسعودی طبع اول مطبع ازہریہ مصر ۱۳۰۳ھ ص ۳۶) میں بسلسلۂ حالات تیمور لکھا ہے کہ امیر تیمور نے شہر حلب پر قبضہ کرنے کے بعد علمائے اسلام کو اپنے دربار میں طلب کیا تھا منجملہ دیگر علماء کے جو دربار میں حاضر ہوئے تھے حافظ خوارزمی قاضی شرف الدین موسی الانصاری الشافعی، قاضی علم الدین القفصی الصیفی المالکی بھی موجود تھے تیمور نے ان علماء سے چند سوالات کئے تھے آخری سوال جو امیر صاحبقران نے کیا تھا وہ یہ تھا کہ ما تقولون فی علیؑ و معاویہ و یزید، امیرالمومنین علیؑ، معاویہ اور یزید کے بارے میں

تمھارا کیا عقیدہ ہے، اس سوال کے سننے کے بعد قاضی شرف الدین نے حافظ خوارزمی سے یہ کہا تھا "کیف تجادبہٗ فانہ شیعی" اب اس کا جواب کیونکر دوگے، تیمور تو شیعہ ہے، اس موقع کو قاضی القضات شہاب الدین احمد بن محمد بن عبداللہ الدمشقی الانصاری المعروف بہ ابن عرب شاہ (یہ قاضی صاحب سلطان احمد جلائر بادشاہ بغداد کے کاتب بھی تھے جس کو امیر تیمور نے شکست دی تھی بغداد فتح کرنے کے بعد امیر تیمور قاضی صاحب کو اپنے ہمراہ سمرقند لے آیا تھا انھوں نے تیمور کے حالات میں کتاب لکھی جس میں تیمور کو بہت ہی برا لکھ کر اُس پر سب وشتم کی ہے) نے عجائب المقدور فی اخبار تیمور میں بھی نقل کیا ہے دیکھو صفحہ ۲۰۹ طبع عثمانیہ مصر ۱۳۰۵ھ اسی طرح علامہ احمد زینی دحلان نے بھی اپنی تاریخ فتوحات الاسلامیہ جلد دوم صفحہ ۱۱۵ و ۱۱۶ مطبوعہ مکہ ۱۳۰۲ھ پر مفصلاً اس واقعہ کو لکھا ہے، اسی طرح علامہ محمود بن محمد علی الشیخانی الشافعی القادری المدنی (معاصر خلیفہ محمد خان سلطان روم و شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر) اپنی کتاب الصراط السوی فی مناقب آل النبی المصطفیٰ میں لکھتے ہیں:-

بانہ کان یحب اھل البیت سیّما الحسین المظلوم شھید الطف والکربلا قیل ما فعل باھل الشام ما فعل الا لحب الرسول حتی قیل کان خضر فی مقدم جیشہ وقیل ان رجلا من الصالحین رأی رسول اللہ صلعم فی المنام ورائی امیر تمر کورکن جالسًا عند النبی صلعم فقال الرائی لامیر تمر کورکن لیس ھذا مقامک فابعد عن رسول اللہ صلعم فقال رسول اللہ صلعم للرائی اسکت اد کلمۃ مثل ھذہ فان امیر تمر کورکن کان یحب الحسین، قلت ولو لم یکن لامیر تمر کورکن حسنۃ واحدۃ الا کونہ محبًا لاھل البیت لکفاہ ذالک"

"امیر تیمور دوستدار اہل بیت تھا خصوصیت سے شہید کربلا حسین مظلوم کو بہت زیادہ دوست رکھتا تھا کہتے ہیں کہ اہل شام کے ساتھ قتل وغارت کا جو سلوک اس نے کیا وہ محض محبت رسولؐ کے سبب سے تھا، ایک مرتبہ ایک مرد صالح نے رسول صلعم کو خواب میں اس صورت میں دیکھا کہ امیر تیمور گورگانی حضرت کی خدمت میں بیٹھے ہیں یہ دیکھ کر اس مرد صالح نے امیر تیمور سے کہا کہ تیری یہ منزلت نہیں ہے کہ دربار رسالت میں بیٹھے یہاں سے دور ہو یہ سن کر رسول اللہؐ نے فرمایا خاموش ہو جا یہ امیر تیمور میرے حسینؑ کو دوست رکھتا ہے علامہ شیخانی کہتے ہیں کہ اگر امیر تیمور کے نامۂ اعمال میں سوائے محبت اہلبیت کے ایک نیکی بھی نہ ہو تو اس کی نجات کے لیے یہ محبت اہلبیت ہی کافی ہے۔

علامہ احمد زینی دحلان نے فتوحات الاسلامیہ کے جلد دوم صفحہ ۱۱۰ (طبع مکہ ۱۳۰۲ھ) پر تیمور کے متعلق یہ کھل کر لکھ دیا ہے:-

"کان رافضیاً شدید الرفض" امیر تیمور کٹر رافضی تھا،

مختصر یہ کہ امیر تیمور کی شیعیت میں شبہ کی گنجائش نہیں ہے اس لیے کا قوی امکان ہے کہ شاہجہاں جو متعصب سُنی تھا اُسکی فرمائش پر محمد افضل بخاری نے اصل تزک سے فارسی میں ترجمہ کرتے وقت ان مقامات کو حذف کر دیا ہو، تزک تیموری کی اصل عبارت سے جو ہمارے ناول کی پیش کردہ ہے یہ یقیناً ثابت ہوتا ہے کہ ضریح (نقل روضہ) تیمور کے لیے بنائی گئی لیکن ہمارے پاس یہ معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے کہ آیا ضریح بنانے کا رواج تیمور کے عہد میں قدیم تھا کہ جدید؟

دراصل ایسا معلوم ہوتا ہے کہ امیر تیمور کو متبرک عمارات کی نقل رکھنے کا ایک خاص ذوق تھا غالباً اسی فطری ذوق کا نتیجہ تھا کہ تیمور اپنے ہمراہ سفر میں ٹوٹ کی ایک چوبی مسجد بھی رکھا کرتا تھا، چنانچہ ایک یورپین مورخ "ہیرلڈ لیمب" اس مسجد کا تذکرہ ان الفاظ میں کرتا ہے :-

"سفری مسجد روانہ ہوچکی ہے، یہ لکڑی کی ایک صنعت نیلے اور سرخ رنگ کی ہے اس مسجد کو کرسی دے کر نصب کرتے ہیں اور سیڑھی لگا کر اس کے اندر جاتے ہیں، رنگین شیشوں کے روشندانوں سے روشنی چھنتی ہوئی اس میں آتی ہے، یہ چوبی مسجد ٹوٹتی ہوئی ہے یعنی اس کے پرزے علیحدہ ہوجاتے ہیں حالت سفر میں اسے توڑ کر اس کے پرزے گاڑیوں میں رکھ لیتے ہیں آج کل یہ مسجد تیمور کے ساتھ ہندوستان کے سفر میں ہے۔ یہاں نماز کے وقت لگادی جاتی ہے اور کوچ کے وقت پھر توڑ کر گاڑیوں میں رکھ لیتے ہیں۔"

("تیمور جس نے دنیا ہلا ڈالی" مصنفہ ہیرلڈ لیمب مترجمہ محمد عنایت اللہ مطبوعہ معارف اعظم گڑھ صفحہ ۱۷۰)

تعجب نہیں کہ تیمور کے اسی ذوق نے روضہ مبارک امام حسینؓ کی نقل کو بھی گوارا اپنے ہمراہ رکھنے کے لیے مجبور کیا ہو، اس بنا پر ضریح یا تعزیہ کا سب سے پہلا موجد ہی تیمور ہوسکتا ہے ہاں اس مسجد کے متعلق ایک فقہی سوال ہو سکتا ہے کہ کیا فقہا کے نزدیک ایسی مسجد ہوسکتی ہے؟ کیونکہ شرعاً مسجد کے لیے زمین کا متعین و محدود ہونا ضروری ہے۔ یہ کہ جہاں پر وہ تخت یا چوبی صنعت کو رکھ دیا جائے اس جگہ مسجد کا اطلاق ہوجائے شیعی و حنفی فقہ کی بنا پر اس قسم کی صنعت پر مسجد کا اطلاق نہیں ہوسکتا ہے جس میں نماز پڑھنا ثواب مسجد کے برابر ہوسکے،

اس کے علاوہ کسی مورخ نے اس چوبی مسجد کا تذکرہ بھی نہیں کیا ہے اور نہ عوام میں اس کی شہرت ہے برخلاف اس متواتر خبر و روایت کے کہ امیر تیمور نے امام حسینؓ کے روضہ مبارک کی نقل کو بنوایا تھا جس کا تحریری ثبوت بھی مل رہا ہے، ہوسکتا ہے کہ امیر تیمور کی یہ چوبی صنعت امام حسینؓ کے روضہ کی نقل رہی ہو جس کو ضریح یا تعزیہ کہتے ہیں جس کا وجود امیر تیمور کے ہمراہ سفر ہندوستان میں بیان کیا جاتا ہے لیکن غلط فہمی سے اس کو ہیرلڈ لیمب نے مسجد سمجھ لیا ہو۔

میرے اس خیال کی تائید ایک دوسری روایت سے بھی ہوتی ہے جو اس سلسلہ میں نقل کی جاتی ہے جس میں یہ ہے کہ تبرکات اور ضریح معجزہ کو تیمور اپنے ہمراہ ایک عماری میں رکھا کرتا تھا جیسا کہ بیان کیا جاتا ہے کہ تیمور نے جب دمشق کو فتح کیا تو وہاں سے اس کو اہلبیت علیہم السلام کے کچھ تبرکات دستیاب ہوئے تھے جس میں کچھ خون آلود کپڑے حضرتؑ کے جسم مطہر کے بھی تھے تیمور نے ان سب تبرکات اور نیز ضریح معجزہ کو ایک عماری میں محفوظ کر دیا تھا جس کو وہ اپنے ہمراہ ہمیشہ رکھتا تھا یہ عماری مع ان تبرکات کے برابر اس خاندان میں محفوظ رہی ایام محرم میں اس عماری کا گشت اس شان سے ہوتا تھا کہ امراء اور وزراء اراکین سلطنت میں جو لوگ نہایت بزرگ اور مقدس ہوتے تھے وہ اس کو اپنے کاندھوں پر اٹھائے رہتے تھے اور تمام فوج ساتھ رہتی تھی (ممکن ہے کہ تعزیے کی وہ شکل جو عماری سے زیادہ مشابہ ہے وہ اسی کی نقل ہو) اس قسم کا تعزیہ میرے خاندان میں اب تک بنایا جاتا ہے جس کو میرے خاندان کے بزرگ سادات بناتے ہیں

ہو سکتا ہے کہ ایسا تعزیہ کہیں اور بھی بنا ہو) یہ تبرکات اسی عماری میں محمد شاہ کے وقت تک رہے جب نادر شاہ ہندوستان میں آیا تو اُن میں سے کچھ تبرکات وہ اپنے ہمراہ لے گیا جو بچ گئے وہ ایک طلائے خالص کی عماری میں رکھے گئے جب شاہ عالم ثانی کا زمانہ آیا اور غلام قادر روہیلہ نے بادشاہ کے ساتھ نمک حرامی کی تو اُس وقت سیندھیا (مرہٹوں) نے بادشاہ کی مدد کی اور فرطِ عقیدت سے وہ عماری اپنے ہمراہ لے گیا اور گوالیار میں عزاداری کی بنیاد ڈالی یہ تھا مرہٹوں کے حالات میں اس عہد کے مورخین بیان کرتے ہیں (فرض عین صفحہ ۳۳ طبع لکھنؤ) تیمور کے تبرکاتِ عزا میں سے ایک علم ریاست محمود آباد میں اب تک موجود تھا جس پر تیمور کا نام اور سنہ کندہ ہے۔

ہمایوں کے عہد میں بھی عزاداری سابقہ انداز و اہتمام کے ساتھ برابر ہوتی رہی، اس عہد میں عزاداروں کو تعزیت امام میں اس قدر توغل تھا کہ اگر روزِ عاشورہ اتفاقاً معرکۂ جنگ میں مصروف پیکار رہتے تھے تو اس وقت بھی مرثیہ پڑھتے اور امام کی مظلومی پر گریہ کرتے جاتے تھے چنانچہ ملا عبد القادر بدایونی منتخب التواریخ میں بذیل ذکر شعرا و فضلا عہد ہمایوں "حیدر تونیانی" کے تذکرے میں لکھتے ہیں:۔

" واین مطلع اورا که در تعزیہ حضرت امام شہید
مقتول قلذہ کبد رسول مقبول علیہ السلام نقش بستہ
در ایام عاشورا در معارک میخوانند ؎
ماہ محرم آمد و شد گریہ فرض عین
گریم خون بیاد لب تشنہ حسینؑ
(تاریخ بدایونی صـ۱۳۰ طبع نولکشور)

کسی دوسرے مقام پر اوپر یہ ذکر بھی کر چکا ہوں کہ شہنشاہ جب ایرانیوں کی مدد سے دوسری مرتبہ ہندوستان پر قابض ہوا ہے تو سنہ ۹۵۹ھ میں بیرم خاں کو کربلا معلیٰ بھیج کر اُس نے ایک ضریح بنوائی تھی جو قیمتی جواہرات سے تیار کی گئی تھی اور جس کو شاہی محل میں رکھا گیا تھا، ہمایوں کا پورا لشکر ایرانی قزلباشوں پر مشتمل تھا اور بادشاہ کے گرد و پیش انھیں کا اجتماع رہتا تھا کوئی وجہ نہیں کہ ان ایرانیوں کی وجہ سے عزاداری امام مظلوم میں کافی فروغ نہ ہوا ہو، ہمایوں کے بعد اکبر اعظم کے عہد حکومت میں بقول مورخ بدایونی شیعوں کا اثر و رسوخ بہت زیادہ ہو گیا تھا اور بقول مورخ مذکور "سُنیان مغلوب و شیعیان غالب" کا مصداق ہو گیا تھا اس لیے اس عہد میں عزائے امام حسینؑ میں عزاداروں کا انہماک لازمی ہے۔

جہانگیر کے زمانہ میں نور جہاں جو عقیدۃً شیعہ تھی اُس نے قیام عزاداری کے لیے یہ اہتمام کیا تھا کہ چند مواضعات بحیثیت معافی کے "سید معین الدین موسوی اجمیری" کی درگاہ سے متعلق کر دیئے تھے جن کا مقصد یہ تھا کہ اس کی آمدنی سے درگاہ معینیہ اجمیر میں عشرۂ محرم میں عزاداری کی جا رہے اور تعزیئے رکھے جائیں اس کے لیے ایک فرمان صادر کیا گیا تھا جس میں عزائے امام اور تعزیئے کا خصوصیت سے ذکر کیا گیا ہے یہ فرمان آج تک اجمیر میں موجود ہے اور اس کے بموجب برابر درگاہ میں تعزیہ رکھا جاتا ہے اور مجلسیں ہوتی ہیں۔

شاہجہاں کے متعلق مولوی عزیز الرحمٰن حنفی اپنی انگریزی کتاب تاریخ جامع مسجد دہلی میں لکھتے ہیں:۔

" شاہجہاں نے جامع مسجد دہلی کی تعمیر کے بعد ایک خوبصورت ضریح نقل روضہ امام حسینؑ بنوائی تھی اس ضریح کو بادشاہ نے مسجد کے اندر محراب عبادت کے داہنے ہاتھ کے جانب رکھا تھا جو عرصہ تک اپنی جگہ

رکھی رہی اس ضریح میں رسولؐ اور اہلبیت رسولؐ کے منسوب شدہ تبرکات رکھے گئے تھے جس کو امیر تیمور نے ۸۰۴ھ (۱۴۰۲ء) میں سلطان روم بایزید خاں کو شکست دے کر حاصل کیا تھا اور نسلاً بعد نسلٍ اس خاندان میں منتقل ہوتے چلے آرہے تھے، یہ ضریح اب بھی احاطۂ مسجد میں ایک حجرہ میں محفوظ ہے جس کی حفاظت کے فرائض جامع مسجد کے امام کے سپرد ہیں۔"

(HISTORY OF JAME MASJID,
By AZIZ RAHMAN,
Page 27, First Edition, 1936.)

شاہجہاں کے بعد اورنگ زیب عالمگیر متوفی ۱۱۱۸ھ تخت سلطنت پر بیٹھتا ہے، اس بادشاہ کے متعلق عموماً بڑی خوش اعتقادی ہے جس کی وجہ سے اس کو "ماحی بدعت و محی سنت" کہتے ہیں وہ بظاہر بڑا مذہبی و پابند شریعت تھا، راقم الحروف نے اس کی زندگی کے بارے میں بہت کچھ تاریخوں میں پڑھا اس کے کلمات، شقعہ جات، رقعات، مکتوبات و احکامات اور دستور العمل کے متعدد مجموعوں کو بھی بالاستیعاب مطالعہ کیا جو خود اس کے عہد یا بعد کے قریبی زمانے میں جمع کئے گئے ہیں لیکن مجھ کو کہیں سے یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ وہ عزاداری امام مظلوم کو ناپسند کرتا تھا و بنظر استحسان نہیں دیکھتا تھا ممکن ہے کہ سیاسی اختلافات و توسیع سلطنت کے رجحانات نے اس کے اعمال و کردار کو داغدار بنا دیا ہو "الملک عقیم" کی بنا پر چاہے اس نے اپنے باپ کو قید میں رکھا ہو یا بھائیوں کے خون کا اس کے دامن پر دھبہ ہو یا دکن کی شیعہ سلطنت کو ختم کیا ہو لیکن اہلبیت کرام و سادات کی محبت و مودت کو وہ یقیناً واجب و لازم سمجھتا تھا اس کی گھریلو زندگی بھی ایسی تھی جو براہ راست اس کی صلبی اولاد کو شیعہ ہونے سے نہیں مانع ہوئی اس کا ولیعہد بڑا بیٹا کٹر شیعہ تھا اس کی چہیتی بیٹی شہزادی زیب النساء بیگم شیعہ تھی اور اسی طرح اس کی بیگمات بھی، یہاں تک کہ خود اورنگ زیب کے متعلق اس کے آخری وصایا جو بہ عدد متبرکہ ائمہ اثنیٰ عشر ہیں یہ گمان ہوتا ہے کہ خود اس کی موت بھی مذہب حقہ اثنا عشری کے عقیدہ پر واقع ہوئی ہے (عالمگیر کا یہ آخری وصیت نامہ جو خصوصیت سے تجہیز و تکفین کے متعلق ہے مسلم یونیورسٹی کے شعبہ مخطوطات میں کئی مختلف مجموعوں میں جو خود عالمگیر سے متعلق ہیں اور تاریخوں میں موجود ہے اور جس کو خان بہادر نبی احمد حنفی سندیلوی نے اپنی مطبوعہ کتاب "تاریخ عالمگیری" کے صفحہ ۱۲۷ تا ۱۳۰ پر شائع کیا ہے) اس لیے بظاہر اورنگ زیب کے متعلق یہ گمان نہیں کیا جا سکتا کہ وہ سید الشہداء امام حسین علیہ السلام کی عزاداری کا مخالف رہا ہوگا یہ ضرور ہے کہ اس کے حالات کے لکھنے والے مختلف مورخین نے عالمگیر کے اعمال و کردار کے سلسلہ میں ایسے واقعات کو ضرور سپرد قلم کیا ہے جو اس کے ذاتی خیالات و افکار سے ٹکراتے ہیں اس حیثیت سے اس کی شخصیت متضاد کردار کی حامل ٹھہرتی ہے، عزاداری کے سلسلہ میں بھی یہی تضاد کار فرما ہے ایک طرف تو ہم عشرۂ محرم کے سلسلہ میں اس کے متعلق مورخین کے یہ بیانات پڑھتے ہیں کہ اس کو تعزیہ امام علیہ السلام سے بڑی عقیدت تھی چنانچہ ہندو مورخ سیل چند نے اپنی تاریخ آگرہ میں لکھا ہے کہ روز عاشورہ اورنگ زیب نے ایک ضعیفہ کو دیکھا کہ سر پر تعزیہ رکھے قلعے کی طرف جا رہی ہے دیکھنے کے ساتھ ہی بادشاہ پر ایک ایسی کیفیت طاری ہوئی جو کشف و مشاہدہ سے حاصل ہوتی ہے وہ سر و پا برہنہ اس ضعیفہ کے پیچھے دوڑا اور تعزیئے کو اس سے لیکر اپنے سر پر رکھ کر قلعہ میں داخل ہوا اور اس وقت سے

وہ خود عزاداری کرنے لگا (سیل چند کی تاریخ آگرہ ایک معتبر تاریخ ہے اور مولوی معین الدین اکبرآبادی نے اپنی تاریخ آگرہ معین الآثار میں اور خان بہادر محمد عبداللطیف سی، ایس، آئی، ایم، آئی، آر، ایس نے اپنی انگریزی کتاب ہسٹری آف آگرہ میں اسی سے اخذ کیا ہے) اورنگ زیب کے زمانے کے اسباب و لوازم عزاداری ایک عرصے تک قلعہ آگرہ میں محفوظ رہے ہیں جن کی حفاظت برٹش گورنمنٹ کرتی تھی بلکہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے بعد تک قلعہ آگرہ میں عشرہ محرم کے موقع پر مجالس حکومت انگریزی کی طرف سے ہوتی رہی ہیں جو کسی وجہ سے بعد میں بند ہو گئیں لیکن قلعہ سے ایک تعزیہ اب تک نکلتا رہا ہے۔

اس کے علاوہ خود اورنگ زیب کی بیٹی شاہزادی زیب النساء بیگم تعزیہ داری کرتی اور مجلس عزا میں شریک ہوا کرتی تھی۔ (معارف نمبر ۶ جلد ۱۲ ماہ جمادی الاول ۱۳۴۲ھ مطبوعہ اعظم گڑھ) مورخ بختاور خاں خواجہ سرا عالمگیری نے اپنی تاریخ مرأت عالم میں اس کا تذکرہ کیا ہے کہ اورنگ زیب ہر سال بارہ ہزار محرم کے کار خیر میں خرچ کیا کرتا تھا (تاریخ ہندوستان شمس العلماء ذکاء اللہ جلد ہشتم صفحہ ۳۰۴ طبع علی گڑھ) ظاہر ہے کہ یہ اخراجات عزاداری ہی کی مد کے ہوں گے، اس سلسلہ میں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ حیدرآباد دکن میں عبداللہ قطب شاہ کے زمانے سے شاہی عاشور خانے میں ایک نہایت متبرک علم نصب کیا گیا تھا جس کے متعلق یہ بیان کیا جاتا ہے کہ وہ اس فولادی طوق و زنجیر سے بنایا گیا تھا جو امام زین العابدین علیہ السلام کو بحالت اسیری پہنایا گیا تھا۔ اس علم کے مصارف کے لیے قطب شاہی خزانے سے رقم معین تھی اورنگ زیب نے بعد فتح دکن اپنے عہد میں اس رقم کو یہ کہہ کر بند کر دیا تھا کہ جب تک علم سے معجزات کا ظہور نہ ہوگا اُس کے شاہی خزانے سے نذرانہ کی رقم نہ ملے گی چنانچہ حکم شاہی سے دو مرتبہ یہ علم مبارک ہاتھی کی پشت پر نکالے گئے اور ہر ہر مرتبہ یہ کرامت ظاہر ہوئی کہ ہاتھی جیسے طاقتور و قوی الجثہ مرکب کی پشت شق ہو گئی اس کرامت کے ظاہر ہونے پر اورنگ زیب نے یہ حکم صادر کیا کہ اس متبرک علم کو دارالشفاء شاہی جیسی کشادہ و وسیع عمارت میں نصب کیا جائے تاکہ اس متبرک علم کی برکت سے جو بیمار کربلا کا تبرک ہے دارالشفاء شاہی کے مریضوں کو شفائے کلی حاصل ہوا کرے اور روزانہ پھول چڑھانے اور بخور سلگانے کے لیے روغن خزانہ شاہی سے مقرر کر دیئے، اس کے لیے ایک شاہی فرمان بھی صادر کیا، اس واقعہ کے ثبوت میں ۱۱۱۱ھ عہد اورنگ زیب کی ایک قدیمی دستاویز متولیان عاشور خانہ دارالشفاء شاہی کے پاس آج تک موجود ہے، جس کو اس مقام پر نقل کیا جاتا ہے:-

حضرت سید الساجدین امام زین العابدین علیہ الصلوات و السلام

فرمان جہاں مطاع خورشید شعاع منشور لامع النور واجب الاتباع از دیوان ہمایوں بیمنت مقرون عزت و جلالت اقبال دستگاہ فرازندہ رایات شجاعت و مردانگی۔ فرازندہ آیات شہامت و فرزانگی، خانخاناں عالی شان رفیع القدر منیع المکان سلطان السلطان نواب محمد عالمگیر بادشاہ غازی برائے مسند وزی یومیہ عاشور خانہ جات وغیرہ صادر شدہ کہ تا وقتیکہ از ہر علم وغیرہ معجزہ و کرامات ملاحظہ نخواہیم نمود جاری نخواہیم داشت پس آں وقت مرزا حشمت علی بیگ

معہ تبرک علم مبارک بحضوری والا حاضر آمدہ عرض نمودند کہ ایں تبرک مبارک در عہد سلطان عبد اللہ آغا محسن خراسانی ہمراہ خود از شام آوردہ بموجب حکم شاہی علم تیار کنایندہ درابواب چوک ایستادہ می نمودند چنانچہ دو وقت بموجب فرمان والا علم مبارک را بر پشت فیل بیروں آوردہ گرد فیل شق گرد دید یس بمجرد استماع ایں کیفیت معجزات فرمان صادر شد کہ ایں تبرک علم مبارک را در دارالشفا شاہی کہ بجائے وسیع و ماندن تبرک بیمار کر بلا در دارالشفار برائے بیماراں باعث شفائے کلی است استادہ نمایند و سال بسال جاری دارند تا ہموں تبرک علم مبارک را مرزا حشمت علی سپردہ شد و فرمان واجب الاذعان صادر شد کہ روز دو صحن بعد وضع از جملہ خرچ شفاخانہ برائے بخور و گل عاشور خانہ از تاریخ فرمان والا بہ متولی مذکورہ رسانیدہ باشند و نقل فرمان معلیٰ گرفتہ اصل را باز دہند و بر حکم فرمان عالی روند۔ فقط ،

تحریر فی التاریخ چہارم ماہ رجب المرجب سنہ ۱۱۱۱ھ

ان حقائق کے پیش نظر اس عہد کے ایک نووارد یورپین سیاح ، ٹروورنیر (TROVER-NIER) کا یہ بیان کہ " اگرچہ اورنگ زیب کے دربار میں اہل ایران کا مجمع رہتا تھا لیکن ان میں سے کسی کو یہ اجازت نہ تھی کہ وہ اپنے مظلوم امام حسینؑ کی شہادت کی یادگار میں کوئی مجلس کر سکیں "
(TROVERNIER TAVELS Vol. I Page 177)
قابل یقین نہیں ہے ، سیاح مذکور کی یہ تحریر کسی خاص مقصد کی بنا پر معلوم ہوتی ہے ، بیشک بعض دوسرے اسباب کی بنا پر اورنگ زیب نے کچھ پابندیاں عائد کی ہیں جیسے تابوت کے گشت کے موقع پر عوام کا شمشیر بازی کر کے لوگوں کو تکلیف و آزار پہونچانا جس کو اورنگ زیب نے روک دیا تھا ، نواب شاہنواز خاں ، مرآت آفتاب نما " میں لکھتے ہیں :-

" واد باشاں در قدر جمع شدہ خرمن مال و جان خلقے بہ آتشبازی می دادند ، ـــــ و در عاشور نیز تابوتے ساختہ بہ شمشیر بازی مردم را آزار می رسانیدند ، ـــــ ایں ہمہ ابواب را موقوف ساختہ (مرآت آفتاب نما) میرے خیال میں اس ممانعت کے بعد تربت (تعزیوں) کے گشت میں اصل شمشیر بازی کی رسم جس سے لوگ زخمی ہو جاتے تھے موقوف ہو گئی اور عوام میں " پٹا بازی " کی رسم جاری ہو گئی جو آج تک اہلسنت میں رائج ہے ۔

اسی طرح مورخ خافی خان نے منتخب اللباب (جلد دوم صفحہ ۲۱۳ و ۲۱۴ طبع کلکتہ) میں بعض حالات سال دوازدہم جلوس عالمگیریہ واقعہ لکھا ہے کہ شب عاشور برہان پور میں تابوت کے گشت کے موقع پر دو ایسے گروہوں میں جو آپس میں عرصے سے انتہائی عداوت و دشمنی رکھتے تھے بڑا زبردست فساد ہو گیا جس کے نتیجہ میں پچاس آدمی مارے گئے اور سو اشخاص سخت زخمی ہوئے اور مال و متاع لوٹا گیا اور تابوت کی بے حرمتی کی گئی ، جب اس خوں ریزی و فساد کی رپورٹ اورنگ زیب کو پہونچی تو اس نے تابوت بنانے اور اور اس کے گشت پر پابندی کے احکام صادر کر دیے ظاہر ہے کہ یہ حکم رفع فساد و امن عامہ کو قائم و برقرار رکھنے کے لیے صادر کیا گیا کسی مذہبی جذبے اور عقیدے کے ماتحت نہیں روکا گیا ۔

اورنگ زیب کے بعد ابو نصر قطب الدین

محمد معظم بہادر شاہ اول تخت نشین ہوا محمد ساقی مستعد خاں مقرب خاص بادشاہ عالمگیر نے جس کے متعلق مآثر عالمگیری میں لکھا ہے کہ وہ زبردست عالم، ادیب کامل، قدوۃ المحدثین اور قرآن و حدیث سے شرعی مسائل کا استنباط کرتا تھا اور جو قاری قرآن، عابد شب زندہ دار اور ہمہ اوقات تفسیر و حدیث و فقہ و سلوک کی کتابوں کا مطالعہ کیا کرتا تھا، اور جو مستعد خاں کے متذکرہ اوصاف کے ساتھ متصلب شیعہ بھی تھا اُس کے عہد میں عزاداری کو اتنا فروغ ہوا کہ مسلمانوں کے دوش بدوش اہل ہنود بھی عزائے امام میں مصروف رہتے تھے جس کا تذکرہ خافی خاں نے منتخب اللباب میں بغض عارت گری یا پ رائے کیا ہے (منتخب اللباب جلد ۲ صفحہ ۶۳۳ طبع بنگال ۱۸۷۴ء) اس حق پرست و عالم بادشاہ نے ایک تعزیہ بھی بنوایا تھا جس کا عکس خواجہ حسین نظامی بن خواجہ حسن نظامی سجادہ نشین درگاہ نظام الدین اولیا نے اپنے ہفتہ وار اخبار منادی مورخہ ۲ محرم ۱۳۵۹ھ مطابق ۱۶ فروری ۱۹۴۰ء یوم جمعہ کے سرورق پر ایک قدیمی تعزیہ کے زیر عنوان شائع کیا تھا، تعزیہ کے بلاک کے نیچے یہ عبارت ہے:-

"یہ تعزیہ اورنگ زیب کے جانشین شہنشاہ بہادر شاہ کا بنوایا ہوا ہے جو درگاہ خواجہ نظام الدین اولیاء کے امام باڑہ میں اُسی وقت سے رکھا جاتا ہے اور غالباً دہلی کے سب تعزیوں سے زیادہ قدیمی اور تاریخی ہے۔"

صرف سلاطین مغلیہ ہی نہیں عزاداری سے دلچسپی لیتے تھے بلکہ امرائے سلطنت بھی عزاداری میں مصروف رہا کرتے تھے، اس مقام پر ایک واقعہ قابل ذکر ہے جو نعمت اللہ خاں سے متعلق ہے اور سیر المتاخرین میں درج ہے، میں اصل فارسی عبارت کے بجائے اُردو ترجمہ درج کرتا ہوں اصل فارسی عبارت کتاب میں ملاحظہ کی جا سکتی ہے" میر جملہ جب صوبہ عظیم آباد کے گورنر بنائے گئے تو امرائے دولت اُن کو رخصت کرنے کے لیے نعمت اللہ خاں پسر روح اللہ خاں عشرہ محرم کی وجہ سے تعزیہ داری امام مظلوم حضرت سید الشہداء میں مشغول رہے اور نہ جا سکے بعد عشرہ یہ بھی میر جملہ کو رخصت کرنے کے لیے گئے اتفاق سے اس وقت محمد امین خاں موجود تھے میر جملہ کے پہلو میں نعمت اللہ خاں بیٹھ گئے انھوں نے دیر میں آنے پر معذرت کرتے ہوئے کہا کہ معاف فرمائیے گا ماتم داری کی وجہ سے اب تک نہ آسکا یہ سُن کر محمد امین خاں نے طنزاً پوچھا کہ کیا جناب کے یہاں کسی کی موت ہو گئی ہے نعمت اللہ خاں نے کہا حضرت سید الشہداء کا ماتم تھا یہ سُن کر محمد امین خاں نے کہا بھلا حضرت یہ تو فرمائیے ہم کو اس سے کیا غرض یزید و حسین دو صاحبزادے تھے ہم کو آخر کیا ضرورت ہے کہ ایک کا ماتم کریں اور دوسرے کو بُرا کہیں اور پھر اُس کے اُٹھ جانے پر غم نہ کریں، نعمت اللہ خاں نے کہا ہاں ٹھیک ہے ہمارا شہزادہ شہید ہوا اس لیے ہم اُس کا غم کرتے ہیں اور آپ کے صاحبزادے نے فتح حاصل کی ہے آپ خوشی کیجئے آخرکار اس گفتگو نے اس قدر طول پکڑا کہ قریب تھا کہ خانہ جنگی ہو جائے لیکن میر جملہ نے درمیان میں پڑ کر رفع دفع کر دیا۔" (سیر المتاخرین جلد دوم صفحہ ۴۵۱ طبع نولکشور)

اس محل پر یہ واضح کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ نعمت اللہ خاں کا جملہ "ہمارا شہزادہ شہید ہوا اس لیے ہم اُس کا غم کرتے ہیں اور آپ کے صاحبزادے نے

فتح حاصل کی ہے آپ خوشی کیجئے۔" بہت ہی لطیف و معنی خیز اور حقیقت پر مبنی ہے، وضاحت کے لیے موضوع کلام سے ہٹ کر چند واقعات کا پیش کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے، سانحۂ کربلا کے بعد آل محمدؐ و دوستداران اہلبیت غم و الم مناتے رہے اور آل مروان و یزید اور ان کے ماننے والے مسرت و شادمانی کے مظاہرے کرتے رہے ہیں، قتل حسینؑ کی وجہ سے یہ لوگ عاشور محرم کو عید مناتے، اس دن لباس نو پہنتے اور لذیذ کھانے پکواتے ہیں، سر میں تیل اور آنکھوں میں سرمہ لگاتے ہیں صرف یہی نہیں فرط مسرت و شادمانی میں عجیب و غریب ڈھونگ رچاتے رہے ہیں، علامہ ابوالفتح محمد بن علی بن عثمان الکراجکی اپنی تالیف "کتاب التعجب" میں اندلس کے مشہور شہر قرطبہ کے مسلمانوں کے متعلق لکھتے ہیں:—

" انھم یاخذون فی لیلۃ العاشوراء راس بقرۃ میتۃ و یجعلونہ علی عصاء و یحمل و یطاف بہ الشوارع والاسواق وقد اجتمع حولہ الصبیان یصفقون ویلعبون و یقفون بہ علی ابواب البیوت و یقولون یا ستی المروسہ اطعمینا المطنفہ یعنون القطائف وانما تعد لھم دیکرمون و یتبرکون بما یفعلون ۔"

(کتاب التعجب بر حاشیہ کنز الفوائد علامہ کراجکی، وذخیرۃ الدارین مولفہ عبدالمجید صفحہ ۴۲ طبع عراق)

قرطبہ کے مسلمان شب عاشور ایک مردار گائے کے سر کو کاٹ کر نیزہ پر بلند کرتے ہیں اور جلوس کے ساتھ اس کو بازاروں اور سڑکوں پر پھراتے ہیں اس کے گرد لڑکوں کا ایک مجمع ہوتا ہے جو اچھلتے، کودتے ہوئے تالیاں بجاتے رہتے ہیں اور ہر مکان کے دروازے پر رُکتے اور چلا چلا کر ایک مخصوص پکوان (قطیفہ) طلب کرتے ہیں جو خاص کر اسی لیے پکا کر رکھا جاتا ہے۔"

یہ تو اسپین کے مسلمانوں کا طریقۂ اظہار مسرت و شادمانی تھا، افغانستان میں اب تک کیا ہوتا ہے اس کے متعلق علامہ جمال الدین افغانی کی "تتمۃ البیان فی تاریخ الافغان" ملاحظہ ہو، جمال الدین افغانی کی اس عربی تاریخ کا ترجمہ افغانی ادیب محمد امین خوگیانی کابلی مدیر جریدۂ ملی "انیس کابل" نے کیا ہے، عبارت ترجمہ ملاحظہ ہو:—

" دراہالی خوست و کرم بعض عادات خوارجیہ دیدہ می شوند وایشان مجسمہ را تیار کردہ در غرۂ زیر زمین دفن می نمایند و در روز عاشورہ از زمین کشیدہ با ہلہلۂ شادمانی گردن مجسمہ را می کشانند۔"

(ترجمہ تتمۃ البیان صفحہ ۱۶۴ طبع کابل)

خوست و کرم کے مسلمانوں میں بعض عادتیں خارجیوں کی پائی جاتی ہیں یہ لوگ چاند رات محرم میں ایک مجسمہ بنا کر زمین میں دفن کر دیتے ہیں اور عاشورہ کے دن اس مجسمہ کو زمین سے نکال کر انتہائی خوشی و مسرت کے ساتھ شور مچاتے ہوئے اس کی گردن کو کاٹتے ہیں۔

خود ہمارے اس ہندوستان میں بھی اموی نواز مسلمان ہمیشہ موجود رہے ہیں اور آج بھی ہیں ان میں بھی عاشور کے دن عید منانا اور مسرت و شادمانی کے طور طریقے رائج تھے جس کے خلاف ملک العلماء قاضی شہاب الدین دولت آبادی نے ہدایت السعداء میں آواز بلند کی ہے صرف یہی نہیں بلکہ جہانگیر کے زمانہ میں ہندوستان میں ایسے مسلمانوں کی کمی نہ تھی جو محرم کا چاند دیکھ کر بڑی خوشی مناتے تھے

اور آپس میں ایک دوسرے کو مبارکباد دیتے تھے۔ (ملاحظہ ہو بہارستان غیبی مولفہ علاء الدین غیبی المعروف مرزا ناتھن مخاطب بہ شتاب خان معاصر جہانگیر بحوالہ A SOCIAL HISTORY OF ISLAMIC INDIA, Page 56.) " نعمت اللہ خاں "سلاطین اہلسنت کے دور حکومت میں اس طرح علانیہ عزاداری کرتے تھے اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مخالف حکومت میں ایک شیعی امیر جب اس طرح سوگواری کرتا تھا تو شیعہ سلاطین کے دور میں عزاداری کس سوگوارانہ طریقہ پر ہوتی ہوگی، نظام الدین احمد شیرازی مصنف تاریخ حدیقۃ السلاطین بعہد عبداللہ قطب شاہ (۱۰۲۵ تا ۱۰۸۳) جو دکن میں موجود تھا اس نے یہاں کی عزاداری کا آنکھوں دیکھا حال لکھا ہے جو بہت دلچسپ اور پڑھنے کے قابل ہے اس کا بیان ہے کہ "عشرۂ محرم میں بادشاہ تخت سلطنت پر جلوس نہیں کرتا، تاج شاہی سر پر نہیں رکھتا، لباس شہریاری کے بجائے جامۂ سوگواری پہن لیتا ہے، نشاط و انبساط کی بساط الٹ دیتا ہے اور عیش و عشرت کے دروازے بند کر دیتا ہے، تمام ممالک محروسہ میں حکم شاہی صادر ہوجاتا ہے کہ نقار خانے خاموش، گانا بجانا موقوف، گوشت ممنوع، پان متروک، حماموں اور حمامیوں کا کاروبار معطل، شراب، تاڑی، سیندھی، بھنگ وغیرہ کی دکانیں بند، مختصر یہ کہ تمام جائز تکلفات اور مباح لذات بھی ممنوع ہو جاتے ہیں، تمام ممالک محروسہ کا کوئی مقام اور کسی طبقے اور کسی مذہب کا کوئی آدمی ان احکام سے مستثنیٰ نہیں ہوتا، شاہی جامدار خانے سے کالے اور نیلے رنگ کے کئی ہزار جوڑے کپڑے اور سبز و سیاہ عصا، امیروں، وزیروں، درباریوں، ملازموں،

ذاکروں اور مداحوں کو تقسیم کئے جاتے، دونوں شاہی امام باڑوں و نیز شہر کے دوسرے عاشورخانوں و عزاخانوں میں مجلسیں ہوتیں اور بڑی شان و شوکت و تزک و احتشام کے ساتھ دسویں دن روز انہ علم اٹھائے جاتے جس میں خود بنفس نفیس بادشاہ، وزراء اور امراء، دولت سبھی شریک ہوتے " (حدیقۃ السلاطین) بالکل اسی طریقہ سے اودھ، میسور، سندھ، بنگال کی شیعہ حکومتیں تھیں جہاں کے امراء، نوابین، بادشاہ و سلاطین مصروف عزا رہا کرتے تھے اس سلسلہ میں پنجاب کی نوزائیدہ شیعہ حکومت کو جو جلد ختم بھی ہوگئی فراموش نہیں کیا جا سکتا اس حکومت کے بانی نواب حیات اللہ خاں المخاطب نواب شاہنواز خاں ہیں جنھوں نے لاہور میں ایک مستقل شیعی حکومت کی بنیاد رکھی تھی جس کا خاتمہ احمد شاہ درانی نے اپنے حملوں سے کر دیا! انھیں شاہ نواز خاں نے اپنے بزرگوں کا مذہب ترک کر دیا تھا اور مذہب شیعہ قبول کر لیا تھا یہ اپنے نئے مذہب میں کافی راسخ العقیدہ تھے تعزیت امام مظلوم میں انھوں نے بہت جوش سے کام لیا تھا، انھوں نے اپنی شاہی مہر میں ائمہ اثنا عشر علیہم السلام کے اسمائے متبرکہ کندہ کرائے تھے، (تاریخ بیان واقع قلمی تصنیف حاجی عبدالکریم ولد خواجہ عاقبت محمود معاصر محمد شاہ) یہ زمانہ سلاطین مغلیہ کا آخری دور تھا اگرچہ اس دور کے سلاطین مغلیہ کی حکومت مضمحل ہوچکی تھی لیکن یہ سلاطین تعزیہ داری دو دیگر رسوم عزا سے بڑی دلچسپی رکھتے تھے: اس دور کے حالات تعزیہ داری و رسوم سوگواری اور دہلی کے امام باڑوں و تعزیہ خانوں سے آگاہ ہونے کے لیے خان دوران، موتمن الدولہ نواب ذوالقدر درگاہ قلی خاں سالار جنگ معاصر محمد شاہ

بادشاہ دہلی کی کتاب " مرقع دہلی " اور " بزم آخر " مصنفہ منشی محمد فیض الدین مصاحب شاہ دہلی ابو ظفر بہادر شاہ ثانی ملاحظہ ہوں۔

اسی طرح حیدر آباد دکن کی سنّی فرمانروایان سلطنت نظام بھی نہ صرف تعزیہ داری سے دلچسپی لیتے رہے بلکہ نوحہ و سلام و مرثیہ کہنا اپنے لیے باعث سعادت و نجات آخرت سمجھتے تھے، سنّی روہیلہ حکومت کے بانی حافظ الملک نواب رحمت خاں بڑے محب اہلبیتؑ تھے ان کی عزاداری و سوگواری کے حالات کو " گلستان رحمت " مصنفہ نواب محمد مستجاب خاں میں پڑھا جا سکتا ہے حافظ الملک ہی کی وجہ سے روہیلوں میں تعزیہ داری کا رواج ہوا۔

نوابین اودھ میں وزیر الممالک نواب شجاع الدولہ کی حالت یہ تھی کہ جنگ و سفر کی حالت میں بھی وہ اپنے ہمراہ چاندی کا تعزیہ اور دیگر لوازمات عزا اپنے ہمراہ رکھتے اور امام باڑہ کے لیے ایک بہت بڑا خیمہ (سیاہ رنگ) بھی رہا کرتا تھا چنانچہ ایک مرتبہ اسی سفر کی حالت میں تھے کہ ہلال محرم ہو گیا اور قصبہ جلالی میں مشغول عزا ہو گئے، منور علی خاں اپنی کتاب لوح تاریخ میں لکھتے ہیں " کول کی راہ میں ایک قصبہ جلالی ہے کہ سیّد اس میں رہتے ہیں وہاں محرم کا چاند دکھائی دیا تب شجاع الدولہ نے وہیں سفر [illegible] تعزیہ داری [illegible] نہ آیا کہ [illegible] زرد کپڑے [illegible] تعزیہ [illegible] گیا اور چاندی کے تعزیے رکھے گئے کہ زرد امیروں کے ہمراہ سفر میں ہوتے ہیں چنانچہ نواب مظفر جنگ (بنگش فرخ آباد والے) اسی مقام پر شیعہ ہوئے (لوح تاریخ قلمی ورق ۱۲۰ تصنیف ۱۲۵۵ھ نمبر ۱۱۵۳ عبد السلام کلکشن یونیورسٹی لائبریری) چونکہ تعزیہ داری کی اشاعت کی طرف نواب شجاع الدولہ کو بڑی رغبت تھی اس لیے چند مواضعات بطور نذر امامؑ قصبہ جلالی کے قدیمی امام باڑے میر خیرات علی کے نام وقف کر دیئے تاکہ اس آمدنی سے تعزیہ داری برابر ہوتی رہے۔

شجاع الدولہ کے بعد نواب آصف الدولہ کو تعزیہ داری کرنے میں خاص شہرت حاصل ہوئی، لکھنؤ میں عظیم الشان و بے نظیر امام باڑہ کو تعمیر کرا کے جملہ ساز و سامان سے اس کو آراستہ و پیراستہ کیا اور اس پر کروڑوں روپئے خرچ کئے ہندوؤں اور مسلمانوں کو جاگیریں و تعلقے عزاداری امام مظلومؑ کے لیے بطور معافی عطا کئے جو آج تک لوگوں کے پاس موجود ہیں اور عزاداری ہوتی ہے، اس عہد سے اودھ کے چپہ چپہ میں عزاداری کا عام رواج ہوا، شیعہ، سنّی، ہندو ہر ایک امامؑ کا عزادار ہوا، آصف الدولہ کے بعد دیگر نوابین و شاہان اودھ برابر عزاداری کو ترقی دیتے رہے، نوحہ و مرثیہ پڑھنے کا دستور عام ہوا، ذاکروں و حدیث خوانوں کی تعداد بڑھی، ہر نواب و بادشاہ نے بڑے بڑے امام باڑے و شاہ نشین بنوائے، ضریحیں، شبیہیں، روضے اور کربلائیں تعمیر کرائیں گھر گھر مجلسیں ہونے لگیں،

جلوس عزا نکلنے لگے، یہاں تک کہ مسلمانوں کے علاوہ کثرت کے ساتھ ہندو عزاداری و مجالس کرنے لگے اور انھوں نے امام باڑے تعمیر کرائے پہلے صرف چالیس دن تک تعزیہ داری ہوتی تھی لیکن نصیر الدین حیدر بادشاہ اودھ نے ۸ ربیع الاول تک عزاداری کو رواج دیا، اس سلسلہ میں لکھنؤ کو خاص بات یہ حاصل تھی کہ شاہان اودھ و نوابین لکھنؤ کی روحانی و دینی قیادت و سرپرستی مجتہدین و علماء برابر کرتے رہے، حضرت غفرانمآب رحمۃ اللہ علیہ، سلطان العلماءؒ، سید العلماءؒ، ممتاز العلماء وغیرہم کی رہبری خواص و عوام کو حاصل رہی۔

علمائے لکھنؤ نے اشاعت عزا کے لیے اثارۃ الاحزان، مجالس مفجعہ و دیگر کتب مصائب تالیف کیے اور حسینیۂ غفران مآب و حسینیۂ رضوان مآب جیسے امام باڑے تعمیر کرائے جس کے نتیجے میں لکھنؤ کے محلے محلے اور گھر گھر امام باڑے و عزاخانے بن گئے اور مجموعی حیثیت سے شہر لکھنؤ کا تصور بحیثیت ایک عظیم عزاخانۂ امام حسینؑ کے کیا جانے لگا یہی وہ شہر حزن و غم ہے جہاں سے آداب و رسوم عزاداری کے آئین و ضوابط کو ہندوستان و پاکستان کے گوشہ گوشہ پہونچایا گیا جس کی وجہ سے لوگوں کو یہ وہم ہوا کہ عزاداری کا رواج لکھنؤ کے نوابوں کے زمانہ سے ہوا حالانکہ واقعہ کربلا کے بعد ہی سے اس کا رواج ہر دیار و امصار میں ہونے لگا اور ہر ملک و قوم کے لباس رسم و رواج کو اس نے پہن لیا اور ہر آنے والے زمانے کے ساتھ وہ اپنے انداز کو بدلتی رہی، عزاداری امام حسینؑ میں یہ بڑی صلاحیت ہے کہ وہ ہر ملک و قوم کے عادات و رسوم کو قبول کرکے ان پر اثرانداز ہوئی ہے اُس نے عزاداروں میں حق شناسی و حق کوشی کا جذبہ پیدا کیا ہے، عزاداری حریت و آزادی کی تعلیم دیتی ہے صبر و استقلال، صداقت و شرافت، عزم و استقامت، شہامت و شجاعت رحمت و رافت کا سبق پڑھاتی ہے اور انسان کے دل سے ظلمت و قسوت کو دور کرتی ہے، عزاداری رقت قلب و گریہ کا سبب بن کر رونے والوں کو نیک خصلت و پاک طینت بناتی ہے، گریہ و ماتم "دعوت عمل" ہے یہی ہمارے قوت عمل کو توانائی بخشتا رہا ہے، تاریخ کے صفحات کو الٹ کر دیکھا جائے یہ آنسو بہانے والی اور سینہ کوبی کرنے والی قوم جرأت و استقلال کے کتنے مظاہرے پیش کر چکی ہے یہ عزادار قوم ہی تھی جس نے ظالموں کو رسوا کیا جس نے آل ابوسفیان و آل مروان کے ظالم و جابر فرماں رواؤں کی بساط حکومت کو پارہ پارہ کر دیا اور جس نے جابرہ بنی عباس کی عمارت حکومت کو ایک معمولی سی ٹھوکر میں مسمار کر دیا، یہ رونے والی اور نوحہ و مرثیہ پڑھنے والی قوم ایک ایسے عزم و قوت کی مالک ہے کہ اس سے کام لے کر جب جس کو چاہتی ہے تاج و تخت کا مالک بناتی ہے اور جس کو چاہتی ہے تخت و تاج اس سے لیکر دوسروں کو دے دیتی ہے، دمشق، بغداد، مصر و ایران اور ہندوستان کی تاریخیں ہمارے عزائم کا پتہ دیتی ہیں۔

ہم نے دنیا میں امن و امان بانی رشتہ

کے لیے جان کی بازی لگادی اور اپنا خون بہایا لیکن دوسروں کے خون کو گرنے نہیں دیا، میدان جنگ میں ہم حسینؑ پر روتے بھی جاتے تھے اور اپنی تلوار کے جوہر بھی دکھلاتے تھے، ہم کو تو افراط گریہ کی تمنا رہی جتنا بھی روئے اس کو بہت کم سمجھے، رونا ہی تو ہماری توانائی اور اصل حیات زندگی ہے اس لیے گریہ ہمارا قومی شعار ہے، عزاداری امام حسینؑ میں اپنے غم و اندوہ کے ساتھ ہم نے جس نظم و ضبط کا مظاہرہ کیا ہے اُس نے یورپ کے ہوشمند مفکرین کو چونکا دیا ہے، چنانچہ مسٹر آرتھر گلمین "A. GILMAN" مشہور یورپین مورخ نے عباسی سطوت و جبروت کے خاتمے اور بغداد کی شان و شوکت کی بربادی پر یہ کہا ہے کہ:-

"But Islam did not die"

اس کے ثبوت میں کہ اسلام کو موت نہیں آئی بلکہ زندہ ہے وہ کہتا ہے:-

"اٹھارہ کروڑ انسان اب تک رسول کی تعلیمات پر کاربند ہیں، دن میں پانچ مرتبہ وہ اپنی چٹائیاں (جانماز) بچھاتے ہیں اور اپنا چہرہ اُس سمت کی طرف موڑ دیتے ہیں جسے رسول کی پیدائش نے ان کے لیے مقدس بنا دیا ہے اور ان کی بتلائی ہوئی نماز پڑھتے ہیں، روزانہ موذن کی آواز ہزاروں میناروں سے بلند ہوتی ہے اور اہل ایمان کی توجہ کو جسارت کے ساتھ اس دنیا کے خیالات سے آخرت کی طرف منعطف کر دیتی ہے اور سالانہ محرّم کی آمد پر لکھوکھا ماننے والے شہیدِ کربلا کے مصائب پر اظہار حزن و ملال کرتے رہتے ہیں اور ایسے جوش و انہماک کا مظاہرہ کرتے ہیں کہ اُن حکمرانوں کا اقتدار اُن کے سامنے لرزہ براندام رہتا ہے۔"

The Saracens by
Arthur Gilman,
Page 441, 442

کیا خوب کہا ہے شاعرِ مشرق ڈاکٹر اقبال نے ؎

شوکت شام و فر بغداد رفت
سطوت غرناطہ از ہم یاد رفت
تار ما از زخمہ اش لرزاں ہنوز
تازہ از تکبیر او ایماں ہنوز
اے صبا اے پیک دور افتادگاں
اشکِ ما بر خاکِ پاک او فشاں

(رموزِ بیخودی)

"تاریخ عزاداری جونپور"

۴۳۴ھ لغایت ۱۳۸۹ھ

(جناب زین العباد مرزا صاحب، عباس مرزا روڈ جہانگیر آباد شہر جونپور)

آغاز عزاداری

واقعۂ کربلا کے ۳۰۰ سال اور ولادت جناب امام عصر علیہ السلام کے ۱۰۰ سال بعد بلاد ہند میں جس مقام پر عزاداری شہدائے کربلا کا آغاز ہو چکا تھا وہ سرزمین شیراز ہند جونپور کی ہے۔

جونپور میں عزاداری امام مظلوم کی تاریخ تقریباً ایک ہزار سال سے کچھ زائد کی حامل ہے۔ آج سے ۹۵۵ سال قبل یعنی ۴۳۴ھ کا تذکرہ مستند مقامی کاغذات و تواریخ سے پیش کیا جا سکتا ہے۔ شرقی مانو منٹ آف جونپور از فصیح الدین اور فیصلہ مقدمہ مسجد سید سالار واقع ظفرآباد جونپور مورخہ ۱۵ رجب ثانی ۴۳۴ھ مسٹر ار۔ بیجے۔ ٹائلرسن جج عدالت دیوانی جونپور سے ظاہر ہوتا ہے کہ ۴۳۴ھ میں سید سالار مسعود غازی ملتان اور دہلی کی راہ سے آکر موجودہ شہر جونپور سے تین میل کے فاصلے پر دریائے گومتی کے جنوبی ساحل پر بمقام منیچ جس جگہ کو اب ظفرآباد کہتے ہیں مقیم ہوئے اور اپنے معمول کے مطابق تبلیغ و توسیع دین میں کوشاں رہے اور ایک عالیشان مسجد کی بنا ڈالی جو آج تک موجود اور آباد ہے۔ سید سالار سیرت رسولؐ و آل رسولؐ اور فضائل و مصائب و قربانی شہدائے کربلا کو تبلیغ دین کا ذریعہ بنائے ہوئے تھے۔ جب تعمیر مسجد مکمل ہو چکی یہی جگہ تبلیغ کا مرکز قرار پائی،

اسی وقت سے ہلال محرم نمودار ہوتے ہی اس مسجد میں ایک شبیہ علم مبارک نصب کر دیا جاتا اور لوگ اعتکاف میں رہتے اور ایام عزا میں سوگوارانہ زندگی بسر کرتے۔ ہر شب بعد ذکر مصائب شہدائے کربلا شیرینی پر فاتحہ ہوتا اور حاضرین میں تقسیم کر دی جاتی۔ یہ عزاداری کی مستقل صورت کا آغاز تھا مگر اسے بھی بہت قبل سے صوفیائے کرام نے سرزمین جونپور پر ایام عزا میں سوگوارانہ زندگی بسر کرنے کا رواج قائم کر رکھا تھا اور نذر و فاتحہ کا سلسلہ رائج تھا۔

تغلق دور میں جونپور کی عزاداری ۷۲۱ھ سے ۷۹۶ھ

۷۲۱ھ میں منیچ کا حکمراں راجہ سنگیت سنگھ ہوا۔

اس راجہ نے تبلیغ اسلام اور منیچ میں مسلمانوں کے کسی اجتماع کو پسند نہ کیا اور مسلمانوں پر ہر طرح کے مظالم کو روا رکھا۔ یہاں تک کہ مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ ہو گیا۔ انہی ایام میں حضرت مخدوم آفتاب ہند سہروردی اور حضرت مخدوم صدر الدین چراغ ہند کا گذر ان اطراف میں ہوا چونکہ ان حضرات کا شمار اولیائے کاملین میں تھا مسلمانوں نے ان کو اپنے حالات سے آگاہ کیا چنانچہ ان اولیاء اللہ نے منیچ پہونچ کر حالات کا مشاہدہ کیا خود وہیں مقیم ہو گئے اور بادشاہ دہلی سلطان غیاث الدین تغلق

کو مقامی حالات سے مطلع کیا۔ بادشاہ نے اپنے بیٹے ظفر خاں کو بہ تعجیل تمام روانہ کیا جس نے پہنچ کر یہاں تسلط حاصل کیا اس کے بعد پہنچ کا نام ظفرآباد رکھا گیا جو آج تک مشہور و قائم ہے اب ان صوفیائے کرام نے ظفرآباد میں مستقل سکونت اختیار کرلی اور اپنی اپنی خانقاہوں میں عزاداری فرزند رسولؐ قائم کی ان کے تعمیر کردہ عزاخانے اور امام چوک اب تک موجود و آباد ہیں۔ آج بھی ظفرآباد میں شیعہ سنی سب ہی تعزیہ داری کرتے ہیں۔ زیادہ بہت سے قدیم امام چوک موجود ہیں جن پر محرم میں تعزیہ رکھے جاتے ہیں۔ ان میں مخصوص عزاخانہ اور امام چوک حضرت مخدوم آفتاب ہند اور حضرت مخدوم چراغ ہند، حضرت ملا محمد قیام الدین بہراری حضرت مخدوم بندگی شیخ ملا الحق ناصحی کے ہیں جن پر زمانۂ محرم میں عزاداریوں کا سلسلہ قائم ہے۔

فیروز شاہ تغلق کا موجودہ شہر جونپور آباد کرنا

جب فیروز شاہ تغلق نے سنہ ۷۶۲ھ مطابق سنہ ۱۳۶۰ء میں موجودہ شہر جونپور کی بنیاد ڈالی تو اس نو تعمیر شہر کی آبادی کے ساتھ ہی یہاں بھی عزاداری کا آغاز ہوا کیونکہ جن لوگوں نے یہاں سکونت اختیار کی ان میں شیعہ سنی سب ہی تھے اور عوام پر صوفیائے کرام اور علمائے کا خاص اثر تھا اور یہ لوگ ایام محرم میں سوگوارانہ زندگی بسر کرتے اور عزاداری کے ذریعہ دین کی تبلیغ کرتے ان کی وجہ سے سنی مسلمانوں کو بھی عزاداری سے دلچسپی تھی۔

فتوحات شرقی از میر محمد قاسم و بیاض مولانا نصیر اور تاریخ عزاداری جونپور از مولوی خیرالدین صاحب سے ظاہر ہوتا ہے کہ نیا شہر جونپور آباد ہونے کے بعد پہلا عزاخانہ جو اس شہر میں تعمیر ہوا وہ سنہ ۷۷۲ھ میں حضرت مولانا مخدوم سید عیسےٰ نے تعمیر کیا تھا چتری گھاٹ کا سا جرہ خاں قائم اور آباد ہے۔ دوسرا عزاخانہ جو اس شہر میں تغلق عہد میں تعمیر ہوا تھا وہ عزاخانہ فاطمہ بی بی عرف بھوا بیگم کا ہے یہ عزاخانہ آج بھی قائم اور آباد ہے۔ ان دو مخصوص عزاخانوں کے علاوہ متعدد عزاخانے تغلق دور میں اور بھی تعمیر ہوئے تھے جنکو سکندر لودی نے مسمار کرا دیا تھا۔ اب صرف ان عزاخانوں کے امام چوک باقی بچے ہیں اور مومنین شہر کی توجہ سے ان پر شب عاشور ہمیشہ سے تعزیے رکھے جاتے ہیں۔

شرقی دور کی عزاداریاں ۷۹۶ھ سے ۸۹۳ھ تک

جس وقت سنہ ۷۹۶ھ مطابق سنہ ۱۳۹۳ء میں ملک الشرق خواجہ جہان نے جونپور کو پایہ تخت قرار دے کر خود مختار سلطنت قائم کی اس وقت تک عزاداری فرزند رسولؐ اس سرزمین پر تقریباً ۳۰۰ سال کی تاریخ کی حامل ہو چکی تھی۔ خواجہ جہان مذہباً شیعہ ہونے کے سبب خمس برابر ادا کرتا اور تمام رسوم عزاداری اس کے محل میں بجالائے جاتے تھے خود کوئی عزاخانہ نہ بنوا سکا کیونکہ نئی حکومت ہونے کی وجہ سے اس کی زیادہ تر توجہ استحکام سلطنت کے کاموں میں رہی۔ پھر بھی شہر کے عزاخانوں میں برابر شرکت کرتا اور عوام میں جذبہ عزاداری کو ہر ممکن انداز سے فروغ دیتا۔ اس کی مدت حکومت صرف چھ سال تھی۔

عہد سید مبارک شاہ شرقی

ملک الشرق خواجہ جہان کے بعد سنہ ۸۰۲ھ مطابق سنہ ۱۳۹۹ء میں سید مبارک شاہ شرقی سلطنت شرقیہ کے تخت حکومت پر متمکن ہوا۔ اگرچہ اس کی حیات نے وفا نہ کی اور اس کی مدت حکومت صرف دو سال رہی پھر بھی اس نے اپنے عہد میں خواجہ جہان کی رسم عزاداری اور فریضہ خمس کو حسب دستور قائم رکھا اور مقامی عزاخانوں اور عزاداریوں کو فروغ پہونچایا اور اس سلسلہ میں عوام کی حوصلہ افزائی کی۔

عہد ابراہیم شاہ شرقی

سنہ ۸۰۴ھ میں سید مبارک شاہ کے فوت ہو جانے کے بعد اس کا چھوٹا بھائی سید ابراہیم شاہ شرقی تخت و تاج کا وارث قرار پایا۔ اس کی مدت حکومت چالیس سال ہوئی اس نے اپنے دور حکومت کا آغاز خانہ خدا کی تعمیر سے کیا۔ مسجد اٹالہ جونپور جس کی بنیاد فیروز شاہ تغلق نے رکھی تھی تعمیر کرایا

جس کی طرز تعمیر میں روایتی اسلامی طرز سے کافی انحراف پایا جاتا ہے کیونکہ مسجد اور عزاخانہ دونوں مخلوط طور پر تعمیر ہوئے تھے۔ کار تعمیر مکمل ہو جانے کے بعد ابراہیم شاہ نے مخدوم سید جہانگیر اشرف سمنانی کو جو اولیائے کاملین میں سے تھے مدعو کیا۔ آپ آخر ماہ ذی الحجہ میں جونپور پہونچے اور اٹالہ مسجد میں مقیم ہوئے۔ جب محرم کا چاند نمودار ہوا تو مسجد اٹالہ کے وسیع صحن میں ایک شبیہ علم مبارک نصب کیا اور معتکف ہو کر سوگوارانہ زندگی بسر کرنے لگے اس دور کی عزاداری کے رواج کے مطابق بر حسب واقعات کربلا کے تذکرہ کے بعد شیرینی پر فاتحہ ہوتا اور وہی تقسیم کی جاتی۔ اسی وقت سے ہر سال زمانہ محرم میں اٹالہ مسجد کے اندر عزاداری ہوتی رہی اور صدیوں قائم رہی یہاں تک کہ جونپور میں فرقہ ناصبی کا زور ہوا۔ اس وقت مسجد اٹالہ، بڑی مسجد اور دیگر جگہوں پر جہاں مستقم عزاداری برادران اہلسنت کے سلسلہ عزاداری بند ہو گیا۔

عزاخانہ خانقاہ نوحہ گران

ابراہیم شاہ شرقی نے ایک وسیع رقبے چبوترے پر جہاں ملک الشرق خواجہ جہان اور سید مبارک شاہ شرقی کی قبریں تھیں ایک عظیم الشان عزاخانہ تعمیر کیا جو خانقاہ نوحہ گران کے نام سے موسوم ہوا۔ جہاں مجالس عزا اور تعزیہ داری شاہی اہتمام سے ہوتی تھی سکندر لودی نے اس عزاخانہ کو مسمار کر دیا تھا جو دالان باقی رہ گیا تھا اس کے شمال جانب شہ نشین میں علم مبارک اور تربت آج تک رکھی جاتی ہے اور محرم میں عشرہ مجالس بھی مسلسل ہوتا آرہا ہے۔ عزاخانہ خانقاہ نوحہ گران میں تمام شاہان شرقی وصیت کے مطابق دفن کئے گئے ہیں اسی لئے وہاں قبروں پر کوئی گنبد بھی نہیں بنایا گیا کہ عزاخانے کے نئے سوء ادب تھا۔ ابراہیم شاہ شرقی کی وصیت کے مطابق اُن کی قبر پر ۹ محرم کو ایک تعزیہ رکھا جاتا ہے جو اب تک قائم ہے۔

عزاخانہ اور خانقاہ حضرت صدر جہاں اجمل محلہ سپاہ جونپور

شرقی مانومنٹ آف جونپور کے فاضل مولف سید فصیح الدین صاحب تحریر کرتے ہیں کہ ابراہیم شرقی حضرت صدر جہاں اجمل کا معتقد تھا اور انہی کی فرمائش پر بادشاہ نے ان کی خانقاہ واقع محلہ سپاہ کے قریب جھنجھری مسجد بھی تعمیر کرائی تھی اس خانقاہ کے تذکرہ کے سلسلہ میں شرقی مانومنٹ میں ایک معجزہ بھی درج ہے۔ کہ ایک شب حضرت صدر جہاں اجمل پر دوران عبادت میں غنودگی طاری ہوئی اور اسی عالم میں حضرت رسول خدا محمد مصطفےٰ کو دیکھا کہ آپ خانقاہ میں تشریف فرما ہیں اور محراب عبادت میں نماز ادا فرما رہے ہیں۔ جب صدر جہاں اجمل بیدار ہوئے فوراً دوڑ کر اس محراب تک گئے دیکھا کہ اس جگہ زمین نم ہے اور سنگین فرش پر قدم مبارک کے گہرے نشان موجود ہیں بس اسی روز سے خانقاہ کا وہ حصہ نبی صاحب کے نام سے موسوم ہوا اور آج تک وہاں عزاداری کا سلسلہ قائم ہے۔

سید محمود شاہ شرقی کا عزاخانہ

سید محمود شاہ شرقی سلطان ابراہیم شاہ شرقی کا بیٹا ۱۴۴۰ء میں سریر آرائے حکومت جونپور ہوا۔ اس کی مدت حکومت ۱۸ سال ہوئی۔ محمود شاہ نے ایک عالیشان عزاخانہ محلہ جگدیش پور میں تعمیر کیا تھا جسکو مثل عزاخانہ خانقاہ نوحہ گران کے مرکزی حیثیت حاصل تھی اس عزاخانہ کو سکندر لودی نے بشکل خندق تبدیل کر دیا تھا۔ بعد کو مومنین شہر نے خاص مقام پر ایک حجرہ تعمیر کر لیا پھر رفتہ رفتہ زیارت گاہ بن گئی آج بھی عزاخانہ چہار صدر امام باڑہ کہا جاتا ہے جہاں ۱۰ محرم۔ ۱۹ صفر اور ۲۸ صفر کو دریائے گومتی کے شمالی ساحل پر آباد محلوں کے تعزیئے دفن کیلئے آتے ہیں اور جنوبی ساحل پر آباد جونپور کے محلوں اور دیہاتوں کے تعزیئے کربلا خانقاہ ذاکران نواب غازی مرزا منعم خان خانخانان کی کربلا واقع محلہ کتگھرہ میں دفن ہوتے ہیں۔

عزاخانہ مولانا سید داؤد محلہ لال دروازہ جونپور

محمود شاہ شرقی کی ملکہ راجے بی بی نے مسجد لال دروازہ اور اس مسجد سے متصل ایک عزاخانہ خانقاہ اور مدرسہ مولانا سید علی داؤد کے لئے تعمیر کیا تھا سکندر لودی کی فوجوں نے محلات شاہی کے ساتھ اس عزاخانہ، خانقاہ اور مدرسہ کو بھی مسمار کر دیا۔ اس عزاخانہ کی پسماندہ یادگار میں تربت کا اہم چوک باقی ہے جس پر حسب روایات قدیمہ ۹ محرم کو ایک تعزیہ اب بھی رکھا جاتا ہے۔

حسین شاہ شرقی کے عہد کی عزاداریاں

سید حسین شاہ شرقی ۱۴۵۸ء میں تخت جونپور کا فرمانروا ہوا اسکا زیادہ تر وقت دہلی کے بادشاہ بہلول لودی اور سکندر لودی سے جارحانہ حملوں کی مدافعت میں صرف ہوا۔ تاہم حسین شاہ نے ایک نئی عزاداری قائم کی اور اپنی تعمیر کردہ جامع الشرق

یعنی بڑی مسجد جونپور کے اندر عزاداری خیر و شاکی جس کی مخصوص جگہ حوض کے سامنے چبوترہ پر معین تھی جو کچھ عرصہ پہلے ناصبی تحریک کی وجہ سے بند ہو گئی ہے۔ اس کے علاوہ حسین شاہ نے ایک عزاخانہ اور امام چوک جامع الشرق کے جنوبی پھاٹک کے سامنے تعمیر کیا تھا۔ علاوہ ان کے عزاداری کو عام فروغ دینے میں بڑی دلچسپی لی۔ جونپوری طبل کا موجد بھی یہی بادشاہ ہے۔

عزاخانہ سید احمد خضری

حسین شاہ شرقی کے دور حکومت میں متعدد عزاخانے تعمیر ہوئے اور نئی عزاداریاں بکثرت قائم ہوئی تھیں چنانچہ جب مخدوم عثمان شیرازی کے پوتے سید احمد خضری نے مسجد خالص مخلص سے متصل خانقاہ عثمان شیرازی کے جانب مغرب ایک عزاخانہ شاندار اور پختہ تعمیر کیا یہ عزاخانہ سکندر لودی کی تاراجی سے محفوظ رہا چنانچہ اب تک باقی اور آباد ہے۔ اور اب "میر گھر" کے عزاخانہ کے نام سے موسوم ہے۔

شہزادوں کا تعزیہ

جب ہمایوں شاہ بادشاہ دہلی نے شاہزادہ حسین شاہ شرقی ابن شاہزادہ محمود شاہ ابن شاہزادہ جلال شاہ والی گور بنگال جو سلطان حسین شاہ شرقی کا بیٹا تھا یعنی شاہزادہ حسین شاہ آخری تاجدار سلطنت شرقیہ سلطان حسین شاہ کے پوتے کا بیٹا تھا اس کو ہمایوں نے منصب ہفت ہزاری دے کر عمر خان کا لقب عطا کیا اور صوبہ بہار کی جاگیر بھی بخشی اس کے کچھ عرصہ بعد شاہزادہ حسین شاہ جونپور آیا اور اپنی پہلی توجہ خاندانی عزاخانہ، خانقاہ، نوحہ گران اور حسین شاہ کے مسمار شدہ عزاخانہ کے چوک پر میدول کی اور ان کی مرمت کرائی اور عزاداری کا اہتمام کیا اسی وقت سے اس چوک کی عزاداری پھر سے جاری ہوئی اور آج تک قائم ہے اور شاہزادوں کا تعزیہ کہا جاتا ہے۔ ایک تربت ۹ ربیع محرم کو سلطان حسین شاہ شرقی کی قبر پہ بھی ان کی وصیت کے مطابق رکھی جاتی ہے اور یوم عاشور کو قبر سے اٹھا کر شاہزادوں کے تعزیہ کے ہمراہ صدر امام باڑہ لے جائی جاتی ہے۔

لودی حکومت میں جونپور کی عزاداری ۱۴۸۸ء تا ۱۵۲۶ء

سکندر لودی کی تاراجی جونپور کا منظر بہت ہی دردناک ہونے کے ساتھ ساتھ شیعان جونپور کے لئے ایک بہت ہی سخت امتحان کا زمانہ تھا۔ خانہ خدا انبلوا حسین مظلوم کے نام لینے والوں سے حکومت بیزار، عزاخانے کھنڈرات کی شکل میں اپنی مظلومیت پر خود ماتم کر رہے تھے۔ مگر شیعان جونپور اور دوست داران مظلومین کربلا کے لئے یہ کوئی نئی چیز نہ تھی آخر قبر حسین بھی تو بار بار کھودی جا چکی تھی اور ہر بار قدر رکے پہلے سے بہتر بارگاہ قائم کر دی، بس یہی وہ قوت احساس تھی جو عزاداران مظلوم کربلا کے رہنے والوں کیلئے باعث تقویت بنی رہی اور شیعان جونپور ہر کام پر صبر اور مستقل مزاجی سے کام لیتے ہوئے فرائض عزا کو انجام دیتے رہے اور حالات کا مقابلہ کرتے گئے کر زمانہ پلٹا خانہ خدا اور عزاخانہ کو مسمار کرنے والوں کا تخت و تاج پانی پت کے میدان میں لٹ گیا بانیان ظلم چشم زدن میں فنا ہو گئے بابر کامیاب رہا ابراہیم لودی ابن سکندر میدان جنگ میں مارا گیا۔

مغل دور کا آغاز ہوا۔ قدرت نے ہمایوں شاہ ہند اور طہماسپ شاہ ایران کے درمیان ذکر فضائل و مصائب شہدائے کربلا برسر منبر رواج دینے کے معاہدہ کے لئے اسباب مہیا کر دیئے۔ نواب غازی مرزا منعم خان خانخاناں اس معاہدہ کے نگراں کی حیثیت سے ہندوستان آئے پھر عہد اکبری میں جونپور کے گورنر مقرر ہوئے۔ جن کے دور میں جونپور کو شیعہ مرکزیت تمام بلاد ہند میں حاصل ہوئی۔ حالات کے اس رد و بدل کو اگر ایک معجزہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔

⁂

عہد مغلیہ میں جونپور کی شاندار عزاداری
سنہ ۱۵۲۶ء لغایۃ سنہ ۱۷۶۴ء "عہد اکبر اعظم"

عزاخانہ خانقاہ ذاکرین نواب غازی مرزا منعم خان خانخاناں محلہ کٹگھرہ جونپور

عہد مغلیہ کے آغاز کے بعد بابر اور ہمایوں کا دور بہت مختصر گذرا۔ مگر جونپور کی عزاداریوں پر کوئی بُرا اثر نہیں پڑا۔ شاہزادہ ہمایوں نے سنہ ۱۵۲۶ء میں جونپور پر حملہ کر کے اس علاقہ کو سلطنت مغلیہ میں شامل کیا تھا۔ اسی وقت سے ہمایوں جونپور کی شیعی مرکزیت سے بخوبی آگاہ تھا۔ اس کے بعد جب ہمایوں شاہ ایران کی توجہ اور امداد سے جب دوسری بار تخت و تاج کا مالک ہوا تب اور خاندان مغلیہ کے ہر بادشاہ نے طہماسپ شاہ ایران اور ہمایوں کے درمیان معاہدہ کے احترام میں ذکر فضائل و مصائب شہدائے کربلا پر کوئی پابندی نہ لگائی اور جونپور جیسے شیعی مرکز کے لئے ہمیشہ شیعہ گورنر کا انتخاب کرتے رہے۔ سید منعم جو شاہ ایران کی جانب سے معاہدہ کی شرائط کے نگراں کی حیثیت سے ہندوستان آئے تھے اور ہمایوں اور اکبر کے شروع شروع کی مشکلات میں ان کے مشورے بہت مفید ثابت ہوتے رہے۔ چنانچہ اکبر اعظم نے شاہ ایران سے مشورہ کے بعد سید منعم کو اپنا وزیر اور نورتن مقرر کیا۔ جب علی قلی نے بار بار جونپور سے مسلم بغاوت بلند کیا تو سید منعم کو جونپور پر قابو حاصل کرنے کے لئے روانہ کیا۔ جونپور پہونچنے پر ان کا قیام شروع شروع میں حکیم کمال کی مسجد کے پشت پر شیر شاہ سوری کی تعمیر کردہ ایک سنگین عمارت میں رہا۔ اکبر اعظم نے خود بھی جونپور میں قیام کیا اور ایک محل قلعہ شاہی سے الگ محلہ کٹگھرہ میں تعمیر کرایا جس کو "فلک نما" کہا جاتا تھا۔ جب علی قلی مغلوب ہوا اور جونپور کی طرف سے بادشاہ کو اطمینان حاصل ہوگیا تو جونپور سے چوسہ تک کی جاگیر اور اپنی محل سرا فلک نما اکبر نے سید منعم خاں کو عطا کر دی اور نواب غازی، مرزا اور خانخاناں کے خطابات بھی عطا کئے۔ سنہ ۹۷۲ھ میں نواب غازی مرزا منعم خاں خانخاناں محل سرا فلک نما واقع محلہ کٹگھرہ میں منتقل ہو گئے اسی سال خانخاناں نے کٹگھرہ میں ایک عزاخانہ تعمیر کیا جو خانقاہ ذاکران کے نام سے موسوم ہوا جو سنہ ۱۸۷۱ء کے عظیم سیلاب میں منہدم ہوگیا۔ آج بھی آبادی محلہ کٹگھرہ اور مقبرہ نواب غازی مرزا منعم خانخاناں کے مقابل سڑک سرکاری کے شمالی جانب بشکل ٹیلہ موجود ہے اور کٹگھرہ کی کربلا کے نام سے مشہور ہے۔

نواب غازی کا تعمیر کردہ چوک جو یہاں موجود ہے اس نمونہ کا امام چوک نہ تو شہر جونپور میں کوئی اور ہے اور نہ ملک کے دیگر حصوں میں کہیں پایا جاتا ہے۔ اس طرح کا چوک اور کربلا ملک ایران کے اکثر حصوں میں ملتے ہیں۔ اس چوک کے بیچ میں پتھر تراش کر ایک گول سوراخ بنایا گیا ہے جس میں دریائے گومتی کے جنوبی ساحل پر آباد محلوں اور مضافات کے تعزیوں کے پھول اور چھوٹی تربتیں یوم عاشور اور چہلم شہدائے کربلا پر ڈالی جاتی ہیں اور پتہ نہیں چلتا کہ کہاں گئیں۔

تاریخ کٹگھرہ از مرزا حسین علی بیگ فارسی قلمی اور دیوان فارسی خانخاناں کے دیباچہ از میر مرتضیٰ علی کاظمی میر کتب خانہ خانخاناں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس عزاخانہ میں عزاداری بطریق ملک ایران رائج تھی۔ مخصوص ہوا کرتی تھی اور ذاکرین اہلبیت رسولؐ کا اجتماع رہا کرتا تھا۔

عہد نوابی میں نواب شجاع الدولہ بہادر کی توجہ اس عزاخانہ کی جانب مبذول ہوئی اس کی قدامت خدمتِ دینی اور تاریخ اور بانی عزاخانہ کی شخصیت نے نواب بہادر کو بہت متاثر کیا ان کی دلچسپیوں کی وجہ سے اس عزاخانہ کی عزاداریوں میں ایک بار پھر

شاہی شان نظر آنے لگی تھی بسنہ ۱۸۷۱ء کے سیلاب گومتی سے زیادہ عظیم اور تباہ کن سیلاب جونپور میں اب تک نہیں آیا ہے اس سیلاب میں جہاں جونپور کو بہت سی حیثیتوں سے تباہ کر دیا وہاں نواب غازی مرزا منعم خانخاناں کے اس متبرک اور بزرگ عزاخانہ سے بھی محروم کر دیا۔ جب نواب شجاع الدولہ بہادر کو خبر ہوئی تو اس کی از سر نو تعمیر کے لئے رقم کثیر منظور کی تاریخ کنگھرہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اسی سال نواب شجاع الدولہ راہئ ملک عدم ہوئے اور نواب آصف الدولہ کو ایسٹ انڈیا کمپنی سے ایک مزید صلح نامہ کرنا پڑا جس کی رو سے جونپور پر انگریزوں کا اقتدار قائم ہو گیا، صرف نواب کی فوج کا ایک دستہ قلعہ شاہی میں رہنے لگا ساتھ ہی نواب آصف الدولہ بہادر نے اپنا دار الحکومت فیض آباد سے لکھنؤ تبدیل کر دیا چنانچہ زمانہ قحط میں نواب آصف الدولہ نے جو رقم مرحوم شجاع الدولہ نے خانقاہ ذاکران کے لئے دینا تجویز کی تھی اس سے عزاخانہ کی تعمیر کرانے کے سلسلہ میں محلہ مچھلی بھون لکھنؤ میں ایک عظیم الشان امام باڑہ تعمیر کرا دیا۔ اس کے بعد شاہان اودھ کے یہاں یہ دستور بن گیا کہ ہر حکمران اپنے عہد کی یادگار میں ایک عزاخانہ کی تعمیر کرتا رہے۔ جس سے سارا ہندوستان متاثر ہوا۔

عزاخانہ سید غلام عباس مرزا سنگین بیگ محلہ کنگھرہ

سید غلام عباس (مرزا ورسنگین بیگ خطابات) مرزا

نواب غازی منعم خان خاناں کے حقیقی بھتیجے تھے۔ اُس نواح کے سپہ سالار کی حیثیت سے ہندوستان آئے جو شاہ ایران طہماسپ شاہ نے ہمایوں کے ہمراہ کی تھی۔ عہد اکبری میں پہلے لکھنؤ میں ملٹری گورنر رہے بعد کو جب خانخاناں کی سپہ سالار اور فوزل خان (غازی اور مرزا خطابات) جو ایک بہادر افغان سردار تھا اور جونپور میں اپنے نام سے محلہ محلہ غازی آباد

کر کے سکونت اختیار کی تھی فوت ہو گیا تو اکبر اعظم نے مرزا سنگین بیگ کو لکھنؤ سے جونپور کا ملٹری گورنر مقرر کر دیا۔

جب جونپور آئے تو مطابق تاریخ کنگھرہ انھوں نے ایک عزاخانہ خان خاناں کی محلسرا "فلک نما" سے جانب جنوب تقریباً سو فٹ کے فاصلہ پر تعمیر کیا اور تاحیات بڑے ذوق و شوق سے عزاداری کرتے رہے۔

بعد وفات اہل خاندان نے اس عزاداری کو قائم رکھا یہاں تک کہ سنہ ۱۸۷۱ء کے سیلاب میں یہ عزاخانہ منہدم ہو گیا جیسا کہ اندراج کاغذات سرکاری سے واضح ہوتا ہے۔

اب اس عزاخانہ کی پسماندہ یادگار میں ایک پختہ چوک باقی ہے جس پر ۲۰ صفر کو کنگھرہ کا چہلم ہوتا ہے۔ چونکہ جونپور میں چہلم شہدائے کربلا کی عزاداری ۱۹ صفر کو ختم ہو جاتی ہے اور اصل تاریخ چہلم یعنی ۲۰ صفر کو صرف عزاخانہ مرزا سنگین بیگ ہی پر تعزیہ رکھا جاتا ہے اور بعد ختم مجلس جلوس برآمد ہو کر حسب دستور قدیم کربلا خانقاہ ذاکران جا کر دفن ہوتا ہے۔ اہل جونپور میں اس چہلم اور عزاخانہ کی بڑی اہمیت ہے۔

عزاخانہ شیخ احمد مخدوم شاہ اڈہن

عزاخانہ شیخ احمد

واقع محلہ مخدوم شاہ اڈہن جو اب امام باڑہ چہار سو کہلاتا ہے۔ عہد اکبری میں شیخ احمد ہفت ہزاری جاگیردار نے تعمیر کیا تھا۔ ایک صدی قبل یہ ایک وسیع اور قابل دید عمارت تھی اب اس کا کافی حصہ سرکاری سڑک میں آ گیا ہے اس عزاخانے کے اتر جانب چوک واقع ہے اس پر محرم کی چاند رات کو ایک علم مبارک نصب کیا جاتا ہے اور نذر ہوتی ہے۔ عشرہ محرم بھر مجالس کا سلسلہ قائم رہتا ہے بعد کو ہر سنیچر کی شب میں تا چہلم مجالس کا سلسلہ قائم رہتا ہے یوم عاشور بعد زوال روز روئے تعزیہ فاتحہ خوانی خاص اہتمام سے ہوتی ہے اس کے بعد تعزیہ بشکل جلوس حسب معمول قدیم

کے مطابق حکیم کحال کے عزاخانہ تک جاتی ہے کیونکہ قدیم زمانہ میں جب تک حکیم کحال کا عزاخانہ قائم تھا اور عزاداری ہوا کرتی تھی دونوں عزاخانوں کے تعزیے کربلا خانقاہ ذاکرین کنگھرہ جاکر دفن ہوتے تھے۔ موجودہ صورت میں شیخ احمد مرحوم کے عزاخانہ کی ضریح صدر بیجا تک شیعہ جامع مسجد تک جاکر پھر واپس ہو جاتی ہے اور صدر امامباڑہ جونپور جاکر دفن کی جاتی ہے۔

حکیم محمد کحال کا عزاخانہ

سنہ ۹۷۳ھ میں اکبر اعظم کے شاہی طبیب حکیم محمد کحال نے لب دریائے گومتی متصل اکبری پل جونپور ایک مسجد (جو اب شیعہ جامع مسجد جونپور کہلاتی ہے) اور اس کے ساتھ حمام اور اس کی بغل میں ایک عزاخانہ تعمیر کیا تھا، اور عزاداری کیا کرتے تھے عشرۂ محرم میں مجالس اور یوم عاشور کو تربت جلوس کے ساتھ برآمد ہو کر شیخ احمد محلہ مخدوم شاہ اڑہن کی ضریح کے ساتھ کربلا خانقاہ ذاکران نواب غازی مرزا منعم خاں خانخاناں واقع محلہ کنگھرہ جاکر دفن ہوتی تھی۔ اب یہ عزاخانہ منہدم ہو گیا ہے حمام بھی گر چکا ہے مسجد اچھی حالت میں قائم ہے ذکر فضائل و مصائب رسولؐ اور آل رسولؐ کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔

نواب محسن خاں ذوالقدر کی مسجد اور عزاداری

شرقی مانومنٹ آف جونپور کے فاضل مؤلف اپنی کتاب کے صفحہ ۵۴ پر تحریر کرتے ہیں کہ اکبر اعظم کو خان زماں علی قلی خاں پر فتح حاصل ہوئی تو خان زماں کے باغی دیوان کچھن داس کی حویلی واقع محلہ حمام دروازہ جونپور نواب محسن خاں ذوالقدر کو ملی جو نواب غازی مرزا منعم خانخاناں کے عہدہ دار تھے۔ نواب محسن خاں نے اس حویلی کے عقب پر ایک مسجد تعمیر کرائی اور اس میں عزاداری شروع کی۔ بعد میں نواب کے ورثاء نے اس حویلی کو شاہ محمد تقی مرحوم کے ہاتھ فروخت کر دیا اس کے بعد تا حیات تقریباً ۵۰ سال

قبل تک شاہ صاحب مرحوم اس عزاداری کو قائم کئے ہوئے تھے۔

روضہ قدم رسولؐ محلہ باغ ہاشم جونپور

عہد اکبری میں محمد ہاشم صاحب ساکن پٹنہ ایک نشان قدم مبارک سرور کائناتؐ مکہ معظمہ سے ہندوستان لائے اور محلہ ڈھریانہ ٹولہ میں اپنے باغ کے اندر ایک خوبصورت گنبد اپنے بیٹے کی قبر پر تعمیر کرا کے نشان قدم مبارک کو نصب کرا دیا جو آج تک موجود ہے یہاں پر محرم کی ساتویں تاریخ کو چراغاں ہوتا ہے اور قدیم رواج کے مطابق محلہ بارہ دریہ کے عزاخانہ سے محرم کی چاند رات کو لوگ ماتمی دستہ کے ساتھ آتے ہیں اور یہاں سے مٹی لے جا کر امام چوک پر نشان پنجہ بناتے ہیں۔

احسن اخوند میر کا عزاخانہ و ذوالجناح

عہد اکبر اعظم میں جب کہ جونپور کا سول نظام نواب غازی مرزا منعم خانخانان کے ہاتھوں میں تھا اور ملٹری نظام سید غلام عباس یعنی مرزا سنگین بیگ کے سپرد تھا۔ دونوں حاکم ایرانی شیعہ اور محب اہلبیت تھے تو رفتہ رفتہ تمام فوجی سردار جو ایران سے ہمایوں کے ساتھ آئے تھے اور اب اسی ملک میں مقیم تھے جونپور آ آکر آباد ہونے لگے انھیں میں ایک مشہور ہستی احسن اخوند میر کی بھی ہے۔ آپ بھی اپنے فوجی دستوں کے جونپور چلے آئے، بادشاہ نے جاگیر بھی عطا کی اور خطاب بھی۔ ان کے فوجی دستے مواضعات رنوہ، دکھن پٹی، لہری، لبسوان، کسوریا، گندو پور، شیخو پور، دریا پور، راجہ پور میں آباد کئے گئے، اور اخوند میر نے خود اپنی سکونت کے لئے ایک نیا موضع آباد کیا اور اس کا نام خراسان رکھا جو اب بگڑ کر خراسون کہا جاتا ہے۔

اس طرح اطراف جونپور میں شیعہ آبادی پھیل گئی ساتھ ہی عزاداریاں بھی شروع ہو گئیں اور ان مواضعات کو آج بھی شیعی مرکزیت حاصل ہے۔ سید احسن اخوند میر نے ایک عزاخانہ بنا کر میں تعمیر کیا اور ایرانی رواج کے مطابق عزاداری اور شبیہ ذوالجناح برآمد کی۔ راجہ ارادت جہاں اور راجہ مظفر جہاں

جو اس خاندان کے آخری برسرِ اقتدار راجہ ہوئے ہیں انھوں نے موضع انگلی میں ایک پختہ عزا خانہ اور مسجد تعمیر کرائی ہے جو اب تک قائم اور آباد ہے۔

روضۂ کربلا موضع امام پور جونپور

سید احسن اخوند میر کے امورِ خیر اور عزاداری

میر مستقیم کے خاندان سے ایک فرد نے موضع امام پور میں جو شہر جونپور سے تقریباً ۱۴ میل دور آباد ہے۔ ایک روضہ بالکل کربلائے معلّےٰ کے نقشہ کے مطابق تعمیر کیا ہے۔ جونپور اور اطراف کے لوگ برابر زیارت کے لئے آتے رہتے ہیں مجالس اور مخصوص بھی جوش رہتی ہے۔

خانقاہ میرزا امیرک رضوی کی عزاداری

نواب غازی مرزا منعم خانخاناں

کے دورِ حکومت کے آخری چند سالوں میں میرزا امیرک رضوی جونپور کی دیوانی پر مامور ہوئے اور جونپور ہی میں سکونت اختیار کی۔ اکبری پل کے جنوبی پچھمی گوشہ پر دریائے گومتی کے کنارے ایک خانقاہ مسجد اور چاہ پختہ تعمیر کیا جو خانقاہ میرزا امیرک رضوی کے نام سے مشہور تھی۔ عہدِ عالمگیر بادشاہ دہلی تک یہ خانقاہ بڑی رونق پر رہی۔ مسجد کے پشت پر جانب مغرب ایک پختہ چبوترہ بالکل مسجد کی دیوار سے ملحق تعمیر کیا گیا تھا جس پر تعزیہ شبِ عاشور رکھا جاتا تھا۔ رفتہ رفتہ یہ خانقاہ غیر آباد ہونے لگی ۱۸۰۲ء میں مسٹر ابراہیم ولنڈ کلکٹر ضلع نے مسجد اور چبوترے کی مرمت کرائی اور خانقاہ کے بوسیدہ حصّوں کو کھدوا کر بازار میں ملا دیا جو اب جونپور میں سرائے خام کے نام سے مشہور ہے۔ یہیں ایک بلند سنگین چبوترے پر میرزا امیرک رضوی کا مزار موجود ہے۔ موجودہ صورت میں تعزیہ کے چبوترہ پر تقریباً تیس سال قبل ایک دالان تعمیر ہوا ہے جو اہلِ محلہ کی توجہ کا نتیجہ ہے اور شبِ عاشور محرم منجانب برادرانِ اہلسنّت واقعات شہادت امام مظلوم و شہدائے کربلا پر کوئی بیرونی عالم روشنی ڈالتے ہوئے مسلمانوں کو حسینؑ مظلوم کے دیئے ہوئے سبق سے آگاہ کرتا اور اس پر عمل کی دعوت دیتا ہے۔

عہدِ شہنشاہ جہانگیر

عہدِ جہانگیری کے آٹھویں سال میں یعنی ۱۰۲۲ھ مطابق ۱۶۱۳ء

میں درگاہ شاہ نجف پنجہ شریف جونپور کی تعمیر شروع ہوئی تھی نواب غازی مرزا منعم خانخاناں کے مخصوص درباری خواجہ پیر کے بیٹے جناب سید علی سعید صاحب اسی سال عرب سے ایک نشانِ قدم سرورِ کائناتؐ اور ایک نشانِ کفِ مبارک جناب امیرالمومنین حضرت علیؑ ساتھ لائے اور ان کو موجودہ مقامات پر نصب کیا اور درگاہ کی عمارت کی تعمیر شروع کی۔ ابھی سلسلۂ تعمیر جاری اور نامکمل ہی تھا کہ سید علی سعید صاحب فوت ہو گئے۔ اس کے بعد یہ عمارت ۱۵۹ سال تک نامکمل پڑی رہی پھر جیسا کہ قلمی ڈائری احوال شیراز هند جونپور از سید علی ضامن ترمذی اور سید فصیح اللہ کاظمی سے معلوم ہوتا ہے ۱۱۸۰ھ میں ایک مومنہ چمن آرا بیگم زوجہ شیخ اشرف شیرازی تاجر خوشبویات نے جو لاولد فوت ہوئے تھے اس درگاہ کو موجودہ شکل میں مکمل کرایا۔ صدر پھاٹک کے مغربی بازو پر جو سنگین دالان ہے یہ ۱۲۹۵ھ میں جناب مدد علی خاں صاحب رئیس جونپور نے تعمیر کرایا تھا۔ درگاہ کے احاطہ میں ایک مسجد، حضرت فاطمہ زہراؑ کی شبیہ تربت، حضرت امام حسینؑ اور حضرت قاسمؑ کی زیارت گاہیں بنی ہوئی ہیں۔

درگاہ حضرت ابوالفضل العباسؑ علمدار نوح شاہ کربلا اور اس سے ملحق امام باڑہ کی عمارت بیٹھک گاہ شریف سے تقریباً دو ہزار فٹ کے فاصلہ پر جانب شمال واقع ہے۔ ان زیارت گاہوں میں تمام سال سیکڑوں مسلمان آتے رہتے ہیں مگر جمعرات کو اور محرم کے پہلے پنجشنبہ کو خصوصیت سے کثیر مجمع ہوتا ہے جس کی تفصیل جلوس پنجہ شریف کے ذیل میں بیان ہوگی۔

جبکہ ۲۱ رمضان کو شبیہ تابوت مولا مشکل کشا امیرالمومنین حضرت علی ابن ابی طالبؑ مرحوم کے عزا خانہ واقع محلہ...

سے جلوس کے ساتھ جس میں ماتمی دستے نوحہ و ماتم کرتے ہوئے مع علم کے قبل افطار آتی ہے اور حضرت عباسؑ کی درگاہ میں رکھدی جاتی ہے۔ بعد افطار و نماز مغرب جلوس تابوت مذکور روضہ امیرالمومنینؑ میں لاکر دفن کرتے ہیں۔ مطابق ڈائری حوال شیراز ہند جونپور از ترمذی صاحب اور فصیح اللہ کاظمی قدیم طریقہ یہ رائج تھا کہ تابوت مبارک حسب دستور افطار سے قبل درگاہ پہونچتا تھا جیسا کہ اب بھی ہوتا ہے پھر تمام رات شب بیداری کا سلسلہ رہتا اور بعد سحر و نماز صبح بعد مجلس تابوت نکلتا ہے اور روضہ امیرالمومنینؑ کے صحن میں ۲۱ر رمضان کو دفن ہوتا ہے۔ چونکہ درگاہ شریف آبادی شہر سے بہت دور واقع ہے مومنین شہر کو تمام شب وہاں قیام میں سہولت نہیں ہوئی اس لئے رفتہ رفتہ مجمع کم ہوتا رہا یہاں تک کہ یہ طریقہ اختیار ہوگیا کہ ۲۰ر رمضان کی شام ہی کو تابوت دفن کرکے مومنین گھروں کو واپس ہو جاتے ہیں۔ چونکہ شہادت جناب امیرؑ ۲۱ر رمضان کو اس وقت ہوئی تھی جب کہ ایک ثلث رات باقی تھی اس لئے جونپور کے مومنین کے لئے یہ امر قابل تعریف نہیں ہے کہ ذاتی سہولتوں کی بنا پر وقت شہادت سے قبل شبیہ تابوت دفن کر دی جائے۔

جنگ درگاہ پنجہ شریف ۱۷۷۶ء

جو روضہ نما عمارت درگاہ پنجہ شریف کے صدر پھاٹک کے باہر جانب مغرب بنی ہوئی ہے اس کی تعمیر کنندہ کا نام ڈائری احوال شیراز ہند کے مؤلف کی تحقیق کے مطابق مسماۃ نورتن تھا۔ مقصد تعمیر اس کے اندر ایک ضریح نصب کرنا بیان کیا گیا ہے جس کی اجازت علماء جونپور کی جانب سے ان جو اس دور میں زیارت گاہوں کے قائم کرنے سے پہلے حاصل کرنا ضروری ہوتا تھا وجہ یہ بتائی گئی کہ جو رقم اس عمارت کی تعمیر میں صرف ہوئی تھی وہ شرعاً جائز طور سے نہیں کمائی گئی تھی، چنانچہ یہ عمارت خالی پڑی رہی۔ عرصہ تک خالی دیکھ کر کچھ لوگوں نے اسے اپنے مذہبی تصرف میں لانے کی کوشش کی۔ جب مسلمانان شہر کو خبر ہوئی موقع پر پہنچ کر روک تھام کر دی اور واپس چلے آئے چند روز بعد ایک منظم تحریک کے ساتھ اسی عمارت پر پھر قبضہ کر لیا گیا اور اس بار کافی تعداد میں وہاں لوگ شب و روز موجود رہنے لگے۔ مسلمانوں نے بعد نماز جمعہ ایک عام اجتماع میں طے کیا کہ مقابلہ کیا جائے گا۔

اس وقت علاقہ جونپور انگریزوں کی طرف سے راجہ چیت سنگھ بنارس کی عملداری میں دیا جا چکا تھا اور راجہ انگریز ریزیڈنٹ کے مشورے پر عمل کرتا تھا۔ جب اس کی اطلاع بنارس راجہ تک پہونچی انگریز ریزیڈنٹ نے راجہ چیت سنگھ کو مجبور کیا کہ مسلمانوں کی سرکوبی بذریعہ ہی فوج کی جائے۔ شاید انگریزوں کا مقصد جونپور میں فرقہ وارانہ جذبات کو مشتعل کرنا تھا۔ فوجیں موقع پر پہونچ گئیں، مسلمان بھی مقابلہ کے لئے موجود تھے۔ ہندوؤں کو بھی انگریزوں کی مداخلت گراں گذری کیونکہ یہ مقامی اور باہمی جھگڑا تھا اس سے قبل ہمیشہ ایسے تمام معاملات میں حاکم اور قاضی شہر مصالحت کرا دیا کرتے تھے۔ اب یہ جنگ مسلمانوں اور انگریزوں کی نوعیت سے دیکھی جانے لگی، ہندوؤں نے اپنے کو اس جھگڑے سے الگ کر لیا اور ہر ممکن تعاون مسلمانوں سے کرنا شروع کیا۔ فوجی افسران سے صلح نہ ہو سکی۔ مسلمانوں نے یا حیدرِ کرار کے نعروں کے درمیان آغاز جنگ کر دیا اب مسلمان اپنے سے بہت زیادہ فاتحوں اور کثیر تعداد پر حملہ آور ہو چکے تھے۔ شہر کے اندر ہر مسلمان گھر بلا تفریق شیعہ و سنی خیام حسینی کا نقشہ بنا ہوا تھا ان گھروں میں سوا عورتوں بچوں اور بیماروں کے کوئی موجود نہ تھا۔ جب مسلمان شاہی فوج کو ہٹاتے ہوئے درگاہ سے کافی دور پہونچ گئے تو گھروں سے نکل کر عورتیں اور بچے درگاہ شاہ نجف پنجہ شریف پر فریادی بن کر جمع ہو گئے اور اپنے وارثوں کی سلامتی کے لئے دعائیں کرتے رہے۔ مسلمانانِ جونپور بعینہٖ حالات میں جتنا تھے کربلائی محرم فلک پر نمودار ہو گیا۔ جنگ جاری تھی شاہی کمک برابر آ رہی تھی کہ محرم کے پہلے پنجشنبہ کے ۱۷۷۶ء کو مسلمانوں نے

مرکونی کے مقام پر انگریزی فوج کو فیصلہ کن شکست دے کر راہ فرار اختیار کرنے پر مجبور کر دیا۔ مسلمانوں کا جانی نقصان کم مگر مالی نقصان زیادہ ہوا پھر بھی فتح کا شکرانہ ادا کرنے کے لئے اپنے گھروں میں داخل ہونے سے پہلے روضہ امیرالمومنینؑ پر حاضر ہوئے دیکھا کہ ہر گھر کی عورتیں اور بچے وہاں مجلس و ماتم میں مشغول ہیں۔ اپنے وارثوں کو صحیح و سلامت پا کر عورتوں نے فوراً نذر شکرانہ کا انتظام کیا موقع پر چاول اور مسور کی دال جو ان کے ہمراہ تھی اسی کی کھچڑی پکا کر نذر کرائی اور سب گھروں کو واپس ہوئے۔ سال آئندہ پھر محرم کی نوچندی کی جمعرات کو عورتیں درگاہ میں جمع ہوئیں پکائیں اور پھر وہی مسور کی کھچڑی پر نذر کرا کے اپنے وارثوں کی سال آئندہ تک سلامتی کی دعائیں مانگیں پھر ہر سال یہی طریقہ اختیار کر لیا گیا اور آج تک محرم کا پہلا پنجشنبہ درگاہ میں بلا تفریق شیعہ و سنی یوں ہی منایا جاتا ہے اور یہ دن محرم کی کھچڑی کا دن کہا جانے لگا۔ غیر مقام کے مومنین جو جونپور کی اس رسم کو دیکھتے ہیں مگر اس تاریخی واقعہ سے واقف نہیں ہیں تعجب سے دریافت حال کرتے ہیں۔

"عہد شاہ جہاں"

عہد سابق تک عزاداریوں، عزاخانوں، خانقاہوں اور درگاہوں کے بابت جو کچھ مقامی تنظیمی اور ترقیاتی اقدام عمل میں آ چکے تھے ان سب کی بقا و عروج اور تبلیغ دین کے لحاظ سے عہد شاہجہانی جونپور کا ایک اہم دور گزرا ہے۔ توسیع عزاداری کے علاوہ اس عہد میں ذاکرین نے کثرت سے واقعات کربلا کو نظم و نثر میں قلم بند کیا ہے۔ مجالس عزا میں ذاکری کو ایک مخصوص انداز بیان کا پابند بنا دیا۔ اور آئندہ شعراء و نثار کے لئے ایک نئے باب کا آغاز قائم ہو گیا تھا جس کو بعد میں میرانیس اور مرزا دبیر نے پایۂ تکمیل تک پہونچا دیا۔ آج تک اس دور میں تعمیر کئے ہوئے عزاخانوں کا وجود قائم ہے۔

"عہد اورنگ زیب"

اپنے عہد میں اورنگ زیب نے جونپور کی بابت کوئی ایسا قدم نہیں اٹھایا جس کی وجہ سے یہاں کی عزاداریوں میں کوئی خلل پڑتا یا جونپور کی شیعی آبادی اس کی وجہ سے متاثر ہوتی بلکہ اورنگ زیب نے جونپور کے لئے اپنے عہد کا گورنر ایک اصفہانی شیعہ عالم مرزا افتخار الملک سلطان حسین کو منتخب کیا جن کی وجہ سے جونپور کے علماء اور صوفیائے کرام میں کار تبلیغ کا جوش روز بروز بڑھتا رہا اور جونپور سے باہر اعظم گڈھ، الہ آباد، بنارس، غازی پور وغیرہ تک حلقہ تبلیغ و عزاداری وسیع ہو گیا۔

سنہ ۱۶۷۵ء میں جب بادشاہ کچھ دنوں جونپور میں مقیم رہا اس نے شرقی مساجد اور قدیم عزاخانوں پر بھی توجہ کی اور ایک فرمان کے ذریعہ شرقی مساجد، سلطان ابراہیم شاہ شرقی کے عزاخانہ، خانقاہ نوحہ گران اور شاہان شرقی کے مزاروں پر فاتحہ خوانی اور چراغاں کے لئے مواضعات وقف کئے اور نواب غازی مرزا منعم خان خانخاناں کے ورثاء کی جاگیروں میں بھی اضافہ کیا۔

سلطنت مغلیہ کا آخری دور

اورنگ زیب کی وفات کے بعد سرزمین جونپور مختلف عنوان سے حکومت مغلیہ میں ستاون سال اور شامل رہی یعنی سنہ ۱۷۶۴ء میں بعہد شاہ عالم بادشاہ دہلی جنگ بکسر کے بعد جونپور پر ایسٹ انڈیا کمپنی کا اقتدار شروع ہو گیا تھا۔ اس دور میں عوام انتہائی غیر یقینی مستقبل کے تصور سے پریشان اور خوف زدہ ہو رہے تھے۔ اس زمانے کے دو عزاخانے ابھی تک جونپور میں موجود اور آباد ہیں۔ اکثر غدر ۱۸۵۷ء میں تباہ ہو گئے۔

قدم رسول حمزہ پور جونپور

عہد شاہ عالم بادشاہ دہلی میں ایک بزرگ شاہ مرتضیٰ رئیس جونپور زیارت عتبات عالیات و فریضہ حج سے

واپسی پر ایک نشان قدم مبارک سرور کائنات اور ایک نشان کف مبارک جناب امیرالمومنین علیہ السلام اور حضرت عباسؑ علمدار کی قبر کی ایک اینٹ ساتھ لائے۔ شاہ صاحب کا خیال تھا کہ ان تبرکات کو درگاہ پنجہ شریف جونپور میں نصب کرا کر زیارت گاہوں میں مزید اضافہ کر دیں مگر علماء اور احباب نے مشورہ دیا کہ ایک مقام پر زیارت گاہوں کا مرکز بنانے سے زیادہ مفید ہوگا کہ مضافات جونپور میں نئی درگاہیں قائم ہوں۔ چنانچہ شاہ مرتضیٰ صاحب نے اپنی زمینداری موضع حمزہ پور میں جو شہر سے تقریباً پانچ میل کے فاصلہ پر واقع ہے ایک احاطہ اور روضہ حضرت عباسؑ اور قدم رسولؐ و پنجہ شریف ایک بلند چبوترے پر تعمیر کیا اور ان تبرکات کو وہیں نصب کر دیا۔ اسی وقت سے مثل درگاہ پنجہ شریف جونپور یہ درگاہ بھی بہت مقبول ہے۔

اس درگاہ کے علاوہ اس دور کے دو عزاخانے پہلا عزاخانہ میر اکبر علی واقع محلہ ولاذاق شہر جونپور اور دوسرا عزاخانہ مرزا محمد امین واقع محلہ کشگھرہ شہر جونپور کا ہے جن کا تذکرہ ذیل میں دیا جاتا ہے۔

عزاخانہ میر اکبر علی محلہ ولاذاق جونپور

اس عزاخانہ کی تعمیر محمد شاہ بادشاہ دہلی کے دور کی ہے۔ اس کا وقف نامہ مورخہ ۱۱۲۸ھ بعہد عالمگیر ثانی بادشاہ دہلی لکھا گیا ہے۔ اس عزاخانہ کی تربت اپنی جسامت کے لحاظ سے شہر کے تمام عزاخانوں سے بڑی ہوتی ہے جس کی وجہ سے یہ عزاخانہ بڑے امام کے نام سے مشہور ہوا۔ عشرۂ محرم میں مجالس کا سلسلہ رہتا ہے ۹ محرم کو تعزیہ رکھا جاتا ہے بعد گشت کے عزاخانہ پر واپس ہوتا ہے اور تمام رات نذر و فاتحہ اور نوحہ خوانی کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔

عزاخانہ مرزا محمد امین کشگھرہ

محمد شاہ بادشاہ دہلی کے عہد میں تعمیر کیا ہوا یہ دوسرا عزاخانہ ہے جو موجود اور آباد ہے۔ پہلے اس کی عمارت خام تھی اب اہل خاندان نے پختہ کرا دی ہے۔ کشگھرہ کا یوم عاشور والا جلوس تعزیہ اس امام باڑہ سے برآمد ہوتا ہے اور تمام محلہ سے گشت کرتا ہوا اور جنوبی ساحل گومتی کے تمام محلوں اور مواضعات کے تعزیوں کو ساتھ لیتا ہوا تقریباً ۴ بجے شام کو کربلا نواب غازی پر دفن ہوتا ہے۔

"نوابین اودھ"

گو جونپور کے لئے یہ دور بہت مختصر گذرا ہے مگر جونپور کی تاریخ کا ایک سنہرا دور تصور ہوتا ہے۔ نواب شجاع الدولہ بہادر کو بھی جونپور سے کافی لگاؤ پیدا ہو گیا تھا۔ خانقاہ ذاکران کی عزاداریاں شاہی انداز پر ہونے لگی تھیں۔ نواب بہادر کے دارالحکومت فیض آباد اور جونپور کے درمیان جو سادات کی بستیاں تھیں وہاں نواب کی جانب سے اکثر عزاخانوں اور زیارت گاہوں کی تعمیریں ہوئیں اور عام طور پر عزاداریوں کو بڑا فروغ حاصل ہوا۔ جونپور کے علاوہ موضع بھادی اور قصبہ بڑاگاؤں پر نواب بہادر کی خاص توجہ ہوئی ان جگہوں پر اس عہد کے عزاخانے اور کربلا اب بھی قائم اور آباد ہیں۔

پنجہ شریف موضع بھادی شاہ گنج

موضع بھادی تحصیل شاہ گنج میں نواب شجاع الدولہ بہادر کا تعمیر کردہ پنجہ شریف اچھی حالت میں قائم ہے اور شاہ گنج، بھادی اور اطراف کے مواضعات کے تعزیئے عاشور محرم اور چہلم شہدائے کربلا کے موقع پر اب بھی یہیں دفن کے لئے آتے ہیں۔ یوں بھی دور اور نزدیک کے مومنین بغرض زیارت یہاں پہونچتے رہتے ہیں۔

قصبہ بڑا گاؤں جونپور

تحصیل شاہ گنج جونپور میں ضلع جونپور و فیض آباد کی سرحد سے قریب ایک موضع سادات منڈھا تھا جس کو اب بڑا گاؤں کہنے لگے ہیں سادات کی قدیم آبادی ہے۔ اس موضع کی عزاداری کو نواب شجاع الدولہ کے دور میں بڑا فروغ حاصل تھا اور آج بھی قرب و جوار کے علاقہ میں یہی عزاداری کا مرکز تصور کیا جاتا ہے۔ اس وقت یہاں سات پختہ اور چار خام عزاخانے ہیں اس کے علاوہ درگاہ پنجہ شریف، درگاہ حضرت عباسؑ علمدار، قدم رسولؐ، روضہ حضرت علیؑ اور روضہ معصومہ کونین اور آٹھ امام چوک اور مسجدیں موجود ہیں اس موضع کی عزاداری اور ۸ ربیع الاول کی شادی کے جلوس میں شرکت کے لئے غیر مقامات سے بکثرت لوگ آتے ہیں۔

جونپور کے چہلم شہدائے کربلا کی تاریخ

از ابتدا تا ۱۹۶۲ء جونپور میں

۲۰ صفر کو چہلم شہدائے کربلا کی عزاداریاں عزاخانوں کے اندر تک محدود تھیں۔ مجالس منعقد ہوتی تھیں علم اور تعزیئے رکھے جاتے تھے مگر کوئی جلوس برآمد نہیں ہوتا تھا۔ تاریخ کنگھورہ فارسی قلمی کے فاضل مؤلف مرزا حسین علی بیگ بیان کرتے ہیں کہ ۱۹۰۸ء میں جب سید آقا غلام عباس ڈپٹی گورنر جونپور نے اپنا عزاخانہ واقع کنگھورہ کا چہلم ہوتا ہے تعمیر کیا تو انھوں نے ۲۰ صفر کو چہلم کا تعزیہ جلوس کے ساتھ عزاخانہ سے برآمد کیا اور ماتمی دستوں کے ساتھ خانقاہ ذاکران تک لے گئے یہ جونپور میں چہلم شہدائے کربلا کا پہلا جلوس تھا۔ سال آئندہ سید آقا مرحوم (مرزا سنگین بیگ) نے تحریک شروع کی کہ ان کے عزاخانوں کے تعزئے ایک جلوس کی شکل میں ۲۰ صفر کو بھی مثل یوم عاشور کے برآمد ہوں۔ چونکہ یہ دور حکومت نواب غازی مرزا منور خان خانان کا تھا اس لئے حکومت کی جانب سے بھی حوصلہ افزائی ہوئی اور اب جونپور میں چہلم شہدائے کربلا کی رونق پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ چکی تھی یعنی ۱۱۶۰ھ مطابق ۱۷۴۷ء تک اسی طرح برابر جونپور میں چہلم شہدائے کربلا دیگر مقامات کی مانند اپنی اصل تاریخ یعنی ۲۰ صفر کو ہوا کرتا تھا۔

سنہ ۱۷۴۶ء میں شہر جونپور میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس کی وجہ سے یہاں چہلم بجائے ۲۰ صفر کے ۱۹ صفر کو ہونے لگا جو اب تک رائج ہے۔ اس واقعہ کی تفصیل یوں ہے کہ اس شہر کے عزاداروں میں شیخ محمد اسلام ایک نمایاں فرد تھے صوم و صلوٰۃ کے پابند اور مذہبی معاملات میں ہر موقع پر پیش پیش رہنے والے ذاکر سید الشہدا بھی تھے پیشہ حکمت تھا۔ سیاسی اعتبار سے یہ دور بڑی افراتفری کا تھا۔ دہلی میں محمد شاہ بادشاہ تھے صوبوں کی سوراباری ہو رہی تھی محمد شاہ کی جانب سے نواب صفدر جنگ نواب اودھ مقرر تھے قلمرو جونپور کا انتظام راجہ بلونت سنگھ بنارس کے سپرد تھا۔ میر رستم علی ناظم اعلیٰ جونپور اور قاضی حسن سعید خاں قاضی شہر مقرر تھے۔ شب عاشور محرم سنہ ۱۱۵۹ھ مطابق ۱۷۴۶ء اپنے عزاخانہ پر تعزئے رکھنے کے بعد شیخ محمد اسلام حسب ذاکری اور زیارت شہر کے دیگر عزاخانوں میں گئے واپسی پر قاضی محمد جمیل اللہ ابن ملا خلیل نے بربنائے حسن عصبیت مذہبی محمد اسلام کو گرفتار کرالیا یہ واقعہ قاضی کی گلی میں پیش آیا، بڑی کوششوں کے بعد بھی جب محمد اسلام کی رہائی ممکن نہ ہوئی تو اہل خاندان نے منت مانی کہ جس تعزیہ کو شیخ محمد اسلام نے اپنے ہاتھوں سے شب عاشور چوک عزاخانہ پر رکھا ہے اس کو وہی بعد رہائی دفن کریں گے۔ چنانچہ یہ تعزیہ بعد عاشور محرم زینت چوک بنا رہا اور شیخ محمد اسلام قیدخانہ ہی جونپور میں مقید رہے۔

چند روز بعد قاضی شہر نے الزامات کی جانچ کرکے کاغذات ناظم اعلیٰ کو دے دیئے اور وہ آخری حکم کے لئے راجہ بلونت سنگھ کے پاس بنارس روانہ کر دیے گئے۔ ۱۸ ماہ صفر ۱۱۶۰ھ کو شیخ محمد اسلام کو خواب میں بشارت ہوئی کہ کل تم رہا کر دیئے جاؤ گے

کی بشارت ان کے برادر اور زوجہ کو بھی ہوئی۔ بعد نماز
صبح شیخ محمد اسلام نے دربان کو حکم دیا کہ دروازے کھول دے
کہ میرے مولا نے مجھ کو بشارت دی ہے کہ آج میں رہا ہو جاؤں
گا اس کی اطلاع ناظم الضلع کو پہونچی تو دریافت حال کیلئے
خود جیلخانہ پر آئے اور محمد اسلام سے گفتگو کر رہے
تھے کہ راجہ بلونت سنگھ کا خاص ایلچی آ پہونچا، حکم تھا کہ
شیخ محمد اسلام بے جرم قید ہیں فوراً رہا کیا جائے۔ محمد اسلام
کی رہائی کی خبر شہر میں مشہور ہوتے ہی مومنین قلعہ شاہی پر
جمع ہو گئے۔ قید خانہ سے نکل کر محمد اسلام سیدھے روضہ
امیر المومنینؑ پر درگاہ پنجہ شریف گئے اور نشان کف مبارک کو
بوسہ دے کر دو ادائے شکرانہ بجا لائے۔ پھر اپنے عزاخانہ پر آ کر
تمام دن تعزیے کے متعلق انتظامات میں مشغول رہے اور
شہر میں ۱۹ صفر کو چہلم شہدائے کربلا منائے جانے کا اعلان کیا
گیا چونکہ محمد اسلام کی معجزنما رہائی کی خبر تمام شہر میں مشہور تھی
کسی نے مخالفت نہ کی اور اس سال چہلم شہدائے کربلا ۱۹ صفر
کو ہو گیا پھر سال آئندہ سے اب تک یہی تاریخ چہلم کی رائج
ہو گئی۔ صرف عزاخانہ سید آقا غلام عباس واقع محلہ کٹگھرہ
ایک ایسا عزاخانہ رہ گیا جہاں اب تک چہلم ۲۰ صفر کو ہوتا رہا
ہے۔ یہ چہلم محلہ کٹگھرہ کے چہلم کے نام سے مشہور ہے۔ یہ عزاخانہ
سنہ ۱۸۷۱ء میں جو سیلاب آیا گر کر تباہ ہو گیا صرف ایک چوک بچ
رہا۔ اہل خاندان کے حالات بعد غدر ایسے نہ تھے کہ عزاخانہ کو
پھر سے تعمیر کراتے یا عزاداری قائم رکھتے اس لئے کٹگھرہ کا چہلم
سنہ ۱۸۷۱ء کے بعد بند ہو چکا تھا۔ جو سنہ ۱۹۰۲ء میں سیدہ افشاں بیگم
والدہ عباس مرزا ایڈووکیٹ کی ایک منت کے سلسلہ میں پھر قائم
ہوا اور اب سال بسال ترقی کرتا جا رہا ہے۔

حکومت برطانیہ ۱۷۶۴ء سے ۱۹۴۷ء تک

آغاز دور برطانیہ کے قبل سنہ میں
جونپور ۲۰۰ سال تک سلطنت مغلیہ کے زیر اقتدار رہی تھی۔ یہ
زمانہ عزاداریوں کے عروج و بقا کے لحاظ سے عزاداری
جونپور کی ایک ہزار سالہ تاریخ کا سب سے زیادہ کامیاب اور
اہم دور گزرا ہے۔ سنہ ۱۷۶۴ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے اقتدار
کو جونپور کے علماء اور عوام وطن عزیز پر غیر ملکی اور عیسائی
حکام کا وجود اپنی قومی ذلت تصور کرتے تھے اس لئے یہ زمانہ
غیر اطمینانی حالت میں گذرا ہے۔

اب تک امراء اور جاگیرداروں کے عزاخانے قرب و جوار
کے علاقوں میں عزاداری کا مرکز ہوا کرتا تھا۔ مگر اس وقت ہر
خاص و عام کی تمام تر توجہ ایسی تحریکوں کی طرف مبذول ہوئی
جس سے قوم پر حکومت وقت کے مذہب عیسائیت کا غلبہ نہ
ہونے پائے جس کا عزاداری فرزند رسولؐ بہترین اور کارآمد
ذریعہ تھا۔ چنانچہ جاگیرداروں اور زمینداروں نے اپنے حلقہ
اثر میں جگہ جگہ عزاخانے اور عزاداریاں شروع کرا دیں اور
چند ہی سال کے اندر گاؤں گاؤں پختہ یا خام عزاخانے نظر
آنے لگے ہر موضع اپنی عزاداریوں کا خود مرکز بن گیا امراء اور
زمینداروں سے ہر طرح کا تعاون حاصل تھا جس کی وجہ سے
عزاداری گھر گھر پہونچ گئی اور تحفظ اسلام کا باعث ثابت ہوئی۔
برادران اہلسنت اور برادران اہل ہنود نے بھی بکثرت حصہ
لینا شروع کر دیا جو سلسلہ جونپور اور اطراف جونپور میں آج تک
باقی ہے۔ گو سلطنت برطانیہ کے دور میں عزاداریوں پر
نہ کوئی پابندی لگائی گئی اور نہ حوصلہ افزائی ہوئی مگر اس دور
میں عزاداریاں ہر گھر میں قائم ہو گئیں جو اب بھی ہو رہی ہیں۔

دور حاضر میں جونپور کی عزاداریاں

اس وقت شہر و مضافات جونپور میں
عزاخانے ایسے ہیں جو آباد ہیں جو تغلق دور کی یادگار ہیں،
شرقی عہد کے بھی عزاخانے ہیں جو جونپور کی عزاداریوں کی
رونق بنے ہوئے ہیں۔ دور مغلیہ کے تعمیر کردہ عزاخانوں میں
بیشتر قائم اور آباد ہیں جن میں سے ہر ایک کی تفصیل اس مضمون
میں اس دور کے تذکرہ کے ذیل میں دی جا چکی ہے۔ جس کے
علاوہ عزا ... امام چوک موجود ہیں جن پر تمام عزا میں عزاداریاں

زمانہ قدیم سے ہوتی چلی آرہی ہیں یہ تمام امام چوک کسی نہ کسی قدیم عزاخانے کی پسماندہ یادگاریں ہیں جن کے عزاخانے غدر ۱۸۵۷ء میں منہدم ہو گئے یا سکندر لودی نے مسمار کرا دئے تھے اور پھر نہ بن سکے۔ علاوہ ان عزاخانوں اور امام چوک کے شہر جونپور اور مضافات جونپور میں بارہ نشان قدم مبارک جناب سرور کائنات اور آٹھ نشان کف مبارک جناب امیر المومنین حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام موجود ہیں۔ آغاز سلطنت برطانیہ کے بعد جو عزاداری کی تحریک کارفرما تھی اس کے نتیجہ میں ہر محلہ ہر موضع اور ہر شیعہ گھر میں تعزیہ داری ہونے لگی اور اکثر برادران اہلسنت اور برادران اہل ہنود بھی تعزیہ دار ہوگئے۔ اگر ہر گھر، ہر موضع، ہر امام چوک اور ہر عزاخانہ کی عزاداریوں پر صرف چند ہی سطور لکھے جائیں گے تو بھی ایک ضخیم کتاب تیار ہو جائے گی جو اس مضمون میں نہ تو ممکن ہے اور نہ اس کی گنجائش ہے اس لئے میں یہاں پر صرف اسی قدر دور حاضرہ پر روشنی ڈالنا مناسب سمجھتا ہوں کہ ناظرین کو بخوبی اندازہ ہو سکے کہ ہمارے قدیم اور عظیم ماضی نے یادگار اہلبیت رسول اور شہدائے کربلا کی جو امانت ہمارے سپرد کی ہے ہم اہل جونپور آج بھی اس کی پورے خلوص سے حفاظت کر رہے ہیں۔

چنانچہ میں عشرہ محرم کے مخصوص جلوسوں کی تفصیل اور ہر حلقہ غم کے مرکزی جلوسوں کی فہرست دے کر اپنے مقصد کو پورا کرتا ہوں۔

"عشرہ محرم" ایک ہزار سال سے زیادہ کی جدوجہد کے بعد جب عزاداری فرزند رسولؐ شہر و مضافات جونپور کے ہر گھر تک پہونچ چکی ہے تو عشرۂ محرم کے دوران یہاں ہر مکان بشیعہ گھر اور اکثر مکانات برادران اہلسنت میں عزاداری کے لحاظ سے عزاخانہ کا منظر پیش ہونے لگتا ہے۔ دوران محرم میں ہر حلقۂ غم کے چھوٹے بڑے جلوسوں کی تعداد کا صحیح اندازہ واقعی ممکن نہیں ہے پھر بھی پہلی محرم تا نہم ۹ محرم جونپور شہر اور اطراف میں دو سو سے زیادہ ایسے جلوس برآمد ہوتے ہیں جو دور دور تک کے مسلمانوں کو اپنی طرف رجوع ہونے کی دعوت دیتے ہیں ان جلوسوں میں نوے ۹۰ دن کے اندر اٹھاون ۵۸ جلوس شبیہ ذوالجناح کے ہوتے ہیں۔ تینتیس ۳۳ جلوس شبیہ علم مبارک کے ہوتے ہیں۔ اٹھائیس ۲۸ جلوس میں شبیہ تابوت برآمد ہوتا ہے۔

گہوارہ حضرت علی اصغرؑ کے تیس جلوس مختلف تاریخوں میں مرکز زیارت ہوتے ہیں۔ ساتویں محرم کو علاوہ دیگر جلوسوں کے بتیس ۳۲ جلوس مہندی حضرت قاسمؑ کے برآمد ہوتے ہیں۔ بعض عزاخانوں میں چوکی برآمد ہونے کا قدیم رواج ہے اور ایسے چھ عزاخانے ہیں۔ برادران اہلسنت کے عزاخانوں سے تعزیہ کے علاوہ جلوس براق بھی برآمد ہوتا ہے۔ واضح رہے کہ یہ مشہور ترین جلوسوں کی تعداد ہے نہ کہ کل جلوسوں کی جو دوران محرم میں برآمد ہوتے ہیں۔

جونپور میں محرم کی چوتھی، چھٹی، ساتویں اور آٹھویں تاریخیں بہت مشہور ہیں ان تاریخوں میں غیر ضلعوں کے مسلمان کثرت سے جونپور کی عزاداریوں میں شرکت کرتے ہیں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان تاریخوں کے مخصوص جلوسوں کی تفصیل بھی یہاں پر درج کر دی جائے:۔

چوتھی محرم کو بوقت سہ پہر محلہ عالم خاں سے ایک بہت بڑا جلوس عزا نکلتا ہے جس میں تربت، گہوارہ اور علم مبارک ہوتے ہیں کئی جوڑ ماتمی طبل اور ماتمی انجمنیں نوحہ و ماتم زنجیریں اور قمع لگاتی ہوئی ہمراہ جلوس ہوتی ہیں۔ شہر کے اندر یہ جلوس گشت کرتا ہوا مغرب کے وقت عزاخانہ کاظم علی خاں صاحب واقع محلہ ٹولہ جاکر ختم ہوتا ہے۔ مجمع کثیر آخر وقت تک جلوس کے ہمراہ رہتا ہے۔

چھٹی محرم اس تاریخ کو عزاخانہ مرزا سنگین بیگ کے امام چوک سے بیبی جہاں کنگھورہ کا جلوس ہوتا ہے بعد ختم مجلس جنہیں ذاکری مولوی سبط حسن رضوی صاحب کے لئے مخصوص ہے نکلتا ہے۔ یہ جلوس اور اس کا علم

اپنی اہمیت کے لحاظ سے جونپور میں بہت اہم اور مخصوص تصور کیا جاتا ہے۔ چوک مذکور سے برآمد ہونے کے بعد اپنے مخصوص راستوں چوراہا ولندگنج، پل شاہی جونپور، چوراہا چہارسو بازار سے گزرتا ہوا حسینیہ کلو مرحوم کے سامنے سے ہوکر محلہ میرست، محلہ شیخ محامد، محلہ اجمیری سے گزرتا ہے اور شام کے بعد مفتی جعفر صاحب کے عزاخانہ واقع محلہ حمام دروازہ جاکر ختم ہوتا ہے۔ تمام ایام عزا میں صرف یہی ایک ایسا جلوس عزا ہوتا ہے جو جونپور کی تمام شاہراہوں پر سے گزرتا ہے اور شہر جونپور کے ایک سرحدی محلہ سے دوسرے سرحدی محلہ تک جاتا ہے۔ جس وقت شہر سے یہ جلوس گزرتا ہے حکام ضلع کو تمام ٹریفک بند رکھنا پڑتی ہے کیونکہ جلوس کے ہمراہ شہر کے تمام ماتمی دستے زنجیری ماتم اور قمع لگاتے ہوئے ساتھ رہتے ہیں اور جابجا بذریعہ لاؤڈ اسپیکر مسلم و غیر مسلم مقررین کی تقریریں برابر ہوتی رہتی ہیں۔ یہ جلوس آج کل زیر انصرام انجمن بزم عزا اکگھرہ برآمد ہوتا ہے جس کے صدر مرزا اشفاق حسین صاحب اور سرپرست مرزا انیس احمد صاحب ہیں۔

ساتویں محرم کو عشرہ محرم کی عزاداریوں کے سلسلہ میں بڑی خصوصیت حاصل ہے

اس روز جونپور شہر و اطراف میں تمام دن اور تمام شب جلوس عزا اور جلوس مہندی حضرت قاسمؑ کا سلسلہ قائم رہتا ہے۔ اس تاریخ کے شب و روز کے اندر تقریباً چوسٹھ[۶۴] جلوس عزا برآمد ہوتے ہیں جن میں اس تاریخ کا مہندی کے مخصوص جلوس شہر و مضافات میں بتیس[۳۲] عزاخانوں سے برآمد ہوتے ہیں اور بتیس[۳۲] عزاخانوں سے شبیہ ذوالجناح برآمد ہوتی ہے۔ جلوس مہندی کے لئے عزاخانے محلہ ملع خانہ، عزاخانہ شیخ التفات حسین صاحب، عزاخانہ میر سید مصطفےٰ بلوا گھاٹ بہت مشہور ہے۔

ساتویں کا دن اور تقریباً نصف شب ختم کرکے محلہ خواجہ دوست پکی خانہ کے عزاخانہ سے بعد ختم مجلس جلوس شبیہ ذوالجناح برآمد ہوتا ہے اور عزاخانہ حکیم فتح محمد صاحب تک جاتا ہے۔ اسی وقت عزاخانہ نبی صاحب واقع محلہ سپاہ سے جلوس شبیہ ذوالجناح عزاخانہ حکیم مذکور پر پہونچتا ہے۔ ہر دو ذوالجناح کا ملنا ایک عجیب منظر پیش کرتا ہے، مومنین شدت گریہ سے بیتاب نظر آتے ہیں یہاں تک کہ سحر نمودار ہونے لگتی ہے اس کے بعد مجمع منتشر ہوتا ہے۔ محلہ خواجہ دوست کا عزاخانہ شہر کے اہم عزاخانوں سے ایک ہے اور یہی حیثیت تاریخ جونپور میں عزاخانہ نبی صاحب واقع محلہ سپاہ کو حاصل ہے۔

آٹھویں محرم کو ہر عزاخانہ سے کوئی نہ کوئی شبیہ برآمد ہوتی ہے ان میں سے بارہ[۱۲] عزاخانوں کے جلوس ذوالجناح، سات عزاخانوں کے جلوس تربت، تابوت، گہوارے اور علم مبارک بہت مقبول ہیں۔ شہر جونپور کی آٹھویں بہت دور دور تک مشہور ہے، نزدیک کے تمام اضلاع کے لوگ اس تاریخ کو زیارت شبیہ ذوالجناح عزاخانہ ناظم علی خان واقع محلہ نقیب خان منڈی کے واسطے آتے ہیں۔ ناظم علیخاں مرحوم تحصیلدار اودھ نے ایک عظیم الشان عزاخانہ تعمیر کیا جس میں اس قدر قیمتی اور نایاب جھاڑ فانوس اور نادر قسم کے زر دوزی اور دیگر قسم کے تبرکات فراہم کئے کہ اس کی مثال سوائے شاہان اودھ کے عزاخانوں کے کہیں نہ ملے گی۔

اس عزاخانے میں یکم تا نہم[۹] محرم دس بجے دن میں مجلس ہوتی ہے پہلے لکھنؤ سے کسی نہ کسی بلند پایہ ذاکر کو بلایا جاتا تھا۔ مولانا مظفر حسین صاحب قبلہ لکھنوی نے تیس[۳۰] سال تک اس عزاخانے میں ذاکری کی ہے۔ آٹھ محرم کو بارہ[۱۲] بجے دن میں مجلس شروع ہوتی ہے۔ سوزخوانی کے بعد ذاکر فضائل و مصائب شہدائے کربلا بیان کرتا ہوا جس وقت شہادت امام مظلوم پر آتا ہے عین اسی وقت عزاخانے کے ایک گوشہ سے شبیہ ذوالجناح نمودار ہوتی ہے مجلس ختم ہو جاتی

مومنین اپنے سروں پر خاک اڑاتے ہوئے اٹھ کھڑے
ہوتے ہیں سینہ زنی شروع ہو جاتی ہے۔ ذوالجناح
عزاخانے سے باہر آتا ہے عوام کا کثیر مجمع ساتھ ہو جاتا ہے
جس میں ہر مذہب کے لوگ شریک ہوتے ہیں۔ اس جلوس
میں بہت ہاتھی ہوتے ہیں جو سنہرے روپہلے ہودج اور زیورات
سے مزین ہوتے ہیں۔ ہر ہاتھی پر سونے اور چاندی کے
پنجوں اور زردوزی کے پٹکوں کے علم مبارک لے کر لوگ
بیٹھے ہوتے ہیں۔ اس کے بعد کئی جوڑ جونپوری ماتمی طبل
تاشے اور جھانجھ ہوتے ہیں۔ اور تخت بند گاڑیوں
پر شہنائی نواز نقار خانے ہوتے ہیں جو شہنائی کے ذریعہ
پُر درد دھن میں نوحہ خوانی کرتے ہوئے جلوس کے
ساتھ ساتھ بڑھتے رہتے ہیں۔ آگے آگے چودہ بڑے
علم ہوتے ہیں جن کی بلندی تقریباً ۲۵ فٹ ہوتی ہے
ہوا میں لہراتے ہوئے پھریروں پر سُرخ چھینٹے قلب پر
ضرب لگاتے اور رُلاتے ہیں کہ میدان کربلا میں علمدار
فوج شاہ کربلا اور سقائے سکینہؑ کے خون سے اسلام کا
پرچم اسی طرح رنگین ہوا تھا۔ پنجہ کے ساتھ ہی حضرت
سکینہؑ کا خشک مشکیزہ بندھا ہوا ہے جس میں ایک
پیوست تیر گواہی دیتا ہے کہ خیام حسینی تک پانی نہیں پہونچ
سکا تھا۔ ان علموں کے آگے شہر کی تمام انجمنیں نوحہ و ماتم
کرتی زنجیریں اور قمع لگاتی ہوئی چلتی ہیں اور مظلوم امام
کے مرکب کی شبیہ کو اپنے حلقہ میں لئے رہتی ہیں، جس کو
دیکھتے ہی ایک منظر آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے اور بعد شہادت
حسینؑ مظلوم جب ذوالجناح تنہا در خیمہ گاہ پر آیا تھا
اہلبیت نے یونہی حلقہ کرکے نوحہ و گریہ کیا ہوگا۔

اس شان کی شبیہ ذوالجناح کم دیکھنے میں آتی ہے
قیمتی زردوزی کے شامیانے کے نیچے گھوڑے پر خون سے تر
چادر پڑی ہوئی، جگہ جگہ تیر پیوست، باگیں کٹی ہوئی، ڈھال
آویزاں اسی کے ساتھ میان میں ذوالفقار، امام کا عمامہ
پشت ذوالجناح پر رکھا ہوا بڑا ہی دل شکن منظر پیش کرتا ہے
اس کے بالکل پیچھے حسینؑ مظلوم کے شش ماہے علی اصغرؑ کا
خالی جھولا، غیر مسلم بھی چشم پرنم نظر آتے ہیں۔ یہ جلوس
عزاخانہ ناظم علی خان سے برآمد ہو کر شیخ التفات حسین مرحوم
کے عزاخانہ تک جاتا ہے جو مسجد اٹالہ کے مقابل واقع ہے
جس وقت ذوالجناح شیخ التفات حسین کے عزاخانہ
کے سامنے پہونچتا ہے اس وقت عزاخانہ مذکور کے اندر
سے ایک تابوت برآمد ہوتا ہے اور ذوالجناح سے ملتا ہے
پھر تابوت اور ذوالجناح عزاخانہ کے اندر جاتے ہیں،
تھوڑی دیر کے بعد ذوالجناح پھر باہر آجاتا ہے اس
وقت آفتاب غروب ہو رہا ہوتا ہے۔ اب مختصر جلوس
کے ساتھ ذوالجناح اپنے عزاخانہ پر واپس ہو کر وہاں
ساتویں کو رکھی گئی مہندی سے ملتا ہے اس وقت
تمام شہر کی خواتین عزاخانہ ناظم علی خاں میں جمع رہتی
ہیں، ذوالجناح کو اپنے حلقہ میں لے کر دیر تک نوحہ و ماتم
کرتی رہتی ہیں، اس وقت وہی منظر سامنے ہوتا ہے
جس طرح کربلا میں بعد شہادت امام مظلوم جب ذوالجناح
در خیمہ پر تنہا آیا تھا اور اہلبیت حلقہ کئے ہوئے گریہ و ماتم
کر رہے تھے۔ اس طور سے جونپور میں ایام عزا کا
آٹھواں دن تمام ہوتا ہے۔ پھر شب میں سید کاظم حسین
ساکن ورسیہ کے عزاخانہ سے شبیہ ذوالجناح برآمد ہوتی ہے
جس کا گشت تمام شب رہتا ہے۔

نویں محرم — کا دن ہر عزادار کے لئے بڑی مشغولیت
میں تمام ہوتا ہے جس کے یہاں تعزیہ
نہیں بھی رکھا جاتا وہ لوگ بھی نذر و فاتحہ کے انتظامات
میں مشغول رہتے ہیں چنانچہ اس روز جلوس عزا زیادہ
نہیں برآمد ہوتے پھر بھی شہر اور اطراف جونپور میں
اس تاریخ کو چھوٹے عزاخانوں میں شبیہ ذوالجناح برآمد
ہوتی ہے اور تین جلوس علم مبارک اور حضرت علی اصغرؑ کے

گوار سے نکالے جاتے ہیں۔ چار عزاخانوں سے تربت اور تابوت اُٹھائے جاتے ہیں۔ اس تاریخ کے تمام جلوس عزا میں میر گھر محلہ دریبہ کے جلوس شبیہ ذوالجناح کو صدر جلوس تصور کیا جاتا ہے اس عزا خانہ میں تقریباً بارہ ۱۲ بجے دن میں بعد مجلس ذوالجناح برآمد ہوتا ہے ہاتھیوں پر لوگ علم لئے ہوتے ہیں کئی جوڑ ماتمی طبل ساتھ رہتے ہیں۔ ماتمی انجمنیں نوحہ و ماتم کرتی ہوئی جلوس کے ہمراہ ہوتی ہیں، یہ جلوس محلوں کا گشت کرتا ہوا عزاخانہ دالان پہونچتا ہے اور عزاخانہ مذکور کے اندر جاتا ہے وہاں سے واپسی پر محلہ پرانی بازار، چھتری گھاٹ، محل غازی سے گذر کر صدر امام باڑہ پہونچتا ہے اور بوقت سہ پہر اپنے عزاخانے پر واپس آتا ہے۔

یوم عاشور

جونپور کا قدیم شہری حصہ جہاں شیعی آبادی کی کثرت ہے دریائے گومتی کے شمالی ساحل پر آباد ہے۔ اس جانب کے تمام محلوں اور مضافات کے تعزیے برائے دفن صدر امام باڑہ جونپور میں لائے جاتے ہیں جن کا سلسلہ طلوع آفتاب کے ساتھ ہی شروع ہوجاتا ہے اور تا شام جاری رہتا ہے۔ اکثر عزاخانوں کے تعزیوں کے ہمراہ طبل اور اکثر کے ساتھ گاڑیوں پر نقارخانے ہوتے ہیں۔ دن کے آخر وقت شہزادوں کا تعزیہ (شرقی) بادشاہوں کی قبر سے اٹھ کر صدر امام باڑے لایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ شہر کی انجمنیں بڑے بڑے علم لئے ہوئے نوحہ و ماتم کرتی ہوئی صدر امام باڑے میں داخل ہوتی ہیں اور روضہ امام حسینؑ اور روضہ حضرت عباسؑ کے درمیان رک کر تا دیر ماتم و گریہ کرتی رہتی ہیں۔

دریائے گومتی کے جنوبی ساحل کے محلوں اور مضافات کے تعزیے برائے دفن کربلا خانقاہ ذاکران واقع محلہ کنگھرہ لائے جاتے ہیں۔ پہلا جلوس عزاخانہ بڑے امام باڑے سے واقع محلہ دلاذاق کا قبل دوپہر پہونچتا ہے جہاں لوگ اعمال عاشورہ کے لئے کربلا خانقاہ ذاکران اور مقبرہ حسن بیگ کے درمیان لب دریائے گومتی جمع ہو جاتے ہیں، عجیب منظر ہوتا ہے ریتیلے نمازی، سامنے بہتا ہوا دریا، دریائے فرات کا منظر پیش کرتا ہے ان جھاڑیوں کے درمیان خاکسار کی نمازیں کربلا میں شہدائے کربلا کی نمازوں کی یاد تازہ کر دیتی ہیں۔

تقریباً ۱۲ بجے دن کے بعد جب محلہ نئی گنج کا جلوس تعزیہ آجاتا ہے اس کے بعد عزاخانہ مرزا محمد امین مرحوم واقع محلہ کنگھرہ میں مجلس شروع ہوتی ہے جس میں تاحیات ذاکری عباس مرزا ایڈوکیٹ کرتے تھے اب مرزا اشفاق حسین ذاکر ہیں بعد ختم مجلس جلوس تعزیہ برآمد ہوکر بیاگ ساہو کی گلی سے گذرتا ہوا منشی اکبر کے تعزیہ سے مل کر امام چوک مرزا سنگین بیگ پر منزل لیتا ہے اور چوک کے گرد تا دیر انجمنیں نوحہ و ماتم کرتی رہتی ہیں پھر جلوس موضع تاراپور میں داخل ہوتا ہے اب جلوس میں شبیر خاں صاحب کا اور رحیم رضان اور بگی بی بی کے تعزیئے جلوس میں شامل ہو جاتے ہیں اب یہ جلوس موضع طرپور دالی پور سے گذر کر سرکاری سڑک پر آتا ہے اور مہابیر باغ دھرم شالہ کے صدر پھاٹک کے سامنے سڑک پر رکھ دیا جاتا ہے جب فقیران کنگھرہ کا تعزیہ ان کے چوک واقع محلہ دلاذاق سے آکر ملتا ہے اس وقت جلوس کربلا ذاکران کنگھرہ کی طرف بڑھتا ہے۔ جس وقت جلوس عزا درمیان کربلا خانقاہ ذاکران اور مقبرہ نواب غازی مرزا منعم خاں خانخاناں پہونچتا ہے اس وقت کنگھرہ کے زنانے عزاخانوں سے تعزیئے برآمد ہوتے ہیں چھوٹے چھوٹے بچے سروں پر تربتیں لئے ہوئے یا سکینہؑ یا عباسؑ کی صداؤں کے ساتھ عجب دل دوز انداز سے سینہ زنی کرتے ہوئے بڑھتے ہیں ساتھ ہی زنانہ عزاخانوں سے الوداعی نوحہ و ماتم اور گریہ و بکا کی آوازیں آتی رہتی ہیں، بہت ہی رقت خیز منظر ہوتا ہے۔ اس کے بعد تمام جلوس کا یہ سلسلہ کربلا پہونچتا ہے اور تعزیئے بعد فاتحہ خوانی کے دفن کئے جاتے ہیں۔

مجلس شام غریباں

صدر امام باڑہ جونپور میں تعزیوں کے دفن ہو جانے کے بعد جو تقریباً مغرب کا وقت ہوتا ہے مومنین عیدگاہ صدر امام باڑہ کے احاطہ میں جمع ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ بعد غروب آفتاب مجلس شام غریباں شروع ہو جاتی ہے جس میں ذاکری مولوی سبط حسن رضوی صاحب کرتے ہیں۔ تمام صحن مسجد میں اندھیرا ہوتا ہے مومنین خاک نشین ہوتے ہیں سب شدت گریہ سے بیتاب نظر آتے ہیں دوران بیان میں دور سے ایک روشنی نظر آتی ہے جو نزدیک ہوتی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ایک طشت میں شمعیں روشن ہیں اس کے پیچھے ایک تابوت نظر آتا ہے یہ بڑا ہی درد انگیز منظر ہوتا ہے مومنین کا اضطراب اور بھی زیادہ ہو جاتا ہے یہ وقت مجلس کے اختتام کا ہوتا ہے اس کے بعد نوحہ و سلام کا سلسلہ شروع ہوتا ہے اور مجمع منتشر ہونے لگتا ہے۔

"زمانہ اربعین کی عزاداریاں"

عشرہ محرم کے بعد شہر کے عزاخانوں میں ہفتہ میں ایک مجلس ہوتی ہے۔ ان مجالس کے لئے ہر عزاخانہ میں ہفتہ کا ایک ایک دن مجلس کے لئے مقرر ہے۔ ان کے علاوہ اکثر عزاخانوں میں عشرہ ثانی بھی ہوتا ہے جن میں قدیم اور مشہور عشرہ ثانی مفتی صاحب کے عزاخانہ واقع مفتی محلہ کا ہے جہاں ۱۱ر صفر سے ۱۸ر صفر تک مجالس کا سلسلہ ——— رہتا ہے مشہور ذاکرین باہر سے مدعو ہوتے ہیں۔ دوسرا قدیم عشرہ ثانی ذوالقدر بہادر کے عزاخانہ میں ہوتا ہے جہاں سلسلہ مجالس ۱۱ر صفر سے شروع ہوتا ہے یہاں صبح کے وقت مجالس منعقد ہوتی ہیں۔ ہر دو عشرہ ہائے ثانی میں مومنین شہر و مضافات بکثرت شرکت کرتے ہیں۔

یہ چہلم شہدائے کربلا کے دو عشرہ ہائے ثانی مخصوص ہیں ایک عزاخانہ محمد سعید خاں صاحب مفتی محلہ اور دوسرا سید طاہر حسین خاں صاحب مرحوم کے عزاخانہ پر محلہ میرمست میں ان عشروں میں کسی بیرونی عالم کو مدعو کیا جاتا ہے۔

ان عشرہ ہائے ثانی کے علاوہ روزہی شہر جونپور اور اطراف جونپور میں مجالس اور کوئی نہ کوئی جلوس عزا برآمد ہوتا ہے جن میں سے چند مخصوص جلوسہائے عزا کا تذکرہ یہاں پر بے موقع نہ ہوگا مثلاً چوبیس[۲۴] محرم کو بوقت شب جلوس شبیہ ذوالجناح جو قاضی تصدق حسین صاحب کے عزاخانے واقع مفتی محلہ سے برآمد ہوتا ہے۔ دوسری صفر کو منجانب خواتین جونپور تابوت حضرت سکینہؑ صدر امام باڑہ جونپور میں برآمد ہو کر اندرون احاطہ گشت کرتا ہے۔ اسی روز شب میں ایک مجلس عزا عباس مرزا ایڈوکیٹ مرحوم کی کوٹھی آغا منزل عباس مرزا روڈ پر منعقد ہوتی ہے جو جونپور کی مشہور مجلسوں میں شمار ہوتی ہے۔ صفر کے پہلے پنجشنبہ کو محلہ پرانی بازار ہی سے جلوس عماری برآمد ہو کر صدر امام باڑہ تک جاتا ہے۔ پھر آٹھ صفر کو تابوت ثانی زہرا حضرت زینبؑ منجانب خواتین جونپور صدر امام باڑہ میں برآمد ہوتا ہے۔ اور پندرہ صفر کو شبیہ علم مبارک سید نظیر حسن خاں صاحب محلہ میرمست کے عزاخانہ سے برآمد ہو کر جا... اور ماتمی دستوں کے ساتھ عزاخانہ پنجن پر آکر اختتام پذیر ہوتا ہے ۱۷ر صفر کو مفتی صاحب کے عزاخانہ مفتی محلہ سے شبیہ ذوالجناح برآمد ہوتی ہے جس میں شرکت کے لئے دور دور تک کے مومنین آتے ہیں۔

"چہلم شہدائے کربلا"

چہلم شہدائے کربلا کی تاریخ پہلے بیان کی جاچکی ہے۔ اس وقت کچھ جلوس چہلم پر روشنی ڈالنا مقصود ہے۔ جونپور کے چہلم کا مرکز عزاخانہ شیخ محمد اسلام ہوتا ہے عزاخانہ کے چوک پر اٹھارہ صفر کو بوقت مغرب تربت رکھدی جاتی ہے اور تمام شب نوحہ و ماتم نذر و فاتحہ کا سلسلہ قائم رہتا ہے اور تا سحر مجمع کثیر رہتا ہے ۱۹ر صفر کو قریب ۱۲ بجے دن میں مجلس شروع ہو جاتی ہے بعد ختم مجلس تربت برآمد ہوتی ہے اور اس کے پیچھے عزاخانہ مذکور کے چوک کا تعزیہ بھی شامل ہو جاتا ہے۔ یہ جلوس محلہ الف خاں

یا قاضی کی گلی سے گذرتا ہوا اپنے مخصوص راستوں سے ہو کر عزاخانہ نقی سچانک پر بوقت مغرب کچھ دیر قیام کرتا ہوا صدر امام باڑہ جاکر دفن ہوتا ہے۔ راستہ بھر شہر کے دیگر عزاخانوں کے تعزیئے جلوس میں شامل ہوتے جاتے ہیں۔ جلوس کی شان اور مجمع کی کثرت اپنی مثال خود ہوتی ہے لوگ غیر اضلاع سے اس روز بکثرت جونپور بغرض شرکت چہلم آتے ہیں۔

چہلم شہدائے کربلا محلہ کٹگھرہ

شہر جونپور کا چہلم سوا محلہ کٹگھرہ کے ۱۹ صفر کو تمام ہوجاتا ہے۔ محلہ کٹگھرہ میں حسب دستور قدیم چہلم ۲۰ صفر کو ہوتا ہے اور اسی تاریخ کو تمام مضافات جونپور میں بھی چہلم منایا جاتا ہے سوا موضع اِملو کے جہاں ۲۱ صفر کو چہلم ہوتا ہے اور قصبہ ظفرآباد کا چہلم ۲۲ صفر کو ہوتا ہے۔

محلہ کٹگھرہ میں چوک مرزا سنگین بیگ پر تعزیہ ۱۹ صفر کی شام کو رکھا جاتا ہے اور ۲۰ صفر کو تقریباً تین بجے دن بعد مجلس جس میں ذاکری جناب مولانا سید محمد زماں صاحب فرماتے ہیں جلوس برآمد ہوتا ہے اور محلہ تاراپور، عمرپور، مالی پور سے گذر کر سڑک سرکاری پر آتا ہے اور کربلا خانقاہ ذاکران پہونچ کر تقریباً ۹ بجے شب میں دفن ہوتا ہے۔ جلوس کے ہمراہ شہر کے ماتمی دستے مع علم مبارک کے ہوتے ہیں اور کئی جوڑ طبل آخر وقت تک ساتھ میں بجا کرتے ہیں۔ شہنائی جلوس کے ہمراہ دردانگیز دھن میں نوحہ ومرثیہ خوانی کرتی رہتی ہے مومنین کا مجمع بہت زیادہ ہوتا ہے۔

یوم شہادت محمد مصطفیٰ و حسن مجتبیٰؑ

۲۸ صفر یوم شہادت رسول اسلام اور فرزند رسول جناب حسن مجتبیٰؑ ہے۔ چنانچہ اٹھائیس صفر کی شب کو جونپور شہر کے تقریباً ہر عزاخانہ اور مضافات جونپور کے تینتیس عزاخانوں میں تعزیئے رکھے جاتے ہیں اور مجالس منعقد ہوتی ہیں۔ مولوی عنایت حسین مرحوم ساکن مخدوم شاہ اڑھن کے یہاں کی عزاداری اس روز کی مرکزی عزاداری تصور کی جاتی ہے

اسی روز ایک بڑی مجلس مرزا محمد احمد صاحب ساکن محلہ رضوی خاں کے یہاں ہوتی ہے۔

۲۸ صفر کو قاضی صاحب کے عزاخانہ محلہ سپاہ پر مجلس ہوتی ہے جس میں کوئی باہر کا عالم ذاکری کے لئے مدعو ہوتا ہے۔ مفتی محلہ میں سید محمد سعید خاں صاحب کے عزاخانہ پر بعد دوپہر مجلس منعقد ہوتی ہے پھر تعزیہ برآمد ہوتا ہے۔ شہر کے تعزیئے ایک جلوس کی شکل میں طبل اور ماتمی دستوں کے ہمراہ جن کے ساتھ علم مبارک بھی ہوتے ہیں صدر امام باڑہ تک جاتے ہیں جہاں تعزیوں کی تدفین عمل میں آتی ہے

آٹھ ربیع الاوّل

اس تاریخ کو دو خصوصیتیں حاصل ہیں۔ اسی تاریخ کو اہل حرم قید شام سے رہائی کے بعد وارد مدینہ ہوئے تھے دوسرے یہ کہ اسی تاریخ کو گیارہویں امام حضرت حسن عسکری علیہ السلام زہر سے شہید کئے گئے۔ چنانچہ محلہ سپاہ اس تاریخ کی عزاداری کا مرکز ہوتا ہے جہاں تمام عزاخانوں میں تعزیئے رکھے جاتے ہیں اور ۸ ربیع الاول کو آٹھ بجے صبح مجالس کا سلسلہ شروع ہوتا ہے بعد اس کے جلوس تعزیہ برآمد ہوتا ہے جس کے ساتھ نقیب مصائب امام مظلوم اشعار کی صورت میں بطور نقابت پڑھتا ہے۔ یہ جلوس قبل دوپہر امام باڑہ نبی صاحب پر ختم ہوتا ہے۔ محلہ سپاہ کے علاوہ شب ہشتم ذوالقدر بہادر کے عزاخانہ میں بھی تعزیہ رکھا جاتا ہے اور ۸ ربیع الاوّل کو بعد مجلس قریب دس بجے دن کے مختلف راستوں سے جلوس صدر امام باڑہ جاکر ختم ہوتا ہے۔

شب بیداری

گذشتہ چالیس سال کے اندر جونپور میں شب بیداریوں کا رواج زمانہ اربعین میں قائم ہوا ہے۔ پہلے مولانا سید محسن نواب صاحب قبلہ مجتہد کے ایماء پر مفتی محلہ میں امام باڑہ چوک مجید میاں میں شب بیداری شروع ہوئی پھر اسی تاریخ کو یعنی ۷ ربیع الاوّل کو حسینیہ کلو مرحوم واقع محلہ مخدوم شاہ اڑھن میں شب بیداری کا سلسلہ جاری ہوا۔ ان شب بیداریوں میں زیادہ تر ذاکرین لکھنؤ اور غیر مقامات سے

مدعو کئے جاتے ہیں اور تمام رات تا وقت نماز سحر سلسلہ بیان جاری رہتا ہے۔

ان دو شب بیداریوں کے علاوہ زمانہ اربعین میں اکثر عزاخانوں میں شب بیداریاں منعقد ہوتی ہیں جن میں مولانا سید حرار حسین صاحب قبلہ کے یہاں مقبول منزل کی شب بیداری مخصوص تصور کی جاتی ہے۔

جلوس عماری

شہر جونپور میں صفر کے پہلے پنجشنبہ کو جلوس عماری برآمد ہو کر صدر امام باڑہ جونپور جاتا ہے۔ مجمع بہت زیادہ ہوتا ہے ماتمی انجمنیں اور طبل آخر وقت تک جلوس کے ہمراہ ہوتے ہیں۔

آٹھ ربیع الاول کو بعد نماز صبح جلوس عماری قصبہ بڑا گاؤں تحصیل شاہ گنج جونپور میں برآمد ہوتا ہے جو سید عباس حسینی صاحب ساکن بڑا گاؤں جونپور (نکہت الہ آباد) کی ذاتی دلچسپیوں کے نتیجہ میں کل ہند شہرت کا حامل ہو چکا ہے یہ جلوس پنجہ شریف بڑا گاؤں سے برآمد ہوتا ہے آگے آگے اونٹوں پر سیاہ عماریاں پھر علم مبارک اس کے شبیہ ذوالجناح، ماتمی انجمنیں نوحہ خوانی میں مصروف ہوتی ہیں۔ یہ جلوس تمام دن گشت کرتا ہوا بعد شام درگاہ میں داخل ہوتا ہے۔ نقیب نادبہ مصائب مظلوم کربلا و اہل حرم اشعار کی صورت میں بیان کرتا ہے عماریاں صحن درگاہ میں روضوں کے سامنے گشت کرکے عزاخانہ کے پاس ٹھہر جاتی ہیں۔ مجلس منعقد ہوتی ہے اس کے بعد مجمع منتشر ہونے لگتا ہے۔

سال کے دیگر ایام عزا اور تبلیغی مجالس

۲۸ رجب

جس سفر کا انجام روز عاشور محرم ۶۱ھ کو میدان کربلا میں رونما ہوا وہ سفر ۲۸ رجب سنہ ۶۰ھ کو مدینے سے شروع ہوا تھا۔ تاریخ اسلام کا یہ ناقابل فراموش دن ہے کہ اس روز فرزند رسولؐ نے نانا کا روضہ، ماں کی لحد، بھائی کا مزار اور وطن عزیز کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے الوداع کہہ کر مع اہلبیت و انصار راہ کربلا اختیار کی تھی۔ اس روز اہل جونپور حسینیہ ٹکور مرحوم میں ایک بڑی مجلس عزا منعقد کرتے ہیں جس میں مرزا افضل حیدر صاحب اور عطا حسین صاحب سوز خوانی کرتے ہیں پھر مولانا سید حرار حسین صاحب قبلہ مقصد سفر امام مظلوم پر مفصل روشنی ڈالتے ہیں پھر انجمنیں نوحہ خوانی کرتی ہیں۔

۲۹ رجب کو بھی اسی عزاخانہ میں مجلس اور آگ پر ماتم ہوتا ہے اور اکثر باہر سے مدعو کئے ہوئے ذاکرین بیان فرماتے ہیں۔

شہادت جناب امیر المومنین حضرت علیؑ

اس عزاداری کے لئے شہر جونپور میں عزاخانہ میر دور مرحوم واقع محلہ بلواگھاٹ مخصوص ہے جہاں ۱۹ رمضان کو بوقت سحر تعزیہ زینت عزاخانہ ہوتا ہے شب بستم کو اس عزاخانہ پر مومنین کا کثیر اجتماع تمام شب رہتا ہے مجلس منعقد ہوتی ہے جسمیں ذاکری جناب مولانا سید حرار حسین صاحب قبلہ کے لئے مخصوص ہے۔ بیس رمضان کو بعد مجلس تقریباً ۳ بجے دن کو جلوس تعزیہ برآمد ہو کر مع ماتمی انجمنوں اور علم مبارک کے قلعہ روڈ، پل شاہی سے گذر کر کچہری روڈ پر آتا ہے اور درگاہ پنجہ شریف جا کر عزاخانہ درگاہ حضرت عباسؑ میں رکھا جاتا ہے۔ بعد افطار و مجلس پھر جلوس نوحہ و ماتم کے ساتھ صحن روضہ امیر المومنینؑ میں لا کر ۲۰ رمضان کو تقریباً سات بجے شام کو دفن کیا جاتا ہے اور پھر مجمع منتشر ہو جاتا ہے۔

اس کے بعد شہر کے عزاخانوں میں مجالس کا سلسلہ رہتا ہے اور حکیم غفور صاحب کی مسجد اور محلہ پرانی بازار جونپور میں شب بیداری ہوتی ہے۔ ۲۱ رمضان کو دن اور رات میں بھی مجالس کا سلسلہ قائم رہتا ہے۔ علاوہ شہر جونپور کے مضافاتی عزاخانوں میں جلوس عزا اور مجالس کثرت سے منعقد ہوتی ہیں۔

یوم جنت البقیع

۸ شوال یعنی جس روز اہلبیت رسولؐ اسلام سے جو بغض رکھنے والوں کی تحریک کے مطابق شاہ ابن سعود نے ۱۹۲۶ء میں حضرت فاطمہ زہراؑ اور ان کی اولاد کی قبروں کو مسمار کر دیا تھا آج تک جونپور میں یوم غم کی حیثیت سے منایا جاتا ہے۔ اس روز ایک شبیہ علم مبارک

ناصریہ عربی کالج جونپور سے برآمد ہوتی ہے اور محلوں کا گشت کرتی ہوئی امام باڑہ کلو مرحوم میں آکر ختم ہوتی ہے اس کے علاوہ تقریباً ہر خانۂ مومن میں مجالس منعقد ہوتی ہیں۔

یوم شہادت حضرت مسلم بن عقیل

نوزدہم ذی الحجہ یوم شہادت حضرت مسلم کے سلسلہ میں زمانہ قدیم سے جونپور کے عزاخانوں اور مومنین کے گھروں میں مجالس عزا منعقد ہوتی تھیں اور یوم غم منایا جاتا تھا۔ تقریباً تیس سال یا اس سے کچھ زیادہ ہوئے کہ شیعہ خواتین نے صدر امام باڑہ جونپور میں تابوت حضرت مسلم برآمد کیا جسمیں ذاکری نوحہ و مرثیہ خوانی بھی عورتیں ہی کرتی ہیں۔ جلوس اندر احاطہ صدر امام باڑہ گشت کرتا ہے خواتین کی انجمنیں ہمراہ جلوس ماتم اور نوحہ خوانی کرتی رہتی ہیں قریب سہ پہر مجمع منتشر ہوتا ہے۔

تبلیغی مجالس

تمام سال جونپور میں زیادہ تر شنبہ کو کسی نہ کسی عزاخانہ میں مجلس ہوا کرتی ہے جسمیں کوئی غیر مقامی عالم ذاکری کے لئے مدعو کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ چند موقعوں پر علمار کا اجتماع بھی ہوا کرتا اور کئی کئی روز مجالس کا سلسلہ جاری رہتا ہے مثلاً مجالس بیادگار جناب مولانا سبط حسن صاحب قبلہ مرحوم جو عموماً دسہرہ کی چھٹیوں میں مفتی محلہ میں عزاخانہ مفتی صاحب میں منعقد ہوتی ہیں کم از کم چار یا پانچ روز سلسلہ مجلس قائم رہتا ہے۔

ذوالقدر بہادر کے عزاخانہ واقع محلہ دریبہ میں سالانہ مجالس منعقد ہوتی ہیں۔ خاندان ذوالقدر کے بزرگ بڑے پایہ کے مرثیہ گو گزرے ہیں موجودہ ذوالقدر بہادر جناب ناصر علی صاحب اور ان کے پسر اکبر سید محمد محسن صاحب ایم اے کو مرثیہ گوئی میں کافی مشق سخن ہے۔ ان مجالس میں اکثر نایاب مرثیوں کو سننے کا موقع ملتا ہے اس لئے مومنین کو ان مجالس کی تاریخوں کے اعلان کا انتظار رہتا ہے۔

• مضافات جونپور میں سالانہ مجالس کے سلسلہ میں تعلقہ رنو قصبہ بڑا گاؤں تحصیل شاہ گنج اور موضع تکھرہ کو خصوصیت حاصل ہے مقامی مومنین مہمان نوازی کے لئے مشہور ہیں۔

جونپور کا سب سے قدیم تبلیغی ادارہ **انجمن تبلیغ الاسلام مقبول منزل بلوا گھاٹ** کا ہے جو محتاج تعارف نہیں ہے۔ مقبول منزل میں تبلیغی مجالس کی بنا سنہ ۱۹۱۴ء میں صدر المحققین جناب مولانا سید مقبول احمد صاحب قبلہ طاب ثراہ کے ایما پر قائم ہوئی تھی۔ شیخ بشیر احمد صاحب مرحوم اس انجمن کی روح رواں تھے مرحوم بڑے حوصلہ مند اور صاحب ایمان بزرگ گزرے ہیں۔ اپنے ذاتی سرمایہ سے عرصہ تک انجمن مذکور اور سالانہ مجالس کو فروغ دیا گئے۔ مقبول منزل کی عمارت کو جو شیخ صاحب کی ذاتی ملکیت تھی مولانا مقبول احمد صاحب قبلہ کے نام نامی سے ہمیشہ کے لئے موسوم کر دیا، خود اپنی زندگی کو بھی قومی خدمات کے لئے وقف کر رکھا تھا۔ آج مقبول منزل اپنی مخصوص جائے وقوع اور قومی خدمات کے لحاظ سے جونپور کا ایک اہم تبلیغی ادارہ تصور کیا جاتا ہے۔ شیخ بشیر احمد صاحب کے انتقال کے بعد کچھ عجب نہ ہوتا اگر یہ انجمن یاد ماضی میں تبدیل ہو چکی ہوتی کچھ عرصہ تک شیخ ہدایت حسین مرحوم اور علی جعفر صاحب نے اپنی اپنی مخلصانہ خدمات سے سہارا دیا پھر غیب سے امداد ہوئی اور جناب مولانا سید جرار حسین صاحب قبلہ جو الہ آباد میں مقیم تھے اپنے ذاتی مفاد کو نظر انداز کر کے خدمت قوم وملت کی خاطر وطن واپس آگئے اور یہی نہیں کہ آج انجمن تبلیغ الاسلام زندہ ہے بلکہ مولانا موصوف نے انجمن حی علی خیر العمل کو قائم کر کے شہر و ضلع جونپور کے مومنین میں ایک تازہ روح پھونک دی ہے۔ آج پہلے سے کہیں زیادہ بڑے پیمانہ پر انجمن تبلیغ الاسلام کی سالانہ مجالس زیر انصرام انجمن حی علی خیر العمل منعقد ہوتی ہے اور مومنین شہر و ضلع اور قرب وجوار کے اضلاع کے مومنین کو اعلان تاریخ مجالس کا انتظار رہتا ہے۔ عموماً یہ تبلیغی مجالس ماہ نومبر کے کسی ہفتہ میں ہوتی ہیں اور کم سے کم دس سے پندرہ تک علمائے دین غیر مقامی مدعو ہوتے ہیں۔ سلسلہ مجالس تقریباً پانچ روز تک قائم رہتا ہے روزانہ صبح دوپہر اور شب میں مجلسیں ہوا کرتی ہیں بیرونی مہمانوں کے لئے معقول انتظام رہتا ہے

کندرکی کی تاریخِ عزاداری

قصبہ کندرکی ضلع مراد آباد کی دوسری بستیوں کی طرح ایک ممتاز مقام رکھتا ہے۔ جائے وقوع کے لحاظ سے بھی اسے اہمیت حاصل ہے۔ وہ مراد آباد سے بذریعۂ ریل و پختہ سڑک صرف گیارہ میل دور ہے۔ بستی صوبائی پختہ سڑک اور ریلوے لائن کے بالکل کنارے واقع ہے۔ شمال میں مراد آباد اور جنوب میں ہندوستان کی مشہور منڈی چندوسی کوئی پندرہ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ سڑک پر ہر وقت روڈویز کی بسوں اور ٹیکسیوں کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ مراد آباد سے کندرکی کے لئے سٹی بسیں بھی چلتی ہیں۔ ان کے علاوہ مراد آباد سے چندوسی، بدایوں، بلاری، سیونڈارا اور شاہ آباد ضلع رام پور آنے جانے والی بسیں بھی یہاں رکتی ہوئی جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ کندرکی دوہری ریلوے لائن پر واقع ہے۔ ایک اس لائن پر جو مراد آباد سے چندوسی جنکشن کو جاتی ہے۔ دوسرے اس لائن پر جو مراد آباد سے راجہ کا سہنس پور اور سادات کی مشہور بستی قصبہ سرسی ہوتی ہوئی سنبھل کو جاتی ہے۔ اس طرح یہاں دوسرے مقامات کی بہ نسبت سب سے زیادہ گاڑیاں چلتی ہیں جن کی تعداد دن رات میں ایک درجن ہوتی ہے۔

کندرکی میں ریلوے اسٹیشن اس زمانے میں تو ہوتا جب کہ بریلی سے لے کر مراد آباد تک ریلوے لائن نہیں بنی تھی اس لئے کہ ان دونوں اضلاع کے درمیان ریاست رام پور واقع تھی اور اُس وقت کے والی ریاست نواب کلب علی خاں صاحب مرحوم نے اپنے علاقہ سے ریل گزرنے کی اجازت نہیں دی تھی۔ اس زمانہ میں ساری ٹرینیں بریلی سے چندوسی، راجا کا سہنس پور اور کندرکی ہوتی ہوئی مراد آباد جایا کرتی تھیں۔ اُس وقت کندرکی کا اسٹیشن مین لائن پر واقع تھا۔ اس قصبہ کو آج کل بجلی اور واٹر ورکس کی سہولتیں بھی حاصل ہیں اور تمام سڑکیں اور گلیاں کوچے پختہ ہیں۔

یہاں کی آبادی کم و بیش آٹھ ہزار ہوگی جس میں اکثریت مسلمانوں کی ہے اور شیعہ افراد کی تعداد ہزار بارہ سو سے شاید زیادہ نہ ہو۔ قصبہ کی سب قومیں ہندو، سُنّی، شیعہ، جین اور عیسائی باہم اتحاد و اتفاق سے رہتے ہیں اور آپس میں کبھی ملال کی کوئی صورت پیدا نہیں ہوتی بلکہ ایک دوسرے کے شریک کار رہتے ہیں۔

قصبہ کندرکی پرتھی راج کے زمانہ میں بھی موجود تھا۔ یہاں پہلے گوشائیوں کی آبادی تھی جن کے نام کے آخر میں لفظ "گر" لگا ہوتا ہے۔ جیسے جمنا گر، گنگا گر، رام گر، موہن گر۔ اس بستی کو ابتداءً ایک گوشائیں "کُندن گر" ہی نے بسایا تھا۔ اسی کے نام سے یہ بستی "کُندن گر کی بستی" کہلائی جانے لگی جو کثرتِ استعمال سے کندرکی

رہ گیا۔ اب کندرکی میں گوشائیوں کا شاذ ایک گھر بھی نہیں۔ ہمارے بچپن میں محلہ سادات سے قریب ہی دو تین گھر گوشائیوں کے باقی رہ گئے تھے اور وہیں اُن کے مُردوں کی قبریں تھیں جن کی شکل ہماری قبروں کی طرح مستطیل نہیں بلکہ مدوّر ہوتی تھی اور ہمیں رات کو اُدھر سے نکلتے ہوئے خوف معلوم ہوا کرتا تھا۔

شیعیان کندرکی کے مورثِ اعلیٰ پہلے پہل مشہد مقدس سے آکر آگرہ میں فروکش ہوئے۔ اُس کے بعد۔۔

۔۔۔ اس خاندان کے ایک عالم متبحر سید عبدالرزاق صاحب طاب ثراہ شہنشاہ اکبر کے آخری عہد میں جب کہ مراد آباد کا گورنر رستم خاں دکنی تھا، کندرکی کے قاضی مقرر کرکے بھیجے گئے۔ آپ نے آکر شروع میں بستی کے باہر اپنے لیے عارضی مکانات بنوائے اور جہاں یہ مکانات بنائے تھے وہاں آج بھی ایک گاؤں قاضی پورہ کے نام سے اُنھیں کا آباد کیا ہوا موجود ہے۔

قاضی صاحب اپنے ساتھ دو نئے قسم کے تحفے بھی لائے تھے ایک اپنے خاندان کا نسّاب اور دوسرے ایک گورکن۔ اسی نسّاب کی اولاد آج تک ہمارے یہاں تقریبات کے موقع پر نسب نامہ پڑھتی ہے اور اسی گورکن کی اولاد ہمارے یہاں کی قبریں کھودتی ہے۔ گویا یہ ہمارے مورثِ اعلیٰ کو نسب کا بڑا خیال تھا اور موت ہر وقت اُن کے پیشِ نظر رہتی تھی جو ایک مومن کی علامت ہے۔

اس کے بعد آپ قاضی پورہ سے منتقل ہو کر کندرکی میں قیام پذیر ہو گئے۔ سب سے پہلے آپ نے ایک مسجد کی تعمیر کرائی جو آج بھی قصبہ میں شیعوں کی واحد مسجد ہے۔ مسجد کے آس پاس اپنے اور اپنے متعلقین و لواحقین کے لئے مکانات تیار کرائے اور اُس کے بعد چاروں طرف حاشیہ پر رعایا کو آباد کیا۔

بس قاضی صاحب علیہ الرحمہ کے وُرود کی تاریخ ہی کو کندرکی کی عزاداری کی تاریخ کا بابِ اول سمجھ لینا چاہئے۔ قاضی صاحب کو جب وہ اپنی تعمیر کردہ مسجد میں مصروفِ تلاوتِ کلامِ پاک تھے، اُن کے ایک منافق غلام نے تلوار سے شہید کر دیا۔ چونکہ عہدِ جہانگیری میں اکبر کے بعد شیعوں پر پھر عرصۂ حیات تنگ ہو گیا تھا اس لئے اس خونِ ناحق کی شنوائی نہ ہوئی اور داد نہ ملی۔

آپ کے بعد قاضی صاحب کے دو صاحبزادوں میں سے عہدہ قضا ان صاحبزادے کو تفویض کیا گیا جن پر تشیع کا شبہ نہیں ہو سکتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ قاضی علیہ الرحمہ کی اولاد میں شیعہ سنی دونوں برابر ہوتے رہے جن کے آپس میں نہ کوئی اختلاف تھا نہ ملال بلکہ چونکہ اُن کے مابین رشتہ داریوں کا سلسلہ جاری تھا اس لئے وہ آپس میں بالکل ایک دوسرے سے گھل مل گئے۔ باپ سُنّی تھا تو بیٹا شیعہ، شوہر شیعہ تو بیوی سُنّی، ماں سُنّی بیٹی شیعہ، ایک بھائی شیعہ تو دوسرے بھائی سُنّی چنانچہ ہمارے بھی دادا تین بھائی تھے۔ سید ہادی علی، سید ہاشم علی اور سید علی حسن۔ اول الذکر سُنّی تھے۔ جب اُن کے والد کا انتقال ہوا تھا تو دونوں بھائیوں کی عمر بہت کم تھی اس لئے اُن کی تعلیم و تربیت کا بار بھی اُنھیں پر پڑا۔ مگر اُنھوں نے بھائیوں کو اپنی ماں کے شیعہ مذہب کے اختیار کرنے کی ہدایت کی۔ ان کے چار لڑکے بھی تھے (۱) سید واجد علی (والد سر سید رضا علی) حاجی سید فدا علی، سید نثار حسین اور سید آلِ حسن صاحبان۔ دونوں بھائیوں اور چاروں بیٹوں کی تعلیم و تربیت شیعہ عقیدہ کے مطابق ہی کی۔ خود بھی بڑے عالم تھے اور سُنّی و شیعہ دونوں کی فقہ و تاریخ پر عبور رکھتے تھے اُنھوں نے اپنے بھائیوں اور اولاد کو خود ہی شیعہ سانچے میں ڈھالا حالانکہ آپ خود عمر بھر حنفی عقیدہ کا اظہار کرتے رہے اور ہاتھ باندھ کر نماز

پڑھتے رہے۔ یہی نہیں کہ انھوں نے آپ ہی اپنے گھر میں شیعیت کو پروان چڑھایا ہو بلکہ وہ عمر بھر عزاداری بھی کرتے رہے حتیٰ کہ آٹھویں محرم کی نذر بھی کرتے تھے اور عشرہ کے دن خود بھی فاقہ سے رہتے تھے اور سارے عزاداروں کی فاقہ شکنی بھی کراتے تھے۔ یہ فاقہ شکنی آج تک ہوتی ہے۔ اُن کے انتقال کے بعد اُن کے دوسرے صاحبزادے حاجی سید فدا علی صاحب اس رسم حسنہ کو جاری کئے رہے۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے چھوٹے بھائی حاجی سید آل حسن نے اس ذمہ داری کو سنبھالا۔ ۱۹۳۰ء میں اُن کی وفات کے بعد سر سید رضا علی صاحب اپنے دادا کی خیر جاریہ کو جاری رکھے رہے۔ ان کے پاکستان چلے جانے کے بعد سید ہادی علی کے دوسرے پوتے سید انصار حسین صاحب رئیس خلف سید شاہ حسین صاحب مرحوم (جو جوانی ہی میں انتقال کر گئے تھے) نے فاقہ شکنی کے بار کو اپنے کاندھوں پر لیا۔ سید انصار حسین صاحب کی رحلت کے بعد ان کے صاحبزادے سید صابر حسین صاحب اپنے خاندان کی روایتی اولوالعزمی کے ساتھ فاقہ شکنی کراتے ہیں۔

دادا سید ہادی علی صاحب مرحوم کی مثال کو دیکھ کر ہمیں عم رسولؐ حضرت ابوطالبؑ کی یاد آجاتی ہے۔ جس طرح سید ہادی صاحب مرحوم کے اخلاص و اعتقاد کو اُن کے شیعہ ہونے کا یقین ہے اُسی طرح حضرت ابوطالب کے اسلام لانے کا بھی یقین کامل ہے حضرت ابوطالبؑ کے اسلام و ایمان میں خواہ کچھ اہلسنت حضرات شبہہ سے کام بھی لیں لیکن قصبہ کندرکی کے سادات کو سید ہادی علی صاحب کی مثال کے پیش نظر ابوطالب کے اسلام و ایمان میں کوئی شک و شبہہ پیدا نہیں ہو سکتا کندرکی کے سنی حضرات بھی برابر یہی سمجھتے رہے کہ ہادی علی صاحب اپنے مذہب کو کسی مصلحت سے چھپائے ہوئے ہیں۔ اگر حضرت ابوطالب نے بھی اسلام اور رسول اسلامؐ کے تحفظ کی خاطر اپنے اسلام کا کھل کر اعلان نہیں کیا تو اس میں تعجب کیا ہے۔ اُنھوں نے اپنے چاروں بیٹوں طالب، جعفر، عقیل اور علی کو مسلمان ہونے سے روکا تو نہیں۔ اسی طرح اپنی بیوی کو اسلامی مسلک پر باقی رہنے کی اجازت دے دی۔ تاریخ کی مستند شہادت ہے کہ جناب فاطمہ بنت اسد مسلمان تھیں لیکن ابو طالب کبھی مانع نہیں ہوئے۔ اگر ابوطالب مسلمان نہ ہوتے تو پیغمبر اسلام ابوطالب اور فاطمہ بنت اسد کے نکاح کو فسخ نہ قرار دے دیتے اس لئے کہ مسلمان عورت اور کافر مرد کا نکاح باقی نہیں رہ سکتا۔

خیر یہ تو ایک تاریخی جملۂ معترضہ بیچ میں آگیا تھا اب ہم پھر اپنے سابقہ مطلب پر آتے ہیں۔ قاضی عبدالرزاق صاحب کی اولاد میں سنی شیعہ دونوں تھے جن کے آپس میں رشتہ داریاں ہوتی تھیں۔ انھیں رشتہ داریوں کا نتیجہ ہمیں آج یہ نظر آرہا ہے کہ کندرکی کے سیدوں میں اب شاید ایک فیصدی سنی بھی نہیں ہے حالانکہ ہمارے لڑکپن میں کم سے کم ایک تہائی سید سُنی تھے۔ اب آپس میں رشتہ داریاں بند ہوگئی ہیں ورنہ اگر لڑکے لڑکی کا لین دین آپس میں ہوتا رہتا تو یہ ایک فیصدی سُنی بھی آج شیعہ ہی نظر آتے۔

کندرکی ہمیشہ سے بڑی مردم خیز بستی رہی ہے۔ ادب، تاریخ، ریاضی، عربی، فارسی غرض کہ ہر شعبۂ علم کے ماہر گزرے ہیں۔ مولانا سید ہدایت علی صاحب تمکین مرحوم بڑے جید عالم تھے جن کی قابلیت کا اعتراف مرزا غالب نے اردوئے معلیٰ میں بھی کیا ہے۔ اُنھوں نے ایک جامع کتاب واقعۂ کربلا پر بھی لکھی ہے جو ہنوز طبع نہیں ہوئی ہے۔ کتاب بڑی تحقیقی ہے۔ بڑے سائز کے ۳۰۵ صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب

حکیم مولوی سید جمیل حسن صاحب رضوی کاملؔ کے پاس موجود ہے۔ اس قابلِ قدر تصنیف کو کوئی مالدار انسان ہی چھپوا سکتا ہے۔ مولانا تمکین صاحب حنفی المسلک اور صوفی منش تھے۔ اُن کی ایک فارسی کتاب "رقعاتِ سراجی" کے نام سے آج بھی موجود ہے جو میرے خیال میں فارسی پڑھنے والے لڑکوں کو گزشتہ ایک صدی سے پڑھائی جا رہی ہے۔ فارسی خطوط کی یہ کتاب مرحوم نے اپنے نواسے سید سراج الحق صاحب مرحوم کے پڑھانے کے لئے لکھی تھی جو چھپنے کے بعد بڑی مقبول ثابت ہوئی اور ریاست رام پور میں ہز ہائی نس نواب حامد علی خاں صاحب کے عہدِ حکومت کے اختتام تک رقعاتِ سراجی زباں کے ۔ اس میں داخلِ نصاب تھی۔ ہم نے بھی رقعاتِ سراجی پڑھنے کے بعد ہی گلستاں شروع کی تھی۔ سید سراج الحق صاحب مرحوم کے اخلاف آج بھی موجود ہیں مگر اُن کی مالی حیثیت اس قابل نہیں کہ وہ اپنے بزرگ کے ایک غیر مطبوعہ شاہکار کو طبع کرا سکیں۔ البتہ اگر جسٹس سید ضیار الحسن صاحب مرحوم چاہتے تو وہ اس کام کو انجام دے سکتے تھے اس لیے کہ وہ باشار اسٹنٹ جج چیف کورٹ رہ چکے تھے اور بہت بڑے رئیس اور زمیندار بھی تھے۔

کندرکی کے کچھ ممتاز مرحوم ہستیوں کے اسمائے گرامی یہ ہیں :-

شیعہ مرحومین

(۱) آنریبل سر سید رضا علی او بی ای

(۲) سید جانباز حسین صاحب ایم۔ اے۔ انسپکٹر اسلامیہ اسکولس

(۳) مولوی سید مہدی حسن صاحب سشن جج رام پور۔ اسٹیٹ متولی وقف میر سعادت علی خاں صاحب تحصیلدار مرادآباد۔

(۴) مفتی سید محمد ادریس صاحب سشن جج۔

(۵) سید نذیر حسین صاحب اسسٹنٹ کمشنر

(۶) خاں صاحب سید ذکیر حسین صاحب جیلر۔

(۷) مولانا سید انصار حسین صاحب مصاحبِ خاص اعلیٰ حضرت نواب حامد علی خاں صاحب آف رام پور

(۸) حکیم حاجی سید علی رضا صاحب جو خشکی کے راستہ سے براہ بلوچستان مشہد مقدس زیارت کو تشریف لے گئے تھے۔ بشتر اسّی برس پہلے بڑا تکلیف دہ اور قریب قریب ناممکن سمجھا جاتا تھا۔ دشوار گزار کوہستانی راستہ جو گھوڑوں خچروں اور گدھوں کے ذریعے طے کیا جاتا تھا لیکن وہ بخیریت پہنچ گئے اور روضۂ اقدس پر کچھ عرصہ رہے۔ وہیں موصوف کا انتقال ہو گیا۔

(۹) حکیم سید محمد حسین صاحب (جدِ امجد حکیم سید جمیل حسن صاحب کاملؔ رضوی) بڑے حاذق طبیب تھے۔ حکیم سید محمد حسن صاحب (والد بزرگوار حکیم سید جمیل حسن کامل)۔ حکیم مہری سید دلدار حسین صاحب طبیب ریاست چرکھاری واصغر آباد۔

سُنّی مرحومین

(۱) خان بہادر سید ضیار الحسن صاحب جج اودھ چیف کورٹ (۲) سید حسن صاحب رضوی وکیل مرادآباد (۳) حکیم سید حسین صاحب مرحوم بڑے پایہ کے طبیب گزرے ہیں (۴) حکیم سید جواد حسن صاحب۔

یہ سُنّی سید بھی سب ہمارے ہم جد ہی ہیں اور وہ ہمیں اپنے سے جدا نہیں سمجھتے۔ چنانچہ جسٹس ضیار الحسن صاحب رضوی مرحوم نے انتقال سے کچھ دن پہلے اپنے مورثِ اعلیٰ قاضی سید عبد الرزاق صاحب کے مزار کی از سرِ نو تعمیر اپنے خرچ سے حکیم سید جمیل حسن صاحب رضوی کامل کی نگرانی میں کرائی ہے اور مزار کا خرچ چلانے کے لئے اسی میں دو دوکانیں بھی نکلوا دی ہیں۔

کندرکی میں سادات رضویہ کے علاوہ کچھ اور خاندان

مثلاً نقوی، کاظمی اور عابدی بھی موجود ہیں جو عرصۂ دراز سے یہاں مقیم ہیں اور باہمی رشتہ داریوں کی وجہ سے آپس میں ایسے گھل مل گئے ہیں کہ یہ پہچان بھی آسان نہیں ہے کہ اس مجمع میں کون رضوی ہے، کون نقوی، کون کاظمی اور کون عابدی۔

عزاداری میں ترقی و انہماک خاص طور پر ۱۸۵۷ء کے ایک واقعہ سے پیدا ہوا۔ ہمارے بزرگوں سے یہ روایت تسلسل کے ساتھ چلی آرہی ہے کہ جب پہلی جنگ آزادی کے دوران میں انگریز فوج نے کندرکی پر حملہ کرنے کا ارادہ کیا تو قصبہ کے تمام لوگ سر بکفن ہو کر فرنگیوں سے مقابلہ کے لئے نکل پڑے۔ ۱۸۵۷ء میں ہندوستانیوں نے جو جنگ لڑی اس میں کوئی باقاعدگی اور نظم نہ تھا وہ نتائج و عواقب سے بے پروا ہو کر لڑائی کی آگ میں پھاند پڑتے تھے اسی لئے نتیجتاً ہندوستانیوں کو ناکامی ہوئی۔ یہی حالت کندرکی کے لوگوں کی بھی ہوئی۔ سارے سید اپنے ہمدردوں اور فرنگی دشمنوں کی زیادہ سے زیادہ تعداد اکٹھا کرکے نکل پڑے۔ قصبہ کے کچھ غدار انگریزوں سے ملے ہوئے بھی تھے۔ انھیں کی شہ پر یہ حملہ کرنے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ سادات کندرکی نے اپنی تمام مستورات کو بستی کے سب سے محفوظ مکان میں جس کا تھوڑا سا حصہ آج کل بنشیر حسین صاحب ٹھیکیدار کے قبضہ میں ہے جمع کر دیا اور ان پر ایک مسلح محافظ تعینات کر دیئے جن کو ہدایت یہ تھی کہ جب کندرکی والوں کو شکست ہو جائے اور تم یہ دیکھو کہ دشمن بستی میں داخل ہو جائے گا تو فوراً ساری عورتوں کو موت کے گھاٹ اتار دینا۔ اگر ہم لوگوں کی عزت ناموس محفوظ رہے۔

انوٹ:۔ اس زمانہ میں ہندوؤں میں خصوصاً راجپوتوں میں جوہر کی یہ رسم جاری تھی۔ انھیں سے مسلمانوں نے اس رسم کو لیا۔ اخلاقی لحاظ اور عزت و ناموس کے تحفظ کے اعتبار سے یہ بات خواہ کتنی ہی حسین و دلکش کیوں نہ معلوم ہوتی ہو لیکن اسلامی نقطۂ نظر سے اس کا کوئی جواز نظر نہیں آتا۔ اسلامی نقطۂ نظر کے مطابق تو ظالم سے اپنی مدافعت آخر لمحہ تک کرنا چاہیئے۔ انسان کو تمام مصائب و آلام پر صبر کرنے کی ضرورت ہے نہ کہ خودکشی کرنے کی۔ خانوادۂ نبوت کی مخدرات نے میدان کربلا میں بھیانک سے بھیانک ظلم برداشت کرکے ہمارے لئے ایک اسوۂ حسنہ چھوڑ دیا ہے۔ ایڈیٹر)

ان شیعہ خواتین نے عالم مایوسی میں "یا علیاہ یا عباساہ" کی صدائیں بلند کرنا اور بارگاہ احدیت میں چہاردہ معصومین کے وسیلے سے یہ دعا مانگنا شروع کی کہ تو ہماری جانوں اور عزتوں کو محفوظ رکھ اور ہمارے سرپرستوں کو اس خطرہ سے نجات دے۔

جب غنیم نے کندرکی پر چڑھائی کی اور وہ اس کے قریب پہنچا تو اس نے دیکھا کہ بہت سے ہتھیار بند سوار سبز لباس میں ملبوس کندرکی کی حفاظت کے لئے موجود ہیں۔ دشمن دہشت زدہ ہو کر بھاگ گیا۔ جب امن قائم ہو گیا تو حملہ آور فوج کے بعض افراد نے بڑے تعجب سے یہ واقعہ بیان کیا جسے سادات کندرکی نے معجزہ ہی سمجھا اور اس وقت سے کندرکی والوں کو عزاداری سید الشہداء میں بڑا انہماک پیدا ہو گیا۔

زمانۂ سابق میں عزاداری

پہلے یہاں دن رات میں غالباً تین مردانی اور ایک زنانی مجلس ہوتی تھی۔ دن کی مجلس اول وقت میر دلاور حسین صاحب رئیس کے یہاں اور دوسری مجلس رات کو حکیم سید محمد حسین صاحب مرحوم (جد سید جمیل حسن صاحب کامل) کے یہاں۔ یہ دو مجالس بڑی قدیم اور غالباً سوا سو ڈیڑھ سو برس سے ہوتی چلی آرہی ہیں۔ تیسری قدیم مجلس سید محمد احسن صاحب مرحوم کے یہاں ہوتی تھی جو بڑے باکی اور مجلس

کی رونق سمجھے جاتے تھے۔ اُن کے انتقال کے بعد اُن کے صاحبزادے مولانا سید انصار حسین صاحب مصاحب نواب صاحب رام پور مجلس کراتے رہے۔ جب سے مولانا پاکستان چلے گئے اُس وقت سے غالباً یہ مجلس بند ہوگئی۔ دن میں تیسری زنانی مجلس سید اخلاق حسین صاحب مرحوم کے یہاں ہوتی تھی جس کا سلسلہ آج بھی اُن کے پوتے سید رضی الحسن رضوی کرتے ہیں۔ یہ مجلس بھی سوا سو سال سے برابر ہو رہی ہے اور اُسی وقت سے اس گھر میں تعزیہ رکھا جاتا ہے۔ شائد اس سے پُرانا اور قدیم تعزیہ کوئی نہیں ہے۔ اس گھر میں اربعین میں بھی زنانہ عشرہ ہوتا ہے اور یہ بھی قدیم عشرہ ہے۔ عاشور کی طرح اربعین کو بھی اس گھر سے تعزیہ نکلتا ہے اور دوسرے تعزیوں کو ساتھ لیتا ہوا کربلا جاتا ہے۔

سابق میں اربعین کا ایک عشرہ سید عطا حسین صاحب مرحوم زمیندار کے مکان پر قائم تھا۔ اُن کی مجلس سید محمد احسن صاحب مرحوم کی مجلس کے بعد ہوا کرتی تھی جس میں وہ خود کتاب سے حدیث خوانی کرتے تھے اور ختم مصائب پر واقعات کی مناسبت سے فوراً ہی بعد کوئی نوحہ منبر ہی پر شروع کر دیتے تھے اور منبر کے نیچے بیٹھے ہوئے بعض نوحہ خوان ساتھ میں پڑھوانے لگتے تھے۔ یہ مجلس بڑی رقت خیز ہوتی تھی اور نوحہ کے بعد تو سامعین کو ضبط کا یارا نہ رہتا تھا۔

ایک مردانی مجلس عشرہ میں عنبر دار سید ارشاد حسین صاحب کے یہاں ہوا کرتی تھی اور وہ خود اپنی مجلس میں بیان کیا کرتے تھے۔ اس پُرانی مجلس کو اب اُن کے خویش سید مستجاب حسین صاحب جاری رکھے ہوئے ہیں اور یقین ہے اُن کے بعد ان کے صاحبزادے سید انتخاب حسین بی۔ اے۔ اس مجلس کو جاری رکھیں گے اور اسی طرح انشاء اللہ نسلاً بعد نسلٍ یہ سلسلہ جاری رہے گا۔

دو زنانی مجلسیں سابق میں اور ہوتی تھیں۔ ایک سید منظفر حسین صاحب کے یہاں جو خود ہی سوز خواں نہ تھے بلکہ اُن کی اہلیہ بھی زنانی مجلسوں میں مقبول سوز خوانی کیا کرتی تھیں۔ اب وہ اور اُن کے سب صاحبزادے پاکستان چلے گئے اور مکان فروخت کر گئے مگر خدا کا شکر ہے کہ یہ مکان ایک مردِ مومن سید شریف الحسن صاحب نے خرید لیا اور اب وہ زنانی مجلس اُن کے یہاں ہونے لگی۔ ایک مجلس مفتی سید بشیر حسن صاحب مرحوم رئیس کے یہاں ہوتی تھی جو آج تک ہوتی ہے۔ اُن کے کوئی اولاد نرینہ تو نہیں رہی لیکن پوتی اور اُس کی اولاد اس کارِ خیر کو جاری رکھے ہوئے ہیں۔ مرحوم کے دوسرے مکان میں اُن کے بھائی مفتی سید ارتضیٰ حسن صاحب مرحوم مختار عدالت نواب گنج ضلع بریلی کے پوتے مجلس کراتے ہیں۔

ایک زنانی مجلس مولوی سید مہدی حسن صاحب مرحوم سشن جج رام پور کے یہاں ہوتی تھی۔ اُن کے مرنے اور اُن کی اولاد کے پاکستان چلے جانے اور تتر بتر ہو جانے کی وجہ سے نہ وہ مکان رہا نہ اُس کے مکین اور نہ اُس کی قدیم مجلس۔ یہ بھی شکر ہے کہ مکان اب بھی ایک سید صاحب ہی کے قبضہ میں ہے۔ ایک زنانی مجلس غالباً سید دلدار حسین صاحب مرحوم کراتے تھے جسے اُن کے مرنے کے بعد اُن کے دو صاحبزادے سید محمد اصغر اور سید محمد مسلم صاحبان کراتے رہے اور اب غالباً اسی مجلس کو مردانی مجلس کی شکل میں تبدیل کر کے مولانا سید محمد سالم صاحب ایم۔ اے۔ ایل ایل بی۔ پی ٹی کراتے ہیں۔

آج کل ایک زنانی مجلس صبح کو حکیم مولوی سید جمیل حسن صاحب رضوی کامل کے یہاں ہوتی ہے اور ایک سید الیاس حسین صاحب کے زنانے امام باڑے میں۔ ایک مجلس ڈپٹی سید نصیر الحسن رضوی۔ ایم۔ اے۔ ایل۔ ٹی کے یہاں۔ اس کے علاوہ اور بھی مجلسیں ہوتی ہیں جن کو

سلسلہ رات گئے تک جاری رہتا ہے۔ زنانی مجلس میں سوزخوانی، حدیث خوانی اور نوحہ خوانی سب عورتیں ہی کرتی ہیں۔

مردانی مجالس کم و بیش دس بارہ ہوتی ہیں جن میں سے دو مستقل رات کو ہوتی ہیں۔ ایک حکیم محمد حسین صاحب مرحوم کے پوتے کے یہاں سوا سو سالہ پرانی مجلس اور دوسری سید نذیر احمد صاحب رئیس مرحوم کے مکان پر جو آج کل اُن کے صاحبزادے حکیم سید عزیز احمد صاحب عزیزؔ کرتے ہیں۔

۸ محرم کی مجلسیں حضرت عباس علمبردارؑ کے نام سے منسوب ہوتی ہیں اور اسی لئے انھیں حاضری کہا جاتا ہے جن میں بہتر سے بہتر مٹھائی تبرک میں تقسیم کی جاتی ہے۔ تبرک کی تیاری ہر گھر میں ساتویں محرم ہی سے شروع کر دی جاتی ہے۔ جہاں جائیے کہیں حلوائی لڈو تیار کر رہے ہیں کہیں بالوشاہی۔ کہیں امرتی اور کہیں پیڑے۔ غرض کہ اس ایک ہی تاریخ میں مومنین کندرکی سیکڑوں سے زیادہ تبرک پر خرچ کر دیتے ہیں۔ مستقل ہونے والی مجالس ہی حاضریوں میں تبدیل نہیں کر دی جاتی ہیں بلکہ دوسرے مومنین انفرادی طور پر بھی اپنے اپنے یہاں حاضریاں کراتے ہیں اور اس لئے یہ تاریخ بڑی مشغولیت کی ہوتی ہے۔ ہر مجلس میں "جب ہوئے بازوئے عباسؑ قلم دریا پر" والے مرثیے کے دو ایک بند ضرور پڑھے جاتے ہیں اور وقت کی تنگی کی وجہ سے دو چار بندوں ہی پر مجلس ختم کر دی جاتی ہے۔

ذاکرین :۔ عشرہ محرم میں باہر سے کوئی ذاکر نہیں بلایا جاتا۔ مقامی لوگ ہی ذاکری کر لیتے ہیں جن میں مخصوص اسمائے گرامی درج ذیل ہیں :۔

(۱) مولانا سید محمد سالم صاحب ایم۔ اے، سابق پرنسپل خصوصاً عشرہ کے دن دوپہر کو بڑی معرکہ آرا مجلس پڑھتے ہیں جس کے بعد تابوت حضرت علی اکبرؑ نکلتا ہے۔

(۲) حکیم سید عزیز احمد صاحب عزیزؔ۔ اچھے ذاکر ہیں اور عام پسند کے خوب گوشے اور نکتے نکالتے ہیں۔

(۳) حکیم مولوی سید جمیل حسن صاحب رضوی کاملؔ بھی اچھی ذاکری کرتے ہیں۔ پہلے بہت سی مجلیں پڑھ لیا کرتے تھے جو بڑی کامیاب رہتی تھیں مگر آج کل عرصہ سے اُن کی صحت خراب ہو گئی ہے اور دو چار منٹ سے زیادہ مجلس پڑھنے کی سکت نہیں ہے۔ خدا انھیں بطفیل بیمار کربلا صحت کلی عطا فرمائے۔

(۴) حکیم مولوی سید یوسف علی صاحب سیفؔ تعلق خوب بیان فرماتے ہیں۔ اُن کی آواز بھی خدا کا ایک عطیہ ہے۔ اُن کی مجلس بڑی رقت خیز ہوتی ہے۔

(۵) ڈاکٹر سید حیدر رضا صاحب، طرز بیان دلکش ہے گوشے بھی خوب پیدا کرتے ہیں مگر اپنے پیشہ کی مشغولیتوں کی وجہ سے مجلیں بہت کم پڑھ پاتے ہیں۔

(۶) سید محمد ناطق صاحب اچھے ذاکر ہیں اور بہت سی مجلیں پڑھ ڈالتے ہیں۔

(۷) سید شریعت حسین صاحب۔ عزاداری میں انہماک کی وجہ سے پڑھنے کا شوق ہوا اور پڑھتے پڑھتے اتنی مشق بہم پہنچالی کہ ہر مجلس بڑی کامیاب ثابت ہوتی۔

(۸) سید قیصر رضا صاحب اپنے صنف کے اچھے ذاکروں میں سے ہیں۔

مولانا سید محمد سالم صاحب سابق پرنسپل کے علاوہ تقریباً یہ ذاکر سب قصبہ ہی میں مستقل قیام رکھتے ہیں اس لئے انھیں پہلی تاریخ ہی سے مجلسوں کی شرکت اور مجلسوں کی خواندگی کا موقع ملتا رہتا ہے۔ بعض

ملازمت پیشہ حضرات جو ذاکری بھی کرتے ہیں عشرہ کی کئی تاریخیں گزرنے کے بعد آیا کرتے ہیں۔ ان میں ماسٹر سید مختار حسین صاحب رضوی (برادرِ خورد حکیم سید عزیز احمد صاحب عزیزؔ) بے جھجک پڑھتے ہیں۔ آپ کو مناظرہ کے مضامین سے بڑی دلچسپی ہے اور اپنے ہر ہر نکتہ کو سامعین کے ذہن نشین اس طرح کرانا چاہتے ہیں جیسے کہ وہ بحیثیت ماسٹر کے ہر بات اپنے طلباء کے ذہن نشین کراتے ہوں گے۔ ماسٹر سید محمود حسن صاحب ایم اے بھی اچھا پڑھتے ہیں۔ بس ان میں کمی یہ ہے کہ شاید وہ علاوہ کندرکی کے کہیں اور نہیں پڑھتے۔ اگر زیادہ سے زیادہ مجلسیں پڑھنے کی کوشش کریں تو بیان میں بڑی روانی پیدا ہو جائے

موجودہ تحت لفظ خوان

سید مختار حسین صاحب یاسؔ، سید عزیز الحسن صاحب، سید قمر علی رضوی نبیرہ حکیم سید عزیز احمد صاحب۔

موجودہ سوز خوان

سید شاہد حسین صاحب۔ سید ضامن حسن صاحب، سید علی مستحسن صاحب، سید نذیر علی صاحب، سید انصار رضا صاحب۔ سید نواب علی صاحب۔

موجودہ نوحہ خوان

سید غضنفر حسین صاحب بڑے مقبول اور اچھے نوحہ خواں ہیں۔ اپنی انجمن کے ساتھ باہر جاتے رہتے ہیں اور عزائی اجتماعات کے موقعوں پر نوحہ خوانی میں کامیاب رہتے ہیں۔

دوسرے نوحہ خواں سید افتخار حسین صاحب جو اپنی انجمن کے صاحب بیاض بھی ہیں۔ اُن کی نوحہ خوانی بڑی پسندیدہ ہوتی ہے اور وہ بھی اپنی انجمن کو لے کر باہر جوار میں آتے جاتے رہتے ہیں۔ ان کے علاوہ اور بھی نوحہ خواں ہیں مثلاً سجاد حسن، آقا حسن، مسیح الحسن وغیرہ ان کے نوحے بڑے پسندیدہ، تبلیغی اور مبکی ہوتے ہیں۔ گرد و نواح کے مواضعات میں بھی اہل سنت حضرات نے اپنے ماتمی دستے اور نوحہ خوانی کی انجمنیں قائم کر رکھی ہیں۔

اہل ہنود میں عزاداری

سورگیہ لالہ ٹھاکر داس صاحب کالستھ رئیس بڑے عزادار تھے۔ مسلمانوں اور خصوصاً شیعوں سے بڑے مراسم تھے بلکہ دن رات کا اُٹھنا بیٹھنا تھا۔ وہ قصبے کے بڑے خوش عقیدہ ہندو عزادار تھے۔ عزاداری سے شغف کا سبب یہ واقعہ ہوا کہ اُن کے یہاں کوئی اولادِ نرینہ نہیں تھی۔ تمنا تھی کہ دولت اور زمینداری و املاک کا کوئی وارث پیدا ہو۔ اُنھوں نے ایک سال منت مانی کہ اگر خدا نے مجھے بیٹا دیا تو میں مجلس کرایا کروں گا چنانچہ بہ تصدق امام مظلومؑ لالہ صاحب کے یہاں "ہری شنکر" نامی لڑکا پیدا ہوا اور لالہ ٹھاکر داس اپنی زندگی بھر عشرہ میں مجالس کراتے رہے۔ جب اُن کا انتقال ہو گیا تب بھی اس سلسلے کو اُن کے لڑکے ہری شنکر نے چند سال جاری رکھا لیکن بعد میں کسی دراندازی کرنے والے نے ہری شنکر کو مجالس سے بدظن کر دیا اور انھوں نے یہ سلسلۂ عزاداری اپنے یہاں سے ختم کر دیا۔ ان مجالس میں میں خود بھی اپنے لڑکپن میں شریک ہوتا رہا ہوں۔ مگر مجلسوں کا بند ہونا تھا کہ لالہ ٹھاکر داس صاحب کے گھر پر تباہی آگئی۔ اُن کا پورا خاندان برباد ہو گیا اور اب اُن کے عالی شان مکانوں میں کہاروں کی آبادی ہے۔

(۲) اسی طرح شری مہیش بل صاحب رئیس کندرکی کے دادا سورگیہ بابو بیربل صاحب رئیس اپنے وسیع مکان میں بزمانۂ عشرۂ محرم مجالس کرایا کرتے تھے اور جب تک مجلسِ عزا برپا رہتی تھی وہ احتراماً کھڑے رہتے تھے۔ بابو بیربل صاحب کو میں نے اپنے بچپن میں دیکھا بھی اور اُن کے یہاں کی مجالس میں بھی شریک ہوا۔ اُن کی

تصویر آج تک میری نظروں میں ہے۔ وہ پستہ قد اور گٹھے جسم کے انسان تھے۔ وضع وقطع بالکل سرحدی پٹھانوں کی سی تھی۔ وہی شلوار، وہی کوٹ، وہی کلاہ اور صافہ۔ صورتاً بڑے شکیل ووجیہ تھے، چہرہ مسکراتا ہوا تھا جس کو دیکھ کر خوف نہیں بلکہ کشش پیدا ہوتی تھی۔ وہ فارسی اور انگریزی دونوں زبانیں بڑی روانی سے بولتے تھے۔ میں نے اُن کو اپنے عم محترم حاجی سید فدا علی صاحب سے فارسی میں بارہا گفتگو کرتے سُنا ہے۔ دونوں فارسی اچھی بولتے تھے اس لئے دونوں میں اتحاد بھی بہت تھا۔ وہ جب کبھی ایک جگہ موجود ہوتے تو فارسی ہی میں گفتگو کیا کرتے۔ کوئی پچاس سال سے اب اُن کے یہاں بھی مجالس کا سلسلہ ختم ہوگیا۔

بس آج کل ایک ہندو دھوبی کلو نامی عشرہ میں ایک مجلس کرادیتا ہے۔ میرے بچپن تک کندرکی کے کائستھ صاحبان جن کو فارسی اور اُردو ادب سے بڑا ذوق تھا، ہمارے یہاں کی مجلسوں میں برابر شریک ہوا کرتے تھے اور مجھے یاد ہے کہ ۸ محرم کو چونکہ مسلمان حلوائیوں کے ہاتھ کی مٹھائی تبرک میں تقسیم ہوتی تھی اس لئے اُس دن بھی ہندو شرکائے مجلس کو تبرک میں بتاشے دیئے جاتے تھے۔

سُنی حضرات کے یہاں مجالس

اہل سنت کے مقتدر اور بااثر بزرگ قاضی مقبول احمد صاحب مرحوم جن کو جمعہ اور عیدین کی نماز میں قیادت کرنے کا بھی فخر اپنے بزرگوں سے چلا آرہا تھا اور جو کندرکی کے موجودہ قاضی حبیب احمد صاحب کے دادا تھے برابر اپنے یہاں مجالس منعقد کرتے تھے۔ مرحوم کے یہاں کی مجلس کا یادگار واقعہ ہے کہ مجلس موسم برسات میں رات کے وقت ہورہی تھی اور ڈپٹی سید نذر حسین صاحب مرحوم

پُرخلوص انداز میں بیان فرما رہے تھے۔ موضوع کلام تھا "سرور کائنات صلعم کا بنی نجران کے عیسائیوں کے ساتھ مباہلہ"۔ مجلس کھچا کھچ بھری ہوئی تھی جس میں سنی شیعوں کے علاوہ ہندو اور عیسائی حضرات بھی کافی تعداد میں شریک تھے۔ جب ڈپٹی صاحب کی تقریر پورے شباب پر تھی کہ آسمان پر بادل چھاگئے۔ بارش کے آثار صاف ظاہر ہونے لگے اور ہر شخص محسوس کر رہا تھا کہ بس اب موسلادھار بارش ہوا ہی چاہتی ہے۔ ترشح .. شروع ہوگیا۔ مجمع میں انتشار کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ خطیب نے بڑے استقلال سے اپنا سلسلۂ کلام جاری رکھا اور مجمع کو مخاطب کرکے جس میں عیسائی حاضرین کے ساتھ خاص طور پر خطاب تھا پُرزور الفاظ اور یقینی لہجہ میں فرمایا کہ میں اس وقت آیہ مباہلہ کے متعلق بیان کر رہا ہوں۔ یہ مباہلہ پیغمبر اسلام اور نصارائے بنی نجران کے درمیان ہوا تھا۔ میں وثوق کے ساتھ کہتا ہوں کہ جو تقریر میں نے شروع کی ہے خداوند عالم بہ طفیل محمدؐ وآل محمدؐ اسے ضرور پایۂ تکمیل تک پہنچائے گا اور میری اس تقریر کے دوران میں یہ متوقع بارش ہرگز کسی قسم کی رکاوٹ نہ ڈالے گی۔ اس لئے آپ حضرات پریشان نہ ہوں میری بات سکون دماغی کے ساتھ سنتے رہیں۔ اگر اس وقت بارش نہ ہوئی اور میری تقریر میں کوئی رکاوٹ نہ پڑی تو سمجھ لیجئے گا کہ یہی سب سے بڑی دلیل اسلام کی صداقت وحقانیت کی ہے۔

ڈپٹی صاحب کے اتنے بڑے دعوے پر سامعین پر سکتہ سا طاری ہوگیا اور ہر مسلمان کے دل میں یہ خطرہ پیدا ہوگیا کہ اگر کہیں بارش ہوگئی اور چیلنج غلط ثابت ہوا تو معاندین خوب مضحکہ اڑائیں گے اور ہماری بڑی رسوائی ہوگی۔

لیکن لوگوں کے تعجب کی حد نہ رہی جب کہ گھنگھور گھٹا جو

جو آسمان پر چھائی ہوئی تھیں چھٹنا شروع ہوگئیں اور دیکھتے ہی دیکھتے تارے چمکنے لگے۔ اس کے بعد ڈپٹی صاحب نے اپنا بیان جاری کیا اور مسلمانوں نے اس کامیابی پر اطمینان اور مسرت محسوس کی۔

اسی کنڈرکی کے ایک دوسرے سُنّی رئیس حاجی باقر بیگ صاحب مرحوم کے دیوان خانہ میں مجلس ہوا کرتی تھی۔ اس مجلس کے بانی حاجی صاحب بڑے مؤدب دوزانو آخر تک بیٹھے رہتے اور آنکھوں سے اشکوں کا سیلاب جاری رہتا۔

حسب ذیل سُنّی حضرات کے یہاں بھی برابر مجالس ہوتی تھیں :-

عبدالرحیم ہیڈ ماسٹر، پیرزادہ عاشق علی، عبدالغنی انصاری ان لوگوں کے انتقال کے بعد ان کے یہاں مجالس کا سلسلہ ختم ہوگیا۔ اب صرف نویں محرم کو ایک مجلس لیاقت قریشی کے یہاں ہوتی ہے اور دوسری سبط حسن صاحب کے یہاں۔

قدیم حدیث خواں

مولانا سید انصار حسین صاحب مرحوم رکن دربار رام پور (۲) حکیم مولانا سید دلدار حسین صاحب مرحوم (۳) مولوی سید جعفر حسین صاحب مرحوم (۴) حکیم سید محمد حسن صاحب مرحوم (سوز خواں اور حدیث خواں دونوں) (۵) مولانا مفتی سید کاظم حسین صاحب جو اب ترکِ وطن کر گئے ہیں۔ حاجی منظور حسین صاحب مرحوم سید احمد حسین صاحب حدیث خواں اور سوز خوان دونوں تھے۔ آواز بڑی اچھی تھی۔

تحت لفظ خوان

حکیم سید مقداد حسین صاحب فارسی اور عربی کی اچھی لیاقت تھی۔ صحت الفاظ کا بڑا لحاظ رکھتے تھے۔ دبیری دبستان خیال سے تعلق رکھتے تھے۔

(۲) منشی سید محمد اسرائیل صاحب مرحوم المتخلص بہ ارشد۔ انیسی مکتبۂ خیال سے تعلق رکھتے تھے۔ بڑے قادر الکلام شاعر تھے۔ اُن کی نظمیں "درخت کہن" اور "میرا مزار" بڑی مقبول ہیں، اُن کا کلام نصاب میں بھی داخل تھا۔ افسوس کہ فانی بدایونی کی طرح ان کی عمر نے بھی وفا نہ کی ورنہ آرزو، حسرت، اثر، جگر اور یگانہ چنگیزی کی طرح وہ بھی فلک شہرت کا درخشندہ ستارہ بنے ہوتے۔ معجز سنبھلی صاحب نے آج کل شاعری میں جو مقام حاصل کیا ہے وہ ارشد کنڈرکوی مرحوم ہی کا فیض ہے اس لئے کہ مرحوم جناب معجز صاحب کے حقیقی ماموں تھے اور انھیں مرحوم سے استفادہ کرنے کا موقع ملا تھا۔ جناب معجز سنبھلی میں شاعری کے یہ "جراثیم" اپنے ننھیالی رشتے کے سبب جناب ارشد مرحوم ہی سے منتقل ہو کر پہنچے ہیں۔

پُرانے سوز خواں

میر محمد احسن صاحب، مولانا سید انصار حسین صاحب قبلہ مرحوم مصاحب خاص دربار نواب حامد علی خاں صاحب والی رام پور کے بڑے بزرگوار تھے۔ بڑے مذہبی، پابند شرع، انتہائی باکی تھے اور عزاداری میں رونق انھیں کے دم سے تھی۔ اگر کسی مجلس میں وہ نہ ہوتے تو ایسا معلوم ہوتا کہ مجلس سامعین سے خالی ہے۔ سوز بہت اچھا پڑھتے تھے۔ خدا نے آواز میں کشش ہی پیدا نہیں کی تھی بلکہ وہ بڑی باٹ دار بھی تھی۔ صبح کے سناٹے میں، اگر اذان دیتے تھے تو دو دو میل تک آواز سُنی جاتی تھی۔ سوز کا مرثیہ پڑھتے تو ہزاروں کے مجمع تک آواز باقاعدہ پہنچ جاتی اور انھیں بازوؤں کے سہارے کی چنداں ضرورت نہ ہوتی تھی۔ وہ اکیلے ہی پچاس پچاس بند کا مرثیہ بغیر بازوؤں کی مدد کے پڑھ سکتے تھے۔ ہر سال نویں محرم کو اپنے یہاں

کی مجلس میں وہ مرثیہ ضرور پڑھتے جس کا مطلع ہے ؎

رفیقان حسین ابن علی کیا کیا دلاور تھے
محمدؐ کے، علیؑ کے، مجتبیٰ کے تھے نہ یار ایسے

اس مرثیہ پر بڑی رقت ہوتی اور پھر کسی ذاکر کے پڑھنے کی ضرورت ہی نہ رہتی (۲) سید محمد ذکی صاحب مرحوم کی آواز بڑی باریک اور سُریلی تھی (۳) سید عبدالباری صاحب حنفی المذہب اور میرے والد کے حقیقی ماموں زاد بھائی تھے۔ بڑی اچھی آواز تھی۔ ہر مجلس میں شرکت کرتے اور سوز ضرور پڑھتے۔ مرحوم نے آخری عمر میں مسلسل مبارک خوابوں اور بشارتوں کے نتیجہ میں خود ہی مذہب حقہ شیعہ قبول کر لیا تھا۔ اس طرح انتقال کے بعد محبت و ذکر حسینؑ کے نتیجے میں قسمت نے انھیں جوار حضرت سیدالشہداء میں پہنچا دیا۔ اب اُن کی ساری اولاد بھی شیعہ ہے اور اُن کے پوتے سید نذیر علی صاحب بڑے اچھے سوز خوان اور میلاد خوان ہیں۔ (۴) سید محمد اصغر صاحب۔ مرحوم مولانا سید محمد سالم صاحب نقوی ایم اے پرنسپل کے عم محترم سوز خوب پڑھتے تھے اور ذاکری سے بڑا ذوق تھا۔ (۵) سید وصی حیدر صاحب مرحوم۔ اُن کے یہاں شب میں مردانہ مجلس مستقلاً ہوتی تھی اور زیادہ تر وہ اپنے یہاں کی مجلس میں سوز کا مرثیہ پڑھتے تھے۔ لحن بڑا اچھا تھا یہی وجہ تھی کہ اُن کے مرثیہ پڑھنے پر رقت زیادہ ہوتی تھی۔ اُن کے دونوں صاحبزادے سید امیر حیدر اور سید عزیز حیدر صاحبان بھی اچھے سوز خواں تھے۔ لیکن اب نہ وہ مکان رہا اور نہ اُس کے مکین۔

یوم عاشور

عاشور کے دن تعزیوں کا جلوس موسم کے اعتبار سے چار پانچ بجے کربلا پہنچ جاتا ہے جو قصبہ سے کوئی دو فرلانگ کے فاصلہ پر واقع ہے۔ کربلا میں پہلے شیعوں کے تعزیے دفن ہوتے ہیں۔ اس کے بعد دیگر اقوام کے تعزیئے۔ مضافات سے بھی بہت سے تعزیے آتے ہیں اور اُن میں سے بعض تو بہت بڑے اور اونچے ہوتے ہیں۔ اتنے بڑے اور بلند کہ ہر تعزیئے کے توازن کو قائم رکھنے کے لئے۔ تعزیئے کے چاروں طرف مضبوط رسیاں بندھی ہوتی ہیں جنھیں متعدد آدمی پکڑے رہتے ہیں تاکہ تعزیہ کسی طرف کو زیادہ نہ جھک جائے۔ دیہات کے تعزیوں کے ساتھ مسلمان ماتم بھی خوب کرتے ہیں۔

شیعہ حضرات جب اپنے تعزیے دفن کر دیتے ہیں تو زیارت روز عاشورہ پڑھی جاتی ہے۔ اس کے بعد شیعہ عزادار آٹھ آٹھ دس دس افراد کی ٹولیاں آگے پیچھے بنا کر بستی کی طرف واپس ہوتے ہیں۔ ہر ٹولی باآواز بلند حسب ذیل فقرات پڑھتی جاتی ہے۔

الوداع اے الوداع۔ شاہ شہیداں الوداع
اے حسین ابن علیؑ، دو جگ کے سلطاں الوداع

یہ مجمع سیدھا محلہ سادات میں سید صابر حسین صاحب خلف سید انصار حسین صاحب مرحوم کے مکان پر پہنچتا ہے جہاں فاقہ شکنی کا انتظام ہوتا ہے۔ چائے اور پلاؤ سے فاقہ شکنی کرائی جاتی ہے۔ یہ وہی فاقہ شکنی ہے جس کا آغاز جناب سید ہادی علی صاحب جد امجد سید رضا علی صاحب مرحوم نے اب سے سوا سو ڈیڑھ سو برس پہلے کیا تھا اور اب تک وہ فاقہ شکنی ان کے اخلاف و اخفاد کرا رہے ہیں جو بحمداللہ سب شیعہ ہیں اور جیسا کہ ہم اوپر بتا چکے ہیں۔ سید ہادی صاحب نے اپنی زندگی ہی میں اپنے سب بھائیوں، بھنوں اور بیٹوں کو شیعہ بنا دیا تھا حالانکہ خود آخر وقت تک حنفی مسلک کے پیرو رہے۔

زنانہ فاقہ شکنی

زنانی فاقہ شکنی کی رسم حسنہ اب سے کوئی پچاس سال

پیشتر جناب سید نذیر احمد صاحب رئیس و چیرمین ٹاؤن ایریا کندرکی نے جاری کی تھی۔ موصوف کے انتقال کے بعد اب یہ فاقہ شکنی اُن کے صاحبزادے حکیم سید عزیز احمد صاحب عزیز کراتے ہیں۔ عزیز صاحب کی اپنی کوئی اولاد نرینہ نہیں ہے مگر اُن کے دو چھوٹے بھائی سید ذکیر احمد اور سید کرار حسین اور ان دونوں کے کئی بیٹے موجود ہیں اس لئے یقین کامل ہے کہ یہ زنانہ فاقہ شکنی انشاء اللہ ظہور قائم آل محمد تک اسی طرح جاری رہے گی۔

کندرکی میں شام غریباں کی کوئی مجلس نہیں ہوتی بس مختلف مکانوں میں ریڈیو کے ذریعہ وہ مجالس شام غریباں سُن لی جاتی ہیں جو لکھنؤ اور کراچی سے نشر ہوتی ہیں۔

جلوس ذوالجناح

ہر سال صفر کی نوچندی جمعرات کو محلہ سادات میں میر مصطفےٰ حسن صاحب کے مکان سے جلوس ذوالجناح نکلتا ہے جس کا انتظام موصوف بڑے شوق اور محنت سے کرتے ہیں۔ اس جلوس نے بڑی مقبولیت حاصل کرلی ہے۔ گردونواح کی شیعہ بستیوں کے مومنین اور ماتمی انجمنیں کافی تعداد میں آجاتی ہیں مثلاً سرسی، سنبھل، مرادآباد، رام پور، بریلی، سہاوا ضلع رام پور، بکنالہ، منڈھن وغیرہ

شب میں بعد فراغت نماز و طعام پہلے مجلس عزا برپا ہوتی ہے جس میں باہر سے کوئی ذاکر پڑھنے کے لئے بلایا جاتا ہے۔ اس کے بعد جلوس ذوالجناح برآمد ہوتا ہے جس کا گشت رات میں محلہ سادات ہی میں ہوتا ہے۔ نماز صبح کے وقت کوئی پانچ بجے وہ سید نجم الحسن صاحب کے عزاخانہ پر جاکر ختم ہوتا ہے۔

اربعین کی پنچائتی مہندی

عزیز الحسن صاحب کے یہاں سے مہندی کا بلوس برآمد ہوکر رات بھر گشت کرتا ہے اور علی الصباح سید الیاس حسین صاحب کے امام باڑہ میں جاکر ختم ہوتا ہے جہاں مہتمم امامباڑہ کی طرف سے ماتمی دستوں کو چائے بھی پلائی جاتی ہے۔

چہلم کے سلسلہ میں ماضی کے ایک واقعہ کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ اس واقعہ کو گزرے کچھ کم ایک صدی ہوچکی ہے واقعہ کی تصدیق مجھے اپنے بزرگوں سے ہوئی ہے۔ ابتدا میں تو اس واقعہ کا ذکر اسی طرح نامناسب تھا جس طرح مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کی تاریخ آزادی ہند کے اُن ابواب کی اشاعت جو انھوں نے ۱۹۸۰ء کے بعد شایع کرنے کے لئے حکومت ہند کے پاس سر بمہر کرکے رکھائے ہیں۔

یہ واقعہ میری پیدائش کے پہلے کا ہے جب کہ ہمارے قصبہ میں پولیس اسٹیشن قائم تھا اور وہ منتقل ہوکر قریبی قصبہ بلاری میں نہیں بھیجا گیا تھا۔ زمانۂ سابق میں کندرکی میں چہلم کے دن تعزیے نہیں نکلتے تھے بس دو ایک مجلسیں ہوجایا کرتی تھیں۔

مگر اُس زمانہ میں ایک شیعہ سب انسپکٹر پولس کندرکی کے تھانہ میں تعینات ہوکر آگئے۔ اُنھیں یہاں آکر معلوم ہوا کہ اس قصبہ میں چہلم نہیں ہوتا۔ اُن کی تعیناتی کے بعد جب پہلا چہلم پڑا تو اُنھوں نے تھانہ کے روزنامچے میں جہاں اور ضروری باتیں درج کیں۔ وہاں مختصراً یہ بھی لکھ دیا کہ آج کندرکی میں چہلم بخیر و خوبی گزر گیا۔ وہ کندرکی میں سات آٹھ برس تعینات رہے۔ ہر سال چہلم کے موقع پر وہ ازداراہ طور پر روزنامچہ میں یہ تحریر کرتے رہے کہ یہاں چہلم کا جلوس امن و امان کے ساتھ گزر گیا۔

جب اُن کا تبادلہ ہوا تو اُنھوں نے سادات کے معتقد بااثر افراد ہی کو نہیں بلکہ اُن سنی حضرات کو بھی جو عشرہ میں تعزیے رکھتے تھے اور اُن ہندو روساء کو بھی جن سے سادات برادرانہ تعلقات رکھتے تھے بُلاکر خاموشی سے کہہ دیا کہ میں

نے آپ کے یہاں جلوس چہلم کے لئے ریکارڈ مکمل کر دیا ہے میرے چلے جانے کے بعد آپ ایکی چہلم میں تعزیئے اٹھائیے انشاء اللہ آپ کو کامیابی ہوگی۔ ہندوؤں سے تو مخالفت کا کوئی اندیشہ نہیں تھا اور سنیوں کی زیادہ تعداد بھی تعزیہ دار تھی۔ بس کچھ شر پسند مسلمانوں نے مزاحمت کا فیصلہ کیا۔ چہلم کے موقع پر امن وامان قائم رکھنے کے لئے پولیس نے چند سنیوں اور شیعوں کو گرفتار کر کے حوالات بھیج دیا اور اپنی حفاظت میں جلوس بخیریت نکلوا دیا۔ اس کے بعد ہر سال بآسانی جلوس نکلنے لگا اور آج تک نکل رہا ہے۔

اب تو اس واقعہ پر تعزیوں پر تمادیاں عارض ہو چکی ہیں اور اب اس کے اظہار میں کوئی قباحت بھی نہیں معلوم ہوتی اس لئے کہ شیعوں کا یہ حق ایک صدی سے مسلم ہو چکا ہے۔

چہلم کا جلوس

۲۰ر صفر کو عشرۂ اربعین ختم ہو جانے کے بعد کوئی دو بجے تعزیے جلوس کی شکل میں بالکل اُسی نوعیت سے نکال کر کربلا لے جائے جاتے ہیں جس طرح یوم عاشورہ کو۔ اس تاریخ کو سید محمد عباس صاحب مرحوم مہتمم امامباڑہ میر سعادت علی صاحب مرحوم تحصیلدار پنشن یافتہ پیل مراد آباد و بلاد کی حاضری کرایا کرتے تھے اور مراد آباد اور سرائے کے لوگوں کو خصوصیت کے ساتھ اس میں مدعو کیا جاتا تھا جن کی وجہ سے تعزیوں کے جلوس میں بڑی رونق پیدا ہو جاتی تھی۔ اس حاضری کے لئے مرحوم نے ایک جائداد بھی وقف کر دی تھی لیکن خاندانی جائداد اور بڑھتی ہوئی گرانی کے باعث اُس کی آمدنی حاضری کے اخراجات کے لئے ناکافی ہوتی ہے اس لئے بہت سے حاضری بند کر دی گئی اور اب شاید اس کی جگہ مجلس ہو جاتی ہے اس وقف کا متولی ماسٹر سید رفیق حسین صاحب اسسٹنٹ ٹیچر پارکرمشن ہائی اسکول مراد آباد کو بنایا گیا تھا جو سید محمد عباس کے بھانجے تھے۔ اب اُن کے مرنے کے بعد اُن کی بڑی صاحبزادی اس کی متولیہ ہیں۔

رمضان کی ۱۹ار، ۲۰ر، و ۲۱ر کو بھی متعدد زنانی مجالس ہوتی ہیں اور ۸ر ربیع الاول کو بھی زنانی مجلس برپا کی جاتی ہے۔

(نوٹ:- کندرکی کی تاریخ عزاداری کے سلسلہ میں ایک بسیط مضمون حکیم مولوی سید جمیل حسن صاحب رضوی کامل نے کندرکی سے اور دوسرا ڈپٹی سید نصیر الحسن صاحب ایم۔ اے نے بنارس سے بھیجا۔ بہت سی باتیں تو دونوں میں مشترک تھیں لیکن بعض ضروری باتیں اگر ایک میں تھیں تو دوسرے میں نہیں تھیں اور بعض اہم واقعات دونوں کے یہاں سے حذف تھے۔ پھر واقعات کی ترتیب بھی کچھ بہت زیادہ مناسب نہ تھی جب میں نے دونوں مضامین پڑھے تو چاہا کہ دونوں کو ایک دوسرے میں سمو دوں۔ ایسا کرنے میں بہت سے اُن معلومات کا اضافہ بھی ہو گیا جو میرے حدود علم وسماعت میں تھے۔ اس لئے بھی کہ میں کندرکی ہی کا ساکن ہوں اور ان دونوں سے عمر میں بہت بڑا ہوں اور اس لئے ماضی کے واقعات کے متعلق میری واقفیت بھی دونوں سے بہرحال زیادہ ہونا چاہیئے۔ اس مضمون کو مذکورہ دونوں صاحبان کا مشترکہ مضمون سمجھنا چاہیئے۔ میں نے تو صرف اسے گھٹا بڑھا کر ذرا سڈول کر دیا ہے۔

مصطفےٰ حسن رضوی ایڈیٹر سرفراز)

ضلع سیتاپور کی عزاداری

سید محمد اکبر صاحب رضوی مرحوم سیتاپوری مولف محمدی دنیا وغیرہ

(ضلع سیتاپور کی عزاداری کے تفصیلی حالات جناب سید محمد اکبر صاحب رضوی مولف حسینی دنیا' محمدی دنیا و تاریخ سیتاپور وغیرہ نے ماہ ستمبر ۱۹۵۰ء میں جب وہ بقید حیات تھے مرتب فرمائے تھے۔ چونکہ مرحوم ریاست محمود آباد میں ملازم تھے اور وہاں کے بے نظیر کتب خانے سے استفادہ کرنے کا آپ کو پورا پورا موقع تھا اس لئے جو واقعات آپ نے لکھے ہیں وہ مستند اور ذاتی معلومات کی بنا پر لکھے ہیں۔ مرحوم چار بھائی تھے۔ ایک بھائی سید محمد اطہر صاحب مرحوم زائر سیتاپوری تھے جن کا مطالعہ بہت وسیع تھا اور ریاست محمود آباد کے مدار المہام کے عہدہ پر فائز تھے مگر دو تین سال ہوئے ان کا بھی انتقال ہو گیا۔ دو بھائی جناب ناظم سیتاپوری اور سب سے چھوٹے بھائی جناب سید محمد حیدر صاحب اسعد ہیں جو آجکل بسلسلہ معاش بمبئی میں مقیم ہیں خداوند تعالیٰ دونوں کو طول عمر عطا فرمائے اور وہ ادبی خدمات کرنے کے برابر مواقع پاتے رہیں حالات کے ترتیب دینے سے بہت کچھ تبدیلیاں ہو گئی ہیں چونکہ تحریر میں ردو بدل ممکن نہیں لہذا ہو سکتا ہے بعض واقعات موجودہ حالات کے مطابق نہ ہوں۔ (ایڈیٹر سرفراز)

تاریخ سیتاپور اور اودھ کی تدوین میں جہاں تک عزاداری و تعزیہ داری کے انکشافات ہوئے وہ اپنی نوعیت سے اس ضلع کی نہیں بلکہ ہندستان کی عزاداری کا ایک اہم باب ہے جس کی طرف ابھی تک توجہ مبذول نہیں کی گئی تھی لیکن اس ضلع کی تاریخ لکھتے وقت چونکہ میری نظر ہر پہلو پر تھی اس بنا پر اس کے لکھنے میں مجھے کوئی امر مانع نہیں ہے کہ میں یہ واضح کر دوں کہ ہمارے ضلع میں عزاداری ہندستان کا وہ شجر مو جود ہے جس کے پھل اور پھول دور دور تک پھیلے اور پھولے ہیں جن کا انکشاف اب تک نہیں ہوا تھا۔

تیمور شاہ کا تعزیہ

جہاں تک تاریخ تعزیہ داری کا تعلق ہے اب تک لوگوں کا خیال ہے کہ تعزیہ داری تیمور کے عہد سے شروع ہوئی تھی۔ تیمور ہر سال کربلائے معلیٰ بغرض زیارت جاتا تھا لیکن ایک مرتبہ اُس نے یہ ارادہ کر لیا کہ اب واپس نہیں جاؤں گا۔ ارباب سلطنت نے اس خیال سے اس کو باز رکھنے کی کوشش کی مگر وہ ارادہ میں کوئی تغیر کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا تھا۔ کربلا والوں نے ایسی صورت میں ایک ضریح اس کی خدمت میں نذر کی جس کو اُس نے پسند اور قبول کر لیا وہ اس ضریح کو ہر وقت اپنے ہمراہ رکھتا تھا۔ جب یہ ضریح کربلا والوں نے پیش کی تھی وہ ۸۰۰ھ کا زمانہ تھا۔ جب وہ ہندستان آیا تب بھی یہ اس کے ہمراہ تھی۔ یہ ہے وہ تعزیہ داری کا انکشاف جو نویں صدی ہجری کا ہے اسی کو ہندستان میں تعزیہ داری کی پہلی کڑی یا نقطۂ آغاز سمجھا جاتا ہے۔

سیتاپور میں تیمور شاہ دہلی کے عہد کا علم

خوش قسمت وہ لوگ ہیں جو ایسے تبرکات کی فراہمی کے کوشاں رہتے ہیں اور ان کی قدر و قیمت ان کے دلوں میں جاگزیں رہتی ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں ریاست محمود آباد کے والیان کی دوررس نگاہیں قابل قدر ہیں وہ

ہشت حسینی یادگاروں کے قیام میں ہمہ تن کوشاں رہتے ہیں۔

یہ علم زمانہ عزا میں عزاخانہ بارہ دری میں آویزاں رہتا ہے اور آٹھویں ربیع الاول میں جب کہ زمانہ عزا ختم ہونے لگتا ہے تو آٹھویں ربیع الاول کے جلوس میں یہ علم آگے آگے ہوتا ہے اس کے دو مقام پر تیمور شاہ دہلی کندہ ہے ۱۱۸۰ھ دوسری حصہ میں جلوس تیمور شاہ دہلی کندہ ہے اور پھر دستہ پر بھی کندہ ہے۔ بیچ کا حصہ کنگورہ دار ہے جس پر (نصر من اللہ فتح قریب) کندہ ہے۔ یہ علم لوہے کا ہے جو اس ضلع کی نایاب چیز ہے اور عزاداری کی قدیم یادگار معلوم ہوتی ہے اس سے قبل کا علم آج تک نظر سے نہیں گزرا اور نہ دیکھنے میں آیا ہو۔ کیا عجب ہے کہ یہ علم ہندستان میں اولیت کا حامل ہو۔

سیتاپور عہد شاہی میں

سیتاپور خاص قدیم زمانہ میں بالکل غیر معروف مقام تھا اور اس کی ایک گاؤں کی حیثیت تھی۔ پہلے اس کا صدر مقام خیرآباد تھا جہاں نظامت تھی اور وہاں ناظم سرکار خیرآباد رہتا تھا فوج۔ دفاتر اور تعلیم گاہیں غرضکہ سب ہی کچھ اسی مقام پر تھا اور کافی گنجان آبادی تھی جہاں ہر مذاق کے لوگ پہونچ گئے تھے۔ بڑے بڑے علماء اور صوفی منش بزرگوں وغیرہ کا وہاں پتہ چلتا ہے۔ غرضکہ وہاں کے لوگ ناقل ہیں کہ اس زمانہ میں وہاں باون محلے تھے لیکن عہد شاہی کے بعد جب انگریزوں کا زمانہ آیا تو چونکہ سیتاپور کے قریب کنٹونمنٹ قائم ہو چکا تھا لہذا خیرآباد کے بجائے سیتاپور کو صدر مقام قرار دیا گیا اور پھر خیرآباد میں اضمحلال پیدا ہوتا گیا۔ خیرآباد کو دل میں خیرا پاسی نے آباد کیا تھا اور پاسیوں کی زیادہ تر آبادی تھی۔

یوسف غازی علیہ الرحمہ کا خیرآباد پر حملہ

مسٹر نیول آئی۔سی۔ایس منصف سیتاپور نے ڈسٹرکٹ گزیٹیر مطبوعہ سنہ ۱۹۰۳ء میں لکھا ہے کہ خیرآباد کو یوسف غازی نے فتح کیا تھا جو بارھویں صدی عیسوی کا آخر زمانہ تھا یعنی جس کو سنہ ۱۱۹۰ء سمجھنا چاہیئے۔ ہجری مطابقت سے وہ سنہ ۵۹۶ھ ہجری کا سال ہوتا ہے۔ چنانچہ پاسیوں کو خارج البلد کر دیا گیا اور مسلمانوں کا عمل دخل قائم ہو گیا مگر اس عہد سے قبل ہی مسلمانوں کی آمد و رفت شروع ہو گئی تھی جو سنہ ۱۰۲۶ء مطابق سنہ ۴۱۶ھ ہجری کا عہد تھا جبکہ سید سالار مسعود غازی وارد ہندستان ہوئے تھے جن کا مزار بہرائچ میں ہے اور جن کے متعلق عام خیال ہے کہ امامیہ مذہب رکھتے تھے۔ احمد آباد ملحقہ قصبہ تمبور میں بدرالدین شہید کی درگاہ ہے۔ اس کے علاوہ سید برہان الدین اور سید رحمٰن کے مزار واقع ہیں جو سید سالار کی معیت میں پانچویں صدی ہجری میں وارد ہندستان ہوئے تھے۔

مجدد تعزیہ داری یوسف غازی کا تعزیہ

یوسف غازی علیہ الرحمہ نے خیرآباد کو فتح کر کے وہاں اپنا تسلط قائم کیا۔ ان کے ہمراہیوں میں سید معصوم علی شاہ اور ملا حسن شہید کی خیرآباد میں قبریں ملتی ہیں جو نمایاں شخصیت کے حامل تھے۔ ملا حسن شہید کے متعلق یہ بھی معلوم ہوا کہ آپ محب اہل بیت اور عزادار تھے خود مجالس کرتے تھے اور حدیث خوانی کرتے تھے قرینہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یوسف غازی محب اہل بیت اور تعزیہ دار تھے اور زائر سید الشہداء بھی تھے۔ کیونکہ جو تعزیہ آپ نے خیرآباد میں شروع کیا ہے وہ بالکل امام حسین علیہ السلام کی ضریح کی نقل ہے جو چاندی کے کٹہرے کی شکل ہو۔ پہلے زمانہ کی ضریح جو کربلا میں تھی وہ کیسی تھی لیکن جو ایک حد تک اب بدل گئی ہے۔ یوسف غازی نے جیسی اس زمانہ میں صورت ضریح کی دیکھی تھی اسی ساخت کی خیرآباد میں بانسوں کے ڈنڈوں سے تیار کرائی ہے۔ چونکہ راقم الحروف زیارت کر چکا ہے اس لحاظ سے میرا خیال ہے کہ وہ تعزیہ جو باون ڈنڈوں کا کہلاتا ہے اسی ضریح کربلا کا نمونہ ہے۔ بیچ میں تربتیں بنا کر اس کے اوپر ایک کپڑے کا بیضاوی چھتری دار گنبد قائم کر کے وسط کے

ارد گرد ایک کٹہرا بنایا ہے جو ترجتوں سے بہت دور ہوتا ہے اور ہاتھوں کا وہاں تک پہونچنا دشوار سا ہوتا ہے۔ بس جنگلے پر ہار ہوتے ہیں جو کافی بڑے ہوتے ہیں۔ عام لوگ بھی خوب ہار چڑھاتے ہیں گاڑیوں باہر سے ہار بس تعزیہ کے لئے آتے ہیں۔ یہ سب مختصر سی شباہت جو تعزیہ کی ہے۔ یہ تعزیہ قریب قریب اسی سائز کا ہوتا ہے جس سائز کی ضریح کربلا ہے۔ کافی وزن اس تعزیہ کا ہوتا ہے۔ بیس پچیس آدمی اس کو کاندھا دیتے ہیں۔ جب تعزیہ کے دفن کا وقت ہوتا ہے تو اس کے ڈنڈے جو بادن ہوتے ہیں کھول لئے جاتے ہیں جو سال بہ سال بلا کسی کمی وزیادتی کے پھر تعزیہ میں استعمال ہوتے ہیں اس لئے ضریح کا سائز ایک ہی رہتا ہے۔ تربت بیچ سے نکال لی جاتی ہے جو کپڑے سے منڈھی ہوئی ڈہری ہوتی ہے اور ضریح مثل جعدار کی کربلا میں دفن ہوتی ہے لیکن بجائے پانی کے دودھ اس کی ڈہل میں بھرا جاتا ہے۔ یہ تعزیہ بادن ڈنڈوں کا تعزیہ مشہور ہے اور یوسف غازی کا کہلاتا ہے بہت سے لوگ بوڑھے بابا کا بھی تعزیہ کہتے ہیں خیال یہ ہوتا ہے کہ غازی علیہ الرحمہ معمر بزرگ ہو گئے تھے اس بنا پر آج بھی وہ بوڑھے بابا کا تعزیہ کہلاتا ہے۔ خیرآباد میں بادن محلے تھے چنانچہ اسی روایت سے غازی مرحوم نے ایک ایک محلہ سے ایک ایک ڈنڈا لے کر اس تعزیہ کی بنا کی تھی تاکہ یہ پورے قصبہ کا تعزیہ ہو جائے اور ہر ایک کا اس پر استحقاق قائم رہے جو ابتک برابر اکٹھا رہا ہے اور اس میں کوئی تغیر نہیں ہوا ہے۔ یہ تعزیہ شب عاشور رکھا جاتا ہے اور عصر عاشور اٹھتا ہے جس جس مقام پر وہ ابتداء سے رکھا جاتا ہے اسی مقام پر ضروری ہے کہ وہ وہاں رکھا جائے اتنی مدت سے اس طریقے میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ یہ تعزیہ محلہ محلہ ہوتا ہوا گیارھویں محرم کو تین یا چار بجے سہ پہر تک دفن ہوتا ہے

جو پہلے گیارھویں شب میں دفن ہوتا تھا جس کے سبب سے اس کی شہرت نہیں ہو سکی لیکن جب سے گیارہ محرم کو اٹھنے لگا کافی مجمع ہوتا ہے۔ لوگوں کا خیال ہے کہ تقریباً ایک لاکھ کا مجمع ہوتا ہے۔ یہ تعزیہ جب گشت کرتا ہے اور دوسرے محلوں میں جاتا ہے تو محلے والے خود اس کا انتظام کرتے ہیں اور اٹھاتے ہیں۔ کربلا میں پہونچ کر بہشتیوں کے محلے والے ہمراہ ہوتے ہیں اور وہی اس تعزیہ کو کھولتے ہیں۔ جہاں تک حالات کا جائزہ لینے سے پتہ چلتا ہے یہ تعزیہ چھٹی صدی ہجری کا ہے جس کو تیمور کے تعزیہ سے کافی اولیت حاصل ہے۔ یوسف غازی کا ۵۹۲ ہجری کا زمانہ ہے اور تیمور کا تعزیہ نویں صدی ۸۰۸ھ کا تعزیہ معلوم ہوتا ہے جو بہت بعد کا ہے کیونکہ اس سے قبل کسی تعزیہ کا پتہ نہیں چل رہا ہے۔ یہ تعزیہ ایک فقیر کے انتظام میں ہے اور وہی کے گھر والے اس کے منتظر رہتے ہیں۔ یہ بھی اس تعزیے کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ سب سے پہلے شہزادوں کا محل کہلایا گیا تھا بعد میں تعزیہ ہوا۔

یوسف غازی کا مذہب و خیالات

یوسف غازی کا مقبرہ خیرآباد کے روضہ محلے میں واقع جو ایک احاطہ میں محصور ہے اور اس میں پھاٹک لگا ہے۔ دروازہ کے اندر داخل ہونے پر داہنی جانب ان کا تعمیر کردہ امام باڑہ جس میں بادن ڈنڈوں کا تعزیہ رکھا جاتا ہے قدیم زمانہ کا ہے اور وہ اسی تعزیہ سے کچھ بڑا ہے جس کے ارد گرد ایک آدمی پھر سکتا ہے اور جا سکتا ہے۔ بائیں طرف ایک مسجد ہے۔ مقبرہ کی بھی میں نے زیارت کی تھی کافی بڑا پختہ قبر قبہ کے اندر موجود ہے جیسی امامیہ مذہب والے لوگوں کے یہاں ہوتی ہے گر اس میں کوئی فرق اب تک نہیں ہو سکا حالانکہ مقبرہ کے باہر حنفی المذہب حضرات کی قبریں ملتی ہیں جو بیچ میں ابھری ہوئی ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک زائر سید الشہداء جس نے تعزیہ کی بنا کی ہو اور امام باڑہ بھی اس کا

ہو اور اس کے ساتھی ملا حسن شہید بھی ہوں جو محب اہل بیت اور خود عزاداراور تعزیہ دار تھے۔ خود مجالس کرتے تھے اور اس میں حدیث خوانی بھی فرماتے تھے۔ یہ قرائن بتا رہے ہیں کہ یوسف غازی بھی محب اہل بیت اور تعزیہ داری کے بانی تھے اور حسن شہید ترویج عزا کے لئے مجالس و حدیث خوانی کیا کرتے تھے اور اس طرح عزاداری کی ترویج ہو رہی تھی۔ یہ تھی ابتدائی عزاداری جو خیرآباد سے وابستہ تھی جہاں کافی ہندو اور اسی کے بقدر مسلمانوں کی آبادی تھی لیکن باوجود اس کے عزاداری میں کوئی رخنہ اندازی کا پتہ نہیں چلتا ہے بلکہ ہندو مسلمانوں میں یک جہتی اور بھائی چارہ کا جذبہ کار فرما رہا۔

خیرآباد کی مجالس اور جلوس عزا

ابتدائی عہد کا جو پتہ چل سکا وہ اوپر تحریر کر دیا گیا ہے لیکن موجودہ زمانہ میں جو صورتیں رونما ہو چکی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ مجالس جو شیعہ حضرات کرتے ہیں وہ چار پانچ سے زیادہ عشرہ میں روزانہ نہیں ہوتیں اور ان کا سیوم امام تک سلسلہ رہتا ہے۔ خیرآباد میں شیعوں کے چند گھر ہیں بقیہ تمام آبادی ہندو اور سنی حضرات کی ہے مگر کافی اشتراک سے تعزیوں میں دونوں شرکت کرتے ہیں۔ بازداری محلہ میں ۱۲ محرم تک چندہ سے اس محلہ کے امام باڑے میں مجلسیں ہوتی ہیں۔ اور ۸ و ۱۰ محرم کو حکیم انوار حسین صاحب مرحوم کے گھر مجلسیں اور متولی ظہیرالدین صاحب کے گھر پر ۸ محرم کو ایک مجلس ہوتی ہے۔

خیرآباد کے جلوس عزا

مجالس محرم تو بہت مختصر ہوتی ہیں۔ جلوسوں کی تفصیل حسب ذیل ہیں:۔

(۱) ۳ محرم کو روضہ دروازہ سے جہاں یوسف غازی کا تعزیہ رکھا جاتا ہے علم ۱۲ بجے دن کو اٹھتے ہیں اور ... کو واپس ہوتے ہیں۔

(۲) ۳ محرم کو قصائی محلہ کے امام باڑہ سے چندہ کر کے علم اٹھتے ہیں وہ بھی بارہ بجے اٹھ کر شب کو واپس ہوتے ہیں۔

(۳) ۵ محرم کو محلہ تقیارہ کے امام باڑہ سے چندے سے اسی طرح بارہ بجے دن کو علم اٹھتے ہیں۔

(۴) بازداری محلہ سے ۷ محرم کو اسی طرح چندے سے ۱۲ بجے علم اٹھتے ہیں۔

(۵) محلہ میاں سرائے سے ۸ محرم کو اسی طریقہ سے علم اٹھتے ہیں۔

(۶) ۸ محرم کو محلہ شیخ سرائے سے علم اٹھتے ہیں ایک گھوڑا بھی نکلتا ہے اس کے ہمراہ ہوتا ہے اس کا بھی اسی وقت پر جلوس اٹھتا ہے اور شام تک واپس ہوتی ہے۔

(۷) ۹ محرم کو ملائے سرواہن سے علم اٹھتے ہیں وہ بھی چندے کے ہوتے ہیں اور اسی مقررہ وقت پر اٹھتے ہیں۔

(۸) شب عاشورہ یادگار پہلا تعزیہ جو یوسف غازی علیہ الرحمہ کا ہے اور جو ایک فقیر کے اہتمام میں ہے۔ غازی جی کے امام باڑہ میں رکھا جاتا ہے اور عاشورہ محرم کو عصر کے وقت اٹھ کر ۱۱ محرم کو سہ پہر کے وقت دفن ہوتا ہے جن کا ابتدا میں تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے کہ یہ زائر اور محب اہل بیت تھے جنھوں نے پہلے پہل تعزیہ کی بنا کی یا نقل ضریح سید الشہداء بنائی اور خیرآباد میں امام باڑہ تعمیر کیا۔

(۹) ۱۱ محرم کو بعد دفن تعزیہ مذکورہ مکا جمعدار کے امام باڑہ میں تعزیہ رکھا جاتا ہے جو حکیم انوار حسین صاحب مرحوم کے زیر انتظام ہوتا تھا اور شب کو مجلس بھی ہوتی ہے۔

(۱۰) جو تعزیہ مکا جمعدار کے امام باڑہ کا ۱۱ محرم کو رکھا جاتا ہے وہ سیوم کو اٹھایا جاتا ہے اور انصاری برادری کے تعزیئے اس کے ساتھ ہوتے ہیں۔

(۱۱) ۹ محرم کو یا ۲۰ محرم کو مرزا امتیاز حسین کے گھر کا تعزیہ رکھا جاتا ہے اور ۱۲ بجے دن کو اٹھتا ہے اور نوحہ خوانی و ماتم بھی ہوتا انجمن شاداں اسلام خیرآباد اس میں کافی حصہ لیتی ہے۔

چہلم امام

۲۰ر صفر کو تعزیے چوک پر آتے ہیں اور ۱۹ر صفر کو ۱۱ بجے دھکو بیاں سرائے سے جمع ہو کر اٹھتے ہیں۔ غلام علوائی کے گھر کا تعزیہ ان میں قابل ذکر ہے۔

منصوٹ۔ بہر حال اتنے زمانہ میں بہ نسبت پہلے زمانہ کے عزاداری کو فروغ ہے۔ خیر آباد میں شیعہ تو بالکل برائے نام ہیں بقیہ پورا قصبہ حضرات اہل سنت اور اہل ہنود کا ہے لیکن دونوں کافی حصہ لیتے ہیں اور برابر کے شریک ہیں۔

نیا سیتاپور (خاص)

انگریزوں نے اپنا تسلط جمانے کے بعد اپنے دفاتر اور عمارتوں کا از سر نو تعمیر کی اور پھر خیر آباد اُجاڑ ہونے لگا اور انگریز حکام ۱۸۵۹ء سے آنا شروع ہو گئے۔ ۲ر اپریل ۱۸۵۹ء مطابق ۲۷ر رمضان ۱۲۷۵ھ کو تامسن گنج کی بنیاد رکھی گئی جہاں بالکل ویرانہ اور کھیت تھے اور مدار کا جنگل چہار جانب پایا جاتا تھا رفتہ رفتہ تعمیر ہو کر آبادی ہو گئی عہد شاہی میں تھا استھانہ چھاؤنی تھی۔ عالم نگر و سرائے پختہ میں چند سال کے بعد ۱۸۹۳ء و ۱۲۹۹ء چھاؤنی اور صدر بازار قائم ہوا۔ صدر بازار کی بھی آبادی بڑھنے لگی اور وہاں بازار قائم ہو گیا۔ تامسن گنج کو تامسن جنٹا ڈپٹی کمشنر نے آباد کرایا تھا اور انگریزی دفتروں کی وجہ سے بازار تامسن گنج کو کافی عروج ہو گیا اور وہ مقام جو نئے سیتاپور کے نام سے یاد کیا جاتا ہے دریائے سرائن کے جنوب مشرق کی سمت آباد ہو تا گیا اور گنجان آبادی اور بازار کو ترقی ہوتی گئی ۱۸۶۸ء میں میونسپلٹی کا قیام ہوا۔

جلوس سرزار

اس ترقی کے زمانہ میں نئے سیتاپور میں عالم نگر میں مولوی ہادی علی خاں صاحب امام جمعہ و جماعت مسجد عالم نگر کے گھر سے چوتھی محرم میں علم اٹھتے ہیں اور ذوالجناح اٹھتا ہے جو پُرانے سیتاپور میں بھی گشت کرتا ہوا آتا ہے اور پورے محلہ میں گشت کرتا ہے۔ جتنی صاحب اور ان کے اعزا اس میں نہایت منہمک رہتے ہیں۔ مجالس بھی ان کے یہاں ہوتی ہے۔ شب عاشور بہت سے گھروں میں تعزیہ رکھے جاتے ہیں اور عاشور کے بعد دوپہر دفن ہوتے ہیں جن کی تعداد سیکڑوں کی ہوتی ہے۔ غرضکہ نئے سیتاپور میں عزاداری میں زیادہ تر مسلمان حنفی المذہب کافی حصہ لیتے ہیں۔ کربلا یادگار حسینی میں (جو ہپکے پل کے پاس واقع ہے) تعزیے دفن ہوتے ہیں۔ ۱۹۰۵ء سے قبل صدر بازار سے ایک ہندو سبز کپڑے پہنے ذوالجناح امام باڑے میں لاتا تھا۔ لیکن اب نہ معلوم کہ وہ کہاں چلا گیا جس کو زمانہ ہو گیا اور کچھ خبر نہیں کہ اس کا کیا حشر ہوا۔ ہمارے نانا سید ناظر حسین صاحب وکیل اس تعزیہ میں شرکت فرمایا کرتے تھے اور کافی گریہ کرتے تھے۔

پُرانا سیتاپور (خاص)

سرائن ندی کے اتر و پچھم جانب پُرانا سیتاپور کہلاتا ہے یہ سیتاپور کی قدر بر آبادی سمجھی جاتی ہے۔ تاریخ سیتاپور مولفہ اکبر علی خاں صاحب (قلمی) سے واضح ہوتا ہے کہ پُرانے سیتاپور میں محلہ کنگری ٹولہ واقع تھا جو زمانہ شاہی میں کنگروں نے آباد کیا تھا مگر پھر وہ لوگ اس مقام سے قصبہ بسوان میں جا کر آباد ہو گئے جس سے وہ مقام شاہی نزول ہو گیا اور ہنگام بندوبست ۱۲ر اگست ۱۸۶۱ء یہ ڈگری محلہ قضیارہ میں آگیا اور یہ محلہ کنگری ٹولہ محلہ قضیارہ سیتاپور میں شمار ہو گیا۔

بسوان کے کنگروں کا مسکن محلہ قضیارہ ہے

اس محلہ میں کنگروں کی آبادی تھی جو تعزیہ سازی سے روزی کماتے تھے اور یہ شاہی زمانہ میں محلہ قضیارہ جو ہے اس کے حدود میں رہتے تھے جو بندوبست سے قبل تک رہے اور بوجہ نزول ہو جانے اس محلہ والے بسوان میں جا کر آباد ہو گئے۔ مسٹر نیول آئی۔ سی۔ ایس نے سیتاپور ڈسٹرکٹ گزیٹر میں بسوان کے حالات میں لکھا ہے کہ یہاں تعزیے بہت

عمدہ بنتے ہیں اور بہت خوبصورت ہوتے ہیں۔ اس میں شک نہیں تعزیئے یہاں اپنی ساخت کے نہایت ہی عمدہ اور خوبصورت ہر سائز کے بنتے ہیں جو صناعی کی بہترین نمونہ ہوتے ہیں کیونکہ ان کی ساخت نہایت موزوں اور تعمیری لحاظ سے بہترین صنعت ہے بسوان ضلع سیتاپور ہندستان میں تعزیوں کی منڈی ہے جہاں کے بے مثل تعزیئے دور دور تک چھوٹے بڑے جاتے ہیں۔ ہر زمانہ میں چھپائی اور لکھائی قلم سے اس مقام پر جاری رہتی ہے اور ان کے علاوہ پرزے بھی بازاروں میں بنتے ہیں جو تعزیہ داری کی صنعت کا بہترین مقام ہے اور یہ سب بنیاد پرانے سیتاپور کی تھی لیکن کنگروں کے بسوان میں چلے جانے سے اور دوری ہو جانے سے میرا تو خیال ہے کہ ان کی ترقیوں میں ایک حد تک کمی ہو گئی کیونکہ یہ صنعت اگر سیتاپور کے مقام پر ترقی کرتی تو کافی عروج ہوتا۔ بڑے بڑے تعزیئے جو اس مقام کے بنے ہوئے سیتاپور میں رکھے جاتے ہیں وہ انھیں لوگوں کی صناعی کا نمونہ ہوتے ہیں جو بسوان سے آتے ہیں اور قیام کرکے ان کو تیار کرتے ہیں۔ کپڑے پر چھپائی اور لحاف و رضائیاں انھیں لوگوں کی تیار کردہ صنعتیں ہیں مگر تعزیئے اس ضلع کے نہایت بہترین صنعت ہیں جس کی وجہ سے بسوان صنعت تعزیہ داری کا مرکز ہو گیا ہے۔ یہ ہمارے پرانے سیتاپور کی ابتدائی یادگار ہے جو تعزیہ داری میں تقویت پیدا کرتی ہے اور اس طرح خواہ قصبہ پارہ کنگروں کا مقام ہو یا بسوان دونوں صورتوں میں اسی ضلع سیتاپور کے مقام ہیں جن کو ابتدا سے فوقیت حاصل ہو چکی ہے۔ یہ کنگر سب کے سب تقریباً حنفی المذہب ہیں لیکن تعزیوں کے متعلق جو روایات وہ خود بیان کرتے ہیں وہ تو میرا خیال ہے کہ شیعہ حضرات بھی اس سے آگاہ نہیں ہیں۔

عشرۂ محرم میں پرانے سیتاپور کی عزاداری

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اس مقام پر جو رجحانات عزاداری تھے اُن کا اثر پہلے سے تھا لیکن اُن میں ترقیاں نہ پیدا ہونا یہ وقت و زمانہ کا تقاضہ تھا جس کا پتہ نہیں چل سکا۔ چنانچہ یہاں کی عزاداری میں تین مجلسیں محرم کے ایام میں معلوم ہوتی ہیں ایک مجلس تو بڑے امام باڑہ کی ہے، دوسری مجلس حاجی صاحب کے امام باڑہ سے متعلق ہے اور تیسری مجلس بنگلہ پر کی ہے جہاں آٹھویں محرم کو علم نکلا کرتا تھا اس کے بعد سے مجلسیں پڑھنے لگیں اور جلوس عزا میں بھی اضافہ اور ترقیاں شروع ہو گئیں اور پھر شب کو امام باڑہ کلاں کے بعد مولوی صادق حسین صاحب مرحوم کے یہاں بھی مجلس شب میں ہوتی تھی اور اس کے علاوہ دن میں مجلسیں اس سلسلے سے ہوتی ہیں (۱) والدی سید مقبل حسین صاحب مرحوم اور اہلیہ سید محمد وجیہ صاحب مرحوم قصبہ پارہ (۲) سید محمد حیدر صاحب متولی قصبہ پارہ (۳) حسینیہ جعفریہ (چھوٹا امام باڑہ بنگلہ) (۴) سید اسحاق حسین صاحب مرحوم وکیل (۵) ماسٹر سید رضی احمد صاحب (قصبہ پارہ) (۶) سید نذیر حیدر صاحب (بنگلہ) (۷) پہلے سجاد مرزا صاحب مرحوم کی ہوتی بعدہ امام باڑہ کلاں میں ہوئی جو اب تک قائم ہے اور اس کے بانی قاضی سید محمد تقی صاحب ہیں (۸) امام باڑہ حاجی صاحب مرحوم (۹) حکیم نہال حسین صاحب مرحوم (۱۰) شیخ علی نقی صاحب - - - - - (۱۱) سید جواد حسین صاحب جدید (۱۲) امام باڑہ سید زیدی کی مجالس کا اب کوئی خاص منتظم نہیں ہے کیونکہ ان کے صاحبزادے پاکستان چلے گئے اور امام باڑہ کس مپرسی کے عالم میں رہ گیا تاہم اہل محلہ قصبہ پارہ اور ڈپٹی مسعود حسن خاں صاحب جو حنفی المذہب بزرگ ہیں اور وہاں رہتے ہیں مجلسیں کرنے لگے ہیں۔ پہلے یہ امام باڑہ بجلی کی فٹنگ سے آراستہ تھا جو بہت خوبصورت بنا ہے مگر گزشتہ سے یہ انحطاط پذیر ہوتا جا رہا ہے۔ (۱۳) کچھ دنوں سید رضی احمد صاحب وکیل مرحوم نے اپنے مکان پر مجلسیں کی تھیں لیکن ان کے صاحبزادے ان کے بعد پاکستان چلے گئے جس سے مجلسیں ختم ہو گئیں (۱۴) سب سے آخری مجلس بڑے

امام باڑہ میں چھٹی تاریخ محرم تک ہوتی ہے پھر جلوسوں کے اُٹھنے کے باعث مجلسیں صرف آٹھ دس آٹھویں تاریخ ہوکر بند ہوجاتی ہیں اور ساتویں کو علم و تخت اٹھتے ہیں اور مہندیاں امام باڑوں میں چڑھائی جاتی ہیں۔ آٹھویں کو حاجی صاحب کے امام باڑہ سے شیعوں کی طرف سے ذوالجناح اٹھتا ہے اور تمام جگہوں پر وہ ہر گھر میں جہاں جہاں جاتا ہے اسی سلسلے سے آتا ہے جس کا تمام رات گشت رہتا ہے۔ یہ جلوس شیعہ حضرات سے متعلق ہیں۔ ۸ محرم کو امام باڑہ سجادیہ میں تابوت اور آٹھویں کو سید نذیر حیدر صاحب کے یہاں سے بعد مجلس علم نکلتا ہے جو بہت قدیم ہے۔ اور نویں کو میر محمد حیدر صاحب کے یہاں بعد مجلس گہوارہ اور میر اسحاق حسین صاحب کے یہاں بعد مجلس تابوت نکلتا ہے۔ امام باڑہ کی مجلس میں میر محمد تقی صاحب کی مجلس میں تابوت گہوارہ، ذوالجناح و علم سب یک ساتھ بعد مجلس نکلتا ہے۔

اسی سلسلے میں ایک طوائف بھی مجلس کرتی ہے جو سنی المذہب تھی اب اس مجلس کے وقت دوسری مجلس اسی گھر میں ہوتی ہے اور اس کے بھتیجے کے یہاں مجلس ہوتی ہے۔

غرضکہ شب عاشور پورے پرگنے اور نئے سیتاپور میں چوک پر تعزیئے رکھے جاتے ہیں اور روشنی ہوتی ہے۔ انجمن شمع حیدری سیتاپور کا بڑے امام باڑہ میں آگ پر ماتم ہوتا ہے جس میں تمام شیعہ سنی اور ہندو حضرات شرکت کرتے ہیں۔ ماتم ہونے سے قبل جلوس علم اٹھتا ہے اور وہ ممبران جو کفنی پہن کر ماتم کرتے ہیں ان کے ہاتھوں میں علم حضرت عباس علیہ السلام ہوتا ہے۔ عشرۂ محرم میں شب کو سنی حضرات کے تعزیئے ہر روز اٹھتے ہیں اور جلوس نکلتے ہیں۔ ساتویں و آٹھویں کو علم و ذوالجناح سنی حضرات شب کو اٹھاتے ہیں اور شیعوں کے بھی علم ۸ و ۹ محرم کو اٹھتے ہیں۔

عاشورۂ محرم

دسویں محرم کی صبح کو انجمن گلدستۂ حیدری سیتاپور کی جانب سے تابوت و علم بعد مجلس اٹھتا ہے اور کربلا یادگار حسینی (جو کچے پل کے قریب ہے) وہاں بڑھایا جاتا ہے۔ نوحہ خوانی اس تابوت میں ہوتی ہے اس تابوت میں بھی ہندو مسلمان شیعہ و سنی شریک ہوتے ہیں۔ اس کے ساتھ قریب کربلا زنجیروں کا ماتم بھی ہوتا ہے جسے لوگ عام طور پر دیکھنے اور زیارت کے لئے آتے ہیں۔ شیعہ حضرات کے تعزیئے اور تابوت اٹھتے ہیں اور سوز خوانی کے ساتھ تعزیئے اٹھائے جاتے ہیں جن میں سنی حضرات بھی اپنے تعزیئے شریک کر دیتے ہیں۔ اس میں سنی حضرات پورے جلوس میں شریک ہوتے ہیں اور گریہ بھی کرتے ہیں۔ بعد فراغ دفن کربلا میں ایک مجلس خاک پر ہوتی ہے اور سر و پا برہنہ حضرات شیعہ شرکت کرتے ہیں۔ واقعہ کربلا اور سانحۂ عظمیٰ سید الشہداء پر تقریریں ہوتی ہیں اور ذاکر کے ہاتھ میں صرف ایک علم رہتا ہے۔ تقریر کھڑے ہوکر ہوتی ہے اس مجلس میں ہندو مسلمان اور شیعہ سب ہی شریک ہوتے ہیں۔ اس مجلس کی بے مثالی اُن حضرات کی ہمت افزائی کی معین ہے جو اپنا بے ذری کو جانا مجالس میں کرتے ہیں۔ یہ مجلس "میدان کرب و بلا" کے نام سے موسوم ہے جو ۱۹۳۱ء سے قائم ہے اور ہر سال ہوتی ہے۔ تمام دن تعزیوں کے دفن کا سلسلہ رہتا ہے اور شب کو گیارھویں محرم کو مجلس شام غریباں بلا فرش ماسٹر ریاست حسین صاحب قبلہ (مرحوم) کے امام باڑہ جعفریہ میں ہوتی ہے اور بعد شب امام باڑہ میں بھی ہوتی ہے اور علم و حاضری کی زیارت ہوتی ہے۔ پھر لکھنؤ کی مجلس شام غریباں جو غفران مآب کے امام باڑہ سے ریڈیو سے براڈکاسٹ ہوتی ہے سنی جاتی ہے اس میں کافی لوگ شرکت کرتے ہیں۔ شب کو تمام بستی کے تعزیئے جو تقریباً سو ڈیڑھ سو سے کم نہیں ہوتے گشت کرکے کربلائے یادگار حسینی (متصل پل پختہ) میں جاکر دفن ہوتے ہیں۔ یہاں تک عشرۂ محرم کی مجالس و جلوس عزا کا مختصر ذکر کیا گیا ہے۔

۱۱ محرم سے سلسلۂ عزا

۱۱ محرم کو ریاض حیدر صاحب مرحوم کا تعزیہ آتا ہے۔ ۱۲ محرم کے

۲۰ محرم تک ریاض حیدر صاحب کی مجالس سید مظاہر حسن صاحب کے دولتکدہ پر سہ پہر کو ہوتی ہیں۔ ۱۳۴۳ھ ہجری سے سید حید عباس صاحب بجائے زنانی مجالس کے مردانی مجالس اپنے مکان پر کرنے لگے ہیں۔ گیارہ محرم کا دن گزر کر شب میں میر محمد حیدر صاحب کے عزاخانے پر مجلس اور روشنی ہوتی ہے۔ پہلے صبح کو قاضی محمد طاہر صاحب کے یہاں پھر صبح کو ماسٹر رضی احمد صاحب کے یہاں کی مجلس ہوتی ہے اور یہ مجلیس سہ پہر کو اور شب کو ہوتی ہیں۔ ۱۱ محرم کو دن گزر کر شب میں ہوتی ہو۔

۱۲ محرم سیوم امام

صبح کو میر محمد حیدر صاحب کے عزاخانے میں مجلس ہوتی ہے اور پھر قاضی محمد طاہر صاحب . . . . مرحوم اور پھر نذیر حیدر صاحب کی علی الترتیب صبح کو مجلیس ہوتی ہیں اور محمد حیدر صاحب کے یہاں کے تعزیئے اٹھتے ہیں۔ کربلا میں بھی ان کے یہاں کی مجلس ہوتی ہے بعدہ امام باڑہ سجادیہ میں ہوتی رہی اور پھر شیخ علی نقی صاحب کے یہاں سہ پہر کو ہوتی ہے۔ یہ تعزیئے محمد حیدر صاحب کے حاجی صاحب کی کربلا سے متصل کربلا سنیم پور میں دفن ہوتے ہیں۔ ۱۲ محرم کو انجمن ذوالفقار حیدری کی جانب سے مجلس ہوتی ہے۔

ہر اتوار کو چہلم تک قاضی سید محمد طاہر صاحب کے یہاں صبح کو مجالس ہوتی ہیں اور ربیع کے آخری اتوار کو علم بھی نکلتا ہو سیوم کو واجد بسالی کا تعزیہ اٹھتا ہے اور گشت کرتا ہو جو حنفی المذہب ہیں اور اسی شب کو مولوی بڑی غنی خان صاحب کے یہاں مجلس ہوتی ہے جو سبھی عالم نگر میں حنفی حضرات کے امام جمعہ و جماعت تھے۔

۲۰ محرم بسواں

چھیکی خان کا تعزیہ رکھا جاتا ہے اور بھولا کمار کا تعزیہ بھی رکھا جاتا ہے جو ہندو دھرم رکھتا ہے: سکا مٹی کا تعزیہ ہوتا ہے۔ اس درمیان میں کئی عشرے بھی ہوتے ہیں اور تعزیئے کیے جاتے ہیں۔

مجالس ۱۳ محرم تا چہلم امام

ہر شب کو انجمن گلدستہ حیدری سیتاپور کی جانب سے مجلس ہوتی ہیں صرف دسواں۔ بیسواں اور چہلم کو انجمن ذوالفقار حیدری کی چہلم تک۔ پہلے یہ مجالس میر مظفر حسین صاحب وکیل کی طرف سے شب کو ہوا کرتی تھیں اور ہر مہینہ کی ۱۲ تاریخ کو اور ہر شب جمعہ کو مجلیس وکیل صاحب مرحوم کی طرف سے ہوا کرتی تھیں مگر اب یہ سلسلہ ختم ہو گیا اور انجمن نے ایک حد تک اس کام کو سنبھال لیا۔ یہ مجلیس بڑے امام باڑے میں ہوتی ہیں۔ کچھ دنوں تک ماسٹر رضی احمد صاحب مرحوم نے اس سلسلے کو جاری رکھا تھا مگر پھر بند ہو گیا۔

۲۵ محرم

۲۵ محرم کی شب کو تابوت بیادگار امام زین العابدین علیہ السلام رکھا جاتا ہے میر مظاہر حسین صاحب کے مکان پر شب کو مجلس ہو کر . . . . تابوت اٹھایا جاتا ہے اور اس میں کوئی ذاکر نہیں ہوتی بلکہ یہ تابوت اسی طرح سے اٹھتا ہے جیسے کسی کا جنازہ اٹھایا جاتا ہو اور لوگ کاندھا دیتے ہیں۔ بس گریہ و بکا کی صدائیں اس تابوت کی زینت ہوتی ہیں۔

۲۹ محرم

میر محمد حیدر صاحب کے یہاں کی اور میر مختار حسین صاحب مرحوم شیخ سرائے کے یہاں کی مجلیس ہوتی ہیں اور انجمن ذوالفقار حیدری کی شب کو ہوا کرتی ہے اور ماسٹر علی جعفر صاحب کے یہاں

یکم لغایۃ ۶ صفر

پہلی تاریخ سے ابتدا میں یہ مجلیس سید محمد اصغر صاحب عرف چھجو میاں مرحوم کیا کرتے تھے لیکن پھر وہ بند ہو گئیں ان کے مرنے کے بعد اب ان کے لڑکے حسن جان وغیرہ کرتے ہیں جس زمانہ میں یہ مجلیس بند ہو گئی تھیں تو سید محمد جعفر صاحب وکیل نے شروع کیں مگر وہ بھی نہ کر سکے۔ ۱۳۴۰ھ ہجری سے سید محمد اصغر صاحب کے لڑکے اب یہ مجالس کرتے ہیں اور سید محمد منیر صاحب بھی ۶ صفر تک مجلیس کرتے ہیں۔

۷ صفر لغایت ۹ صفر

مجالس روزانہ امام باڑہ کلاں کے بعد جو شب کو انجمنیں کرتی ہیں۔ تین مجلیس مرتب مضمون ہذا (محمد اکبر صاحب مرحوم) کے مکان

پر ہوتی ہیں جن کو کافی زمانہ ہوگیا۔ ۸ر صفر کو بیوہ مرحوم علی صاحب مرحوم ایک مجلس سہ پہر کو کیا کرتی ہیں۔ ۹ر لغایت ۹ر صفر میری مجلسوں کے بعد سید سردار حسین صاحب سابق سنیٹری انسپکٹر مجالس کرتے ہیں اور انہیں تاریخوں میں تجمل حسین صاحب کے صاحبزادے بھی میری مجلس کے بعد مجالس کرتے ہیں۔

۱۰ر صفر صبح کو اہلیہ احمد حسن صاحب مرحوم کے یہاں کے اور سردار حسین صاحب اور کوٹ کے تعزیئے جو میر اسحاق حسین صاحب کے یہاں رکھے جاتے ہیں کربلائے حاجی صاحب مرحوم میں دفن ہوتے ہیں۔

۱۰ر تا ۲۰ر صفر شب کو میر نقی حسن صاحب کے یہاں مجالس کا سلسلہ ۲۰ر صفر تک رہتا ہے اور چہلم جو ۲۰ر صفر کو ہوتا ہے اس تاریخ کو اٹھ کر حاجی صاحب مرحوم کی کربلا میں مدفون ہوتے ہیں۔

دیہہ حضرت سکینہ علیہا السلام رات کو دن گزر کر شب کو تمام گھروں کے تابوت جن پر پردے پڑے ہوتے ہیں امام باڑہ کلاں میں رکھے جاتے اور زنانی مجلس بڑے پیمانے پر ہوتی ہے۔ کافی مجمع ہوتا ہے۔ دوسرے عزاخانوں میں ایسے ہی تابوت اٹھ کر ذاکروں کے ساتھ انجمنیں سیتاپور کی اٹھاتی ہیں۔

۱۱ر لغایتہ ۱۶ر صفر۔ میر ممتاز حسین صاحب عطار کے دولتکدہ پر مجالس سالانہ ہوتی ہیں۔

۱۷ر صفر امام رضا علیہ السلام کا یوم شہادت ہے چنانچہ ۱۷ر صفر کو مجلسیں زنانی مرتب مضمون ہٰذا کے مکان پر ہوتی ہیں۔ تعزیئے حاجی صاحب کی کربلا میں دفن ہوتے ہیں۔ زنانی مجلس میں شب چہلم گہوارہ کی زیارت ہوتی ہے۔ ۱۹ر صفر کو میر نقی حسن صاحب کی مجلس میں ذوالجناح سجایا جاتا ہے اور گشت ہوتا ہے اور محمد مہدی صاحب کے یہاں مہندی اٹھتی ہے جس میں ذاکری بھی ہوتی ہے۔ ۱۹ر لغایتہ چہلم سید محمد حیدر صاحب متولی کے یہاں کی ان کے عزاخانے میں مردانی مجالس برپا ہوتی ہیں۔ ۱۹ر لغایتہ ۱۹ر صفر سید احمد حسن صاحب محلہ بنگلہ کے یہاں کی مجلس ہوتی ہے۔

شب چہلم شب چہلم عزاخانوں میں روشنی ہوتی ہے سید علی نقی صاحب اور شبیر احمد صاحب اور ماسٹر علی جعفر کے یہاں سید نقی حسن صاحب کی مجالس کے بعد دیگر حضرات کے یہاں شب میں مجلسیں ہوتی ہیں۔

شب بست و یکم تو بابا کالا کا شب میں تعزیہ رکھا تھا جو حنفی تعزیہ دار تھا اب کون رکھتا ہے اس کا علم نہیں۔ روشنی کا کافی انتظام وہ کیا کرتا تھا۔ دن گزر کر شب میں دفن ہوتا ہے اور بستی کے تعزیئے روشنی کے ساتھ کربلائے یادگار حسینی (متصل پل پختہ) دفن ہوتے ہیں۔

چہلم امام ۲۰ر صفر سیتاپور میں چہلم ۲۰ر صفر ہی کو ہوتا ہے۔ دن میں میر محمد حیدر صاحب اور میر نقی حسن صاحب اور سید محمد اکبر رضوی کے تعزیئے کربلائے حاجی صاحب دفن کے لئے جاتے ہیں اور سلیم پور کی کربلا میں کچھ تعزیے دفن ہوتے ہیں۔ سید محمد حیدر صاحب متولی کے تعزیوں کے ساتھ اس دن ذوالجناح گہوارہ بھی ہوتا ہے۔

بنی اسد بنی اسد کا قافلہ کربلائے حاجی صاحب میں آتا ہے اور شہدا کو دفن کرتا ہے۔ بنی اسد کا قافلہ عرب انداز کی پوشاک میں ہوتا ہے جو کفنی پہن کر پھاوڑے کاندھوں پر لے کر نکلتے ہیں اور تابوت دفن کرتے ہیں۔ ۱۳۵۰ھ ہجری سے یہ کربلائے حاجی صاحب میں نہایت عمدہ طریقہ پر سماں پیش کیا جاتا ہے اور کافی گریہ ہوتا ہے۔ قافلہ میں اونٹ وغیرہ سب کا انتظام ہوتا ہے۔ بعد ختم دفن شہدا کا سلسلہ سہ پہر تک رہتا ہے۔ مجلس عزا کربلا میں ہوتی ہے۔ یہ جلوس کربلائے سلیم پور میں جاتا ہے جس میں ۱۳۶۳ھ ہجری سے مزید اضافہ ہوا ہے۔

امام باڑہ سجادیہ میں بھی اس روز مجلس ہوتی ہے اور

بڑے امام باڑے میں اور علی نقی صاحب کے دو تکڑے پر ہوتی ہے شب کو بابو کا تعزیہ اور دیگر بستی کے تعزیے اُٹھتے ہیں جو تقریباً سب حضرات اہل سنت کے ہوتے ہیں۔ روشنی کا انتظام ان تعزیوں کے گشت میں کافی ہوتا ہے۔

۲۷ و ۲۸ صفر شب سید نذیر حیدر صاحب کے یہاں شب میں مجلس ہوتی ہے اور سید افتخار احمد صاحب عرف جمو میاں بھی مجلس کرتے ہیں۔

۲۸ صفر کو تابوت امام حسن علیہ السلام کا اٹھتا ہے جو انجمن رضویہ سیتاپور کا بنا کردہ ہے اس میں انجمن گلدستۂ حیدری اور انجمن ذوالفقار حیدری دو انجمنیں شریک ہو کر ذاکری کرتی ہیں بعدہٗ امیر علی صاحب کی مجلس بڑے امام باڑہ میں ہوتی ہے۔ تابوت کربلائے یادگار حسینی میں بڑھایا جاتا ہے۔

۴ ربیع الاول ۵ گزر کر شب کو شیخ مشتاق علی صاحب کے مکان پر مجلس ہوتی ہے۔ شروع ربیع الاول میں بقید یکشنبہ بیوہ میر محمد عباس صاحب مرحوم کا تعزیہ اٹھا کرتا ہے۔

۵ ربیع الاول علی الصباح بڑے امام باڑے سے چُپ تعزیہ اٹھتا ہے۔ پہلے یہ تعزیہ حکیم ظفر حسین صاحب محلہ عالم نگر سے اٹھاتے تھے پھر مولوی صادق حسین صاحب نے اس کمی کو محسوس کر کے اٹھانا شروع کیا اور راقم الحروف اس تعزیہ میں ہر طرح سے شریک رہتا تھا۔ ذوالجناح کا سجانا اور محلوں وغیرہ کا انتظام میرے ذمہ رہتا تھا اور ذاکری (نقابت) بھی متعلق تھی پھر ان کے صاحبزادے اختر حسین صاحب اس تعزیہ کا انتظام کرتے رہے بعدہٗ ۱۳۸۰ھ ہجری سے سید محمد حسن صاحب کے یہاں سے اس کا اہتمام ہوتا ہے زوالجناح اس تعزیہ کا گھروں میں نہیں جاتا۔ چُپ تعزیہ کے دفن کے بعد ناصر حسین صاحب مرحوم خلف پیشناز صاحب کے نام سے ایک مجلس چھوٹے امام باڑہ میں منعقد ہوتی ہے لیکن پہلے یہ مجلس ان کے مسکونہ مکان میں ہوا کرتی تھی۔

۵ ربیع الاول کو انجمن شمع حیدری کی جانب سے چھوٹے امام باڑہ سے تابوت اٹھنے لگا ہے۔ دن گزر کر پانچویں شب میں سید محمد عابد صاحب کی جانب سے ایک مجلس چھوٹے امام باڑہ میں ہوتی ہے۔ اس مجلس کے بعد میر مظفر حسین صاحب مرحوم کے یہاں کے تعزیے ذاکری کرتے ہوئے بڑے تعزیے کے چوک پر آتے ہیں جن کو اب ہمشیرہ راقم الحروف بڑے تعزیے کو اپنے اہتمام سے اٹھاتی ہیں جو قدیم زمانہ کی یادگار ہے اور کافی مشہور ہے۔ اسی شب میں بابو سید احمد صاحب کا تعزیہ جو (تقیائین صاحب) کا تعزیہ مشہور ہے۔ اسی شب میں چبوترے پر آتا ہے اور امام باڑہ میں رکھا جاتا ہے۔ کافی لوگ ان تعزیوں کی زیارت کو آتے ہیں۔ پہلے تقیائین صاحب کا مذکورہ تعزیہ (بڑا) سیوم کو اٹھا کرتا تھا پھر ۲۰ صفر کو اٹھا۔ اس کے بعد ۴ ربیع الاول کو رکھا جانے لگا اور اب تو میر مظفر حسین صاحب وکیل مرحوم کے تعزیے کے ساتھ اُٹھنے لگا ہے جو چھٹی ربیع الاول کو شب میں اٹھ کر ساتویں شب میں تقریباً صبح تک دفن ہوتا ہے پوری رات ذاکری ہوتی ہے مگر بجلی کے تاروں کے لگ جانے کی وجہ سے اس تعزیے کو چھوٹا کرنا پڑا۔ ۱۳۸۱ھ سے بڑا تعزیہ اٹھتا ہے۔

۶ ربیع الاول انجمن ذوالفقار حیدری کی جانب سے صبح کو تابوت بڑے پیمانہ پر اٹھتا ہے اور ممبران انجمن اس میں ذاکری کرتے ہیں۔ قریب ۱۲ بجے وہ کربلائے یادگار حسینی (متصل پل پختہ) پہنچتا ہے اور بڑے امام باڑے سے اٹھتا ہے۔ مجلس جو میر مظفر حسین صاحب مرحوم کی صبح کو ہوا کرتی تھی اس میں فی الجملہ تاخیر ہو جاتی ہے اور مجمع تابوت کے باعث مجلس میں کم جاتا ہے۔ یہ مجلس بڑے پیمانے پر ہوا کرتی تھی جس میں

طعام تقسیم ہوا کرتا تھا مگر زمانہ کے حالات کے بدلنے سے بلا حصہ یہ مجلس بہرحال ہوتی ہے لیکن سامان پر قید بند ہو جانے سے مجبوراً جس پیمانے پر یہ مجلس ہوتی تھی اس کو نظر انداز کرنا پڑا۔ ساتویں شب میں وہ بڑا تعزیہ اٹھتا ہے اور اس کے ساتھ چھوٹے تعزیئے ہوتے ہیں۔ سہ پہر کو پہلے محلوں میں چھوٹے تعزیئے گشت کرتے ہیں اور ذاکرین کے ساتھ اٹھتے ہیں اور پھر اس جلوس کے واپس آنے پر بڑا تعزیہ اٹھایا جاتا ہے جو اس تاریخ کا سب سے قدیم تعزیہ ہے۔ کافی مجمع اس تعزیہ میں ہوتا ہے اور دونوں تعزیئے ایک ہی ساتھ ہونے سے کافی رونق بڑھ جاتی تھی۔ ہندو مسلمان شیعہ سنی سب ان تعزیوں میں شرکت کرتے ہیں اور سیتاپور کی انجمنیں کافی حصہ لیتی ہیں۔ یہ تعزیہ بڑے تعزیہ کے نام سے سیتاپور میں مشہور ہے اور یہ تاریخ سیتاپور میں خاص اور یادگار تاریخ ہے۔

۸ ربیع الاول آٹھویں شب میں انجمن گلدستۂ حیدری کی جانب سے الوداعی مجلس ہوتی ہے اور وہ سیاہ لباس جو سوگ کی علامت ہے اور جسے محرم کا چاند دیکھتے ہی ممبران انجمن پہن لیتے ہیں آج کی تاریخ بڑھا دیا جاتا ہے۔ اس مجلس کے بعد شیخ عابد رضا صاحب وکیل کے دولتکدہ پر مجلس ہوتی ہے اور بعد ختم مجلس ان کے یہاں کا تعزیہ سوز خوانی کے ساتھ کربلائے یادگار حسینی جاکر دفن ہوتا ہے۔

زنانی انجمنیں زنانی مجالس جو تقریباً ہر جگہ ایام عزا میں ہر گھر میں روزانہ ہوا کرتی ہیں۔ لیکن بصورت عشرہ زنانی مجالس میں ذاکری کے لئے یہ دو انجمنیں قائم ہیں۔ ایک انجمن عزائے فاطمی۔ دوسری انجمن بہار اسلام تیسری انجمن عزائے سکینہ ہے ان کی وجہ سے کافی زنانی مجالس میں رونق ہے۔

زنانی مجالس:۔ ۱۲ ربیع تا ۱۳ جمادی الاول جناب سیدہ سلام اللہ علیہا کی یادگار مجالس بیوہ احمد حسن صاحب مرحوم وکیل کے زیر اہتمام ہوتی ہیں اور تابوت رکھے جاتے ہیں۔ یکم تا ۳ جمادی الثانی کو بھی جناب فاطمہ صلوٰۃ اللہ علیہا کے دفینہ کے سلسلے میں بڑے امام باڑہ میں مجلس اور تابوت رکھے جاتے ہیں۔

دفینہ جناب زینب علیہا السّلام پھر ۱۶ جمادی الثانی کو بیوہ ریاض حیدر صاحب مرحوم کے یہاں مجلس ہوتی ہے اور تابوت رکھے جاتے ہیں۔

دفینہ جناب سکینہؑ ۱۰ صفر کو عرصہ سے ہوتا ہے اور کافی مجمع اس تاریخ بڑے امام باڑہ میں ہوتا ہے لیکن ۱۳۸۷ھ میں کچھ اختلافات ایسے رونما ہوئے جس سے اس مجلس میں کمی ہوئی اور دوسرے امام باڑوں میں تابوت رکھے جانے لگے۔

۲۸ رجب صبح کو بیادگار سفر حضرت سید الشہداء چھوٹے امام باڑے سے جلوس اٹھتا ہے جس میں اونٹ اور ذوالجناح اور گھوڑے جن پر چادریں خالی پڑی ہوتی ہیں ہمراہ ہوتا ہے ۱۳۰۳ھ ہجری سے اس جلوس کی بنا ہوئی جو میر تقی حسن صاحب کی بنا کردہ ہے۔

۳ و ۴ شعبان ادارہ رضویہ کی جانب سے شب میں مجلس ہوتی ہے۔ ۴ شعبان کو میر مظاہر حسن صاحب کے یہاں کی بڑے امام باڑہ میں مجلس ہوتی ہے۔

۱۸ لغایت ۲۰ رمضان شبیں ماہ صیام بڑے امام باڑہ میں تینوں دن بیگم بھیوں کی جانب سے مجالس ہوتی ہیں ۱۹ کو مسجد تضیارہ میں ایک مجلس ہوتی ہے اور تابوت صبح کو بعد نماز بیوہ احمد حسن صاحب کے یہاں آتا ہے۔ بعد نماز عشا مسجد بنگلہ میں مجلس ہو کر تابوت اٹھتا ہے امام باڑہ کلاں آتا ہے۔ تینوں دن سید محمد حیدر صاحب کے یہاں صبح کو مجالس ہوتی ہیں اور پھر محمد وحید صاحب کے

یہاں کی مجالس ہوا کرتی ہیں۔ ۱۷ر رمضان کو تابوت بعد مجلس اٹھتے ہیں۔ ۱۸ر کو کربلا حاجی صاحب میں دفن ہوتے ہیں۔

۸ر شوال یوم انہدام جنت البقیع

علم جنت البقیع ادارے انجمن رضویہ کی طرف سے اٹھ کر حسینیہ خورد میں آتا ہے لیکن پہلے مجلس ہوتی ہے۔

۱۳ر و ۱۴ر شوال

ان کے علاوہ حسینیہ خورد میں ۱۳ر کو ماسٹر سید ریاست حسین صاحب کے بیان کی مجلس ہوتی ہے اور ۱۴ر کو عبدالمجید صاحب کی طرف سے اسی امام باڑہ میں ہوتی ہے۔

۲۲ر و ۲۳ر ذیقعدہ

۲۲ر کو شب میں قبل فراغ تابوت حسینیہ کلاں میں مجلس ہوتی ہے اور ۲۳ر کو ادارہ رضویہ کی طرف سے تابوت سہ پہر کو اٹھتا ہے اور صبح کو مجلس ہوتی ہے۔ ۲۹ر ذیقعدہ کو حسینیہ جعفریہ میں حکیم سید عسکری حسن صاحب کے بیان کی صبح کو مجلس ہوتی ہے اور بعدہ علم اٹھتا ہے۔

۷ر و ۸ر و ۹ر ذی الحجہ

۷ر کو حسینیہ جعفریہ میں مجلس ادارہ رضویہ کی طرف سے ہوتی ہے اور بعدہ علم اٹھتا ہے۔ ۸ر کو حسینیہ کلاں میں میر مظاہر حسن صاحب کے بیان کی مجلس جناب مسلم علیہ السلام کی یادگار میں ہوتی ہے۔ ۹ر کو نقی حسن صاحب کے مکان پر مجلس ہوتی ہے جو جناب مسلم کی تاریخ وفات ہے۔

۲۸ر و ۲۹ر ذی الحجہ

سہ پہر کو ۲۸ر ذی الحجہ مولوی التجا حسین صاحب مرحوم کے مکان پر مجلس ہوتی ہے مگر اب کوئی سال سے ۲۹ر کو ہوتی ہے پہلے صبح کو اختر حسین صاحب کے یہاں ہوتی تھی گزشتہ سے ان کی وفات پر بند ہو گئی۔ ۲۹ر ذی الحجہ کو قاضی سید محمد طاہر صاحب وکیل کی مجلس صبح کو ہوتی ہے۔ ۲۹ر ذی الحجہ کو رویت ہلال کے سلسلہ میں بڑے امام باڑے میں مجلس ہوتی ہے اور بعدہ جلوس عزا ماتم و نوحہ خوانی سے اٹھتا ہے اور امام باڑوں میں جاتا ہے۔ ۲۹ر کو محمد حسن صاحب کے یہاں کی مجلس شب کو ہوتی ہے۔

ہر قمری مہینہ میں نوچندی جمعرات کو سید مظاہر الحسن صاحب کے مکان سے علم اٹھتا ہے اور ذاکری کے ساتھ بڑے امام باڑہ میں آکر مجلس ہوتی ہے۔ ۲۱ر تاریخ ہر ماہ قمری و شب جمعہ میر مظفر حسین کے یہاں کی مجلس ہوتی تھی مگر اب انھیں بس کو کرتا ہے۔ مختصر یہ ہے کہ سیتا پور میں کافی عزاداری کو فروغ ہے حالانکہ تقسیم ملک کے باعث فاہ بلکہ کمی ضرور ہوئی مگر اب یہ کمی رفتہ رفتہ دور ہوتی جا رہی ہے۔

جلسہ یادگار حسینی

۱۳۶۹ھ کی یادگار حسینی میں سیتاپور بھی پیچھے نہیں رہا اور اس سال نہایت اہتمام کے ساتھ جلسے بین الاقوامی کئے گئے جس میں الکٹرک فٹنگ اور لاؤڈ اسپیکر متعدد جگہوں پر لگے تھے اور کافی شاندار پنڈال سجایا گیا تھا۔

سیتا پور میں سنہ حسینی کا آغاز

اسی سلسلے میں کربلا (متصل پل بجتہ) میں کوئیں کے کنارے ایک مینارہ تیار کیا گیا اور بنوایا گیا تھا جس پر کربلائے یادگار حسینی کندہ ہے اور اس کے پہلو ۱۹۳۰ء اور آغاز سنہ حسینی مطابق ۱۳۴۹ھ ہجری کندہ ہے۔ اور اسی مینارہ پر اس کے نیچے ایک دوسرا پتھر ہے جس پر انیس علیہ الرحمہ کا مشہور شعر کندہ ہے ؎

اک افسانۂ بیکسی رہ گیا
نہ قاتل رہا اور نہ سرور رہے

جس کے متعلق سنا گیا ہے کہ یہ شعر جرمنی کے عجائب خانہ میں سنہرے حروف میں لگایا گیا ہے جو واقعہ کربلا پر شاعر کا بہترین کارنامہ ہے اور واقعہ کربلا اس شعر میں پورا سمویا ہوا ہے۔

سیتاپور میں مرزا دبیر اعلی اللہ مقامہ نے بڑے امامباڑہ میں مجلس پڑھی ہے جو یاد رکھنے والی بات ہے۔

منعقد ہوئیں۔ سیتاپور میں عشرہ کی مجالس مردانہ جن کا ذکر کیا گیا ہے اور صرف تعداد ان کی بیان کردی گئی ہے ان مجالس میں راقم الحروف سید محمد اکبر رضوی کی پہلی مجلس ہوتی ہے جس میں اکثر باہر سے ذاکر آئے۔ مولوی غلام علی صاحب جلالپور جٹان سے آئے تھے اور کئی مقام پر ذاکری کرتے تھے جن میں ابو سید احمد صاحب کی مجلس سب سے آخر تھی اور ان کے علاوہ حکیم نہال حسین صاحب اور مرزا سجاد مرزا صاحب کی مجلس میں بھی ذاکری فرمایا کرتے تھے۔

میر اسحاق حسین صاحب وکیل کے یہاں علاوہ مقامی ذاکروں کے مولوی لقا علی صاحب بدایونی اور کئی سال علامہ مجتبیٰ حسن صاحب کامون پوری عشرۂ محرم میں تشریف لائے ہیں جو آجکل مسلم یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں۔ علاوہ بریں ذاکر بھی لکھنؤ اور دیگر مقامات سے تشریف لائے ہیں اور چھٹی ربیع الاول کے بڑے تعزیہ میں تو کافی سوز خوان آتے تھے جن میں سجاد حسین صاحب سوز خوان اور حسن جعفر صاحب لکھنوی قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ مولوی ظہور حسن صاحب مجتہد مرحوم لکھنؤ شمس العلماء مولانا سید سبط حسن صاحب مرحوم لکھنؤ۔ مولوی ابن حسن صاحب جارچوی۔ مولوی ہارون صاحب مرحوم۔ ماسٹر محسن صاحب۔ مولانا سید محمد سعید مرحوم مجتہد لکھنؤ خواجہ غلام الثقلین صاحب۔ مولانا محمد سبطین صاحب۔ مولوی برکات احمد صاحب، شیخ ارشاد حسین صاحب، مولوی حمید الصمد صاحب، مولوی محمد مہدی صاحب زید پوری۔ مولوی مبارک علی شاہ وغیرہ وغیرہ آ گئے ہیں اور سیتاپور میں پڑھے ہیں۔

کمال پور ضلع سیتاپور کی عزاداری

۱۰ صفر کو تمام قرب و جوار کے تعزیے جمع ہو کر اٹھتے ہیں اور اطراف کے لوگ ان کی شرکت کے لئے آتے ہیں جس میں حضرات اہل سنت اور اہل ہنود کا کافی حصہ ہوتا ہے۔ کاشتکاروں کے تعزیے ہوتے ہیں کیونکہ کمال پور میں زیادہ تر آبادی اہل ہنود کی ہے۔ کمال پور سیتاپور سے لکھنؤ جانے والی ریلوے لائن پر تیسرا اسٹیشن ہے۔ یہ ریلوے لائن ہو جانے سے بڑھنے لگا کیونکہ ابتدائی زمانہ میں کمال پور جس کی کوئی اہمیت نہ تھی غلہ کی منڈی کے لئے مشہور تھا۔ راجہ صاحب کسمنڈا کی کوٹھی اور باغ وہاں کا مشہور عمارتیں ہیں۔

موضع اسلام نگر کے سادات نقوی

کمال پور سے تقریباً ایک میل پر یہ گاؤں اسلام نگر کے نام سے آباد ہے جس کے زمیندار حنفی المذہب فقیر محمد خاں صاحب ہیں۔ وہاں ایک مرتبہ تقریباً سنہ ۱۹۴۰ء میں وہاں شیعیان سیتاپور کا ایک وفد گیا تھا کیونکہ یہ مومنین (شیعہ تو ہیں) مگر دیہات کی بود و باش کے باعث تعلیم سے بالکل بے بہرہ ہیں۔ چنانچہ رضویہ دینیات اسکول سیتاپور کے طلبا کی ہمراہی میں یہ وفد گیا تھا۔ وہاں ایک امام باڑہ بننے کی کوشش کی گئی۔ جس کو زمیندار صاحب نے منظور فرما لیا۔ تقریباً چالیس پچاس مومنین سادات نقوی اس گاؤں میں آباد ہیں جو عزاداری اور تعزیہ داری کرتے ہیں۔ یہاں انکے جد اعلیٰ آ کر آباد ہوئے تھے جنھوں نے اپنی اولاد کو تعزیہ داری کی ہدایت کی تھی۔ راجہ صاحب کسمنڈا ایک سخت مزاج آدمی تھے اور لوگوں کو تعزیہ داری سے روکنے کی کوشش بھی کی تھی مگر ان لوگوں نے راجہ صاحب کو خاموش کر دیا اور اپنے کام سے غافل نہیں ہوئے کیونکہ اُدھر کے گاؤں میں زیادہ ہندو آباد ہیں۔

قصبہ لہرپور ضلع سیتاپور

یہ مقام فیروز شاہ تغلق کا آباد کردہ ہے پہلے تغلق پور نام تھا مگر ایک لوہاری نامی پاسی نے مسلمانوں کو وہاں سے بھگا دیا تھا جب طاہر غازی سنہ ۱۰۴۳ھ میں سید سالار کے مزار کی زیارت کے لئے اس قصبہ سے گزرے تو اپنی فوج کے ذریعہ ان پاسیوں کو جو چار سو برس سے وہاں تھے ان کو نکال دیا گیا یہ قصبہ راجہ ٹوڈرمل کی پیدائش کا مقام ہے جو شہنشاہ اکبر کا

وزیر اعظم تھا اور ۹۲۳ھ ہجری میں ولادت ہوئی تھی اور ۹۹۸ھ میں وفات پائی۔ ٹوڈرمل نے بندوبست اول اول ہندوستان میں رائج کیا اور جمع بندی کا طریقہ قائم کیا۔ ملک کو بارہ صوبوں میں تقسیم کیا۔ دس سالہ بندوبست کا طریقہ۔ صوبوں میں سرکاروں اور پرگنوں کی تقسیم، مال گزاری کی وصول یابی اور فوجی بھرتی کا طریقہ۔ زمینوں کی پیمائش اور فصلی سال سے مال گزاری کا قائم کرنا جو اب تک جاری ہے۔ یہ سب اسی ہوش مند وزیر کے دماغ عالیہ کے جلوے ہیں جو ہمارے سیتاپور کی مشہور و معروف ہستی اور ہندوستان کی مایہ ناز ہستی تھی۔

لہرپور کی عزاداری

یکم تا ۹ محرم مولوی شاکر علی صاحب کے موسومہ امام باڑہ میں عزاداری ہوتی ہے جس کو مولوی سید تقی صاحب نے بسلسلہ یادگار حسینی ۱۳۴۱ھ میں پھر سے تعمیر کرایا ہے۔ یہ امام باڑہ شیعہ حضرات سے متعلق ہے۔ ساتویں محرم کو محلہ چھاؤنی سے علم اور ذوالفقار، دُلدُل وغیرہ کے جلوس نکلتے ہیں۔ اور ہر محلہ سے علم اس ساتویں میں آکر شریک ہوتے ہیں اور پھر چار بجے صبح تک یہ علم وغیرہ علی الترتیب واپس ہوتے ہیں۔ آٹھویں محرم کو مہندی کے نام سے جلوس اٹھتا ہے جس کی ابتدا لوکھر یا پور اور محلہ بہلول نگر سے اول شب ہوتی ہے اور آٹھ بجے رات سے سلسلہ شروع ہو کر ۲ بجے صبح تک ختم ہو جاتا ہے۔ گشت محلہ دار ہوتا ہے۔ ساتویں آٹھویں محرم کو ان جلوسوں میں کافی سبیلیں محلہ دار ہوتی ہیں پہلی سبیل قاضی ٹولہ سے جہاں شاکر علی صاحب کا موسومہ امام باڑہ ہے شروع ہوتی ہے۔ نویں محرم کو ہر محلہ میں تعزیوں کا گشت ہوتا ہے اور جو تعزیہ پنچایتی ہوتا ہے اس میں چندہ سے تعزیہ داری کی جاتی ہے۔ اس قسم کے پنچایتی تعزیے کافی اونچے اور بڑے ہوتے ہیں جو ۳۵، ۲۵ ہاتھ سے کم نہیں ہوتے۔ ۲۵ محلے اس قصبہ میں ہیں چنانچہ ۲۵ تعزیے پنچایتی تو ہوتے ہی ہیں ان کے علاوہ اور بھی ہوتے ہیں۔

دسویں محرم عاشورہ

مولوی شاکر علی صاحب کے موسومہ امام باڑہ کے تعزیے صبح ۶ بجے اٹھ کر ۱۱ بجے تک دفن ہو جاتے ہیں جو شیعوں کے ہیں جو تقریباً ۲۵ یا ۳۰ ہوتے ہیں۔ اس کے بعد دسویں محرم کو محلہ چھاؤنی سے تعزیے اٹھنے کا سلسلہ شروع ہوتا ہے اور ساتویں کی طرح علی الترتیب محلہ وار تعزیے اٹھتے ہیں جن میں قرب و جوار کے مواضعات کے تعزیے شرکت کرتے ہیں۔

۱۱ محرم

یہ مذکورہ تعزیے اول اول ایک مخصوص مقام پر جسے گورکھیت کہتے ہیں آکر جمع ہوتے ہیں اور گیارھویں تاریخ مقررہ مقام سے اٹھ کر طاہر شاہ کی کربلا اور تالکٹورے کی کربلا اور مفتی ٹولہ کی کربلا میں جا کر دفن ہوتے ہیں۔ ۱۰ محرم سے تعزیوں کا جمع ہونا تقریباً ۱۱ بجے شب سے شروع ہوتا ہے اور پھر ۶ بجے شام تک دفن کی نوبت آتی ہے۔

۱۱ محرم کی مجلس

شاہ ولایت احمد صاحب سجادہ نشین درگاہ مجا شاہ میں ۹ بجے صبح کو مجلس ہوتی ہے اور تقریباً تمام مسجدوں میں قرآن خوانی ہوتی ہے۔ اس مجلس میں خصوصیت کے ساتھ کافی مجمع ہوتا ہے اور اسی درگاہ میں ہوتی ہے۔ شاہ ولایت احمد صاحب کے یہاں کا تعزیہ علیحدہ ہوتا ہے اور محلہ کے یہ دونوں تعزیے درگاہ مجا شاہ میں رکھے جاتے ہیں۔ دسویں اور نویں کو بھی شاہ ولایت احمد صاحب کے یہاں مجالس ہوتی ہیں۔

چہلم

چند محلوں میں تعزیے رکھے جاتے ہیں۔ شاکر علی صاحب کے امام باڑہ میں بھی تعزیہ رکھا جاتا ہے۔ حضرات اہل سنت کے چالیس پچاس تعزیے ہوتے اور آٹھ دس شیعوں کے ہوتے ہیں کیونکہ شیعوں کے صرف چند گھر ہیں بقیہ اہل سنت کی آبادی ہے۔ قاضی ٹولہ کا امام باڑہ باوجودیکہ منہدم ہو گیا ہے جو محمد حیدر صاحب کا ملوکہ تھا

مگر اب بھی اس کھنڈر میں تمام جلوس آ کر ضرور قیام کرتے ہیں۔

قصبہ تال گاؤں کی عزاداری

۱۹۵۲ء تک عشرۂ محرم میں ۲۱ مجلسیں ہوتی رہی ہیں۔ ۱۲ محرم کو سیوم امام میں میر عابد علی صاحب مرحوم کا بڑا تعزیہ چوک پر رکھا جاتا ہے جس میں کافی مجمع ہوتا ہے اور کافی مشہور ہے ان کے صاحبزادے اب تک اس کو قائم رکھے ہوئے ہیں۔ یہ تعزیہ پھر ۱۳ محرم کو اٹھ کر ۱۴ محرم کو دفن ہوتا ہے۔ عاشورۂ محرم کو تقریباً پچاس تعزیے ہوتے ہیں۔ انصاری برادری کی وہاں کافی آبادی ہے اور قرب وجوار کے مواضعات میں وہی لوگ بستے ہیں جو اہلِ سنت ہیں۔ مسٹر نیول نے سیتاپور گزیٹیر میں لکھا ہے کہ ضلع سیتاپور میں بنکروں (یعنی انصاری لوگوں) کی اچھی خاصی آبادی ہے اور کافی مالدار ہیں۔ بہت سے بنکر اپنے کو انصاری نہیں بلکہ شیخ کہتے ہیں۔ ۱۳۸۳ھ ہجری میں یہ پتہ چلا کہ تقریباً ایک ہزار تعزیے ہو گئے ہیں بہرحال نسبتاً بڑھ رہے ہیں۔ محرم کے زمانہ میں اگر آپ گزریں تو چاروں طرف سے تعزیوں کو آتے دیکھیں گے جو مختلف مقامات سے آتے رہتے ہیں۔

تال گاؤں میں ایک خنجر کا واقعہ

پرانے لوگوں سے اس کی تصدیق ہوئی ہے کہ جس مکان میں منشی زاہد علی صاحب رہا کرتے تھے ان سے قبل اس میں جو لوگ رہتے تھے وہ شبِ عاشور ایک خنجر ہانڈی میں رکھ کر اس پر ہار اور پھول چڑھا کر گھر ہی گھر میں اٹھایا کرتے اور نکالتے تھے۔ معلوم یہ ہوا کہ یہ بغداد سے آئے تھے اور یہاں آ کر سکونت پذیر ہوئے تھے وہ اپنے ہمراہ یہ خنجر لائے تھے۔ جب یہ خبر خنجر کی اہلِ محلہ کو معلوم ہوئی تو کافی برہمی پیدا ہوئی اور ان کا پائی کاٹ کر دیا گیا۔ چنانچہ ان لوگوں نے اسے تالاب میں پھینک دیا۔ لیکن پھر وہ واپس خود بخود آ گیا۔ بالآخر کئی مرتبہ کوشش کی گئی وہ بار بار اسی گھر میں آ جاتا تھا۔ آخر میں اس کو گلا دینے کی فکر کی گئی... لوہار نے اس کو گلا دینے کو کہا گیا جب وہ آگ میں سُرخ کیا گیا تو جب اُس پر گھن پڑنے لگے تو وہ قدِ آدم اُچھلنے لگا۔ یہ دیکھ کر لوہار بہت گھبرایا اور اُس نے کہا کہ یہ تو کوئی پاپ ہے۔ بالآخر وہ واپس کر دیا۔ عرصہ سے اُس خنجر کا پتہ نہیں ہے کہ کیا ہوا۔

میرا خیال ہے کہ یہ ان خنجروں میں سے کوئی خنجر تھا جس نے امامِ مظلوم کو مجروح کیا تھا اس لئے خدا کی قدرت سے یہ پوشیدہ نہیں ہو سکتا ہے کیونکہ روزِ محشر اس کو گواہی دینا ہے بہرحال جو صورت خصوصیت سے معلوم ہوئی وہ تاریخی تھی جس کے جاننے والے اب بھی موجود ہیں اور انھوں نے تصدیق کی تھی۔

پرسینڈی کی عزاداری

قرب وجوار کے مواضعات میں بنکر (انصاری) کافی آباد ہیں اور کپڑوں اور دریوں کا کاروبار سیتاپور میں کرتے ہیں۔ پرسینڈی سیتاپور سے گونڈہ جانے والی ریلوے لائن پر پہلا اسٹیشن ہے اور ایک بڑے گاؤں کی حیثیت رکھتا ہے۔ جب ہلال محرم نکلتا ہے تو باجوں سے اس کا اعلان وہاں کے لوگ کرتے ہیں اور اسی سے معلوم ہو جاتا ہے کہ محرم شروع ہو گیا اور اسی طرح اندر مواضعات میں اعلان ہوتا رہتا ہے۔ نویں محرم کو چوک پر مواضعات کے تعزیے آتے ہیں اور دسویں محرم کو موضع کی کربلا میں یکجا جمع ہو کر دفن کرتے ہیں جن کی تعداد شمار کرنا محال ہے۔ اس موضع کے ہندو مسلمانوں میں کافی عزاداری ہوتی ہے اور دونوں برابر کے حصہ دار ہیں اب بھی کوئی اس معاملہ میں اختلاف کی صورت پیدا نہیں ہوئی ہے اور عزاداری برابر بڑھ رہی ہے۔

ضلع بھنڈریہ کا جلسہ

یہ محمود آباد سے سدھولی جانے والی پختہ سڑک پر واقع ہے۔

یہاں فقیر، حلوائی اور بھانڈوں کی آبادی ہے اسی وجہ سے اس کا نام بھانڈوں پر پڑا۔ ۲ یا ۳ تعزیئے ۲۸ صفر کو رکھے جاتے ہیں اور ۲۹ صفر کو (چہلم وہاں کا ہوتا ہے) اس میں دفن ہوتے ہیں کافی مجمع ہوتا ہے اطراف کے لوگ آ کر شرکت کرتے ہیں۔

موضع بہاں کا چہلم

سب چہلوں کے بعد ۹ ربیع الاول کو جب عزاداری تقریباً ختم ہو جاتی ہے وہاں کا چہلم ہوتا ہے۔ بہاں محمود آباد سے جانے والی سڑک پر موضع دولت پور کے پورب جانب واقع ہے۔ محمود آباد سے تین چار کوس ہے یہاں سب سے آخر میں چہلم کرتے ہیں تاکہ کافی مجمع ہو سکے۔ بڑے بڑے دس بارہ تعزیئے اس چہلم میں ہوتے جو دس ربیع الاول کو مقررہ کربلا میں دفن ہوتے ہیں کافی مجمع اس چہلم میں ہوتا ہے۔

قصبہ باڑی کی عزاداری

سیتاپور سے لکھنؤ جانے والی ریلوے لائن پختہ سڑک پر قصبہ سدھولی واقع ہے۔ یہاں سے قصبہ باڑی ایک میل کے فاصلے پر ہے۔ محمد علی شاہ بادشاہ اودھ کے زمانہ میں سادات بارہہ وہاں آ کر آباد ہوئے اور فوجی چھاؤنی میں ملازمت کر لی تھی سلطنت اودھ کے خاتمہ کے بعد بہت سے حضرات بارہہ پلٹ گئے لیکن بعض یہیں آباد ہو گئے۔ ان کی اولادیں موجود ہیں۔ البیرونی سیاح نے باڑی سے متعلق ایک تاریخی انکشاف کیا ہے کہ قنوج کے زوال کے بعد باڑی اودھ کا پایہ تخت تھا۔ وہاں کا قلعہ اب تحصیل کی گورنمنٹ عمارات میں پڑ گیا اور کھنڈر ہو گیا۔ مبارک شاہ خلف ہمایوں بادشاہ دہلی نے آباد کیا تھا اور ایک باڑی یعنی پھلواری بنوائی اسی پر بستی کا نام باڑی پڑ گیا۔ بہرحال قصبہ کافی آباد اور بڑا تھا جو انقلاب زمانہ سے زوال پذیر ہو گیا ہے۔

عشرۂ محرم

ابتدائی زمانہ میں وہاں کی عزاداری یوں بیان کی جاتی ہے کہ صبح سے لے کر پوری رات مجلس کا سلسلہ جاری رہا کرتا تھا اور بلاتفریق تمام مسلمان اس میں حصہ لیتے تھے شاہی عہد میں بڑے امام باڑہ میں جو حاضری ہوتی تھی اس میں حضرات اہل سنت بھی شرکت کرتے تھے۔ اب موجودہ زمانہ میں چار مجلسیں شیعوں کی اور تین یا چار حضرات اہل سنت کی رہ گئی ہیں۔ دو امام باڑے شیعہ حضرات کے اور پانچ امام باڑے سنیوں کے ہیں جن میں دلبر کا امام باڑہ مشہور ہے۔ طوائفوں کی مجلسیں دلبر کے امام باڑہ میں ہوتی ہیں۔ نواب آصف الدولہ بہادر کے زمانہ کی ایک ضریح چوبی کا ایک جز باقی رہ گیا ہے جو اپنی بہترین صناعی کا آئینہ دار ہے۔ یہ ساتویں کو بڑے امام باڑہ سے دن میں اٹھتا ہے جس میں کافی مجمع ہوتا ہے آٹھ بجے شب کو پنج پیروں میں لا کر بڑھا دیتے ہیں۔ آٹھویں محرم کو تمام رات علموں کے جلوس امام باڑہ دلبر سے اٹھتے ہیں اور تمام شب گشت ہوتا ہے اور پھر صبح ۸ بجے واپسی ہوتی ہے۔ نوحہ خوانی ان جلوسوں میں حضرات اہل سنت کرتے ہیں۔ شب عاشور ایک علم ہندی طوائف کے یہاں سے اٹھتا ہے اور تمام شب اس کا گشت ہوتا ہے۔ تعزیہ دار اپنے اپنے تعزیئے شب کو چوک پر لاتے ہیں جس کی زیارت کے لئے لوگ آتے ہیں۔

دسویں محرم کو ۸ بجے صبح کو شیعوں کے تعزیئے کربلا میں دفن ہوتے ہیں اور ۱۰ بجے تک فراغت ہو جاتی ہے۔ پھر گیارہ بجے صبح کو سنیوں کے تعزیئے اٹھتے ہیں اور ۱۱ بجے شب کو دریا کے سرائن سے متصل کربلا میں دفن ہوتے ہیں اور یہ کربلا ان کی علیحدہ ہے۔ ۲۰ صفر چہلم کو شیعوں میں اور ۲۸ صفر کو چوک پر اور ۳۰ صفر کو سنیوں کے یہاں کا چہلم ہوتا ہے۔

تسبیح جو سرخ ہو جاتی ہے

بڑے امام باڑہ میں ایک تسبیح ہے اس کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ شب عاشور وہ کسی وقت سرخ ہو جاتی ہے۔ یہ امام باڑہ کے مہتمم کے پاس رہتی ہے۔

لیکن اس سے بہت کم لوگ واقف ہیں زیادہ چھان بین کرنے سے یہ انکشاف ہو سکا ہے۔ میں اس کی تصدیق کی کوشش کر رہا ہوں ابھی تک یہ معلوم ہو سکا ہے کہ اس تسبیح کا ایک دانا سُرخ ہو تا ہے جو قریب صبح عاشور دیکھا جا سکتا ہے۔

قصبہ صدر پور کی عزاداری

صدر پور میں دو امام باڑے ہیں جن میں یکم محرم لغایت ۲۰ صفر مجالس ہوتی ہیں لیکن مردانی مجالس صرف عشرۂ محرم تک ہوتی ہیں۔ ایک مجلس مردانی ۱۱ محرم کو کھانے کی شیخ امتیاز حسین صاحب کی جانب سے ہوا کرتی تھی جس میں کافی لوگ شرکت کرتے ہیں۔

زنانی مجالس چہلم تک دونوں وقت ہوا کرتی ہیں۔ باہر کا امام باڑہ چونکہ منہدم ہو گیا ہے لہٰذا مردانی و زنانی مجالس اندر ہی کے امام باڑہ میں ہوتی ہے۔ ۹ محرم کو علم اٹھتے ہیں جن میں چار علم شیخ احسان حسین صاحب اور ان کے بھائیوں کے ہوتے ہیں۔ اور علم قریب دو سو قصبہ صدر پور کے لوگوں کے ہوتے ہیں اور سب علم ایک ساتھ ۲ بجے شیخ امتیاز حسین صاحب کے دروازہ پر آ جاتے ہیں وہاں سے سبیل کا انتظام منجانب شیخ صاحب ہوتا ہے بعدہ امام باڑہ میں مجلس ہوتی ہے اور پھر علم گشت کرتے ہیں جس میں دس گیارہ بجے شب کے ہو جاتے ہیں۔ بعد گشت علم ۱۲ بجے بڑی مسجد جو شاہجہاں کی تعمیر کردہ کہی جاتی ہے وہاں حضرت قاسم علیہ السلام کا تابوت اٹھ کر شیخ امتیاز حسین صاحب کے امام باڑہ میں آتا ہے۔

محرم میں شب کو اکثر قصابوں کے بڑے تعزیے آتے ہیں جو کافی بڑے اور ۲۰ یا ۲۵ ہاتھ اونچے ہوتے ہیں پوری رات گشت ہوتا ہے۔ سنی بڑ قصاب بہت زیادہ عقیدت سے محرم میں حصہ لیتے ہیں۔

شب عاشور:۔ دسویں محرم کی رات میں قصبہ کے تعزیے چوک پر لائے جاتے ہیں اور اس قصبہ کے تمام مسلمان تقریباً تعزیہ دار ہیں جن کی تعداد تقریباً چار ساڑھے چار سو ہے ان میں دو تعزیے بہت بڑے ہوتے ہیں اور کافی مشہور ہیں ایک تعزیہ بڑ قصاب کا اور دوسرا جلاہوں کا ہوتا ہے۔ ۱۰ محرم کو قریب ۲ بجے تعزیے اٹھتے ہیں اور شب کو تقریباً گیارہ بجے تک کربلا میں مدفون ہوتے ہیں۔ اسی طرح ۲۰ صفر بروز چہلم صبح کو تعزیے اٹھتے ہیں جو تقریباً سو ہوتے ہیں۔ شیخ احسان حسین صاحب کے یہاں کی مجالس مردانی شب میں ہوتی ہیں۔

موضع شیخ پور متصل صدر پور سیتاپور کی عزاداری

میں سید ابرار حسین صاحب کا گھر ہی بہت انہماک سے حصہ لیتا ہے۔ مجالس عشرۂ محرم تقریباً صبح کو ۹ بجے تک ہوتی ہیں۔ عاشور کو ان کے یہاں کے تعزیے اُٹھتے ہیں۔ ۲۸ صفر کو پھر مجلس برپا ہوتی ہے اور اس میں محمود آباد کی انجمن حیدری پڑھنے کے لئے مدعو کی جاتی ہے۔ طعام و قیام کا بندوبست سب ابرار حسین صاحب اور ان کے گھر سے ہوتا ہے۔ محرم اور صفر میں ذاکرین مجالس پڑھنے کے لئے بلائے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ فدا حسین صاحب کے یہاں شب کو مجالس ہوتی تھیں مگر اب وہ نہیں ہوتیں۔ مہدی حسن صاحب کے یہاں سید ابرار حسین صاحب کے گھر کی مجالس کے بعد ہوتی ہیں مگر افسوس ہے کہ وہ بند ہو گئیں۔ ابرار حسین صاحب کے بھائی مقبول حسین صاحب مرحوم نے اپنی حیات میں عزاداری کی بقا کے لئے ایک وقف کیا تھا جو وقف علی الاولاد کی نوعیت کا ہے۔ سنہ ۱۳۶۹ ہجری میں سید مقبول حسین صاحب کا انتقال ہو گیا معلوم نہیں اب کیا حالت ہے۔

قصبہ پنتیے پور ضلع سیتاپور کی عزاداری

کچھ فاصلے پر یہ قصبہ

ریلوے اسٹیشن پر واقع ہے جو سیتاپور سے بڑھول جانے
والی ریلوے لائن پر واقع ہے اور محمود آباد سے
دوسرا اسٹیشن ہے مگر محمود آباد سے خام سڑک سے وہ
دو ڈھائی کوس ہے۔ ساڑھے تین سو سال کا زمانہ ہوا
کہ ہوئی کے انہوں چیتے پال نامی نے اس قصبہ کا نام
اپنے نام پر رکھا تھا۔ یہاں چیتے پال کے قلعہ کے آثار
اب بھی پائے جاتے ہیں اور یہ قلعہ اب ریاست بلہرہ
کی ایک تحصیل کا مرکز تھا جو اب بھی ہے۔ قلعہ ہی کے
کے قریب یہاں شیخ گوہر علی صاحب مشیر کا مکان تھا جو
اب منہدم ہو گیا۔ میاں مشیر اسی چیتے پور ضلع سیتاپور
کے رہنے والے تھے جو تمام ہندستان میں اپنی ہجو
گوئی میں لاثانی سمجھے گئے ہیں۔ آپ مرزا دبیر کے
شاگرد تھے۔ ان کے ہجویوں کو مولانا شبلی نے خاص
طور پر اپنے مخالف ہوتے ہوئے کلام کی ندرت اہمیت
کے پیش نظر سنا تھا اور کافی تعریف کی تھی۔ آپ مرزا دبیر
اعلی اللہ مقامہ کے شاگرد تھے۔ ۱۲۳۰ھ میں تقریباً
ولادت ہوئی تھی۔ آپ نے ہجو گوئی کو درجۂ کمال
پر پہونچا دیا تھا۔ ۱۲۹۰ھ مطابق ۱۸۷۳ء میں آپ کا انتقال ہوا۔
اپنا وطن ان خطرات کی بنا پر جو ہجو گوئی کے باعث پیدا
ہو گئے تھے اپنی جان کو غیر محفوظ سمجھ کر شاہ اودھ کے
یہاں پناہ لی اور لکھنؤ کے محلہ مفتی گنج میں رہنے لگے۔ "کنا پ کتاب"
نے جو تعقاب کے جواب میں لکھی گئی تھی ان کے لئے اور بھی خطرہ
پیدا کر دیا اور واجد علی شاہ بہادر اودھ کے ہمراہ کلکتہ پہنچے۔
یہ کتاب ضبط کر لی گئی تھی کیونکہ پبلک میں سخت بے چینی پیدا
ہو گئی تھی۔ آپ کے مرثیے بھی ہیں اور ہر بیت ۲۴ کے ہیں۔
آپ ہندستان میں بہت مشہور و معروف تھے جن کا نام
فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ آپ کے کلام میں یہ بند بہت مشہور ہے ؎

تو اپنے ایک جام پہ ارزاں ہو گیا ساقیا
جو وہ پلانے والے ہیں پر نہ ہوا کچھ کیا

بتلائے دیتا ہوں تجھے میخانوں کا پتا
بطحیٰ و کاظمین و خراسان و سامرا
خورشید مدعا مرا برج شرف میں ہے
اک کربلا میں اک مرا ساقی نجف میں ہے

چیتے پور کے امامباڑے

جو قلعہ چیتے پال کا بقبضۂ ریاست بلہرہ ہے اور جس کے آثار
باقی ہیں اسی قلعہ میں زیر تعمیر گوشوں میں ایک امامباڑہ بھی
بنا ہے جو تعزیہ داری و مجالس کے لیے مخصوص ہے
اور ریاست کے عمال کی زیر نگرانی ہے۔ یہ چیتے پور کی
آبادی سے اچھا خاصا اونچا ہے۔ نصیر عالم کا قدیم
امامباڑہ کسی زمانہ میں تعمیر ہوا تھا جس کے اب پانچ در
دکھائی دیتے ہیں جو شاہی عہد کے آثار معلوم ہوتے ہیں۔
محرم میں ریاست بلہرہ کی طرف سے ریاست کے امامباڑہ
میں مجلس و تعزیہ رکھا جاتا ہے۔

چیتے پور کی عزاداری

اس قصبہ میں تعزیہ داری کافی ہوتی ہے۔ خصوصیت
سے یہاں کا چہلم مشہور ہے ۲۳ صفر کو یہاں چہلم میں
تعزیئے چوک پر آتے ہیں اور ۲۴ کو وہاں کے چہلم میں
دفن کئے جاتے ہیں۔ چہلم میں کافی مجمع ہوتا ہے اور دور
دور کے لوگ وہاں شرکت کرتے ہیں۔ زیادہ تر آبادی
وہاں اہل سنت کی ہے ۱۳۳۳ھ ہجری سے سید رحمان علی
صاحب تحصیلدار بلہرہ کی سعی سے وہاں آگ پر ماتم بھی
ہونے لگا ہے جس میں حضرات اہل سنت بھی شرکت
کرتے ہیں۔ عشرہ میں تھوڑے سے تعزیئے ہوتے ہیں جو
دسویں محرم کو کربلا میں مدفون ہوتے ہیں مگر چہلم کے تعزیئے
تقریباً سو دو سو ہوتے ہیں جو کافی اونچے اور بڑے
ہوتے ہیں اس کے علاوہ چھوٹے بھی تعزیئے اس کے ہمراہ ہوتے ہیں

قصبہ ریاست محمود آباد سیتاپور کا مختصر ذکر { تا نوحہ شیخ نصر اللہ شہر بغداد کے

قاضی القضاۃ جدِّ والیانِ محمود آباد تھے عہد سلطنت غوریہ
میں وارد ہندستان سنہ ۱۲۰۲ھ مطابق سنہ ۶۰۱ء ہوئے تھے
اور بمنظوری خلیفہ بغداد جو کوئی مذہبی حیثیت سے نہ تھا بلکہ
بادشاہ خلیفہ کہلاتا تھا اور یہ طرۂ امتیاز سمجھا جاتا تھا۔
خلیفہ سے ان کو تبلیغی خدمات کرنے کی اجازت ملی جو سلطان
شہاب الدین غوری کی مرہون منت تھی۔ آپ اسلام کی
تبلیغ کرنے پر مقرر ہو گئے آپ نے کھتریوں کو حلقہ بگوش
اسلام کر دیا۔ چنانچہ یہ معلوم کر کے سلطان غیاث الدین تغلق
نے ان کے خدمات کا اعتراف کیا اور نہایت امتنان و تشکر
کے ساتھ فرمان خوشنودی مزاج اور خلعت فاخرہ
عطا کیا۔ غرضکہ شاہان دہلی میں ان کو تقرب حاصل ہوتا گیا
اور جاگیریں ان کے خدمات پر عطا ہونے لگیں چنانچہ
اس خاندان میں نواب محمود خان تک اس خاندان کا سلسلہ
جاری رہا نواب صاحب شکار کے شائق تھے اور اطراف
محمود آباد میں برابر آنا جانا رہتا ہے چنانچہ ان کی وجہ
سے چند گھر وہاں لوگوں کے بن گئے اور ضروریات کی چیزیں
نواب صاحب کی وجہ سے رکھی جانے لگیں اور ایک بازار
چھوٹا سا ہو گیا۔ یہاں روسہ اور جوار کا جنگل تھا ایک
مسجد اس قصبہ کی قدیم ہے جو اسی جنگل میں تھی یہ مسجد
عالمگیری کے نام سے اب تک مشہور ہے اس کی پشت پر
ایک قبر ہے اور ایک اسی جگہ پر املی کا درخت ہے جو محمود آباد
کی تاریخ میں اول تھیں۔ محمود آباد کا نام نواب محمود خان کے
نام پر ہوا ہے۔ یہاں کے والیان نے کافی اس مقام کو
فروغ دیا اور ترقی دی۔ یہ خاندان محمود آباد ہمیشہ حکومت
کا بہی خواہ رہا لیکن مفاد اسلام پر ہمیشہ اس کی نظر رہی
چنانچہ آج مدرسۃ الواعظین لکھنؤ کا قیام جو اسی ریاست
سے وابستہ ہے انھیں تبلیغی خدمات کا اثر ہے جو ان کے جد اعلیٰ
کرتے رہے چونکہ تاریخ اپنے حالات کو دہراتی ہے اس بنا پر
یہ صورت تبلیغی اب بھی اس خاندان میں پائی جاتی ہے۔

اس ریاست کے خاندان میں اپنے جملہ خاندانی خطابات
پر مختار رہے۔ نواب بایزید خان ان کے قائم مقام ہوئے
جو عہد جہانگیر بادشاہ دہلی میں فوجدار آف جونپور کے
عہدہ جلیلہ پر فائز ہو کر وہیں عمر ختم کر دی۔ فتح جنگ ادرے پور
میں خلعت فاخرہ اور شمشیر عطا ہوئی اور دربار شاہی سے
عمدۃ الدولہ، امیر الملک، غضنفر الدولہ، مظفر جنگ کے خطابات
جلیلہ عطا ہوئے۔ میاں مصاحب علی خاں سنہ ۱۲۰۰ف میں ہوئے
جو نہایت فیاض اور مہمان نواز تھے صبح کو دوکان داران کا
نام لے کر دوکان کھولا کرتے ہیں جس طرح آصف الدولہ بہادر
کا نام لکھنؤ میں دوکان دار صبح کو لیا کرتے تھے۔ راجہ نواب
علی خاں تک یہ سلسلہ یکے بعد دیگرے ہوتا رہا۔ پھر راجہ
امیر حسن خاں بہادر اور ان کے بعد مہاراجہ علی محمد خاں صاحب کے
سی، ایس، آئی ہوئے ان کی وفات کے بعد اب موجودہ والی
راجہ محمد امیر احمد خاں صاحب بہادر زاد حشمتہ ہیں جو دور انقلابی
سے گزر رہے ہیں لیکن عزاداری کی بقا میں ہمہ تن کوشاں ہیں اور
انھیں روایات قدیمہ پر عزا میں انہماک ہے۔

شاہی محمود آباد [illegible] خاندان کی خدمات ایسے ہیں جو نہایت شاندار و درخشاں ہیں جو
کافی خوشنما [illegible] اس لئے چھوڑے جاتے ہیں لیکن قدامت [illegible] یہ مختصر سا
خاکہ پیش کر دیا گیا ہے۔ محمود آباد کا قلعہ محلّی نہایت خوبصورت
اور شاندار ہے اور الکٹرک فٹنگ سے آراستہ و پیراستہ
ہے۔ یہاں محلسرا میں متعدد امام باڑے جو ہر ایک کے
نام سے یاد کئے جاتے ہیں جس میں بجلی کے جھاڑ و فانوس
اس کی شان کو دوبالا کرتے ہیں۔ یہاں مشاہد مقدسہ کی عمارات
ایک ہی مقام پر تعمیر ہوئی ہیں جس میں پہلے روضہ حضرت عباس
علیہ السلام (موسومہ درگاہ) ۲۔ روضۂ نجف ۳۔ روضۂ پسران
مسلم ۴۔ روضۂ کربلا ہے ان میں اسی طرح بجلی کی فٹنگ ہے مشاہد
میں روزانہ وہاں وقف کی جانب سے مجلسیں ہوتی ہیں جو محکمۂ وقف
کے زیر انتظام ہیں۔

عزا اے محترم : تقریباً میرے قیام محمود آباد میں جو خدمات

ہوتی ہیں ۱۱ مجالس عشرۂ محرم میں یکے بعد دیگرے ہوتی تھیں مگر اب ان میں کمی ہو رہی ہے جو راجہ صاحب زاد حشمہ کے عراق چلے جانے سے رونما ہوئی ہے راجہ صاحب ممدوح دامے درمے برابر کفیل رہتے تھے لیکن ان کی عدم موجودگی کے باعث کافی ضعف ہو گیا ہے اور متعدد مجالس بند ہو گئیں۔

یکم لغایت ۹ محرم تقسیم طعام دو سو سہ لنگر روزانہ بمقام کربلا ہوتا ہے اور عام تقسیم ہے۔ ۸ محرم کو بستی کے منز محلہ خداگنج سے اٹھتے ہیں۔ ۸ محرم کو ریاست کے علم اور ذوالجناح و گہوارہ کا جلوس اٹھتا ہے تمام بستی میں ذوالجناح گھروں میں جاتا ہے۔ یکم لغایت ۹ محرم روضہ حضرت عباس علیہ السلام شب میں ہوتی ہے اور میر محمد جعفر صاحب، ور میر تفضل حسین صاحب اور علی محمد صاحب۔ اور ریاست کی بارہ دری کے امام باڑہ میں جو نہایت عمدہ طریقہ سے جھاڑ و فانوس و علموں سے سجایا جاتا ہے جس میں کافی بڑا منبر نقرئی ذاکرین کے لیے موجود ہے دونوں وقت وہاں صبح و شام مجلسیں ہوتی ہیں۔

مہندی کا جلوس ۶ محرم

یہ محمود آباد کا جلوس مہندی جو ریاست کی جانب سے اٹھتا ہے کافی شہرت رکھتا ہے گیس کی روشنی اور تخت جنیوں کے جن میں چینی کے گلاس لگے ہیں کافی شان بڑھا دیتے ہیں۔

۱۱ محرم لغایتہ ۲۰ محرم

صبح کو تین چار مجلسیں ہوتی ہیں جن میں صرف ریاست کی مجلس تو ہوتی ہے اور مجلسیں تقریباً ختم ہو گئی ہیں۔ یہ بعد ختم زمینداری کے اثرات معلوم ہوتے ہیں۔ ۲۴ محرم کو تابوت امام زین العابدین قلعہ معلیٰ میں ذاکرین کے ساتھ آتا ہے اور بارہ دری کے امام باڑہ میں بعد کو مجلس ہو کر پھر ۲۵ محرم کو تابوت و ذوالجناح اور چاندی کے ماہی مراتب ... و جھنڈیاں سبز جلوس کے ساتھ دفن کے لیے کربلا تک جاتی ہیں اور ہمراہ تابوت ہوتی ہیں۔ غرضکہ پھر ۱۶ صفر کو اسی طرح امام رضا علیہ السلام کا تابوت قلعہ میں آتا ہے اور ۱۷ صفر کو اسی طرح ساز و سامان کے ساتھ تابوت اٹھتے ہیں اور ذاکری کرتے ہوئے کربلا لائے جاتے ہیں بعد دفن کربلا میں مجالس ہوتی ہیں۔ دفن تابوت پر توپ داغی جاتی ہے۔ ان جلوسوں میں تابوت کے آگے اور پیش پیش اس خاندان کے افراد (ایک مجاہد کی حیثیت سے) ہوتے ہیں اور ذاکری ان کے سامنے ہوتی ہے۔ ان حضرات کی شان یہ ہوتی ہے کہ تلوار گلے ہوتی ہے اور سر و پا برہنہ ہوتا ہے اور ایک چوب ہاتھوں میں رہتی ہے۔ یہ قدیم دستور اس ریاست میں برابر چلا آتا ہے اور اس خاندان کا شعار ہے۔ محمود آباد میں اب تک باوجود اختلافات شرپسند حضرات یہ طریقہ ہے کہ جلوس عزا کے ساتھ ہر مذہب و ملت کا شخص سر و پا برہنہ ہو کر شریک ہوتا ہے اور یہ طریقہ اور رواج قدیم اب باوجود انقلاب کے اب تک رائج ہے۔

مجلس شام غریباں

گیارھویں شب میں امام باڑہ میاں جانی صاحب مرحوم میں جو شکستہ ہو گیا ہے ہوتی ہے اور اسی میں لکھنؤ کی غفران مآب کے امام باڑہ کی جو مجلس براڈکاسٹ ہوتی ہے وہ بھی سنی جاتی ہے۔

۲۵ محرم

امام زین العابدین علیہ السلام کی وفات کی تاریخ میں تابوت ۲۴ کا دن گزر کر شب میں قلعہ معلیٰ میں ذاکرین کے ساتھ آتے ہیں اور پھر امام باڑہ بارہ دری میں مجلس ہوتی ہے ۲۵ کو دن میں پھر قریب دس گیارہ بجے تابوت اٹھتے ہیں اور ذاکرین کے ساتھ کربلا جا کر دفن ہوتے ہیں۔ جلوس میں نقارہ، سبز جھنڈیاں اور ماہی مراتب اور ذوالجناح ہوتا ہے اور ایک دو بجے سہ پہر کو دفن ہوتا ہے۔ درگاہ کے قریب جو سب سے پہلے واقع ہے جب ذوالجناح

پہونچتا ہے تو خود بخود وہ گھوڑا دوڑتا ہوا کربلا جاتا ہے۔

۱۷؍صفر ۱۶؍صفر کو شب میں تابوت قلعہ میں امام رضا علیہ السلام کے آتے ہیں اور ذاکری کے ساتھ محلسرا اور بارہ دری کے امام باڑہ میں رکھے جاتے ہیں۔ دن میں بالکل محرم کی طرح جلوس تابوت مع حشم و خدم اٹھتا ہے اور تعزیوں کے سامنے والیان ریاست یا ان کے قریب کے اعزا تلواریں لگائے پیش پیش ہوتے ہیں اور ذوالجناح اسی طرح حضرت عباس علیہ السلام کے قریب پہونچتا ہو تو خود بخود جست کرتا ہوا کربلا کے مشہد کی طرف بھاگنے لگتا ہے اور روضہ کے اندر جاکر ضریح کے سامنے باہر اک دم سر جھکا دیتا ہے۔ یہ طریقہ ذوالجناح کا اس ریاست میں برابر رہا کر باوجود روکنے کے کوئی اس کو روک نہ سکا۔ شب کو ریاست کی جانب سے قلعہ میں ایک مجلس ہوتی ہے جو بڑے پیمانے پر ہوتی ہے جس میں پانچ چھ ہزار کا مجمع ہوتا ہے اور خصوصیت سے اس میں جلیبیوں کی تقسیم ہوتی ہے اور پھر ۱۹؍ کو شب میں بوندیوں کی قلعہ میں ہوتی ہے۔ یہ دونوں مجلسیں مشہور ہیں۔

۲۸؍صفر امام حسن علیہ السلام اور سرکار رسالت کی شہادت کی تاریخ میں ۲۷؍صفر کو شب میں تابوت قلعہ میں ذاکریوں کے ساتھ آتے اور بارہ دری کے امام باڑے اور محلسرا کے امام باڑوں میں رکھے جاتے ہیں جو متعدد ہوتے ہیں۔ دن میں دس گیارہ بجے پھر جلوس اسی شان سے اٹھتا ہے اور والیان و اعزا اور والیٔ ریاست انھیں روایات کے ساتھ شرکت کرتے ہیں اور ان کے سامنے ذاکرین پڑھتے ہیں۔ یہ طریقہ اب تک جاری ہے کوئی نہ کوئی گھر والا ضرور ان تاریخوں میں ہوتا ہے۔ ایک دو بجے سہ پہر تک جلوس عزا ختم ہوتا ہے اور تابوت دفن ہوتے ہیں بعد فراغ توپ سے سلامی ہوتی ہے جو ریاست میں موجود ہے۔ بہرحال ۱۸؍ لغایتہ ۲۷؍صفر دن میں مجالس روزانہ ہوجاتی ہیں۔

۱۸؍تا ۲۷؍صفر شب کو روزانہ قلعہ میں بارہ دری کے امام باڑہ میں مجلسیں ہوتی ہیں۔ امام باڑہ بارہ دری نہایت خوبصورت ہے جس میں جھاڑیں اس کی شان کو دوبالا کرتی ہیں۔ بجلی کی فٹنگ ہے اور منبر بھی نہایت شاندار چاندی کا کافی اونچا چاندی کے تخت پر رکھا جاتا ہے۔

۲۲؍صفر کو محمودآباد کا چہلم ۲۰؍صفر کو مجلس تو ہوتی ہے مگر ۲۱؍ کو قلعہ میں اسی طریقہ سے ذاکری کے ساتھ تابوت و کربلا (جو محمودآباد ہی میں بنتی ہیں) آتی ہیں اور رکھی جاتی ہیں پھر ۲۲؍ کو جو یہاں کی تاریخ چہلم ہمیشہ سے ہے اپنے قدیم روایات و حشم و خدم کے ساتھ جلوس عزا اٹھتا ہے اور کافی مجمع اس تاریخ میں قصبہ میں ہوتا ہے۔ یہ سب جلوس قلعہ سے اٹھ کر مسجد عیدگاہ کے قریب سے گزر کر کربلا جاتے ہیں اور یہی قدیم راستہ ہے۔ پولیس والے اسی طرح سرو پا برہنہ جلوس عزا کے ساتھ رہتے ہیں ورنہ [illegible] دور دور ہوتے ہیں۔ اس تاریخ میں کافی اہتمام کیا جاتا ہے سبیل ساتھ ساتھ ہوتی ہے۔ نقارہ کا گھوڑا اور جھنڈیاں نابینا ماہی مراتب ذوالجناح۔ علم و کربلائیں (یعنی جو محمودآباد میں بنتی ہیں) اور بالکل کربلا کے روضہ کی شکل ہوتی ہیں کربلا میں جاکر دفن ہوتی ہیں۔ یہ کربلائیں نہایت گہرے گڑھے میں جو کنویں کے اندر کا ہوتا ہے اندر اتاری جاتی ہیں اور پھر دفن ہوتی ہیں بعد ختم جلوس توپ کے فیر سے سلامی آخری ہوتی ہے اور اسی طرح اور جلوسوں میں بھی ہوتا ہے۔

۲۸؍صفر اس سے قبل ذکر رہ گیا ذکر کر دیا گیا ہے۔ اسوا اس کے صبح کو الطاف حسین صاحب عرف کلو کے مکان پر مجلس ہوتی ہے اور تعزیہ اٹھتا ہے اور پھر امام باڑہ چودھریان جب

کے یہاں سید زوار علی صاحب کے زیر اہتمام مجلس ہوتی ہے جو ۱۲ بجے تک ہوتی ہے اور پھر ۹ بجے کو وزیر علی صاحب کے یہاں کا تعزیہ دفن کے لیے جاتا ہے۔

یکم ربیع الاول لغایتہ ۸ ربیع الاول

صبح کو روزانہ مجلس ہوتی ہے۔ یکم ربیع الاول کو شب کو مسجد عالمگیری جو قلعہ معلّٰی سے قریب ہے تمام جلوس وہیں سے اٹھ کر قلعہ میں آتے ہیں چنانچہ یہ تابوت بھی اسی مسجد سے قلعہ معلّٰی میں ذاکرین کے ساتھ آتے ہیں اور پھر بارہ دری کے امام باڑہ اور محلسرا کے امام باڑہ میں شب کو رکھے جاتے ہیں اور ان میں دس گیارہ بجے اسی طریقہ سے جلوس اٹھتے ہیں جن کا کچھ مختصر ذکر کیا گیا ہو۔ ۲ ربیع الاول کو پھر تابوت اٹھتے ہیں اور کربلا میں جا کر دفن ہوتے ہیں۔

۳ تا ۴ ربیع الاول

۳ و ۴ ربیع الاول کو محلسرا میں جہاں راجہ صاحب اعلیٰ اللہ مقامہٗ کے امام باڑہ میں مردانی مجلسیں اور باہر کے لوگ پڑھتے ہیں۔ ذاکرین مقامی و غیر مقامی ان مجالس میں آتے ہیں۔ شب میں ۴ و ۵ ربیع الاول کو قلعہ معلّٰی میں وہ علم اٹھتا ہو جو تیمور کے عہد کا ہے۔

آٹھویں ربیع الاول

۸ ربیع الاول کو خاص طور پر لوگ محمود آباد آتے ہیں۔ کافی مجمع ہوتا ہے اور سب وہی ساز و سامان جو عام طور پر ہوتا ہے اس کے علاوہ انجمنوں کے دستے اور زنجیر زنی کا ماتم بڑے جوش و خروش سے ہوتا ہے۔ پھر تمام شہدائے کربلا کے تابوت جن پر ان کے اسمائے مطہرہ لکھے ہوتے ہیں اور بنی اسد کا قافلہ بھی شربے اور پھاوڑے لئے نکلتا ہے سب سے آخر میں تابوت سید الشہدا ہوتا ہے جس پر کافی تیر لگے ہوتے ہیں آتا ہے۔ مجمع کافی ہوتا ہے قریب شام یہ جلوس ختم ہو پاتا ہے اور توپ کی آخری سلامیاں ہوتی ہیں۔ جب یہ جلوس مسجد عیدگاہ کے قریب پہنچتا ہے تو اس مسجد میں گہوارہ سج کر نکلتا ہے اور جلوس میں شریک کیا جاتا ہے۔ کافی گریہ و بکا اس موقع پر ہوتا ہے کیونکہ وہابیوں نے اس میں کافی مداخلت کی تھی حتی کہ مقدمہ بازی کی بھی نوبت آئی اور بحمد اللہ یہ مقدمہ کامیاب ہو گیا اور عزاداروں کے حق میں فیصلہ ہو گیا۔ گہوارہ بدستور تقریباً چالیس سال سے زائد سے اسی طرح اسی مسجد سے نکلتا ہے چنانچہ کافی پولیس اس کے اہتمام کر لیے آتی ہے۔ انجمن سجادیہ محمود آباد کے اہتمام سے بعد فراغ جلوس عزا آگ پر ماتم کئی سال ہو گئے ہونے لگا ہے۔ جہاں تک ریاست کا تعلق ہے وہ تو جلوس و مجالس جاری ہیں مگر اہالیان قصبہ کی کچھ ایسی حالت خاتمۂ زمینداری کے بعد سے ہو گئی کہ عزاداری میں کافی کمی ہو گئی ہے اور کافی مجلسیں بند ہو گئی ہیں۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ یہ لوگ والیان ریاست کے بل بوتے پر مجالس کرتے تھے اور جب سے وہ باہر ہیں ان حضرات میں توجہ کم ہو گئی ہے۔

محمود آباد کا ذوالجناح

یہ ذوالجناح بجز جلوس عزا کے کسی اور کام میں نہیں لایا جاتا۔ جب ریاست کے جلوس اٹھتے ہیں تو یہ سجا جاتا ہے اور چاندی کے ساز سے مزین کیا جاتا ہے۔ عجب بات ہے کہ جب یہ حضرت عباس علیہ السلام کے روضہ کے سامنے آنے لگتا ہے تو کنوتیاں بدلنے لگتا ہے اور پھر ایک دم سے کربلا کے روضہ کی طرف دوڑتا ہے اور روضہ کے باہری حصہ میں جا کر ضریح کے سامنے سر جھکا دیتا ہے اور ماتھا ٹیک دیتا ہے۔ بہت سے لوگوں نے زور آزمائی کی مگر اس کو روک نہ سکے۔ نیا ذوالجناح بھی آیا مگر وہ بھی اسی طرح سے دوڑ پڑتا ہے اور روضہ امام حسین علیہ السلام دوڑتا ہوا جاتا ہے اور ضریح کے سامنے جا کر سر جھکا دیتا ہے۔

ریاست محمود آباد کی انجمنیں

دو انجمنیں خصوصیت کے ساتھ ایام عزا میں حصہ لیتی ہیں مگر زیادہ تر انجمن حیدری اور اسی کی ایک برانچ انجمن غنچۂ حیدری محمود آباد ہے جو کم و بیش جلسوں میں ذاکری کرتی ہیں اور ماتم میں حصہ لیتی ہیں یہ سنہ ۱۳۰۲ھ میں انجمن حیدری اوّل اوّل معلوم ہوتی ہے۔ انجمن محمدی بھی کچھ دنوں رہ کر اب خاموش ہے۔ انجمن سجادیہ بھی قائم ہے جس کا سنہ ۱۳۱۹ھ سے آغاز ہوا ان میں زیادہ تر حضرات اہل سنت شریک ہیں اور ماتم میں اور ذاکری میں حصہ لیتے ہیں۔
انجمن غنچۂ حیدری انجمن حیدری کی برانچ ہے جس میں نو عمر بچے شریک ہیں اور ان کا علم آٹھویں ربیع الاول کو اٹھتا ہو اور زنجیروں کا ماتم کرتے ہیں۔ محمود آباد کی حالت بعد خاتمہ زمینداری کے بہت کمزور ہو گئی ہے اور عزاداری کی حالت بمقابلہ پہلے کے بہت ہی اضمحلال پر ہے۔
نوٹ:۔ بہرحال اپنی ملازمت کے سلسلے میں میں نے کافی رنگ عزا دیکھے اور کافی ترقی پذیر حالات کا مشاہدہ کیا لیکن ضبطی زمینداری کے بعد یہاں کے حالات کچھ اتنے کمزور ہو گئے جو بیان کے قابل نہیں ہیں تاہم جہاں تک ریاست کا تعلق باقی ہے ان کے حالات ایک حد تک کچھ ایسے ناگفتہ بہ نہیں ہیں جو عزاداری کو اتنا کمزور کر سکیں جیسا کہ انقلاب حکومت کا عزم و ارادہ ہے تاہم بہت کچھ باتیں اس عزا میں اثر پذیر ہیں اور رخنہ اندازی سے دوچار ہیں جو بدلتے حالات سے رونما ہونے کا خیال ہے۔ پھر بھی ابھی تک ایسے بدحالات نہیں ہو سکے ہیں جو نا امیدیوں کا رنگ چڑھا سکیں۔ زمانہ عزا بہت کچھ باوجود رخنہ اندازی کے غنیمت کہنے کے قابل ہے کیونکہ والی محمود آباد اور ان کے اہل و عیال کا قیام ریاست میں رہتا ہے اور زنانی مجالس ریاست تو برابر اسی طریقہ سے ہو رہی ہیں اور مردانی مجالس جو اہالیان محمود آباد سے متعلق تھیں ان میں کمی محسوس کی جا سکتی ہے لیکن خاص خاص مواقع اپنی شان عزا کو برابر قائم و برقرار کئے ہیں۔ خداوند عالم بحق محمدؐ و آلِ محمدؐ ان کو قائم و برقرار رکھے۔

دیگر عزاداری

۱۸؍ رمضان تا ۲۱؍ رمضان کو علی الصباح مسجد متصل قلعہ معلّٰی سے تابوت قلعہ میں آتا ہے اور مجلس عزا ہوتی ہے۔ یہ تابوت سب ذاکری کے ساتھ آتے ہیں اور امام باڑہ بارہ دری میں رکھے جاتے ہیں۔ شبوں میں صبح اور شام مجالس اسی امام باڑہ میں ہوتی ہیں۔ عزا خانہ کافی سجا ہوا ہوتا ہے جو منبر اور جھاڑوں سے آراستہ ہے۔ منبر پر ایک جوڑی علم کی نہایت قیمتی آویزاں ہے جو اپنی صناعی میں اپنا خود ہی جواب ہے۔ علاوہ بریں اور بھی علم عزا خانے کے خاص ہیں جو قدیم زمانہ کے ہیں۔ اس کے بعد امام باڑہ چودھری کا صاحب مرحوم جو قلعہ سے ملحق علیحدہ ہے بعد بارہ دری کے امام باڑہ کے وہاں شبوں کو مجالس ہوتی ہیں۔ تابوتوں کے دفن پر اور روزانہ مشاہرہ میں بھی مجالس وقف سے ہوتی ہیں اور علی جان خدمت گار بھی مجالس روزانہ کرتے ہیں۔ ۲۱؍ رمضان کو شب میں ایک مجلس بڑے پیمانے پر ہوتی ہے جس میں کافی دور دور کے لوگ شرکت کرتے ہیں اور اس میں حضرات اہل سنت اور اہل ہنود اور مومنین سب لوگ ہوتے ہیں اور حصہ بھی لیتے ہیں۔ یہ عام بات ہے کہ جلوس عزا میں جو لوگ شرکت کرتے ہیں وہ سر و پا برہنہ ہو کر شرکت کرتے ہیں اور یہ قدیم رواج محمود آباد کا ہے تاہم اب اس میں بھی کمزوریاں محسوس ہو رہی ہیں

محمود آباد کے قرب و جوار کے موضعات میں عزاداری

موضع وہینا میں مومنین

کے تین گھر ہیں جن کے یہاں روزانہ صبح کو مردانی مجالس ہوتی ہیں جس میں ہنود اور اہل سنت حضرات گاؤں کے شریک ہوتے ہیں۔ ار محرم کو عاشورہ کے دن تقریباً چالیس تعزیے ہوتے ہیں اور چہلم میں آٹھ دس تعزیے ہوتے ہیں۔

موضع بہردلی موضع بہردلی میں امام باڑہ دسیلہ ہے جو کہ ریاست محمود آباد کا تعمیر کردہ ہے اور وہ سید صاحبان کی زیر نگرانی ہے جو اب بھی ریاست کے امام باڑہ بارہ دری قلعہ میں ملازم ہیں۔ زنانی مجالس ان کے یہاں ہوتی ہیں مردانی مجلس ایک ہر سال ہوتی ہے اور محمود آباد کے حضرات اس میں شریک ہوتے ہیں۔ سید جواد حسین صاحب وجعفری حسن صاحب کا گھر شیعہ ہے اور وہ کاشتکار ہیں۔ بدلو نداف اہل سنت ہو وہ بھی موضع بہردلی میں تعزیہ داری کرتا ہے۔ بالا دین و کبیڑی کوری ہندو ہے۔ غرضکہ ابھی تک یہ لوگ تعزیہ داری کرتے ہیں۔ دس محرم اور چہلم کو تعزیہ اٹھاتے ہیں یہ سب مواضعات محمود آباد سے قریب واقع ہیں۔

موضع کلواپور حاجی ہرا پگی نقیر۔ جمن نقیر۔ رجب و رمضان۔ اہل سنت ہیں اور تعزیہ دار ہیں۔ بیچو لونیا اور دیگر ہندو لوگ تعزیئے رکھتے ہیں۔

موضع گوہلی ابوالقاسم واعجاز حسین واصغر حسین وہاں شیعہ تعزیہ دار ہیں۔ اشرفی کوری کلو کمہار گردھاری پاسی اہل ہنود ہیں اور تعزیہ دار ہیں۔

موضع پہاڑاپور فصاحت حسین، اعظم اللہ خان علی حسین وغیرہ محرم میں تعزیئے رکھتے ہیں اور ان کی کافی اہمیت ہے۔

موضع نعمت پور ۲۵ر صفر کو چوک پر تعزیئے رکھے جاتے ہیں اور ۲۶ر کو دفن ہوتے ہیں۔ فقیر میاں جو صوفی بزرگ ہیں وہ مجلس کرتے ہیں اور کافی توجہ سے موضع میں چہلم کرتے ہیں۔ غرضکہ قرب و جوار کے مواضعات میں کافی عزاداری ہوتی ہے اور اہل ہنود کافی تعزیئے محمود آباد سے لاتے ہیں جن کا شمار مشکل ہے۔ کیونکہ کافی لوگ تعزیئے بناتے ہیں۔

تحصیل بسواں خاص ضلع سیتاپور سیتاپور خاص کے حالات میں یہ لکھا جا چکا ہے کہ یہاں ایک کنگری محلہ تھا جو اب محلہ قضیارہ سیتاپور میں آگیا اور اس کنگری محلے کے لوگ بسواں میں جاکر آباد ہو گئے ہیں۔ یہ لوگ بسواں میں تعزیہ ساز ہیں اور اس کام میں کافی ترقی کی ہے۔ مسٹر نیول آئی۔ سی۔ ایس نے سیتاپور گزیٹیر میں لکھا ہے کہ بسواں اپنی تعزیہ سازی کے لئے مشہور ہے جو صنعت و حرفت کا وہاں کی کافی آئینہ دار ہے۔ اس تعزیہ سازی میں کافی لوگ کام کرتے ہیں وہاں سے تعزیئے دور دور تک جاتے ہیں جو اپنی صناعی کی بہترین نمونہ ہوتے ہیں۔ چھپائی تعزیوں کے پرزوں کی علیحدہ ہوتی ہے اور ظلم کا کام تو نہایت ہی عمدہ ہوتا ہے اور تعزیوں کی بندش وہ لوگ ایسی کرتے ہیں جو اپنی آپ ہی مثال ہے اور ہندستان بھر میں یہاں کے تعزیئے اپنی بندش اور ساخت کے اعتبار سے سب مقاموں پر فوقیت رکھتے ہیں اور دور دور مشہور ہیں۔

مختصر ذکر صدشاہی میں یہاں کاغذ خوب بنتے تھے چنانچہ یہاں اسی وجہ سے کاغذی محلہ موجود ہے اور دوسری وجہ کنگروں کی ہے جن کی صنعت و حرفت ہندستان میں نمایاں ہے۔ تاریخی وجہ تسمیہ بسواں کی یوں بیان کی گئی ہے کہ تقریباً پانچسو برس کا زمانہ گزرا ہے کہ اس مقام کو ایک فقیر مسمی بسور ناتھ نے آباد کیا تھا۔ رفتہ رفتہ یہ بسواں ہو گیا ہے۔ یہ سیتاپور سے بڑھول جانے والی ریلوے لائن پر تیسرا اسٹیشن ہے اور اکبر شاہ کے عہد میں آباد ہوا تھا۔ تعزیئے اور تابوت کے لیے یہ مقام مشہور ہے اور چھپائی کا کام بھی خوب ہوتا ہے۔

عزاداری

جہاں تک تعزیوں کا تعلق ہے یہ مقام تعزیوں کی منڈی ہے۔ بڑے بڑے اور چھوٹے سے چھوٹے تعزیے یہاں کے خوب ہوتے ہیں۔ چہلم یہاں کا جو ۲۲ر صفر کو ہوتا ہے قابل دید ہے۔ ۲۱ر صفر کی شب میں چوک پر تعزیے رکھے جاتے ہیں اور شب میں چراغاں ہوتا ہے دور دور سے لوگ یہاں کا چہلم دیکھنے آتے ہیں کیونکہ تعزیے یہاں کے بے مثل صناعی کا مظاہرہ کرتے ہیں پورے سال میں وہ اپنے تعزیوں کو بناتے ہیں جو بہت چھوٹے ہوتے ہیں لیکن صناعی کا کمال ہوتا ہے جو ایک ہی رخ کے ہوتے ہیں۔ بائیسویں صفر کو تعزیے دفن ہوتے ہیں۔ ایک تعزیہ اُن میں اسی طرح کا ہوتا ہے جیسا خیرآباد میں یوسف غازی نے ۹۶۰ھ ہجری میں شروع کیا تھا اور میرا یہ خیال ہو کہ سب سے پہلا تعزیہ ہندستان ہی میں نہیں بلکہ دنیا کا پہلا تعزیہ یہی ہے جو ایک ہی پیمائش پر آج تک قائم ہے کیونکہ اس کی لمبان و چوڑان کا چوکھٹا اور ڈنڈے محفوظ رہتے ہیں اور ہر سال اسی پیمائش پر تعزیہ سجا جاتا ہے۔ اس تعزیے میں صرف ترتیبیں دو دو ہے دفن ہوتی ہیں جو غالباً کہیں نہیں ہوتا جو ایک چھپر کھٹ پر بنایا جاتا ہے جس میں کمی و بیشی اس کی پیمائش کے سبب سے ممکن نہیں ہے۔

۱۰ر صفر اور ۱۲ر صفر کو شیخ تجمل حسین صاحب آنریری مجسٹریٹ مرحوم کے یہاں شب کو مجالس ہوتی ہیں اور قرب و جوار کے لوگوں کو موصوف مدعو فرماتے ہیں۔ قاضی محمد طاہر صاحب وکیل اور سید محمد اطہر صاحب ذاکر منیجر ریاست محمودآباد علاوہ دیگر ذاکرین کے خصوصیت سے وہاں ذاکری کرتے ہیں۔ سیتاپور، محمودآباد، شیخ پورہ وغیرہ سے لوگ آکر شرکت فرماتے ہیں۔ ۱۲ر صفر چہلم کو ان کے یہاں ضریح اٹھتی ہے۔ اہلسنت و اہل ہنود اور شیعہ حضرات ان کی مجالس میں برابر شرکت کرتے ہیں۔ بسواں ایسا مقام ہے جہاں وہابیوں کی کسی طرح دال نہیں گلی کیونکہ بستی کی بڑی آبادی تعزیہ ساز ہے تقریباً پورے سال وہاں تعزیے بنتے رہتے ہیں اور سال بھر تک بکری ہوتی رہتی ہے جو طلب حاجت اور برکت کے لیے لوگ دور دور سے آتے ہیں۔ محمد میاں کے یہاں تعزیہ رکھا جاتا تھا جو قاضی عزیزالدین صاحب دیوان دتیا کے بہنوئی تھے۔ تعزیے کی بقا کے لیے ساٹھ بیگہ معافی تھی۔ قاضی ہادی حسن صاحب پدر قاضی تحفو صاحب جو اہلسنت ہیں قاضی ٹولہ میں مجلس کرتے تھے اور واقعہ خوانی کی طرز پر ذاکری کرتے تھے۔ ریاست محمودآباد کی کوٹھی واقع بسواں میں ریاست کی جانب سے عشرہ میں مجالس ہوتی ہیں۔ میر مومن علی صاحب مرحوم کا ایک امام باڑہ بہت قدیم ہے جہاں عشرۂ محرم میں مجالس ہوتی ہیں اور اب ان کے مرنے پر ان کے بھانجے مختار حسین صاحب تعزیہ بھی رکھتے اور مجالس بھی کرتے ہیں۔ یہ تعزیہ تمام بستی میں گشت کرتا ہے۔ قصائیوں کا تعزیہ جو چندہ کا ہوتا ہے وہ اہل سنت کا سب سے بڑی دھوم سے اُٹھتا ہے۔

بسواں کا قدیم تخت تعزیہ اور بزرگ

عہد شجاع الدولہ بہادر میں (جو ۱۷۵۶ء لغایت ۱۷۷۵ء کا عہد ہے) میر نثار اللہ صاحب لازم شاہی بسواں آکر تعزیہ داری شروع کی تھی اس سے قبل وہاں تعزیہ داری کا پتہ نہ تھا۔ انھوں نے ایک تخت کی پہلے پہل بنا کی تھی اس تخت پر ایک مسند ہوتی تھی اور اس پر ہار ڈالے جاتے ہیں۔ یہ تخت مومن علی صاحب کے امام باڑے سے اٹھتا ہے اور محلہ محلہ اس کا گشت ہوتا ہے سنی و شیعہ سب شرکت کرتے ہیں۔ میر نثار اللہ کے زمانہ سے اب تک یہ تخت برابر اٹھتا ہے اور چہلم میں بھی اس کا گشت ہوتا ہے۔ کمہاران کے تعزیے جنھیں خود وہ لوگ بناتے ہیں خاص طور سے قابل دید

ہوتے ہیں۔ تعزیئے چھوٹے ہوتے ہیں اور صرف ایک رُخ ایسا ہوتا ہے جس میں صناعی اُن کی دیکھی جاسکتی ہو۔ ۱۹۰۰ء میں مخالفین عزاداری نے کچھ جھگڑا بسواں میں کرنا چاہا تھا جس سے تعزیئے بند ہوگئے تھے اور احتجاج کے طور پر نہیں اٹھائے گئے لیکن معاملہ روبہ اصلاح ہونے کے بعد پھر تعزیہ داری پہلے سے کہیں زیادہ ہوگئی اور اب بھی بڑھتی جارہی ہے۔ بسواں میں زیادہ تر تعداد اہل سنت کی ہے جو تعزیہ دار اور تعزیہ ساز ہیں۔

موضع جہانگیرآباد کی عزاداری

یہ موضع پہلے ریاست محمودآباد کی تحصیل تھی۔ یہاں مسلمانوں کی کافی آبادی ہے زیادہ تر جُلاہے بستے ہیں۔ دسویں محرم کو تقریباً پچاس ساٹھ تعزیئے قرب وجوار کے مل کر یہاں جاتے ہیں اور وہاں کی کربلا میں دفن ہوتے ہیں۔ چہلم کی کوئی خاص تاریخ مقرر نہیں ہے بلکہ آخر ایام عزاداری میں اس کا اعلان ہوجاتا ہے اور چہلم ہوتا ہے۔ یہ بسواں کے قریب واقع ہے۔

سیوتہ کی عزاداری

مرزا اصغر علی بیگ صاحب سیوتہ کے سربرآوردہ حضرات میں ہیں اور ایک جوشیلے مذہبی انسان ہیں۔ ان کا امام باڑہ بھی ہے۔ مذہبی شغف کافی ہے اور عزاداری کے لئے ایک امام باڑہ بھی بنا یا ہے جو اچھی حالت میں ہے۔ صاحب تصنیف بھی ہیں۔ اصلاح کی کافی سعی رہتی ہے۔ تین رسالے تحقیق مذہب کے لئے لکھے ہیں اور راقم الحروف کو عنایت فرمائے ہیں۔

۶ محرم کو مرزا اصغر علی بیگ صاحب اور امجد علی بیگ صاحب کے یہاں کی صبح کو مجلسیں ہوتی ہیں جن میں کبھی خود یا اور کوئی ذاکر پڑھتا ہے۔

۸ محرم کو علم اُٹھتے ہیں جو تقریباً ستر یا اسی ہوجاتے ہیں ان کے ساتھ مہندی بھی ہوتی ہے۔

۹ محرم کو ریاست کے کوٹھار میں ریاست کا جو تعزیہ رکھا جاتا ہے اس کا گشت تمام رات رہ کر پھر کوٹھار میں واپس آجاتا ہے۔

۹ محرم کو چوک پر سو ڈیڑھ سو تعزیئے رکھے جاتے ہیں جن میں ہندو مسلمان سب ہی کے تعزیئے ہوتے ہیں۔ چکوؤں کا تعزیہ جو چندہ سے بنوایا جاتا ہے پندرہ بیس ہاتھ اونچا ہوتا ہے اس میں شور اور تختی اور گھیسٹے جلوسے خاص طور پر یاد رکھنے کے قابل ہیں جو بڑے انہماک سے حصہ لیتے ہیں۔ سیوم امام میں مجلس ہوتی ہو۔

۹ محرم کو ریاست محمودآباد کے کوٹھار میں مقامی ذمہ دار ریاست مجلس کرتا تھا۔ مرزا اصغر علی بیگ وغیرہ کے یہاں ملاکر دس بارہ مجالس عشرہ میں ہوتی ہیں مگر اب ان میں کمی بتلائی جاتی ہے میرے خیال میں ضبطی زمینداری کی وجہ سے یہ کمزوری پیدا ہوئی ہے۔ موضع جہانا ڈوال' موضع ریوسہ اور موضع کنڈاری کے مل کر سب تعزیئے موضع اڈیری جو سیوتہ کے قریب ہے جمع ہوتے ہیں جن کی تعداد پچاس ساٹھ کے قریب بتلائی گئی ہے عاشور محرم کو ہو جاتے ہیں اور چہلم میں فالحال کم ہوتے ہیں۔ سیوتہ خاص میں تعزیوں کی تعداد قریب آٹھ دس بیان کی گئی ہے اور چہلم میں ۲ یا ۴ تعداد ہوتی ہے۔ قرب وجوار میں عاشور محرم کو سو ڈیڑھ سو کی تعداد تعزیوں کی ہوجاتی

ہے اور چہلم میں آٹھ دس کی تعداد ہوتی ہے ریاست کے باغ میں جو کربلا ہے اس میں دفن ہوتے ہیں جس میں سہلاپور کیڑھی پوردہ۔ منگل پوروہ وغیرہ کے تعزیئے ہوتے ہیں۔

کنڈری کے تعزیئے

موضع کنڈری جو سیوتہ کے قریب واقع ہے اس میں دس بارہ کبڑیوں کے گھر ہوں گے وہ سب اہل سنت ہیں اور تعزیہ دار ہیں۔ سیوتہ میں صرف اصغر علی بیگ صاحب کے گھر والے شیعہ ہیں اور انھیں کا تعمیر کردہ امام باڑہ سیوتہ میں موجود ہے۔

پرگنہ تمبور ضلع سیتاپور کی عزاداری

ایک گھر شیعوں میں سید ظفر حسین صاحب کا ایسا ہے جو عزاداری میں میر قافلہ ہے۔ آپ کی بدولت مجالس محرم میں ہو جاتی ہیں اور آپ کو کافی شغف ہے۔ یہاں کا انداز مجلس کا یہ ہے کہ جب کوئی شخص مجلس کی بنا کرتا ہے تو فرش بچھا دیا جاتا ہے اور میر ظفر حسین صاحب کو بلوایا جاتا ہے وہ میر انیس اعلیٰ اللہ مقامہ اور مرزا دبیر مغفور کے مراثی پڑھتے ہیں اور وہاں حصہ کی تقسیم ہوتی ہے وہاں ایک امام باڑہ بھی تھا مگر وہ منہدم ہو چکا ہے۔ سید ظفر حسین صاحب کے اجداد تمبور کے زمینداروں میں تھے اور محمد نذیر آزاد سیتاپوری کی کس موضع میں موضع احمد آباد میں زمینداری تھی۔ قرب وجوار کے مقابلہ میں موضع احمد آباد میں تعزیہ داری کافی ہوتی ہے۔ چاند رات سے روزانہ شب کو مجالس ہوتی ہیں جو ظفر حسین صاحب کی کوشش و توجہ کا نتیجہ ہیں اور آپ خود ہی ذاکری فرماتے ہیں جو جلوس تعزیئے اور علم اٹھتے ہیں ان میں جب تک میر صاحب نہیں تشریف لے آتے نہیں اٹھائے جاتے۔ عشرۂ محرم میں ظفر حسین صاحب مذکور کے یہاں روزانہ شام کو مجالس ہوتی ہیں۔ پھر سیوم امام کے روز مجلس ہوتی ہے چہلم کی شب میں بھی ایک مجلس ہوتی ہے اس میں تمام حضرات اہل سنت اور ان کے مولانا صاحبان بھی شریک ہوتے ہیں۔

مستجاب الدعوات علم

یہ مقبول علم محرم کو پہلے پہل سید یوسف علی صاحب نے اٹھایا تھا۔ اس علم پر حضرت عباس علیہ السلام کے توسط سے لوگ خدا سے دعائیں مانگتے ہیں اور مرادیں بر آنے پر وہ لوگ اسی کی بقدر علم اٹھاتے ہیں۔ چنانچہ ساٹھ پینسٹھ کی تعداد عباسی علموں کی ہو چکی ہے اور برابر تعداد بڑھتی جا رہی ہے۔ یہ علم ۲ بجے دن کو اٹھتے ہیں اور شام تک واپسی ان کی ہو جاتی ہے۔ سید ظفر حسین صاحب کے مکان پر یہ جلوس ختم ہوتا ہے۔ سید یوسف علی صاحب مرحوم، سید ظفر حسین صاحب کے جد اعلیٰ ورئیس تمبور تھے اور محرم میں بڑے اہتمام سے ساتویں کی مہندی اٹھاتے تھے۔ چہلم اور ساتویں کو جو علم اٹھتے ہیں وہ بھی سید ظفر حسین صاحب کے گھر سے اٹھتے ہیں جو تقریباً ۱۰ بجے صبح کو اٹھ کر ۵ بجے شام تک ختم ہوتے ہیں، ہر جلوس کے ختم پر سید ظفر حسین صاحب کے مکان پر مجلس ہوتی ہے اور تمام اہل سنت حضرات اس میں شرکت کرتے ہیں۔ عاشور محرم کو ۱۲ بجے دن تعزیئے اٹھتے ہیں جن کی تعداد دو ڈھائی سو کی ہوتی ہے اور گیارھویں تاریخ صبح کو علی الصباح ان کے دفن کی نوبت آتی ہے۔ چہلم میں پچاس ساٹھ کی تعداد چھوٹے اور اوسط درجہ کے تعزیوں کی ہوتی ہے جو ۱۲ بجے دن کو اٹھ کر علی الصباح عاشور کی طرح دفن ہوتے ہیں۔ اگر کسی وجہ سے سید ظفر حسین صاحب موجود نہیں ہوئے تو ان کے صاحبزادے سید محمد امین سلمہ ان کے قائم مقام ہوتے ہیں اور اسی طرح وہ اپنے باپ کے کاموں کو انجام دیتے ہیں۔ باوجودیکہ وہ شیعہ اثنا عشری ہیں مگر تمام اہل سنت اس معاملہ میں اسی گھر کے لوگوں کا احترام کرتے ہیں جو یہاں کی عزاداری کا بانی ہے بہرحال ان کی وجہ سے تمبور کی عزاداری میں کافی رونق باقی ہے۔ کافی ہندو مسلم

ان کا خیال رکھتے ہیں۔

تحصیل مسرکھ خاص کی عزاداری

یہ مقام اس تحصیل کا صدر مقام ہے۔ یہ مقام راجہ دہیچ رشی کا آباد کردہ ہے جس کا پہلے ویدوں میں ذکر ملتا ہے۔ یہ ہندستان بھر کا بڑا تیرتھ گاہ ہے۔ پھاگن کے مہینہ میں یہاں پیکرے کا میلہ ہوتا ہے۔ غرضکہ ہندو آبادی میں یہ مقام نہایت متبرک اور پاک سمجھا جاتا ہے۔ میلوں میں دور دور سے لوگ آکر شرکت کرتے ہیں۔ یہاں بیاس جی کا آشرم رہا ہے جنھوں نے ویدوں کو چار حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ رگوید۔ سام وید۔ یجروید اور اتھربن وید سب اسی رشی کی یادگار ہیں جس نے سیتاپور میں رہ کر اس عظیم کام کو اٹھاسی ہزار فقرا کی موجودگی میں پایۂ تکمیل کو پہونچا دیا۔

مسرکھ کی عزاداری

یہاں سید اقبال حسین صاحب کا گھر سادات کا ہے اور ان کے چند اعزہ بھی ہیں۔ چودھری نخو کے والد ماجد تعزیہ دار تھے اور مجالس بھی کرتے تھے سید محمد تقی صاحب کے یہاں بھی مجالس ہوتی تھیں جو سید صادق حسین صاحب کے پدر بزرگوار ہیں۔ ان کے گھر کے کئی آدمی ہیں جو تعزیہ دار اور عزادار ہیں اور مجالس کرتے ہیں۔ دیگر لوگ بستی کے جو مسلمان ہیں وہ بھی تعزیے رکھتے ہیں۔ عشرۂ محرم میں بیس پچیس تعزیے شب عاشورہ کو رکھے جاتے ہیں اور دسویں کو دفن ہوتے ہیں اور چہلم میں بھی اتنی ہی تعداد ہو جاتی ہے۔ بازار مسرکھ میں ایک مسجد تیرتھ کی پشت پر ہے اور عیدگاہ تحصیل کی کچہری سے بالکل متصل واقع ہے۔ بنکروں اور منہیاروں کی آبادی لیکن سب عزاداری کرتے ہیں۔ ساتویں بھی ہوتی ہے جس میں چھوٹے بڑے علم تقریباً پچاس کی تعداد میں اٹھتے ہیں اور دو علم تو کافی بڑے ہوتے ہیں۔ آٹھویں محرم کو ایک بڑی مجلس بھی ہوتی ہے۔ ۳ یا ۴ مجلسیں روزانہ ہو جاتی ہیں۔ عاشور کے دن میر صاحبان کے تعزیے ۱۰ بجے صبح کو دفن ہو جاتے ہیں جن کی تعداد پانچ چھ ہوتی ہے۔ زنانی مجلسیں بھی روزانہ ہوتی ہیں جو تعزیے اٹھتے ہیں وہ ۵ سے ۹ فیٹ بلند ہوتے ہیں۔

مسرکھ کی خصوصیت ماتمداری

چونکہ مسرکھ میں کافی ہندوؤں کی آبادی ہے اور تیرتھ ان کا استھان ہے پھر بھی مسرکھ ایسے مقام پر حضرت سید الشہداء علیہ السلام کے ماتمدار زیادہ ہیں جو ہندو ہوتے ہیں ہندو ماتم میں کافی شرکت کرتے ہیں بلکہ مسلمان بمقابلہ ان کے کم ہیں اور ماتمداری میں کم شریک ہوتے ہیں۔ ایک ہندو لنے مقام پر حسین علیہ السلام کی ماتمداری میں بمقابلہ مسلمانوں کے ہندو زیادہ شریک ہوں یہ ایک خاص بات ہے۔ راقم الحروف مسرکھ میں رہا ہے: ہاں تقریباً کل بستی ہندوؤں کی ہے تھوڑے سے مسلمان ہیں۔ مگر ہندوؤں کا ماتم میں شرکت کرنا ایسے مقام پر تعجب خیز ہے۔

موضع نرہن کی عزاداری

سید سردار حسین صاحب اور ان کے بھائی نثار حسین صاحب و صغیر حسن صاحب وغیرہ کے یہاں عشرۂ محرم میں مجالس ہوتی ہیں اور موضع کے لوگ ان کے امام باڑہ میں جو ان کے جد کا تعمیر کردہ ہے مجالس کرتے ہیں۔ ان کے یہاں کے چہلم میں ایک بڑا تعزیہ اٹھتا ہے جو تقریباً ۴۰ فیٹ اونچا ہوتا ہے۔ بیس پچیس تعزیے عشرۂ محرم میں ہوتے ہیں جو دسویں کو دفن ہوتے ہیں۔ چہلم میں دس بارہ تعزیے ہو جاتے ہیں۔ ان کے عشرۂ محرم میں بیرونی ذاکرین بلائے جاتے ہیں۔ وہاں کا سیوم خصوصیت رکھتا ہے۔
مسرکھ کے قرب و جوار اور اطراف میں جہاں مسلمان آبادی ہے تعزیہ داری ہوتی ہے۔ نرہن مسرکھ سے ۳ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ سردار حسین صاحب کا گھر عزاداری میں کافی منہمک رہتا ہے۔

پرگنہ اورنگ آباد ضلع سیتاپور۔ صدیق مرزا صاحب

وہاں کے تعلقدار رہے ہیں۔ اورنگ آباد میں جنگروں، مغلوں اور پٹھانوں کی آبادی ہے جو تقریباً تین ساڑھے تین ہزار ہوں گے ہندو وہاں تقریباً پانچسو ہوں گے۔ وہاں کے روساء میں امیر مرزا صاحب اور حامد مرزا صاحب کے خاندان کے لوگ عزاداری کرتے ہیں اور مجالس برپا کرتے ہیں ایک بڑا تعزیہ عاشور محرم کو ان کے گھر سے اٹھتا ہے۔ مدار بخش گھوئی اپنے وسیع مکان میں تعزیہ رکھتے ہیں اور بھی لوگ تعزیہ دار ہیں۔ عاشورۂ محرم کو بارہ پندرہ تعزیے ہو جاتے ہیں اور چہلم میں آٹھ دس کی تعداد ہوتی ہے۔

پرگنہ قطب نگر کی عزاداری

یہاں کے تعلقدار اہل جماعت تھے۔ وہاں ایک انجمن حیدری قطب نگر قائم ہے۔ ساتویں میں مہندی اور دلدل برآمد ہوتا ہے۔ اور آٹھویں محرم کو علم اُٹھتے ہیں اور حاضری بھی ہوتی ہے۔ پندرہ گھروں میں روزانہ صبح و شام ۵ مجلسیں ہو جاتی ہیں۔ عاشور کو تعزیے دس گیارہ بجے اٹھتے ہیں۔ وہاں کے رئیس احمد شاہ ان کے یہاں برابر عشرہ محرم میں مجالس ہوتی ہیں اور لکھنؤ سے پڑھنے والے آتے ہیں۔ کافی اہتمام کرتے ہیں۔ علاوہ بریں احمد حسین صاحب اور مولوی افضال حسین صاحب اور صادق حسین صاحب اور سید محمد باقر صاحب کے یہاں کی مخصوص مجالس ہوتی ہیں اور عشرۂ محرم میں ان حضرات کی وجہ سے کافی رونق ہوتی ہے۔ انجمن حیدری مقامی ضروریات عزا کے لیے ہے لیکن کبھی کبھی وہ انجمن باہر بھی جاتی ہے اور اس انجمن کے صدر ذاکر حسین صاحب ہیں۔

مہولی کی عزاداری

مہولی میں چند سید صاحبان کے گھر ہیں جو تین بھائی تھے یہ تینوں میر صاحبان راجہ نونے سنگھ کے توپ خانہ پر ملازم تھے۔ راجہ نونے سنگھ کے صاحبزادے کنور بلبھدر سنگھ کی جب ولادت ہوئی تھی تو اس پیدائش کی خوشی میں کچھ بیگہ آراضی ان بھائیوں کو عزاداری کے سلسلے میں عطا کی گئی تھی جس کی سند ان کے یہاں موجود کہی جاتی ہے یہ زمانہ غدر سے پہلے کا تھا۔ ابتدا میں ہندو مسلمان مل کر تعزیے اپنے اپنے ایک ساتھ دفن کیا کرتے تھے لیکن کچھ عرصہ سے وہ لوگ کسی مسلمان کے یہاں اپنے تعزیے رکھنے لگے ہیں جو منتی تعزیے سمجھے جاتے ہیں۔ اسی وجہ سے وہ کسی نہ کسی طرح ان کو رکھتے ہیں۔ اس موضع مہولی میں ہر مسلمان کے گھر میں تعزیے رکھے جاتے ہیں وہ کسی خوف سے دوسرے لوگوں کے یہاں نہیں رکھتے بلکہ منت جہاں کی ہوتی ہے وہاں رکھتے ہیں۔

محرم میں شیعوں کے گھروں میں زنانی مجالس برابر ہوتی ہیں۔ پانچویں محرم کے بعد مردانی مجالس بھی ہوتی ہیں۔ تقریباً دس بارہ مجالس گھروں کے اعتبار سے ہو جاتی ہیں سُنی حضرات بھی مجالس کرتے ہیں اور تعزیے دار ہیں۔ ۸ محرم کو اقبال صاحب مرحوم کے یہاں سے تخت اٹھتا ہے ان کے بعد ان کے صاحبزادے انوار صاحب اٹھاتے ہیں۔ آٹھویں محرم کو شیعوں کے یہاں مخصوص طور پر نذریں ہوتی ہیں۔ غفور نائی بھی بڑا تعزیہ دار تھا جو اپنا تعزیہ بڑے اہتمام سے اٹھایا کرتا تھا جو ۱۳۰۴ھ میں فوت ہو گیا۔ شب عاشور عام طور پر تعزیے محرم کے چوک پر لائے جاتے ہیں اور عاشورہ کو نوحہ خوانی وغیرہ کے ساتھ شیعوں کے تعزیے دس گیارہ بجے صبح تک دفن ہوتے ہیں۔ اعمال عاشورہ بجا لاتے ہیں۔ اہل سنت حضرات اپنے تعزیے چار بجے سہ پہر کو اٹھاتے ہیں اور قریب ۵ بجے وہ سب تعزیے بڑے گاؤں کی سڑک کے کنارے رکھ دیئے جاتے ہیں جہاں نواب صاحب شیش محل کا باغ بھی ہے وہاں قرب و جوار کے مواضعات مو منج گیا۔ املیا وغیرہ کے تعزیے بھی آتے ہیں۔ پہلے کٹگھرہ اور تکیہ کے بھی تعزیے آتے تھے لیکن اب ان لوگوں نے اپنی علیحدہ کربلا بنائی ہے اور وہیں دفن کرتے ہیں۔ سبیلیں لوگ کافی رکھتے ہیں۔ تعزیے تقریباً

ایک دو بجے تک دفن ہوتے ہیں۔ سیوم کو بھی ایک مجلس ہوتی ہے اور بیسویں کو منظور صاحب کے یہاں کا تعزیہ رکھا جاتا ہے اور رضا حسین صاحب کے یہاں مجلس ہوتی ہے جس میں سیتاپور کے حضرات اور محمودپور سریاں کی انجمن نمائندگی کرتی ہے۔ موضع پاتا بوجھ محولی سے ایک میل پر واقع ہے وہاں بھی تعزیہ خصوصیت کے ساتھ اٹھتا ہے باہر کے لوگ اس میں شرکت کرتے ہیں جو ایک سنی منہیار کا تعزیہ ہے جو لوگ اس تعزیے میں آتے ہیں ان کی وہ خاطر داری اور مہمان داری کرتا ہے۔

قصبہ آنٹ کی عزاداری

شاہ فضل اللہ آملی نے شہر آمل سے ہندستان میں آکر عظیم آباد پٹنہ میں توطن اختیار فرمایا تھا ان کی زوجہ اور ان کے فرزند قطب زماں سید شاہ عبدالرحمٰن الملقب شاہ سلطان جہانگیر ہر سہ بزرگواروں نے اسی مقام پر انتقال کیا اور وہ موضع اسازمی پرگنہ تلا کا اطراف عظیم آباد پٹنہ میں دفن ہوئے آپ کا مزار نواب عبدالرحمٰن خاں ملقب بہ نواب افضل خاں خلف علامہ شیخ ابوالفضل میر منشی اکبر شاہ دہلی نے جو سید شاہ سلطان جہانگیر کے ہمعصر بھی تھے تعمیر کرایا تھا۔ سید شاہ مصطفیٰ خلف سلطان جہانگیر قصبہ آنٹ میں اپنے والد کے سجادہ نشین ہوئے۔ انھوں نے دو شادیاں کی تھیں جن میں سے ایک شیخ ابوالفضل کی پوتی تھی۔ یہ خاندان آنٹ میں پھلا پھولا۔ یہ نسباً نقوی سادات ہیں جو اس قصبہ میں سکونت پذیر ہوئے تھے ان کا سلسلۂ نسب امام علی نقی علیہ السلام تک پہونچتا ہے۔

بہرحال ان سادات میں زیادہ تر صوفی منش بزرگ گزرے ہیں اور حضرات صوفیا عزاداری کے حامی تھے یا کم از کم اتنا یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ یہ حضرات مخالف عزاداری نہیں تھے اور شیخ ابوالفضل کا سلسلہ بھی اس کو گوارہ نہیں کر سکتا تھا کہ اس مسئلہ میں کوئی اختلاف کیا جائے۔ قرب و جوار میں تعزیہ داری ہوتی ہے قصبہ میں بھی تعزیہ رکھے جاتے ہیں۔ نویں محرم کا دن گزار کر شب دہم کو تعزیے چوک پر آتے ہیں اور عاشورۂ محرم کو دفن ہوتے ہیں۔ جہاں تک علم ہو سکا تقریباً اٹھارہ بیس تعزیے محرم میں ہوتے ہیں اور سات آٹھ چہلم کے موقع پر ہوتے۔ مزید حالات نہ معلوم ہو سکے۔

قصبہ مچھریٹہ کی عزاداری

ساتویں محرم سو ڈیڑھ سو علم ہوتے ہیں اور مجمع تقریباً آٹھ دس ہزار کا ہوتا ہے۔ ان علموں میں چند عباسی علم بڑے ہوتے ہیں اور بقیہ چھوٹے ہوتے ہیں۔ براق، باجہ، اکھاڑہ بھی ساتویں کے جلوس میں ہوتا ہے اس قصبہ میں زیادہ تر جوگیوں کی آبادی ہے جو پہلی محرم کو جہاں کہیں بھی ہوتے ہیں محرم میں مچھریٹہ میں ضرور آجاتے ہیں۔ یہ اس مقام کی خصوصیت ہے کہ کوئی جوگی ایسا نہیں ہو جو مچھریٹہ کا ہو اور محرم کے دنوں میں قصبہ میں موجود نہ ہو۔ پہلی محرم کو اس کا اس مقام پر ہونا لازم ہے جو جوگی بستی میں حاضر نہ ہوگا اس پر کافی پابندیاں عائد کی جاتی ہیں۔ تقریباً پچاس تعزیے محرم میں ہوتے ہیں جو گیارہ بجے اٹھا کر ۲ بجے شب کو دفن ہوتے ہیں۔ دسویں بیسویں چہلم میں کچھ کم یا زائد چالیس پچاس تعزیے ہوتے ہیں۔ سیتاپور گزیٹیر میں مسٹر نیول نے کہا ہے کہ یہاں ایک امام باڑہ بھی ہے مگر اب معلوم ہوا ہے کہ وہ رنڈیوں کے قبضہ میں ہے۔

یہ چھوٹا قصبہ ہے جو شہنشاہ اکبر کے عہد میں آباد ہوا تھا یہاں پہلے جنگل تھا۔ یہاں مچھندر ناتھ کا استھان تھا جس کے نام سے یہ قصبہ موسوم ہوا ہے۔ چار مسجدیں اور ایک امام باڑہ گو سیتاپور گزیٹیر نے کہا ہے جو مسٹر نیول آئی۔ سی۔ ایس کی تالیف ہے۔

موضع پسانواں کی عزاداری: یہ ایک جنگلی اور غیر آباد مقام

ہے صرف تھوڑی سی آبادی اس گاؤں کی ہے۔ یہاں جرائم کے باعث گورنمنٹ نے ایک تھانہ قائم کرنے کی ضرورت محسوس کی اور تھانہ وہاں قائم ہے۔ یہاں کی عزاداری اپنی نوعیت کی امتیازی ہے۔ نویں محرم تک یہاں محرم کے کوئی آثار نہیں معلوم ہوتے جس سے یہ اندازہ ہو سکے کہ محرم آ گیا لیکن دسویں محرم کو وہاں کے ٹھاکروں وغیرہ دیگر تعزیہ داران کے تقریباً دس بارہ تعزیے آ کر ایک چبوترے پر جمع ہوتے ہیں اور ان کے گھر کی عورتیں آ کر ان تعزیوں کے گرد طواف کرتی ہیں اور ان پر چاول اور کھوٹیاں نچھاور کرتی ہیں۔ اس چبوترے کے اوپر ایک شامیانہ لگا دیا جاتا ہے جس پر وہ تعزیے رکھتے ہیں۔ وہاں شربت کی سبیلیں مختلف لوگوں کی طرف سے ہوتی ہیں۔ شربت داب پاگڑ کا ہوتا ہے، وہ ہر سال گڑ کی پاریاں امام کے نام پر گڑ بناتے وقت رکھ چھوڑتے اور محفوظ کر لیتے ہیں اور انھیں سبیل کا شربت تیار کیا جاتا ہے۔ قرب و جوار کے سب تعزیے جب اس مقام پر آ کر جمع ہو جاتے ہیں تو تمام گھروں کے پلنگ و چارپائیاں اس چبوترے کے چاروں طرف بچھا دی جاتی ہیں اور ان پر کوئی دری یا چاندنی بچھا دی جاتی ہے اور تب ان پلنگوں پر وہ قرب و جوار کے تعزیے رکھے جاتے ہیں جو اطراف کے مواضعات سے تعلق رکھتے ہیں۔ جب سب تعزیے یکجا ہو جاتے ہیں تو سبیل پلانے کا سلسلہ شروع کیا جاتا ہے بعدہ کربلا میں دفن کے لئے لے جاتے ہیں۔ یہاں کے تھانہ دار بھی تھانے پر سبیل ضرور رکھتا ہے اور لوگ تھانے کی سبیل میں بھی شرکت کرتے ہیں۔

موضع بھیٹی و موضع سندولی کا چہلم

یہ موضع بالکل ریاست محمود آباد سے ملا ہوا ہے۔ ۵ر صفر سنہ [illegible]ھ سے حضرات فتح پور کی سعی سے یہاں ہندو و مسلمانوں نے ایک جدید چہلم قائم کیا ہے۔ پولیس نے اس جدت پر اعتراض بھی کیا تو ان لوگوں کو موضع والوں نے جواب دیا کہ جب ہم ہندو مسلمان مل کر اپنی خوشی سے یہ چہلم کر رہے ہیں اور کسی کسی کو کوئی اعتراض بھی نہیں ہے تو پولیس کی مداخلت کا کیا سبب ہے۔ تھانہ پر جانے والے لوگ سب ہندو تھے۔ چنانچہ تھانیدار صاحب نے اس چہلم کو اپنے یہاں نوٹ کر لیا اور خاموش ہو گئے۔ یہ مزید تر قی عزاداری محمود آباد کی کمی کو پورا کرتی ہے جو کم ہونے لگی تھی۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس میں حقیقتاً قدرت کی مدد ہے ورنہ ایسی صورتوں کا ہونا جب کہ حکومت بدل گئی اور ہندوؤں کے جذبات کافی بھڑک گئے ہیں تو اس قسم کی ترقی ہونا اس زمانہ میں تعجب خیز ہے۔ ۲۰ر صفر یہاں کا چہلم ہوتا ہے۔ پھر اس کے بعد نورپور کا چہلم اور پھر موضع املیا کا نمبر ہے یہ مقامات قریب محمود آباد کے واقع ہیں تقریباً بیس پچیس چھوٹے بڑے تعزیے وہاں ہو جاتے ہیں۔ موضع بانسرہ و فتح پور میں ۲۶ر صفر اور نورپور میں ۲۸ر صفر اور املیا میں ۲۹ر صفر چہلم کی تاریخیں ہیں جو محمود آباد سے قریب مقامات ہیں۔

۹ و ۱۰ ربیع الاول موضع بھماں کا چہلم

عام طور پر ایام عزا آٹھویں ربیع الاول کو ختم ہو جاتے ہیں مگر موضع بھماں جو محمود آباد قصبہ سے تین چار کوس پر واقع ہے وہاں اس کے بالکل خلاف نویں ربیع الاول کو تعزیے رکھے جاتے ہیں اور چوک پر آتے ہیں اور دسویں ربیع الاول کو دفن ہوتے ہیں۔ کافی مجمع کئی ہزار کا ہوتا ہے اور وہاں لوگ قرب و جوار کے آتے ہیں بلکہ دور دور کے لوگ وہاں کے چہلم میں شرکت کرنے آتے ہیں۔ بڑے بڑے تعزیے وہاں ہوتے ہیں اور چھوٹے اور اوسط کے بھی ہوتے ہیں۔ بہر حال یہ وہاں ایک نیا انداز ہے ان کا خیال ہے کہ جب سب جگہ چہلم ہو جائیں تو ہم لوگ اطمینان کے ساتھ اپنے یہاں کا چہلم کریں گے۔ مسلمان کچھ زیادہ نہیں ہیں ٹھاکر صاحبان بھماں وہاں کے با اثر ہیں تاہم بڑے جوش و خروش

سے وہاں کا جشن کرتے ہیں جو خصوصیت کا حامل ہو۔

اوقاف سیتاپور

(۱) ریاست محمود آباد بقائے اُمورِ خیر کے لئے ہیں چنانچہ ۲۴ راگست [illegible] کو موضع سرولی کا وقف کیا گیا مجالس تعزیہ داری محرم و اربعین وعزاداری ماہ صیام و نیز ولادت حجج معصومین کے لئے ہے۔

(۲) دوسرا وقف ۶ مواضعات کا بیادگار صاحبزادہ علی احمد خاں آف محمود آباد کیا گیا جو مہاراجہ علی محمد خاں صاحب نے اپنے بھائی کی جانب سے فرمایا ہے جو ۱۹۱۹ء میں ہوا تھا اور بغرض بقائے مدرسۃ الواعظین لکھنؤ و مدرسہ امامیہ دیگر اُمور مذہبی مثلاً فاتحہ اموات وغیرہ و تحفظ مشاہد محمود آباد و لنگر و مہندی حضرت قاسم علیہ السلام مع روشنی وغیرہ ہوا ہے۔

(۳) تیسرا وقف بیادگار رانی صاحبہ مرحومہ محمود آباد ہوا برائے تنخواہ قرآن خوانان کربلا و روشنی و مجالس پنجشنبہ و فاتحہ سالانہ ۳ مئی ۱۹۲۳ء مہاراجہ صاحب نے کیا تھا۔

(۴) چوتھا وقف مہاراجہ کے نام سے ۱۲ ستمبر ۱۹۴۳ء ہوا جو پبلک اغراض مثلاً زہرا اسپتال (زنانہ) و تنخواہ داران و دیگر مفاد عامہ پر مشتمل ہے جو تقریباً ۳ لاکھ کا ہے۔

(۵) پانچواں وقف امیریہ کے نام سے ہوا ہے جس میں اُمورِ خیر اور تنخواہ داران کا مشاہرہ ہے اور اُس میں ہر دیگر اُمورِ خیر کی ادائیگی کی صراحت ہے جو ۱۳۰۳ھ ہجری کیا گیا ہے۔

(۶) سیتاپور میں ریاست محمود آباد اور ریاست بلہرہ کی جانب سے ۱۳۱۰ھ میں عزاداری کی بقا کی خاطر موضع کچھار کا وقف کیا گیا۔ دونوں ریاستوں کا اس میں نصف نصف حصہ ہے۔

(۷) ایک وقف سجاد مرزا صاحب مرحوم ہوا ہے جو امام باڑہ اور عزاداری کے لئے ہے اور متولی منتظم کے لئے معاوضہ بھی دیا جانا منظور کیا گیا۔ اس کے علاوہ تین وقف سجاد مرزا صاحب مرحوم نے اور فرمائے ہیں۔ جن کی تفصیلات انھیں اُمورِ خیر پر مشتمل ہے۔

(۸) امام باڑہ سیتاپور (بڑے امام باڑہ) کے لئے ایک وقف موضع پیپری کا دس بسوہ کا کیا گیا جو محمدی بیگم زوجہ عنایت علی صاحب مرحوم کی جانب سے ہے جن کی نکاسی حاصل ۱۵۰ ہے اور مالیہ ۵۰ مال گزاری ہے مورخہ ۵ مئی ۱۹۱۹ء کو ہوا ہے اور اس کے منتظم سید احمد صاحب مقرر کئے گئے ہیں۔

(۹) ایک وقف سید احمد حسین صاحب محلہ جنگلہ نے اپنے حصۂ مکان سے متعلق کیا ہے جو عزاداری اور اس کی بقا کی خاطر ہے جس میں مجالس عشرہ محرم شامل ہیں اور سید ریاست حسین صاحب اس کے منتظم ہیں یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس کا وقف نامہ باقاعدہ ہوا ہے یا وقف زبانی ہے۔

(۱۰) ایک وقف مرزا محمد مرزا صاحب قزلباش عرف مجن صاحب خلف مرزا ابوالحسن صاحب کا ہے اور وہ بقدر حصہ خود مخلفہ و تعلق وعزاداری ہے اور اسی سلسلے میں تین اور وقف ہوئے ہیں جو انھیں اغراض سے متعلق ہیں۔

(۱۱) ایک وقف مجالس محلہ جنگلہ کے سلسلے میں موضع گرامی کا ہوا ہے اور اس کا اندراج واقف حضرات ہی کے نام ہے۔

(۱۲) ایک وقف علی الاولاد مسماۃ زہرا بیگم زوجہ میر مظفر حسین صاحب وکیل کی جانب سے ۱۹۳۵ء میں ہوا تھا اور سردار حسین صاحب اس کے متولی و منتظم ہیں یہ باغ پختہ متصل اسٹیشن بڑی لائن کے کنارے واقع ہے۔

(۱۳) ان اوقاف کے علاوہ اور بھی چھوٹے چھوٹے اوقاف معلوم ہوتے ہیں مثلاً بسوان میں سالو بیگ کا وقف عزاداری

سے متعلق ہوا تھا۔

(۴) اسی طرح بادن ڈنڈوں کے تعزیے کے لئے کسی ہندو کی جانب سے کچھ وقف ہوا ہے جس کی صراحتیں نہیں معلوم ہو سکیں اور جو پتے پہلے ان کا اس موقع پر ذکر کر دیا گیا ہے جس طرح مہولی کی عزاداری میں کچھ وقف راجہ لونے سنگھ نے عزاداری کے لئے کیا تھا اور وہ فرمان وغیرہ ان حضرات کے بیان سے ہے۔ محمود آباد میں محلہ خدا گنج کے امام باڑہ کے لیے قدیم زمانہ سے ایک وقف تھا مگر تفصیلیں نہ معلوم ہو سکیں۔

سیتاپور کے امام باڑے اور ان کا مختصر ذکر

اس ضلع میں عزاداری کے سلسلے میں کافی امام باڑے تعمیر ہوئے تھے لیکن اب ان میں سے بہت سے منہدم ہو چکے ہیں میں ان منہدمہ امام باڑوں کو چھوڑ کر باقی کا ذکر کر رہا ہوں:

سیتاپور خاص کے امام باڑے ایک امام باڑہ محلہ قضیارہ سیتاپور میں بڑے امام باڑہ کے نام سے ہے جو شیعوں کا وقف عام ہے (۲) ایک امام باڑہ محلہ بنگلہ سیتاپور میں ہے جو امام باڑہ جعفریہ کہلاتا ہے اور عام لوگ چھوٹا امام باڑہ کہتے ہیں (۳) ایک امام باڑہ سجادیہ محلہ قضیارہ میں ہے جس کی عمارت نہایت شاندار ہے لیکن اب کس مپرسی کے عالم میں ہے (۴) ایک امام باڑہ سید محمد حیدر صاحب متولی وقف کچنار کے مکان میں ہے (۵) ایک امام باڑہ محلہ شیخ سرائے میں حاجی صاحب کے نام سے مسجد سے ملحق واقع ہے۔ (۶) ایک امام باڑہ جوگیوں کا تعمیر کردہ ہے جو سب ان سلسلہ

خیرآباد کے امام باڑے یہاں سگا جبار کا امام باڑہ قدیم زمانہ کا ہے اور اب اس کو آثار قدیمہ میں لانے کی سعی ہے اور محلوں میں بھی امام باڑے ہیں۔ آغائی صاحب کا امام باڑہ اچھے حال میں ہے۔ محلہ قضیارہ خیرآباد کا امام باڑہ جو محلہ والوں کا ہے امام باڑہ مرزا بندہ علی بیگ اب تقریباً منہدم ہو گیا ہے کچھ آثار باقی ہیں۔

امام باڑہ واقع لہرپور مولوی شاکر علی صاحب کا ہے جو سید محمد تقی صاحب کے انتظام میں ہے۔ قاضی ٹولہ میں جو امام باڑہ ہے وہ تقریباً منہدم ہو چکا ہے لیکن اس کی عظمت یہ ہے کہ لہرپور کے تمام جلوس وہاں تھوڑی دیر کے لئے ٹھہرا کر پھر اٹھائے جاتے ہیں۔ یہ امام باڑہ سید محمد حیدر صاحب خلف محمد افضل صاحب کا تھا جو بے توجہی سے زدہ حالت میں ہو گیا۔

امام باڑہ موضع سندولی یہ موضع محمود آباد سے بالکل متصل ہے وہاں پختہ امام باڑہ ہے جو اب شکستہ حالت میں ہے۔ موضع کلو پور (بہرولی) کا امام باڑہ خام ہے لیکن وسیع ہے۔

پینتے پور کا امام باڑہ یہ قلعہ میں ہے اور نو تعمیر عمارت ہے جو تعزیہ داری کے لئے مخصوص ہے۔

باڑی کے امام باڑے پرانا قصبہ ہے شیعوں کے دو امام باڑے اور سُنیوں کے تین امام باڑے ہیں۔ ایک بڑے امام باڑہ کے نام سے اور ایک دلبر خوا نف کا مشہور ہے۔

موضع مصطفیٰ آباد کا امام باڑہ یہ موضع خلیل نگر کے متصل ہے اس میں انصار حسین صاحب عرف بچن صاحب مرحوم کے گھر کا امام باڑہ ہے جس کی حالت اچھی نہیں ہے۔ ۱۳۶۷ھ میں وہ فوت ہو گئے۔

موضع نعمت پور {گئی ہے} سدھولی کو جو سڑک محمود آباد سے گئی ہے اس سے کچھ دور واقع ہے

جو ایک طوائف کا امام باڑہ ہے۔ ۲۰ صفر کو وہاں چہلم ہوتا ہے۔

موضع بانسرہ کا امام باڑہ

یہ گاؤں ریاست محمود آباد کا ملوکہ تھا اور اس کا زیادہ حصہ ریاست کا تھا وہاں دو امام باڑے ہیں ایک اشفاق حسین صاحب کا دوسرا قمرالدین صاحب کا خام ہے۔

موضع بھرپور کا امام باڑہ

سید محمد تقی صاحب مرحوم کے گھر کا ہے جس کی یادگار حسینی [illegible]ھ میں جدید تعمیر کی گئی ہے۔ خانپورہ کا امام باڑہ اب منہدم ہو چکا۔ محمد تقی صاحب نے اس امام باڑے میں ایک مہمان خانہ حسینی اور تعزیہ خانہ کی تعمیر کرائی تھی (سرفراز لکھنؤ ۱۰ ستمبر [illegible])

سیوتہ کا امام باڑہ

سیوتہ گانجر کا مقام ہے وہاں مرزا جعفر علی صاحب کا تعمیر کردہ امام باڑہ ہے جو قدیم و پختہ ہے اور حالت اس کی غنیمت ہے مرزا صاحب کا گھر صرف شیعہ ہے۔

تالگاؤں کا امام باڑہ

وہاں قدیم امام باڑہ ہے جس میں عزاداری ہوتی ہے۔ عابد علی صاحب مرحوم کا گھر وہاں بڑی شان سے تعزیہ داری کرتا ہے۔ بڑا تعزیہ وہاں کا مشہور ہے۔

موضع کچنار کا امام باڑہ

یہ گاؤں وقف تھا جو سید محمد حیدر صاحب متوفی کے زیر اہتمام تھا۔ وہاں ایک امام باڑہ موجود ہے۔

خیرآباد میں یوسف غازی کا امام باڑہ

یہ امام باڑہ روضہ محلہ میں غازی علیہ الرحمہ کے مزار کے احاطہ میں ہے جہاں ان کا تعزیہ باون ڈنڈوں والا رکھا جاتا ہے۔ شب عاشور وہ اسی امام باڑہ میں سجایا جاتا ہے جو ایک چھپر کھٹ کے چوکھٹوں پر سجایا جاتا ہے۔ اس کے برابر ایک چھوٹی سی مسجد ہے۔ امام باڑہ قدامت کے باعث بہت مشہور ہو چکا ہے۔

موضع اسلام نگر کا امام باڑہ

نفوس سادات اور شیعہ وہاں تقریباً چالیس کے ہوں گے جو چند گھروں پر مشتمل ہیں۔ راقم السطور وہاں گیا تھا وہاں کے زمینداروں سے امام باڑہ کی تعمیر کی منظوری حاصل کرائی سیتاپور کا ایک وفد وہاں گیا تھا جس کا میں بھی ایک فرد تھا۔ یہ علم نہیں کہ امام باڑہ کی حالت کیا ہے۔

قطب نگر اور موضع زہن کے امام باڑے

تحصیل سرکو میں یہ علاقے واقع ہیں۔ قطب نگر میں تین چار امام باڑے ہیں جہاں عزاداری ہوتی ہے۔ سید احمد شاہ و محمد شاہ کا خاندان عزادار و تعزیہ دار ہے۔ موضع زہن میں سردار حسین صاحب اور ان کے بھائیوں کے دم سے تعزیہ داری ہوتی ہے وہاں دو امام باڑہ ہیں سیوم وہاں کا مشہور ہے۔

موضع دُپنیہ کا امام باڑہ

یہاں تین امام باڑے ہیں ایک حامد حسین خاں صاحب کا اور دوسرا باز شاہ حسین خاں صاحب اور تیسرا تہور حسین صاحب کے گھر کا ہے۔ جہاں یکے بعد دیگرے یکم تا ۹ محرم مجالس ہوتی ہیں اور زنانی مجالس کا تو چہلم تک سلسلہ رہتا ہے۔

بسواں کے امام باڑے

(۱) راجہ اسکول بسواں کی فیلڈ ہے اسی میں قدیم زمانہ کا ایک امام باڑہ ہے جس کے اب صرف تین در رہ گئے ہیں چھتیں گر چکی ہیں جو نوب خانہ سے موسوم تھا (۲) ایک امام باڑہ چودھری علی اختر صاحب (مرحوم) کے مکان میں ہے (۳) مختار حسین صاحب کے گھر کا ایک قدیم امام باڑہ ہے۔

ریاست محمود آباد کے امام باڑے

یوں تو گھروں میں کافی امام باڑے محمود آباد میں ملیں گے لیکن جو نمایاں ہیں وہ تحریر کئے جا رہے ہیں۔

امام باڑہ عطا حسین صاحب محمود آباد

یہ شاہی زمانہ کا ہے جو محلہ خدا گنج میں واقع ہے اس سے متعلق ملکاپور کی معافی ہے اور ایک فرمان سنہ ۱۲۳۴ف اس معافی کا دیکھنے میں آیا ہے۔

امام باڑہ میاں جانی صاحب

تصدق حسین صاحب کا یہ امام باڑہ بالکل منہدم ہوگیا ہے۔ چھتیں باقی نہیں ہیں صرف دَر رہ گئے ہیں تاہم وہاں اب تک شام غریباں کی مجلس ہر سال ہوتی ہے۔

امام باڑہ داروغہ محمد بخش محمود آباد

یہ امام باڑہ اسٹیشن کو جانے والی سڑک پر واقع ہے اس کی بھی حالت بہت ابتر ہوگئی ہے اور بہت شکستہ حال ہے۔

امام باڑہ داروغہ دلدار حسین صاحب محمود آباد

یہ امام باڑہ کچھ غنیمت حال میں ہے اور اسی سبب سے وہاں مجالس ہوتی ہیں۔ امام باڑہ غالب علی خاں صاحب محمود آباد اور امام باڑہ ببو میاں کے امام باڑہ تقریباً اب ختم ہوچکے ہیں صرف کچھ آثار باقی رہ گئے ہیں۔

حکیم امداد علی صاحب

کا امام باڑہ مکان ہی میں ہے اور وہاں عزاداری ہوتی ہے اور مجالس ہوتی ہیں۔ غنیمت حال میں ہے۔

امام باڑہ چودھری صاحب

کافی وسیع اور بڑا ہے جو ریاست کی زیر نگرانی ہے۔ مجالس وہاں برابر ہوتی ہیں۔ یہ قلعہ معلیٰ سے متصل ہی واقع ہے۔

امام باڑہ موسومہ (بارہ دری)

نہایت ہی عمدہ ہے جس کا فرش سنگ مرمر اور سنگ موسیٰ کا ہے اور اس میں ایک صندل کی منبر رکھی ہے۔ بیچ میں چاندی کا منبر رکھا ہے جو کافی بلند ہے۔ جھاڑ اور فانوس سے یہ امام باڑہ آراستہ ہے۔ ایک جھاڑ سو بتیوں کا بہت بڑا ہے جس میں بجلی کی فٹنگ ہے اور اس کے سٹ کی اور جھاڑ ہیں وہاں لگے ہیں۔ بجلی دو پنکھوں کی فٹنگ ہے اور کافی وسیع ہے۔ ریاست میں یہ امام باڑہ بہت عمدہ ہے۔

محلسرا کے امام باڑے

زنان خانے میں کئی امام باڑے ہیں جن میں مہاراجہ صاحب مرحوم کے نام کا امام باڑہ بہت آراستہ و پیراستہ ہے۔ ایک امام باڑہ امیر الدولہ بہادر کا ہے۔ اور دو امام باڑے یا تین امام باڑے اندر اور ہیں۔

امام باڑہ موسومہ امراؤ بیگم

یہ امام باڑہ داروغہ احمد حسین صاحب کے مکان میں ہے اور اچھی حالت ہے۔

امام باڑہ اچھی بی مرحومہ محمود آباد

یہ امام باڑہ [illegible] کے قریب مکان سید اشتیاق علی صاحب تحصیلدار کے مسکونہ مکان میں ہے جو ان کو رہنے کو دیا گیا ہے۔

امام باڑہ حسن جان تبعدار محمود آباد

یہ امام باڑہ ان کے مکان ہی میں ہے اور باہری حصہ میں واقع ہے۔ اسد حسین صاحب اس کا انتظام کرتے ہیں۔

امام باڑہ مسماۃ منیر انجمن محمود آباد

یہ امام باڑہ [illegible] ہی بہت خوبصورت بنا ہے اور مجلس بھی اسی سلسلے میں ایک ہوتی ہے۔

امام باڑہ مدی جمعدار ڈیوڑھی محمود آباد

یہ امام باڑہ جبین احمد خاں صاحب عرف منتو میاں کے تصرف و انتظام میں ہے۔

ہندوؤں کی عقیدت

یوں تو منتوں اور مرادوں کے لئے ہندو حضرات بڑی مانا کرتے ہیں اور سبیلیں رکھتے ہیں اور تعزیہ داری کرتے ہیں لیکن

ایک بات خصوصیت کے ساتھ ہندو عورات میں ایسی ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ امام حسین علیہ السلام کی ذات بابرکات سے ان کو کیسی عقیدت ہے۔ اولاد کے لیے یا کسی اور اہم کام کے لئے جب عورتیں کوئی منت یا مراد تعزیوں کے ایام میں کرتی ہیں تو جب سے تعزیہ چوک پر آتا ہے اس وقت سے وہ نہیں بیٹھتیں بلکہ تمام تعزیہ خانوں میں جاتی ہیں اور تعزیوں کے سامنے لوبان کی دھونی دیتی رہتی ہیں اور وہ خوشبو بھی مرچھل سے تعزیہ کی طرف دیتی رہتی ہیں تمام رات اور تمام دن وہ تعزیہ خانوں کا گشت کرتی رہتی ہیں۔ نہ کھاتی ہیں اور نہ پیتی ہیں بلکہ وہ ضروریات جو جبراً و قہراً طاری ہوا کرتے ہیں یعنی از قسم بول و براز اس سے بھی دور رہتی ہیں کیونکہ ایسی حالتوں میں نہانا ضروری ہے مگر وہ جب نہا دھو کر اس مقصد کے لئے نکلتی ہیں تو پھر یہ حالت ہو جاتی ہے کہ دو آدمی ان کو سنبھالے رہتے ہیں جب ان کی مرادیں آ جاتی ہیں اور اولاد ہوتی ہے تو بعض تو حسینؑ مظلوم کی عطا کے باعث حسینؑ مظلوم کے نام کی مناسبت سے حسینی یا اور کوئی نام رکھتے ہیں۔ غرضکہ امام حسین علیہ السلام کی عالمگیر شخصیت وہ ہے کہ خود بخود متاثر ہوتے ہیں اور ان سے کافی عقیدت ہے۔ یہ اس قدر اہم کام ہے کہ عورتیں بے ہوش ہو جاتی ہیں مگر اپنے عزم و ارادہ میں کامیابی حاصل کر کے تب دم لیتی ہیں۔ چنانچہ اس ضلع میں بھی شب عاشور یا اور چہلم کے مواقع پر اس قسم کے واقعات دیکھنے میں آئے جن کو جوگی بھرنا عام لوگ کہتے ہیں لیکن یہ اپنی اہمیت کے لحاظ سے یاد رکھنے والی بات ہے جو عزاداری میں خصوصیت رکھتی ہے۔

دو سو سال پرانا مرثیہ

تاریخ عزاداری نمبر کے نام کی مناسبت سے اب کی ہم جو مرثیے، سلام اور نوحے دے رہے ہیں وہ بھی پرانے شاعروں ہی کے ہیں تاکہ ان سے کم از کم ہندوستان میں عزاداری کی قدامت پر کچھ نہ کچھ روشنی پڑ سکے۔

حسب ذیل مرثیہ ایک قدیم شاعر خلیفہ محمد علی سکندر کا ہے جن کی وفات سنہ ۱۸۰۱ء میں ہوئی تھی۔ یہ مرثیہ کھڑی بولی میں نظم کیا گیا ہے۔ اس مرثیہ کو اگر دیہات کے مخلوط مجمعوں میں پڑھا جائے تو بڑا مقبول اور پُر اثر ثابت ہوگا۔ ہم نے سکریٹری امامیہ مشن پر بھی زور دیا ہے کہ وہ اس کو کتابی شکل میں شائع فرما دیں تاکہ اس طرح اس سے زیادہ سے زیادہ افراد استفادہ کر سکیں اور وہ دیہات دیہات پہونچ سکے۔

(ایڈیٹر)

۱

بن کربل ما بانو نے کھیا نینا نیر بہاوت ہے
ابن علیؑ کی لوتھ کے اوپر بیاکل ہو ہو جاوت ہے
چھاتی پیٹت آنسو ڈھلکت رو رو بین سناوت ہے
زہراؑ جی کی ہیہ پیاری بن سیاں دکھ پاوت ہے
یا حیدرؑ تم ساقی کوثر چھنو اتنا نیک پلاؤ
تس کے مارے بھو تمہاری ترس رہی ہے پیاس بجھاؤ

تم بن مورا کون ہے کا سے مانگوں نیر
کنبہ بگرا کھت گیو کھیت رہے شبیرؑ

۲

بستی موری کس جنگل میں بے بے آن بسیلی　　پیٹت پیٹت، چھاتی موری پھٹ گر ہوگئی نیل
پھولن جوں کمھلائے کے جل بن کا نٹا سوکھ بیلی　　ماٹی کے سے رنگ بھئی ہوں سیّاں کارن پیلی
سیاں کو میں کیونکر جا کے اپنے گلے لگاؤں　　ظالم لوگوا گھیرے کھڑے، میں کیونکر لوتھ اٹھاؤں
بانو ایسا کون ہے جو ہاتھ پکڑ لے جائے
لوتھ کنے شبیرؑ کے موکو جائے بٹھائے

۳

سیّاں اپنا گلا کٹا کر لے گئے مورا سُکھڑا　　رات بسے میں بھیتر بیٹھی کیسے کاٹوں دُکھڑا
بھالے اپنا پروا کا، چندن جیسے مُکھڑا　　جوں موری نظر پڑت ہے دم جاوت ہے گھڑا
داغ بنی، نینی کی چھاتی، نینن اندر تارے　　نین رو رو لال بھئے ہیں سوکھ اگن کے مارے
پُتلی اوپر انسوا پلک تپئی بھر آئے
گرم توے پر بوند جوں چمک چمک ڈھر جائے

۴

بیڑے اوپر اہلِ حرم کے اسے موہے کرتارا　　لوہو کی ندیا میں ڈوبا پار لگاون ہارا
موکو سمندر ہی پھرت ہوں سر جھوت ناو کنارا　　آن پڑی منجدھار بپت کی دیوے کون سہارا
سیاں بن یوں غم کی ماری بہور ہی مت موری　　نیر بنا جوں مچھلی تڑپے رہو بھئی گت موری
منھ پر ڈھانپنے کو کتی لے دامن کا پاٹ
لہریں لے لے رو رہی لگی رنڈاپے کھاٹ

۵

ناکوئی مورا دُکھ پوچھت ہے ناکوئی سنگ سنگھاتی
کالی رین ڈرانی لاگے دو جے دیا نہ باتی
کیس بکھیرے بھوکی پیاسی سیّاں کا دُکھ کھاتی
ہائے حسینا سیاں جو جھے یوں کہہ کر چلاتی
اوڈھن کی ڈھگ بیٹھی بن میں سرکو مے دے مارے
نندن کے گرے ڈار کے بنھیاں رورداتہ پسارے

۶

تب نندن سے میں اُٹھ بولی آوے کیسے چینا
دُور وطن سے قید پڑی ہوں تھکتے ناہیں نینا
کس کے آگے بیٹھ بجھانوں اپنے غم کے بینا
اصغرؑ اکبرؑ قاسمؑ جو جھے ٹکڑے بھئے حسینا
اب ان کی لوتھن کے صدقے کوئی بند چھڑا دے
میلی سی اک چادر دے کر اپنا بول سنا دے
اے بانو تو جھٹ گئی اُٹھ یاں سے چل جب
سیّاں کو نہلائے کے کفن پہنا گڑ دا

۷

جواب کے میں جیتی چھوٹوں سیّاں کے ڈھگ جاؤں
بن کربل میں اپنے ہاتھوں وا کی گور بناؤں
چاروں اور ردوار اچھا کے خاصے پیڑ لگاؤں
تکیہ کی سی صورت باندھوں نیکا کنواں کھداؤں
پانی بھر بھر ٹھلیاں لاؤں سرکاندھے پر دھر دھر
رات بسا کر اُدس میں پانی ٹھنڈا کر کر
رستے میں جھری رکھوں نیر بہا کر نین
پیو بٹاڈ لوگو اندر امام حسینؑ

۸

سن کر موری ہانک بٹاؤ پانی پیون آ دیں ۔۔۔ ابن علیؑ کی گور کا صدقہ اپنی پیاس بجھادیں
چھاؤں تلے جھاڑو کی بیٹھیں تکیہ میں سُکھ پاویں ۔۔۔ جَدْ وہ موری بپتا پوچھیں کہ بی بی ہم جادیں
کس کنبے کی بی بی ہے تو کس نگری سے آئی ہے ۔۔۔ کیوں تکئے میں روتی ہے کس کی گور بنائی ہے

تب اُن سے میں یوں کہوں ارے بٹاؤ لوگ
اسی گور کی کارنا لینا ہم نے سوگ

۹

زہراؑ موری ساس کہاوت سسرا مورا حیدرؑ ۔۔۔ سیاں مورا الگت حسینؑ جیٹھ حسنؑ سا دیور
دیور وہ عباسؑ بہادر پوت سا جانی اکبرؑ ۔۔۔ قاسمؑ بنڑا لال بھتیجا ننھا بٹوا اصغرؑ
اتنا مورا کنبہ کٹا ہے اتنوں کی میں پیاری ۔۔۔ وطن ہمارا دیس مدینہ میں بانو دکھیاری

بھلا بٹاؤ لوگوا کیجو مجھ پر غور
ایسی کوئی جہان میں ہوگی دکھیا اور

۱۰

تکیہ کے دروازے آگے خاک لپیٹے منھ کو ۔۔۔ کبیں کنڈے گل[1] کفنی پہنے کھڑی کہت ہر در رو
کوئی نجف کو جاتا ہو تو ارے بٹاؤ لوگو ۔۔۔ اتنا مورا ایک سندیسا حیدرؑ جی سے کہیو
بَن کربل میں بانو ہو تمھاری پیاری ۔۔۔ ابن علیؑ کی گور کے اوپر بیٹھی کرتی زاری

بلک بلک مر جائے گی نیکی ہو سنچو یا شاہ

صدقہ اپنے پوت کا وا کا کرو نباہ

[1] کل ۔ مالی

۱۱

ارے بٹاؤ لوگو پھر تم دیس مدینے جانا　جتنے وہاں کے رہنے والے ان سب کو بلوانا

ختم رسُولؐ کے روضے آگے جا کے سیس نوانا　سر چھاتی کو پیٹ کے اپنی ردرو بپتو سنانا

جائے کھبریا داکی لیجئے سب کے پیغمبر　زہرا جی کی بھوا کیلی بانو کربل بھیتر

تکیے میں دیکھی کھڑی راکھ لپیٹے کیس

ابن علیؑ کی گور کے اوپر کیے فقیری بھیس

۱۲

یا احمدؐ جی یوں اُمت نے بانو کو بلکایا　تین دنا کربل کے بھیتر پانی نا ہیں پایا

بے لبس کر کے کنبہ واکا پیا سا کاٹ گرایا　لوٹ لیا دھن جو کچھ پایا گھر کو پھونک جلایا

اب تکیے میں بھکویں گدڑی اوڑھے آہیں مارے　یا پیغمبرؐ نام تمھارا لے لے بھو پکارے

بانو بیٹھی فقیرنی اتنی بھیک دلاؤ

درسں حسینؑ شاہ کا موکو تنک دکھاؤ

۱۳

ارے بٹاؤ لوگو جائی پھر وہاں کیجو زاری　جس روضے میں بی زہرا ہے جگ لِستادن ہاری

اتنی موری اور سے کہیو اے بی بی دکھیاری　اک تکیے میں کالی کفنی پہنے رانڈ بچاری

کیس بکھیرے گور کے اوپر کہتی ہے دن رینا　اُٹھ چلئے زہرا کے ڈیرے مورے سنگ حسینا

تم زہرا کے لاڈلے اور زہرا موری ساس

تم دونوں اوٹھ گئے بیٹھوں کاکے پاس

۱۴

سنو بٹاؤ لوگوا پھر تم اون قبروں پر جانا　　بس کھا کر جس جائے حسنؑ نے لینو گور ٹھکانا
پھاڑ گریباں دھول اُڑا کر رو رو یہو سنانا　　بیٹھ حسنؑ کی پینتیاں رو رو دسیس لگانا
اک تکیہ میں بھابھی تمھری بانو غم کی ماری　　سانجھ سویرے بال بکھیرے کہتی ہے بےچاری
اس تکیہ کو چھوڑ کر اوٹھ جاؤں کت اور
تکیہ دونوں جہان کا ہے سیّاں کی گور

۱۵

تمھیں حسنؑ بانو کہتی تھی جیٹھ کہاوت مورے　　اور قاسمؑ بنڑے کے ناتے سمدھی لاگت مورے
سو یہ دو ناتے لے گئے سکھ اور بپت مورے　　تم جنّت میں سو رہے یاں نینا برست مورے
نیند نہ آوے غم کے مارے دل اندر سے پکیا　　مانیؑ موکو بچھونا ہے، ہے گور سرہانے تکیا
ہوں تمھری، واری گئی، تنِک حسنؑ جی آؤ
جہاں تمھارا بیر ہے ہاتھ پکڑ لے جاؤ

۱۶

اتنی باتیں کہہ کر بانو جب رو رو چپلائی　　گلے لگا کر زینبؑ بولی سُن اصغرؑ کی مائی
رونے سے کچھ ہاتھ نہ آوے ہوتی ہے رسوائی　　جس تن لاگے سو ہی جانے کس کی پیر پرائی
ایسا کون ہمارا والی کھبر کھبر جو لیوے　　اہل حرم کے بند چھڑا کر اک اک چادر دیوے
لوچھن ہارے سب موئے رہ گئے عابدؑ لال
سو تو دوہرے سنگ بندھے ہیں سر ننگے بےحال

بانو زینبؑ جوں جوں رووے یوں کلثومؑ پکارے　　مجھ دُکھیا کو چھوڑ حسینؑا کیدھر جائے بسارے
گھروالی عباسؑ کی کہتی دونوں ہاتھ پسارے　　سیّاں مورا کھووے کٹا کر جو جا ندی کنارے
ماں بہنوں کو دیکھ پکاری قاسمؑ جی کی دلہن　　دولہا مورا سہرے کی لڑیں سنگ کٹا کر گردن

سن عابدؑ نے یوں کہا اے بہنی مت رو
ابھی رین ہے کاٹنی بھور بھئے کا ہو

۱۸

ارے محباں رو کر بیٹھو وا بچی دکھیاری　　جا کا نام سکینہؑ بی بی ابن علیؑ کی پیاری
عابدؑ لاگے دیکھتے کانن سوتی تھی بےچاری　　ماں بہنیں پھپھیں کا رونا سن کو چونک پکاری
اے بابا تم کت سووت ہو مو کو نیند نہ آوے　　کانن کے دردن کے مارے گردن مور پراوے

تھپکی دے بہلائے کے، عابدؑ بولے پاس
بہنی تورے بابا نے لینو ہے بن باس

۱۹

چین کہاں آوت تھا وا کو اُٹھ بیٹھی وہ بالی　　عابدؑ جوں جوں بہلاوت ہے جاوت ناہ سنبھالی
بیاکل ہو ہو ہے ہے کہتی بابا مورے والی　　گودی میں بیٹھلا کے مو کو کرتے تھے خوشیالی
اب اپنی چھاتی سے بابا مجھ کو کیا نرالا　　ایسی کیا تقصیر ہوئی جو بن میں لا کر ڈالا

مجھ بالی کی بالیاں لے گئے لوٹ غنیم
خالی کان رو رہی تم بن بھئی یتیم

۲۰

چا چا جی نے پانی کارن اودھر جیا کھپایا — ایدھر تم نے مورے کارن پیاسا گلا کٹایا
عابدؑ کو ظالم لوگوا نے بندھوا کر بٹھلایا — تس پر مجھ بالی بچی کو بن پانی ترسایا
اب تک پیاسی مرتی ہوں بابا پیاس بجھاؤ — کوثر سے اک پیالا بھر کر مو کو لا پلواؤ

کیا کروں کا سے کہوں نکست ناہیں جان
اک بھڑک پیاس کی رو جے دُکھتے کان

۲۱

کیسے آئے بابا ہم کو آج بچھڑ کر چینا — چھاتی اوپر اپنی مجھ کو رکھتے تھے دن رینا
میں گودی میں ہنس ہنس کہتی بابا جان حسینؑا — بول سکینہؑ بی بی کہہ کر کرتے تھے یہ بینا
تب تم اپنے من کے بھیتر پھولے ناہ سماتے — گلے لگا بہلا کر مورے سر پر ہاتھ پھراتے

نا جانوں اب کیا ہوا بابا تمہرا پیار
آج کبھی بے سدھ نا لینی ایسے گئے لبسار

۲۲

اے بابا کیا روٹھ گئے ہو کیسی جی پر ٹھانی — اب لگ مورے پاس نہ آئے رو رو کھوئی دوانی
جو ل جوں مو کو پیاس لگت ہے جاوت ہوں گھبرانی — جان چلی جاوت ہے بابا تنک پیاو پانی
جیبھ جدی باہر ہے منہ میں ہونٹھ جدی پپرائے — نیر لگا نینن کا ڈھرنے تو بھی خبر نہ آئے

جو تم اب اس حال میں تنک کروگے دیر
پھر دیکھیو تم آن کر بھئی سکینہؑ ڈھیر

(۲۳)

جب سے مورے ہاتھ بندھے ہیں تب سے نیند نہ آئی — سنکل سے جاتی ہے ٹوٹی موری نرم کلائی
ایکن اور سسکتی قیدی بانو موری مائی — رو دیے اور پڑا روتا ہے بندھوا عابد بھائی
پھپھیاں چچیاں سر پیٹت ہیں بہنی رانڈ بلکتی — میں ان سب کے آگے بابا باٹ تمھاری تکتی

میں ان سب کی لاڈلی تم سب کے سرتاج
بندی آن چھڑائیے سب کی رکھیے لاج

(۲۴)

تب عابد نے سن کر وا کو اتنا بول سنایا — اے بہنی کون ادھر سے موا یہاں نہیں آیا
اتنا کیوں روتی ہے بی بی جو لکھا سو پایا — کوئی گھڑی دم لے کر سو لے کہتا ہے ماں جایا
بھور بھئے اب کیسی دیکھیں ہم پر بپتا آوے — بانو ابھی سے کانپن لاگی سیدھ ہوا نہیں جاوے

جل پی کے منہ ڈھانپ لے اپنا ادھ سنبھال
اے بہنی وہ دیکھ لے اُکھڑے تمبو پال

بھور بھئے جب پوچھاٹن لاگی ہا جا کو رح نکارا — اونٹن پر دکھیا چڑھ جالیں اودھر ہوا گذارا
جدھر پڑا تھا بن سر گھائل دین دنی کا پیارا — کٹا ہوا سب کنبہ واکا دہل رہا تھا سارا
اونٹن کی لے ہاتھ مہر وا عابد آن پکارے — کس بپتا میں چھوڑ کے مو کو بابا جان سدھارے

ماں بہنیں پھوپھیاں سبھی قیدی مورے سنگ
باٹ کٹے نہیں ایک دو کھ دو بے ادگی انگ

۲۶

عابدؔ کی سن زاری دکھیا اونٹن پر چلاّئیں بیاکُل ہو کر گر پڑیاں ہے ہے کر کر دھائیں
سیس کھلے زنجیریں پہنے لوتھن پر جب آئیں پیاروں کو پہچان کے اپنے آنسو بھر بھر لائیں
آپس میں یہ دیکھ پکاریں اے بھنو یہ کیا ہے ایک جیسّا جو جیسے نا ہیں سگرا کٹم کٹا ہے

تب تو سگری بیبیاں لوتھن کو پہچان
سر چھاتی کو پیٹ کر کرنے لگیں بیان

۲۷

لوتھن کے ڈھگ سیس کھلے بن چادر چھوٹی بڑیاں ہے ہے کر کر پیٹن لاگیں مقتل اوپر کھڑیاں
غم کے مارے کھائی گھڑی رو رو کر گر پڑیاں ہاتھ ادھا دکھلاون لاگیں زنجیروں کی کڑیاں
کہنے لاگیں ہم رانڈوں کی بندی کون چھڑاوے کون ہمارا ہووے سنگھاتی کون وطن پہونچاوے

والی وارث مر گئے لوٹ لیا گھر بار
ہم قیدی بن میں شہر میں دیکھت ہے سنسار

۲۸

کوئی کھڑی سرورؔ کو بیٹے کو کوئی کنٹھڑی اصغرؔ کو کوئی کھڑی قاسمؔ کو بیٹے کو کوئی کھڑی اکبرؔ کو
کوئی کھڑی کانن کو پکڑے کوئی کھڑی زیور کو کوئی کھڑی کہتی ہے سر سے چھین لیا چادر کو
ایکن اور کھڑے ہیں عابدؔ گلے پہ طوق سنبھالے ایکن اور لعیناں نے جب ان دکھلائے بھالے

تب تو سگری بیبیاں پیٹت پیٹت لاچار
اونٹن کے ڈھگ جاکے رو رو بھئیں سوار

(۲۹)

پکڑ مہروا عابدؑ جاتے نین نیر بہاتے — پھر پھر لوٹھیں دیکھت جاتے یوں کہہ کر چلاتے
اے بابا ہم تم کو بن میں بے بس چھوڑے جاتے — شام نگر لے جاتے ظالم تنک نہیں ٹھہراتے
کیونکر مو سے راہ کٹے گی پیر چلا نہیں جاوے — ماں بہنوں کی زاری سن کر جگرا اُلٹا جاوے

تس پر لاگی پیاس ہے دور بڑی ہے راہ
بابا کیسے ہوئے گا عابدؑ کا نرباہ

(۳۰)

اب آگے کچھ کہا نہ جاوے مو سے حال حرم کا — موری چنتا میں یوں آوے بھیس بنا ماتم کا
بیٹھ محباں آگے باچوں یہ مرثیہ غم کا — بہت رلادوں روؤں پیٹوں نہیں بھروسہ دم کا
کت فقیر غریب سکندر جیوں تمرے بلہارا — یہاں رکھیئے پت موری سرورؑ وہاں کیجئے سہارا

دوؤ جگ کے تم دھنی مانگوں کاکے دُوار
بھیک تمہارے دوار سے مانگت ہے سنسار

ہندی الفاظ کے معنی

لفظ - معنی
ما - میں - اندر
یو - یہی
چلو آتنا - چلو بھر
کا سے - کس سے
سگرا - سارا
کھت گیو - کھیت رہا - قتل ہو گیا
آن بسیلی - آن بسی
بھیلی - بھئی - ہو گئی
سکھڑا - سکھ، آرام، چین
اگن - آگ - تپش
سرتارا - خدایا
پار لگاون ہارا - پار لگانیوالا
ہو کے سمندر - سوکھے سمندر میں

بپت - بپتا - مصیبت
سنگھاتی - ساتھی
دو بجے - دوسرے
دیا نہ باتی - چراغ نہ بتی
ڈھگ (بالکسر) - نزدیک
جو جھے - قتل ہو گئے
نندن - بیٹا
گرے ڈار کے - گلے میں ہاتھ ڈال کے
بکھانوں - بیان کروں
نیکا (بہ یائے معروف) - اچھا، عمدہ
جھرنے - سبیل - پیاؤ
بٹاؤ - مسافر
جد - جب

کارنا - کارن - واسطے
لینا (بہ یائے معروف) - لیا
بٹوا - بیٹا
کفنی - کالی کفنی
سندلیسا - پیغام - خبر
سیس نوانا - سر جھکانا، تسلیم بجالانا
بھکوین - بھیٹی - پرانی
جگ نستارن ہاری - دنیا کے دکھوں کو دور کرنیوالی
- دن رات
ڈیرے - ٹھکانا - گھر
پکیا - پک گیا
بیر - بھائی

لفظ - معنی
ڈھرے سنگ بندھے ہیں - ہمارے ساتھ دہری بیڑ یعنی جکڑے ہوئے ہیں
بسارے - بھول گئے - یعنی کدھر جا کر مجھے بھول گئے
بسارے - بھلا دیے
عابد لاگے - عابد کے پاس
کت - کہاں - کدھر
مور - میری
پراوے - دکھتی ہے
اسمت - بے چین
سنگل - زنجیر
مہروا - مہار
پت (بالفتح) عزت

لکھنؤ کے ماثر متبرکہ - روضے اور کربلائیں

از جناب شیخ تصدق حسین صاحب ایڈوکیٹ مرحوم

۱- کربلائے عظیم اللہ خاں

اس کربلا میں عظیم اللہ خاں مخاطب بہ اعظم الدولہ نے متصل کربلائے میر خدا بخش روضہ حضرت امام رضا علیہ السلام بعہد دولت محمد علی شاہ تعمیر کرایا تھا روضہ میں مسالہ سے دلکش گلکاری کی گئی ہے اور فرش میں مختلف رنگوں سے دیدہ زیب شطرنجی بنائی گئی ہے ایک مسجد روضے کے اندر ہے اور دوسری باہر جو مسجد گوہر شاد کی نقل بتائی جاتی ہے۔ عظیم اللہ خاں کو محمد علی شاہ نے دیوان عام کا داروغہ مقرر کرکے اعظم الدولہ کا خطاب بھی عطا کیا تھا۔ پانچ سال تک داروغہ عظیم اللہ خاں کا ستارۂ اقبال بہت آب وتاب سے چمکتا رہا اُس کے بعد ہمیشہ کے لئے غروب ہو گیا۔ مشہور ہے کہ مداریہ حقہ عظیم اللہ خاں کی ایجاد ہے جس کو عظیم اللہ خانی حقہ بھی کہتے ہیں قیصر باغ کے قریب ایک عالیشان دو منزلہ کوٹھی بھی عظیم اللہ خاں نے بنوائی تھی جس کو چار لاکھ روپئے میں واجد علی شاہ بہادر کے ہاتھ فروخت کر دیا اسی وجہ سے یہ کوٹھی "چولکھی کوٹھی" کے نام سے مشہور ہوئی۔ محمد علی شاہ نے عظیم اللہ خاں اور اُن کی دو بیویوں فضہ اور اماسن کے وثیقے بھی مقرر کئے تھے جو اُن کے ورثا کو اب تک مل رہے ہیں۔ ۱۷ اپریل ۱۸۴۹ء کو بزمانہ شہریاری واجد علی شاہ عظیم اللہ خاں مرگ مفاجات سے ملک عدم کو راہی ہوئے اور اپنے ہی تعمیر کردہ روضہ میں مدفون ہوئے۔

۲- کربلائے میر خدا بخش
۳- کربلائے حاجی مسیتا

یہ کربلا شہر کی آبادی سے دور موضع کری کنورہ میں واقع ہے

اس کربلا کو بزمانۂ فرمانروائے شاہ زمن غازی الدین حیدر میر خدا بخش نے ۱۲۳۳ھ میں تعمیر کرایا تھا۔ اس کے قبل دو اور کربلائیں میاں الماس علیخاں اور حاجی مسیتا اسی کربلا کے قریب بزمانہ حکومت نواب سعادت علیخاں بنوا چکے تھے اس طور پر یہ تیسری کربلا تھی جو سرزمین لکھنؤ پر تعمیر ہوئی۔

احاطہ کربلا میں داخلہ کے لئے تین بلند اور ہم وضع پھاٹک شکل ترپولیہ کے تعمیر ہیں۔ کربلا کے وسط میں حضرت امام حسین علیہ السلام کا روضہ ہے جس کے چاروں طرف نہایت وسیع مستطیل صحن ہے اور ہر طرف غلام گردش ہے۔ روضہ کے بالائی حصہ میں ایک سنہرا گنبد ہے جس کے آگے عراقی طرز کے دو گلدستے ہیں۔ روضے کے جانب جنوب بھی عراقی وضع کا ایک بلند مینار برائے اذان تعمیر ہے۔

روضے کے مغربی دروازے پر حسب ذیل تاریخ تعمیر

کندہ ہے :-

مقتل اطہر حسین شہید شدہ تاریخ ایں خجستہ بنا

ایک مرتبہ شاہ غازی الدین حیدر نے ۱۲۳۲ھ میں اپنے مدار المہام آغا میر مخاطب بہ معتمد الدولہ سے ناخوش ہوکر اُن کو خانہ نشین کر دیا اور ان کی جگہ پر نواب قمر الدین خاں، اور میاں آفریں علیخاں مقرر ہوئے۔ آخر الذکر کے کارکن ان کے شاگرد میر خدا بخش تھے ایک سال چند ماہ کے بعد بادشاہ کا ملال دور ہو گیا تو آغا میر پھر بحال کر دیئے گئے۔ آفریں علیخاں قمر الدین محاسبہ میں دھرے گئے۔ آفریں علیخاں کی ساری آفت ان کے کارندے میر خدا بخش پر آئی بہزار دقت ریذیڈنٹ کی سفارش سے ان کی گلو خلاصی ہوئی ۱۲۴۳ھ میں انتقال کیا اور اپنی ہی کربلا کی مشرقی رواق میں دفن ہوئے۔

زمانہ شاہی میں باشندگان لکھنؤ اپنی مرضی کے مطابق کل کربلاؤں میں اپنے تعزیئے لیجاتے تھے کسی کربلا کی قید نہ تھی مگر جب ہنگامہ غدر ۱۸۵۷ء کے بعد محرم کا زمانہ قریب آیا تو سرکار انگریزی نے اعلان کر دیا کہ کل تعزیئے صرف کربلائے میر خدا بخش میں جائیں سب کربلاؤں میں مناسب انتظام نہیں ہو سکتا۔ یہی امر اس کربلا کے بعد فروغ اور دوسری کربلاؤں کی بے رونقی کا باعث ہو گیا۔

۴۔ کربلائے ملکہ آفاق

شاہ نصیر الدین حیدر کی کربلا کے جانب غرب تھوڑی ہی دور پر سلاکتا گنج میں ملکہ آفاق کی شہرۂ آفاق کربلا ہے جس کے گنبدوں اور میناروں کی کلسیاں دور ہی سے جگمگاتی ہوئی نظر آتی ہیں اس کربلا کا دوسرا نام "خسکہ مین" بھی ہے۔

کربلا میں ایک امام باڑہ بھی ہے جس کی چھت پر دو بڑے گنبد ہیں۔ سب سے زیادہ قابل تذکرہ اس امام باڑہ کا فرش ہے جس میں نفیسی ساخت کے زرد، سرخ اور سبز مختلف وضع و قطع کے چینی چمکدار ٹکڑوں کو ملا کر شطرنجی کی وضع بنائی گئی ہے یہ ٹکڑے اپنی چمک رنگ اور خوشنمائی میں جاپان کے بنے ہوئے ٹکڑوں سے ٹکر کھاتے ہیں۔ امام باڑہ کے بائیں جانب دوسرے ملحقہ احاطہ میں ایک دوسری عمارت ہے جس میں حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام اور حضرت امام علی نقی علیہ السلام کے مزارات واقع سامرہ کی نقل بنائی گئی ہے اس روضہ کی گلکاری اور رنگ آمیزی قابل دید ہے اس کے بالائی حصہ میں ایک قبہ اور دو گلدستے ہیں جن کی سنہری کلسیاں نہایت ہی دلکش اور جاذب نظر ہیں۔

ملکہ آفاق نواب امام الدین خاں کی بیٹی تھیں جو نواب قمر الدین خاں وزیر اعظم محمد شاہ بادشاہ دہلی کے پوتے تھے۔

ملکہ آفاق محمد علی شاہ بادشاہ اودھ کو بزمانہ صاحبزادگی منسوب ہوئیں اُن کا نام جہاں آرا بیگم عرف چھوٹی بیگم تھا۔ ۸ رجولائی ۱۸۳۷ء کو جب اُن کے شوہر کے سر پر تاج شاہی رکھا گیا تو موصوفہ کو ملکہ آفاق مخدرۂ عظمیٰ ممتاز الزمانی نواب جہاں آرا بیگم کا خطاب عطا ہوا۔

یہ کربلا زمانہ حکومت محمد علی شاہ بادشاہ میں تعمیر ہوئی، ملکہ آفاق نے بتاریخ ۲۴ اکتوبر ۱۸۵۰ء اپنی جائے سکونت حسن باغ میں رحلت کی۔ زیر تعمیر روضہ انھیں کا تعمیر کردہ امامباڑہ ان کی دائمی آرام گاہ بنا۔

۵۔ کربلائے شاہ نصیر الدین حیدر

یہ کربلا محلہ ارادت نگر میں واقع ہے جس کے روضے کے بالائی حصے میں دو بڑے بڑے گول سر کے گنبد اور دو نامکمل مینار ہیں اس کا نام بانی کربلا نے "شبیہ کربلا" رکھا تھا، روضہ کے وسط میں دو درجے ہیں پہلے درجے میں ایک خوشنما چوبی ضریح رکھی ہے اور دوسرے میں بادشاہ کی قبر ہے۔ روضے کے صدر دروازے

کے بائیں جانب اُس غار یا نشیبی مقام کی نقل تعمیر کی گئی ہے جہاں پر شمر نے حضرت امام حسین علیہ السلام کا سر مبارک تن اطہر سے جدا کیا تھا۔

ابھی کربلا زیر تعمیر تھی کہ بتاریخ ۱۰ر اکتوبر ۱۸۳۷ء شاہ نصیر الدین حیدر کو اُن کے بدخواہوں نے زہر دیکر عالم بالا کو رخصت کر دیا۔ دوسرے روز اپنی ہی بنوائی ہوئی کربلا میں آغوش لحد میں سُلائے گئے۔ منور نے تاریخ وفات کہی:-

مرد اے وائے نصیر الدین حیدر بادشاہ
۱۲۵۳ھ

بادشاہ کی رحلت کے بعد پھر کسی کو توفیق نہ ہوئی جو عمارت کو مکمل کر کے آراستہ کر دیتا چنانچہ وہ اسی طرح بے رونق پڑی ہوئی ہے پہلے اُس کے اخراجات کی متحمل گورنمنٹ ہوتی تھی مگر جب سے شیعہ کالج کربلا کی اراضی پر تعمیر ہوا ہے اس وقت سے اُس کے مصارف کالج کے ذمہ ہو گئے ہیں۔

۶- کربلائے نواب سعید الدولہ

یہ کربلا نصیر الدین حیدر بادشاہ کے شاہی اسپتال کے سامنے محلہ حیدر گنج قدیم میں لب سڑک واقع ہے اس میں حضرت امام حسین علیہ السلام کا روضہ تعمیر ہے۔ روضہ کے اندرونی جانب دلفریب رنگ آمیزی ہے اور آیات قرآنی نہایت خوش خط تحریر ہیں بوجہ امتداد زمانہ غلام گردش کے کچھ حصے منہدم ہو گئے ہیں اور کچھ باقی ہیں۔ کربلا کی بقا و داشت کے لئے کوئی جائداد وقف نہیں ہے کربلا کے بانی نواب زکی علیخاں مخاطب بہ سعید الدولہ نواب ممتاز الدولہ کے بیٹے اور نواب ملکہ زمانیہ کے نواسے تھے اُن کی شادی پرنس مجھلی علیخاں مرزا خورم بخت کی بیٹی سے ہوئی تھی موصوف نے ۱۸۷۸ء میں انتقال کیا اور اپنی ہی کربلا میں مدفون ہوئے۔ اُن کی رحلت کی وجہ سے کربلا ناتمام رہ گئی۔

۷- کربلائے نواب معتمد الدولہ

یہ کربلا غازی الدین حیدر بادشاہ کے وزیر اعظم نواب معتمد الدولہ سید محمد خاں عرف آغا میر نے محلہ نزہی میں ۱۸۱۸ء میں تعمیر کرائی تھی جس میں موصوف نے حضرت موسیٰ کاظم علیہ السلام کے روضہ واقع عراق کی شبیہ بنوائی تھی روضہ کے چاروں گوشوں میں چار گلدستے ہیں اور بالائی حصہ میں تین گول قبے بنے ہیں دو آگے کی طرف اور ایک ان کی پشت پر۔ روضہ کے اندر صرف ایک درجہ تھا جو اب تک بدستور قائم ہے کربلا کا پھاٹک اور چہار دیواری معدوم ہو چکی ہے ایک مختصر سی مسجد بھی کربلا کے وسط میں تھی جو شکستہ حالت میں اب تک موجود ہے کربلا کے متعلق بارہ بیگہ دس بسوہ اراضی تھی جس میں تعزیئے دفن ہوتے تھے۔ انگریزوں نے اس کربلا کو ضبط کر کے اس میں اس کانشن میسن لاج ( ) قائم کیا تھا جس کو عوام جادو گھر کے نام سے تعبیر کرتے ہیں ابھی تک یہ کربلا موجودہ گورنمنٹ کے قبضہ میں ہے۔

۸- کربلائے نواب رفیق الدولہ

اس کربلا میں حضرت عباس علیہ السلام کا روضہ ہے جس کو سید امام علی رفیق الدولہ محلہ ٹھاکر گنج کے آگے کاکوری کے راستے میں تعمیر کرایا تھا روضہ کے اندرونی جانب رواق اور وسطی حصہ میں سفید پتی ہوئی دیواروں اور محرابدار چھتوں پر نہایت خوشنما گلدستے، قدرتی مناظر، جدولیں اور بیلیں مختلف رنگوں کے تال میل سے بنائی گئی ہیں جو دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ روضہ کے اوپر ایک خشتی گنبد ہے جس کے دونوں جانب دو منارے بنے ہوئے ہیں۔ اراضی جس پر یہ روضہ تعمیر ہوا ہے عطیہ شاہی تھی۔ بعد تعمیر روضہ یہ مقام "عباس باغ" کے نام سے مشہور ہو گیا۔

میر امام علی محمد علی شاہ بادشاہ کے قدیمی رفیق تھے جب وہ تخت سلطنت پر متمکن ہوئے تو امام علی کو رفیق الدولہ کا خطاب عنایت کیا۔ بادشاہ کا ہاتھ بوجہ کسی مرض یا ضعف پیری کے ازکار رفتہ تھا یہ کھانا بھی اپنے ہاتھ سے کھلاتے تھے اور شب کو داستان بھی سناتے تھے۔ اُن کا وثیقہ بھی بادشاہ نے مقرر کیا تھا۔ ۱۱ ربیع الثانی سنہ ۱۲۷۸ھ میں، رفیق الدولہ نے مرض اسہال سے انتقال کیا اور اپنے تعمیر کردہ روضے کی رواق میں دفن ہوئے قبر پر قطعہ تاریخ مندرجہ ذیل لگا ہوا ہے۔

چون یازدہم ز ربیع الثانی　　رفتہ زجہاں وائے رفیق الدولہ
تاریخ غم رحلت او کیوان گفت　　شد قصر جناں جائے رفیق الدولہ
۱۲۷۸ھ

۹۔ کربلائے بی مصری

یہ کربلا محلہ مصاحب گنج میں قریب برن خانہ واقع ہے بی مصری نواب آصف الدولہ کے زمانہ میں ایک مشہور صاحب فن تھیں۔ نواب آصف الدولہ اُن کے بڑے قدرداں تھے سفر وحضر میں حاضر باش رہتی تھیں۔ نواب موصوف نے ان کو تخمیناً بارہ بیگہ اراضی عطا کی تھی جس میں موصوفہ نے ایک مسجد اور سکونتی مکان بنوایا تھا۔ دونوں عمارتوں کے درمیان ایک معمولی سا امامباڑہ بنوایا تھا مسجد نہایت خوبصورت بنی ہوئی ہے مگر ظاہرہ نیامی سے آراستہ نہ ہو سکی تھی امام باڑہ کے باہر ایک درخت کے نیچے چھوٹی چھوٹی تربتیں بنی ہوئی ہیں بغیہ میں تعزیے اور میتیں بھی دفن ہوتی ہیں۔ بی مصری کے دو لڑکیاں بڑی ہم اور بی مصاحب نامی تھیں جو دو سیدوں کو بیاہی گئیں سید جالب مرحوم مدیر ہمت نے اخبار نو کورکی دوسری سنہ ۱۹۰۹ء کی اشاعت میں بہت تجسس و تحقیق کے بعد لکھا تھا کہ مصری کی بغیہ لکھنؤ کا بہت پرانا قبرستان ہے۔۔۔۔ یعنی مثنوی سحرالبیان کے جادو نگار مصنف میر حسن مرحوم یعنی میر انیس کے جد امجد اسی گورستان میں مدفون ہیں بعض معتبر لوگوں کی

زبانی یہ بھی سننے میں آیا کہ تاج الشعراء میر تقی میرؔ کا مرقد بھی اسی بغیہ میں تھا مگر اب کوئی یہ بتانے والا بھی نہ رہا کہ میر حسن کی قبر کون سی ہے اور میر تقی کا مزار کونسا ہے یا دونوں باکمالوں کے مرقد برقرار بھی ہیں یا دست برد زمانہ سے ناپید ہوگئے۔

۱۰۔ روضہ حضرت زینبؑ معروف بہ زینبیہ

یہ روضہ مہدی گنج میں واقع ہے اس میں داخلہ کے دو پھاٹک ہیں ایک مردانہ دوسرا زنانہ۔ اصل روضہ سادہ مگر شاندار ہے دالان در دالان سے متصل شہ نشین ہے جس کے کئی درجے کے سامنے کے رُخ دروازوں کی جوڑیاں لگادی گئی ہیں۔ شہ نشین میں حضرت زینبؑ کا مزار بنایا گیا ہے جس کے کٹہرہ پر سیاہ پوشش ہے اس مزار کے عقب میں حضرت فضہ کا مدفن بنا ہے برابر والے دوسرے درجہ میں جناب سکینہؑ دختر حضرت امام حسینؑ کا مرقد بنایا گیا ہے اس کے کٹہرہ پر بھی چاروں طرف سیاہ غلاف چڑھا ہوا ہے شہ نشین کے بالائی جانب ایک بڑا کرخی گنبد ہے۔ یہ روضہ سنہ ۱۲۹۶ھ میں تعمیر ہوا۔ تاریخ تعمیر یہ ہے۔ "روضۂ زینب مجیرِ ملال"۔ اس روضہ کو میر مددعلی عرف اچھے صاحب متخلص بہ تقیش نے تعمیر کرایا تھا اصلی روضہ شام میں واقع ہے۔ میر مددعلی شہزادہ سلیمان قدر کے مختار اور لکھنؤ کے نامور مرثیہ گو جناب مودب کے نانا تھے انھوں نے سنہ ۱۸۹۳ء میں انتقال کیا اور اپنے ہی تعمیر کردہ روضے میں مدفون ہوئے۔

اس روضہ میں ہر سال دو دلیے ہوتے ہیں جن میں فرقہ امامیہ کی مستورات شریک ہوتی ہیں پہلا دلیہ دسویں صفر کو حضرت سکینہؑ کا ہوتا ہے اور دوسرا ۷ جمادی الثانی کو حضرت زینبؑ کا جس میں شیعہ خواتین کثیر تعداد میں شریک ہوتی ہیں۔

۱۱۔ کربلائے منشی فضل حسین

یہ کربلا وکٹوریہ اسٹریٹ پر شاہ نصیر الدین حیدر کے

شاہی اسپتال سے تھوڑے فاصلے پر کربلائے تال کٹورہ جاتے ہوئے سڑک کے داہنی جانب ملتی ہے۔ اس میں صاحبزادگان حضرت مسلم کے روضہ کی نقل بنائی گئی ہے مشہور ہے کہ یہ عمارت اصل روضہ واقع مسیب عراق عرب سے بہت مشابہ ہے اس میں دو حجرے پہلو بہ پہلو واقع ہیں جن کے اوپر دو قبے پاس پاس بنے ہوئے ہیں۔ چہار دیواری کے اندر تعزیئے دفن ہوتے ہیں اور ایک مسجد بھی ہے۔ یہ روضہ منشی تفضل حسین نے ۱۲۹۶ھ / ۱۸۷۷ میں تعمیر کرایا تھا۔ تاریخ تعمیر درج ذیل ہے:-

مقام دلکش از تفضل حسین ست ؛ رہ ہر سوختہ را یادِ مسلم
نوشتم سال تاریخ بنائش ؛ بود ایں روضۂ اولادِ مسلم

منشی تفضل حسین عہد دولت سلطان عالم واجد علی شاہ دفتر بخشی گری میں منشیوں میں ملازم تھے بعد انتزاع نواب محسن الدولہ کے یہاں کارپرداز رہے پھر بعد ہنگامۂ غدر ۱۸۵۷ء حسین آباد ٹرسٹ میں کسی اعلیٰ منصب پر فائز رہے سکونتی مکان وکٹوریہ اسٹریٹ پر تھا موصوف نے ۱۳۱۱ھ / ۱۸۹۱ میں انتقال کیا اور اپنے ہی بنا کردہ روضہ میں موت کی میٹھی نیند سو رہے ہیں۔

۱۴۔ کربلا مصاحب الدولہ

یہ کربلا مصری کی بغیہ میں مصاحب گنج کے قریب واقع ہے۔ اس میں مصاحب الدولہ نے حضرت عباس علیہ السلام کا روضہ تعمیر کرایا تھا۔ جو درگاہ حضرت عباسؑ واقع رستم نگر کی مشہور عمارت سے بہت مشابہ ہے روضہ کی شہ نشین پر ایک نہایت کہنہ مگر خوشنما ضریح سنگ مرمر کی رکھی ہوئی ہے روضہ کے اوپر ایک بڑا خشتی گنبد ہے جس کے بالائی حصے میں سنہری کلسی لگی ہوئی ہے چھجو خاں (انیس الدولہ) اور گھسیٹے خاں (مصاحب الدولہ) دو سگے بھائی دہلی کے باشندے تھے بعہد دولت بادشاہ امجد علی شاہ دونوں بھائی سلطان عالم کے ملازم ہو کر بخطاب مصاحبان خورد سر بلند ہوئے ۱۸۴۷ء میں جب سلطان عالم صاحب صاحب تاج و تخت ہوئے تو گھسیٹے خاں کو خطاب مصاحب الدولہ اور خدمت عرض بیگی عطا ہوئی۔ ۱۸۵۶ء میں جب سلطان عالم بعد ضبطی سلطنت کلکتہ تشریف لے گئے تو مصاحب الدولہ بھی ان کے ہمرکاب تھے۔

۱۸۸۷ء میں جب سلطان عالم اس جہان فانی سے رخصت ہو گئے تو مصاحب الدولہ بھی لکھنؤ چلے آئے اور یہاں بڑے ٹھاٹھ سے رئیسانہ زندگی بسر کرتے رہے اپنے نام پر محلہ "مصاحب گنج" انھیں نے آباد کیا تھا۔ موصوف نے تخمیناً ۱۸۹۲ء میں انتقال کیا اور اپنی مسجد کے سامنے والی اراضی میں مدفون ہوئے۔

۱۳۔ کربلائے نواب عظمت الدولہ

یہ کربلا منصور نگر کے قریب محلہ مہدی گنج میں واقع ہے۔ اس میں صرف ایک عالیشان امام باڑہ بنا ہے جس میں عریض و طویل شہ نشین اور دالان کے علاوہ بغلی درجے بھی تعمیر ہیں امام باڑہ کے سامنے وسیع صحن میں تعزیئے دفن ہوتے ہیں احاطہ کے اندر ایک مسجد بھی کسی خانم صاحبہ کی تعمیر کردہ موجود ہے جس کی تاریخ تعمیر "منزل دین" ہے۔ جنتہ کا قدیم تعزیہ الکیسویں صفر کو اور فقیر کا تعزیہ ۲۲ رجب کو [illegible] کربلا میں دفن ہوتا ہے اس کربلا کو ابتداءً جناب سید محمد باقر صاحب منصف الدولہ نے تعمیر کرایا تھا آپ جناب مولوی سید محمد صاحب سلطان العلماء کے نور نظر اور غفران مآب جناب مولوی سید دلدار علی صاحب نصیرآبادی کے پوتے تھے۔

یہ کربلا بعد میں کسی صورت سے نواب عظمت الدولہ کے قبضہ میں آ گئی عظمت الدولہ منتظم الملک سید محمد رضا خاں انتظام جنگ معجز الدولہ مرزا ابوالقاسم خاں جنرل فوج کے بیٹے تھے جن کو شاہ غازی الدین حیدر کی بیٹی

نواب زہرہ بیگم منسوب تھیں۔ عظمت الدولہ کی شادی بھی آخری تاجدار اودھ کی بیٹی سپہر آرا اکبری بیگم سے ہوئی تھی۔ بعد طوفان غدر ۱۸۵۷ء جب انگریزوں کی دوبارہ عملداری ہوئی تو کپتان کا رنگی نواب عظمت الدولہ کی کئی لاکھ روپیہ کی مالیت کا کل ساز و سامان لے کر چلے گئے موصوف اس وقت صرف لنگی باندھے بیٹھے تھے۔ دشمنوں نے پہننے کے کپڑے تک نہ چھوڑے جب نواب نے اپنا گھوڑا ہزار روپیہ کو فروخت کیا تو کپڑے نصیب ہوئے نواب نے سرکار سے برابر مراسلت کی مگر کچھ سماعت نہ ہوئی۔

۱۴۔ کربلائے دیانت الدولہ

یہ کربلا محمد حسین خواجہ سرا

مخاطب بہ دیانت الدولہ نے بزمانہ شہریاری واجد علی شاہ مرحوم ۱۲۶۸ھ مطابق ۱۸۵۲ء میں محلہ منصور نگر میں تعمیر کرائی تھی۔ اس روضہ میں حضرت امام حسینؑ کے مزار پرُ انوار کا شبیہ بنا ہے کل روضہ میں سنگ مرمر کا نفیس فرش ہے اور دیواروں وغیرہ پر جا بجا مرمر کے مانند دلکش اور خوشنما جال بنا کر اس کے خانوں میں نال میل کے رنگوں سے دیدہ زیب اور دلفریب پھول بنائے گئے ہیں دوسرے مقامات پر بھی حسب موقع نہایت جاذب نظر گلکاری کی گئی ہے۔

روضہ کی چھت پر ایک خوبصورت اور عالیشان سنہرا گنبد ہے جس کے اوپر نہایت خوبصورت کلس لگا ہے اس گنبد کی پشت پر ایک دوسرا خشتی گول گنبد بھی ہے اور دروکار کی چھت کے دونوں گوشوں پر دو خشتی گلدستے ہیں۔ اُن کا بالائی حصہ بھی سنہرا اور نہایت خوشنما ہے۔ تاریخ تعمیر ہے:—

کربلا مقتل حسین شہید

دیانت الدولہ کا لا قوم کے زنگی نثراد خواجہ سرا تھے ۱۲۶۸

اور بزمانہ ولیعہدی واجد علی شاہ کے ملازم ہو گئے تھے۔ انھوں نے اپنی خدمات کی وجہ سے اپنے آقائے نامدار کے دل میں گھر کر لیا تھا جس کی وجہ سے انھوں نے اُن کو محمد معتمد علیخاں کا خطاب عطا کیا پھر تخت نشین ہو کر انھیں "دیانت الدولہ معتمد الملک محمد معتمد علیخاں بہادر امانت جنگ" خطاب دے کر سرفراز فرمایا۔ بعد انتزاع سلطنت دیانت الدولہ بادشاہ کے ہمرکاب کلکتہ بھی گئے۔ وہاں سے زیارت عتبات عالیات کو گئے۔ زیارت سے فراغت کرنے کے بعد پھر کلکتہ واپس آ کر بادشاہ کی خدمت ملازمت ہوئے مگر ۱۸۶۹ء میں پیمانہ عمر چھلک گیا لاش ریل پر لکھنؤ آئی اپنی کربلا کے روضہ میں جانب مغرب مدفون ہوئے۔

اُن کے وصی میاں داراب خواجہ سرا تھے جو ملکۂ عہد کے یہاں نواب ناظر تھے۔ کربلا انھیں کے اختیار میں تھی ہر مہینے کی پانچویں کو مجلس عزا پابندی سے برپا ہوتی تھی میر انیسؔ کے بیٹے میر خورشید علی نفیس رونق افروز منبر ہوتے تھے۔ جو مجلس اُمنائی (BOARD OF TRUSTEES) میاں داراب کے امام باڑہ واقع کچا احاطہ فقیر محمد خاں کا انتظام و نگرانی کرتی ہے وہی کربلائے دیانت الدولہ کا بھی انتظام و انصرام کرتی ہے اور میاں داراب کے علاقہ کی آمدنی سے چودہ سو روپے سال برائے مصارف کربلائے دیانت الدولہ بھی دیے جاتے ہیں۔

۱۵۔ شاہ نجف لکھنؤ

یہ روضہ سکندر باغ کی بغل میں ۱۲۳۳ھ میں

شاہ غازی الدین حیدر نے بنوایا تھا جو شاہ نجف کے نام سے مشہور ہے اصل روضہ بمقام نجف اشرف حضرت علی مرتضیٰ علیہ السلام کے مزار پرُانوار پر تعمیر ہے لکھنؤ کا یہ روضہ اسی اصل روضہ کی نقل ہے۔ روضہ کے چاروں طرف غلام گردش ہے اور بالائی حصہ میں ایک بڑے قد کا

خوبصورت گنبد ہے جس پر سنہرا کلس لگا ہوا ہے۔ تاریخ تعمیر شاہ نجف یہ ہے:۔

بااین عقیدت نجف اشرف بنا ٭ فرمود بنا بعہد نواب وزیر
تاریخ مبارکش چو جستم از عقل ٭ ہاتف گفتا عجب نجف شد تعمیر
۱۲۳۲ھ

زمانہ شاہی میں روضہ کے وسط میں نہایت خوشنما سبز بلوری تعزیہ رکھا تھا جو انگلستان سے ڈھل کر آیا تھا۔ اس پر نہایت خوشنما اور دلکش سنہرا مینا کیا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ بعض دوسرے تعزیے ہاتھی دانت۔ آبنوس۔ صندل۔ نقرئی۔ گنگا جمنی یا کسی دوسری شے کے بنے ہوئے تھے۔ اس روضہ میں شاہ غازی الدین حیدر کے علاوہ ان کی تین بیویاں مبارک محل۔ ممتاز محل۔ سرفراز محل بھی زیر خاک موت کی میٹھی نیند سو رہی ہیں۔

شاہ غازی الدین حیدر نے ۱۲۴۳ھ میں وفات پائی۔ تاریخ ذیل اُن کے مدفن پر لگی ہوئی ہے۔

چوں رفت شہ زمن ز دنیا ٭ ماتم ز دل خاص و عام گرفت
از روئے بکاہ و آہ گفتم ٭ حیدر بہ نجف مقام گرفت
۱۲۴۳ھ

۱۶۔ کاظمین

اس کربلا میں ساتویں امام حضرت موسیٰ کاظم علیہ السلام اور نویں امام حضرت امام محمد تقی علیہ السلام یعنی دادا پوتے کے مزارات واقع بغداد کی نقل محمد رضا خاں نو مسلم نے محلہ منصور نگر میں تعمیر کرائی۔ یہ عمارت بہت شاندار منظر پیش کرتی ہے جس کے بالائی حصے پر دو بڑے بڑے گول مونڈھے بنا کر دونوں پر شلجم نما قبے تعمیر کرکے ان پر خوشنما کلسیاں لگائی گئی ہیں دونوں مونڈھوں اور قبوں پر سونا چڑھا ہوا ہے جس میں طلائی کام کی ایسی چھائی دکھائی گئی ہے جب آفتاب کی شعاعیں ان قبوں پر پڑتی ہیں تو اُن کی جگمگاہٹ سے آنکھوں میں خیرگی پیدا ہوتی ہے۔ اس کی گلکاری اور رنگ آمیزی بھی قابل دید ہے۔

محمد رضا خاں عہد امجد علی شاہ میں گزرے ہیں انھیں شرف الدولہ خطاب ملا تھا۔ انتظام علاقہ حضور تحصیل ان کے سپرد ہوا اس کے علاوہ اور بھی چند نفع بخش سرکاری کام ان سے متعلق رہے۔

۱۲۶۹ھ میں روضہ کاظمین بنوایا اور ۲۷ جمادی الاول ۱۲۷۰ھ کو اس جہان فانی سے سدھار گئے۔

۱۷۔ کربلائے ملکہ جہاں

اس کربلا کو ابتداءً داروغہ عاشق علیخاں پیشدست داروغہ ایوان عام عظیم اللہ خاں نے بمقام عیش باغ بعہد دولت شاہ محمد علی شاہ تعمیر کرایا تھا جس میں حضرت امام حسین علیہ السلام کا روضہ تعمیر ہے مابعد نواب ملکہ جہاں نے داروغہ صاحب کو معاوضہ دے کر کربلا حاصل کرلی اور اس میں ایک دوسرا روضہ حضرت عباس علیہ السلام کا بھی تعمیر کرایا اس کی مسجد میں خط ثلث کے کتبے بہترین قسم کے ہیں ملکہ جہاں محمد علی شاہ کی چہیتی بیوی تھیں ان کا نام حسینی خانم تھا سلطنت اور حکومت بادشاہ نے بر موصوف نے بمقابلہ خاص محل نواب ملکہ آفاق اُن کو نواب ملکہ جہاں کا خطاب دیا تھا موصوفہ بہت سلیقہ مند تھیں خط نسخ خوب تحریر کرتی تھیں بادشاہ نے معتمد الدولہ آغا میر کی کل ضبط شدہ املاک واقع دولت پورہ (متصل سٹی اسٹیشن) مع وزیر باغ و بلند باغ ان کو عطا کر دی تھی۔ مجالس عزا موصوفہ نے بہت حوصلہ مندی سے منعقد کیں انھیں بیگم سے بادشاہ کے ایک بیٹے ہمایوں بخت مرزا احمد علیخاں تھے جن کی شادی نواب نور بیگ خاں رئیس مدراس کی بیٹی سے ہوئی تھی جن کو سسرال سے خاقان کا خطاب عطا ہوا تھا۔ اُن کی محل سرا موسومہ "خاقان منزل" محلہ وزیر گنج میں اب تک موجود ہے۔ ملکہ جہاں نے ۹ جولائی ۱۸۸۱ء کو انتقال کیا لاش کربلائے معلیٰ روانہ کی گئی۔

۱۸۔ درگاہ حضرت عباسؑ

یہ درگاہ شہر لکھنؤ کی قدیم ترین اور نہایت مقبول زیارت گاہ ہے جو محلہ رستم نگر میں واقع ہے۔ اس کی وضع قطع امام باڑہ کی ایسی ہے جو حضرت عباس علیہ السلام

سے منسوب ہے خاص روضہ درگاہ کے اوپر ایک نہایت خوشنما اور شاندار کرخی سنہرا گنبد ہے جس کی کلسی پر ایک جالدار اور دیدہ زیب علم لگا ہوا ہے۔

اس زیارت گاہ کے بانی مبانی ایک شخص مرزا نقیر بیگ تھے جنھوں نے اس کو بزمانہ حکومت نواب آصف الدولہ تعمیر کرایا تھا مگر اس وقت تک عمارت خام تھی مابعد نواب آصف الدولہ نے اس کے اوپر ایک خشتی گنبد تعمیر کرادیا تھا۔

نواب سعادت علیخاں کے زمانہ میں اس درگاہ کی بہت ترقی ہوئی انھوں نے گنبد خشتی کو طلائی کیا درگاہ وسیع کرائی اور اس کے دو دروازے مرزا نے اور زنانے قرار دیئے بعد تعمیر نواب سعادت علیخاں اس زیارت گاہ کا نام حضرت عباس مشہور ہوا۔ مرزا محمد حسن قتیل نے قبہ کا مادہ تاریخ کہا۔

ع این گنبد جدید بنائے سعادت است
۱۲۱۴

اس درگاہ میں زیادہ تر حاضری چڑھائی جاتی ہے جس میں پہلے شیرمال۔ کباب۔ ادرک کی ہوائی۔ پنیر کے ٹکڑے۔ مولی کی قاشیں۔ پیاز کا لچھا اور پودینہ ہوتا ہے مگر اب شیرمال کے علاوہ دوسری چیزوں میں بہت کمی واقع ہوگئی ہے پنیر تو بالکل نایاب ہوگیا ہے۔

نواب سعادت خاں کے بعد سے یہ دستور ہوگیا تھا کہ جو نیا بادشاہ تخت نشین ہوتا وہ اس آستانہ پرشاندار شاہی جلوس کے ساتھ نذر حاضر ہوتا۔ جب سلطان عالم واجدعلی شاہ کلکتہ جانے لگے تو اپنا تاج اور تلوار درگاہ میں چڑھا گئے۔

۱۹۔ شبیہ روضۂ فاطمین واقع رستم نگر

یہ روضۂ مبارک

ابتدائے عہد واجدعلی شاہ میں ایک مسماۃ مومنہ جواہر خانم عرف جواہر نامی نے تعمیر کرایا جب وہ پریشان حالی کے لحاظ اور شاید بیوہ ہوگئیں۔ تو انھوں نے اس روضہ کے ساتھ ساتھ اس کی متعلقہ اراضی کا بیع نامہ ایک خطیر رقم لیکر نواب سلطان بیگم صاحبہ بنت شاہ اودھ نواب محمد علی شاہ کے نام کردیا۔ بیگم صاحبہ نے کچھ عرصہ بعد اس کو اپنے فرزند نواب صادق علیخاں صاحب کے نام کردیا اور بیگم صاحبہ کے شوہر نواب معظم الدولہ باقر علیخاں ابن نواب کمال الدین حیدر خاں ابن نواب شجاع الدولہ بہادر نے اس میں اور اراضی خرید کر شامل کی آپ کے بعد نواب صادق علیخاں صاحب نے روضے کے برابر ایک پختہ وسیع کمرہ تعمیر کرایا اور اس میں مومنین دفن ہونے لگے آپ کی جانب سے جناب حکیم چھوٹے صاحب موسوم بہ حکیم لسوڑا اس روضے کے منتظم و نگراں معین ہوئے اور تاحین حیات نگراں رہے اس روضہ کے پائین ایک تہ خانہ تھا جس میں متعلقہ سامان رکھا جاتا تھا ہر نوچندی جمعرات کو نہایت اہتمام سے مجلس ہوتی تھی روضہ کی چہار دیواری کے باہر پھاٹک کے برابر ایک وسیع دالان اور کمرہ تھا جس میں سبیل تھی کمرہ میں سبیل کا سامان رکھا جاتا تھا ساتویں محرم کو سبیل پر شربت ہوتا تھا اب اس کا کوئی پتہ نہیں صرف نشان باقی رہا۔

نواب صادق علیخاں صاحب کے انتقال کے بعد اُن کے تین فرزند نواب حسین علیخاں صاحب و نواب اصغر علیخاں صاحب و نواب زین العابدین خاں صاحب اس کے مالک و متولی ہوئے جو اب بھی ماشاءاللہ موجود ہیں اور اپنے موروثی مکان عقب مدرستہ الواعظین واقع کیننگ اسٹریٹ لکھنؤ میں فروکش ہیں۔

۲۰۔ شبیہ روضہ نجف اشرف واقع رستم نگر لکھنؤ

حسن مرزا صاحب لکھنوی تاجر تھے انھوں نے دوران سفر کلکتہ میں خواب دیکھا کہ میں تابوت جناب امیر اٹھائے ہوں اور تابوت کی ساخت اس وضع کی ہے جب وہ ۱۲۹۲ھ میں لکھنؤ آئے اور اپنے ہاتھ سے تابوت بنا کر شب نوزدہم ماہ صیام یعنی شب ضربت اپنے قرابت دار میر محمد شاہ صاحب کے مکان واقع رستم نگر میں (اسی مقام پر جہاں اب نجف اشرف ہے) تابوت رکھا اور

شب بست وکیم اٹھایا۔ اب اس کو شرت کی برکت کہئے یا فیض امام سے مقبولیت کہ ابتدا ہی سے کثیر مجمع ہونے لگا کچھ عرصہ بعد تو محلے کے مکان مستورات سے اور میدان اور سڑکیں مردوں سے مملو نظر آنے لگیں جب یہ مکان ناکافی ہوا تو محلے کے بڑے مکانوں سے تابوت اٹھایا جانے لگا۔ حسن مرزا صاحب کی کوئی اولاد نرینہ نہ تھی دو بیٹیاں تھیں جن کے شوہر برابر شریک و سہیم رہا کرتے تھے حسن مرزا صاحب کے انتقال کے بعد اُن کے بڑے خویش حاجی افضل حسین صاحب تاجر کارخانہ دار تاجر اور رہائش اصغر آباد کے کارپردازان خاص سے تھے اُسی طرح تابوت اٹھاتے رہے اسی کے ساتھ ساتھ حاجی صاحب نے پہلے وہ مکان خرید جس سے تابوت کی ابتدا ہوئی تھی رفتہ رفتہ نجف اشرف کا نقشہ بنوا کر انتظام کرتے رہے بالآخر ۱۳۳۲ھ میں مرحوم نے ایک اجتماع کثیر کیا جس میں تمام مجتہدین کرام بھی شریک تھے سرکار ناصر الملت اعلی اللہ مقامہ نے اپنے دست حق پرست سے سنگ بنیاد رکھا اُسی سال قبہ تعمیر ہوا جس میں مداح آل پیمبر جناب مرزا کاظم حسین صاحب محشر کا تصنیف کردہ قطعہ تاریخ نصب ہے۔

فروغ گنبد عالیست ہمچو ماہ تمام ✽ طواف مہر کند از نہار تا سر شام

بگوش اہل ثواب آید ایں ندا از غیب ✽ شد ایں بنائے مقدس بہ خنیا بہ عام

بہ آستان مبارک بیا و بوسہ بزن ✽ کہ سجدہ گاہ جہان است خوابگاہ امام

بئے وضو بطلب آب کوثر و تسنیم ✽ کہ تا قبول شود پیش بار

برائے سال بنائش رقم کن اے محشر

شبیہ تربت شاہ نجف امام انام

بعدہٗ تعمیر سب رکی تکمیل دو سال بعد . . . . .

میں ہوئی اب اس روضۂ مبارک کے متولی حسن مرزا صاحب مرحوم کے نبیرگان خادم حسین صاحب اور ناصر حسین صاحب ہیں جو اپنے اسلاف کے قدم بقدم چل رہے ہیں۔

۱۲۱۔ کربلا نواب امین الدولہ

لکھنؤ میں حضرت عباس علیہ السلام کے ۵ روضے ہیں، سب سے پہلے مرزا فقیر بیگ نے بزمانہ نواب آصف الدولہ محلہ رستم نگر میں درگاہ حضرت عباس کی بنا ڈالی، دوسرا روضہ عیش باغ میں بعہد دولت محمد علی شاہ مرحوم داروغہ عاشق علی خاں نے بنوایا جس کو بعد میں نواب ملکہ جہاں نے معاوضہ دے کر حاصل کر لیا۔ تیسرا روضہ اُسی زمانے میں میر امام علی رفیق الدولہ نے بمقام عباس باغ کاکوری کے راستے میں تعمیر کرایا۔ چوتھا نواب امداد حسین خاں امین الدولہ نے دریا گنج میں، پانچواں گھسیٹے خاں مصاحب الدولہ نے مصری کی بغیہ میں بزمانہ شہریاری جانِ عالم واجد علی شاہ بنوایا۔

نواب امداد حسین خاں امجد علی شاہ مرحوم کے وزیر اعظم تھے، ان کے تعمیر کردہ روضے کی محرابوں میں آیات قرآنی نہایت نستعلیق خط میں مسالہ سے تحریر ہیں اور اس کی صنعت اور رنگ آمیزی نہایت نفیس اور دلکش ہے، فرش میں رنگین چوکے بنائے گئے ہیں روضے کے اوپر روغنی گنبد اور دو منارے ہیں یہ کربلا دو برس میں واجد علی شاہ مرحوم کی تخت نشینی کے تیسرے سال بن کر تیار ہو گئی، تاریخ تعمیر حسب ذیل ہے:-

کرد تاریخ چو نواب امین الدولہ ✽ مرقد پاک علمدار شہ عرش مقام

برق تاریخ رقم کرد بامداد حسینؑ ✽ شد بنا مشہد عباس علمدار حسینؑ

۱۲۶۶ھ

۱۲۸۵ھ میں نواب امین الدولہ نے مرض فالج میں مبتلا ہو کر انتقال کیا اور اپنے ہی تعمیر کردہ روضے میں سپرد خاک کئے گئے۔ اب اس کربلا کے منتظم نواب محمد رضا صاحب عرف منجھے نواب صاحب ہیں جو اس کی بقا و ترقی میں کافی کوشاں رہتے ہیں۔

نواب آصف الدولہ اور عزاداری

جناب تصدق حسین صاحب صابی، بی، اے، ایل، ایل، بی لکھنؤ (مرحوم حنفی)

پونے دو صدی قبل یعنی ۱۷۷۵ء سے پہلے لکھنؤ کی حیثیت ایک قصبہ کی ایسی تھی۔ یہ ہلال ابھی بدر کامل نہ ہوا تھا اس کی مختصر سی آبادی ٹیلہ حضرت پیر محمد شاہ سے لے کر مہدیوں تک متفرق طور پر پھیلی ہوئی تھی۔ تہذیب و تمدن کی لہریں پورے طور پر ابھی یہاں تک نہیں پہونچی تھیں۔ دو چار اکابر ملت اور بزرگان دین کے یہاں مزارات تھے یا فرنگی محل کا مدرسہ نظامیہ تھا جس نے بعہد حکومت شہنشاہ عالمگیر اورنگ زیب جنم لیا تھا اور اسی سرچشمۂ علم و فضل سے سب فرنگی محل سیراب ہو رہے تھے۔

۱۷۷۵ء میں نواب شجاع الدولہ کے نور نظر نواب آصف الدولہ مرزا یحییٰ علی خاں عرف مرزا امانی اپنی والدہ محترمہ امۃ الزہرا بیگم مخاطب بہ نواب بہو بیگم صاحبہ سے بہ وجوہ کشیدہ خاطر ہو کر فیض آباد سے لکھنؤ چلے آئے اور اسی مقام کو دارالحکومت قرار دے دیا نواب کے دم قدم سے لکھنؤ کے لئے رونق چمن میں ایک تازہ بہار آ گئی موصوف نے اس میں بارونق مواضعات شامل کر کے بڑی بڑی عالی شان و فلک بوس محل سرائیں اور کوٹھیاں بنوائیں اور بہت سے دلکش اور نزہت بخش باغات سے بھی اس کو زیب و زینت دی اور پچیس لاکھ روپیہ سالانہ تعمیرات صرف کرتے رہے

اس طور پر لکھنؤ کو شہر کا مرتبہ بخشنے اور اس کو دلہن کی طرح آراستہ کرنے کا سہرا نواب آصف الدولہ کے سر ہے چنانچہ موصوف نے اپنی زر پاشیوں اور کاوشوں سے اس غنچے سے پودے کو صرف بائیس برس کی آبیاری سے ایک چھتنار درخت بنا دیا جس کے زیر سایہ بڑے بڑے علماء و فضلاء و کاملین فن۔ نامی گرامی شعراء اور مشہور و معروف ارباب پناہ لیتے گئے اور شہر لکھنؤ ہندوستان کا پیرس اور فخر اصفہان ہو گیا۔

لکھنؤ میں تعزیہ داری کا عروج بھی انھیں کی ذات سے ہوا۔ چنانچہ جس دوکان پر سر بازار تعزیہ ملاحظہ کرتے تو ادھر سے پاپیادہ نکلتے اور کم سے کم پانچ روپیہ اور زیادہ سے زیادہ ہزار روپئے بطور نذر چڑھاتے اور کئی لاکھ روپئے ہر سال محرم میں صرف کرتے تھے۔

۱۷۸۴ء میں لکھنؤ میں قیامت خیز قحط پڑا جب کہ آدمی کو آدمی کھائے جاتا تھا اور قحط زدہ لوگ اولاد جیسی پیاری اور محبوب چیز کو فروخت کر کے اپنا پیٹ پال رہے تھے جب رحم دل اور بلند حوصلہ نواب کو رعایا کی تباہی و بربادی کا المناک نقشہ دکھایا گیا تو انھوں نے خزانے کا منھ کھول دیا اور امامباڑہ کی بطور امدادی کام کے احاطہ مچھی بھون میں داغ بیل ڈالدی مگر سیر چشم اور دریا دل نواب نے اس خیال سے کہ یہ امامباڑہ بہترین قسم کی

عمارت ہوا اور اب تک جو امام باڑے تعمیر ہو چکے ہیں ان
سب سے اعلیٰ و افضل ہو بہت سے نقشے مختلف معماروں
سے تیار کرائے مگر کفایت اللہ دہلوی کا نقشہ سب
سے زیادہ پسند خاطر ہوا اور اسی کے موافق عمارت
تعمیر ہوئی تھی۔ تنگ دست اور مفلوک الحال شرفاء
جو زمانہ کے ہاتھوں پامال ہو رہے تھے مگر آبرو کے
رکھ رکھاؤ کے خیال سے مزدوروں کے ساتھ کام کرنا
اپنی کسرِ شان اور ہتک عزت خیال کرتے تھے وہ
شب کی تاریکی میں آکر مشعلوں کی روشنی میں معمولی سا
کام کر جاتے تھے اور پاس شرافت سے ان کو معاوضہ
میں پورے دن کی اُجرت بغیر نام پکارے دے دی
جاتی تھی اور ان کی توہین و تذلیل نہیں ہونے پاتی تھی
سات برس کے بعد بقول مرزا ابو طالب مصنف تفضیح الغافلین
و معاصر نواب آصف الدولہ یہ مایۂ ناز شہرۂ آفاق
امامباڑہ بن کر تیار ہوا۔ مرزا کمال الدین حیدر مصنف
قیصر التواریخ راوی ہیں کہ اس عمارت میں پچاس لاکھ
روپیہ کی لاگت آئی اور تقریباً اسی قدر رقم اس کی
تزئین و آرائستگی میں صرف ہوئی۔

امامباڑہ تیار ہونے پر اس کے وسطی ہال میں
تعزیہ داری ہونے لگی یہ ہال بقول مسٹر نیول NEWILL
اور گزیٹیر ۱۶۳ فٹ لمبا ۵۳ فٹ چوڑا اور ۴۹ فٹ
بلند ہے جو اینٹ اور چونے کی صناعی کا بہترین نمونہ
ہی نہیں پیش کرتا ہے بلکہ اس کا شمار دنیا کے اعلیٰ ترین
دالانوں میں ہے جس کی چھت بغیر لکڑی یا لوہے کی
مدد کے محراب دار بنائی گئی ہے۔

مرزا ابو طالب کے بیان کے مطابق وسطی ہال کی
لمبائی ۶۰ گز اور چوڑائی ۲۰ گز ہے امام باڑہ کے آگے
ایک وسیع چبوترہ تھا جس کے وسط میں ایک حوض بھی
بنایا تھا مگر اب کوئی حوض چبوترہ پر موجود نہیں ہے۔

امام باڑہ کے حدود میں ایک ضعیفہ کا مکان بھی آگیا تھا جس کی
وجہ سے عمارت کانی رہی جاتی تھی مگر بڑھیا اپنی بات
پر اڑی ہوئی تھی اور مکان دینے پر کسی طرح راضی نہ ہوتی
تھی بالآخر وہ اس شرط پر رضامند ہوئی کہ مکان کے
عوض اس کو دوسرا مکان بنوا دیا جائے اور امام باڑہ
میں اس کے نام کا تعزیہ بھی ہر سال رکھا جائے نواب نے
اس کی دونوں شرطیں منظور کر لیں اور جب امام باڑہ میں
تعزیہ داری شروع ہوئی تو محرم کے نو دن سے پہلے
نواب نے بڑھیا کے نام کا تعزیہ بھی مغربی جانب کی صحنچی میں
زندگی بھر خود رکھا اور اب تک اس مقام پر بدستور
سابق رکھا جاتا ہے۔

امام باڑہ کی آراستگی اور سجاوٹ کے متعلق مرزا
ابو طالب لکھتے ہیں۔ امام باڑہ کی تکمیل کے بعد سے نواب
آصف الدولہ چار پانچ لاکھ روپئے سالانہ اس کی آرائش
و زیبائش پر صرف کرتے تھے۔ انھوں نے سینکڑوں چھوٹے
بڑے تعزیئے چاندی سونے کے بنوائے تھے اور شیشے
آلات کی مد میں سفید و رنگین کنول دیوار اور طاق کنول جھاڑ
اور فانوس مردنگیں جو خریدی جاتی تھیں وہ حد و حساب سے
باہر تھیں۔ امام باڑے کے کل بڑے بڑے دالانوں کی چھتیں
اور فرش شیشہ آلات سے پٹے پڑے تھے اسی لئے زیارت
کرنے والوں کے لئے اندر بالکل گنجائش نہ رہتی تھی اور زائرین
کھلے ہوئے چبوترے پر بیٹھ کر دور سے زیارت کرتے تھے
اس قدر ساز و سامان موجود ہوتے ہوئے بھی نواب کو سیری
نہ ہوئی اور جب ڈاکٹر بلین
ولایت جانے لگے تو نواب نے ان سے ایک سنہرا اور ایک
سرخ تعزیئے اور جھاڑوں اور دیگر سامان شیشہ آلات کی
فرمائش کی، کل سامان کی قیمت ایک لاکھ روپیہ طے پائی
سنہ ۱۲۱۱ھ میں ایک تعزیہ آگیا اور دوسرے کے لئے سال
آئندہ کا وعدہ ہوا۔

۱۸۲۴ء بزمانہ حکومت شاہ غازی الدین حیدر پادری ہیبر (HEBER) بسلسلہ سیاحت لکھنؤ بھی آئے تھے امام باڑہ آصفی کی نسبت وہ حسب ذیل رقمطراز ہیں:-

"اس مقدس عمارت میں بکثرت جھاڑ لٹک رہے تھے جس کی سنہری اور روپہلی ڈالوں اور پھل دار ترشی ہوئی خوش رنگ قمقموں کی چمک دمک سے آنکھوں میں خیرگی پیدا ہوتی تھی اور جو جھاڑ بہت وزنی اور لٹکانے کے قابل نہ تھے وہ فرش پر رکھے ہوئے تھے ان جگمگاتے ہوئے جھک کے جھاڑوں کا نچلا حصہ بہت گھیردار تھا اور اوپر کی جانب گاؤدم ہوتے چلے گئے تھے ان کے بیچ بیچ میں نقرئی اور مرصع . . روضے یا تعزیے جو آٹھ دس فٹ بلند ہوں گے رکھے ہوئے تھے۔

ان کے علاوہ نوربان اودھ کے پرانے زمانے کے زرنگی پٹکے جن پر آیات قرآنی کڑھی ہوئی تھیں بڑے بڑے نقرئی پنجے جن پر بخط طغرا الفاظ کندہ تھے مقدس ڈھالیں جن پر خدائے قدوس کے اسمائے گرامی کی مرصع کاری کی گئی تھی خراسانی تلواریں ، نیزے ، بھالے مشہور زمانہ سپہ سالاروں کے عمامے اور چند مخصوص قسم کے متبرک منبر بھی تھے جو امام باڑہ کی زیب و زینت میں چار چاند لگا رہے تھے۔"

آصف الدولہ نے ۲۱ر ستمبر ۱۷۹۷ء کو انتقال کیا اور اپنے تعمیر کردہ امام باڑہ میں سپرد خاک کئے گئے مگر بدقسمتی سے انھوں نے امام باڑہ کی شکست و ریخت کی مرمت و مصارف امام باڑہ کے لئے کوئی جائداد وقف نہیں کی اس وجہ سے یہ عرصہ تک وقف حسین آباد کی زیر نگرانی رہا۔ اب کچھ عرصہ سے محکمہ تحفظ آثار قدیمہ نے اس کو باستثنار مسجد اپنے تحت میں لے لیا ہے آصف الدولہ کے مرقد کے علاوہ ایک اور قبر بھی امام باڑہ میں ان کی بیوی شمس النسا بیگم کی ہے موصوفہ اور نواب سعادت علی خاں میں موافقت نہ تھی اس وجہ سے وہ الہ آباد میں سکونت پذیر تھیں اور وہیں رحلت کی مگر بزمانہ حکومت شاہ غازی الدین حیدر ان کی نعش الہ آباد سے لکھنؤ لا کر آصف الدولہ کی قبر کے مشرقی پہلو میں دفن کی گئی۔ مس سڈنی نے (. . . . .) اپنی کتاب ہسٹارک لکھنؤ . . . . میں بعد جانچ و تحقیقات لکھ مارا کہ آصف الدولہ کی قبر کے برابر کفایت اللہ معمار کی قبر ہے مگر یہ بات بالکل بے بنیاد ہے۔ کفایت اللہ کی مسجد موسومہ بلند مسجد اور امام باڑہ محلہ صاحب گنج میں ہے عہد آصفی کا یہ مایہ ناز معمار جس کی تعمیر کی ہوئی عمارت کو دیکھ کر یورپ کے بڑے بڑے انجینیر انگشت بدنداں ہو جاتے ہیں اپنے ہی امام باڑہ واقع صاحب گنج میں موت کی میٹھی نیند سو رہا ہے۔

آصف الدولہ کے عہد دولت میں حقیقتوں کا کوئی فلاں ایسا نہ تھا جس میں کوئی جھاڑ باڑی یا جھاپہ خوار و زراں ہو مگر وہ زمانہ اس کی بہار کا تھا اب خزاں رسیدگی کے زمانہ میں پت جھاڑ ہونے کے بعد صرف چند قد آدم آئینے جن میں پرانی وضع کے سنہرے چوکھٹے لگے ہیں اور تھوڑا سا شیشہ آلات باقی رہ گیا ہے اس کمی سامان کے متعلق منشی رام سہائے تمنا جو حضرت محمد علی شاہ کے ہمعصر تھے اپنی کتاب افضل التواریخ میں تحریر کرتے ہیں کہ امام باڑہ حسین آباد کی آرائش کے لئے امام باڑہ آصف الدولہ کی قیمتی اور نادار اشیاء منگوائی گئی تھیں زینت حسین آباد باعث بے رونقی امام باڑہ کلاں ہوئی اور روشنی بھی کم ہونے لگی مگر "نہیں محتاج زیور کا جسے خوبی خدا نے دی" امام باڑہ آصفی کی عمارت خود اتنی پرصنعت اور پرعظمت ہے کہ اس ننگی بوچی حالت میں بھی اپنے پرائے، ملکی و غیر ملکی سبھی اس کو دیکھ کر دنگ رہ جاتے ہیں اور اودھ کے دوسرے فرمانرواؤں کی آراستہ و پیراستہ عمارتوں کا اس کو سرتاج خیال کرتے ہیں۔ درحقیقت اس عمارت کے تناسب نے اور سونے پر سہاگہ کا کام دیا ہے جس سے اس کی دلکشی اور دلفریبی میں چار چاند لگ گئے ہیں اور بغیر امام باڑہ آصفی عمارات لکھنؤ کا تصور بے دولہا کی برات معلوم ہوتا ہے۔

درگاہ حضرت عباسؑ (لکھنؤ)
تاریخ و تعمیر کی روشنی میں

(از نواب زادہ سید فدا حسین صاحب لکھنؤ)

جس جگہ پر یہ درگاہ بنی ہے یہاں پہلے مرزا فقیرا کا مکان خام تھا جس کی چھت اور دیواریں خام تھیں۔ مرزا فقیرا کو ایک شب بشارت ہوئی کہ دریا سے گومتی کے فلاں فلاں کنارے پر جہاں علم ہائے حضرت عباسؑ میں سے جن کو کربلائے معلیٰ میں بلند کیا تھا ایک علم دفن ہے اس کو کھود کر نکالے اور اپنے مکان میں لاکر نصب کرے۔ چنانچہ حسب بشارت مرزا صاحب موصوف نے اس مقام کو کھودا علم برآمد ہوا جو حیرت کا سرچشمہ تھا۔ اسے نہایت تعظیم و تکریم سے اپنے گھر وا قع رستم نگر لائے اور اسے اپنے گھر میں نصب کیا۔ علم مبارک نے شہرت پائی اور شہر کے عوام وہاں جاکر منت مرادیں اپنی مانگتے تھے اور ان کی حاجت برآری ہوتی تھی۔

چند روز بعد نواب آصف الدولہ بہادر اپنے کسی خدمت گار پر خفا ہوئے اور فرمایا کہ کل تیری ناک کٹواؤں گا وہ ہر طرف روڑا، منتیں مرادیں کرنے لگا۔ چنانچہ درگاہ آیا منت مانگی۔ نواب آصف الدولہ بہادر نے دوسرے دن اس کی ناک نہ کٹوائی بلکہ چند روز بعد اس پر ایسے مہربان ہوئے کہ اس سے باتیں کرنے لگے۔ اس نے نواب کو مہربان پاکر عرض حال کیا کہ حضور نے تو کٹوانے کے باب میں حکم دیا تھا مگر بہ تفضل و صدقہ میں حضرت عباس علیہ السلام کے بچ گیا۔

نواب نے تفصیل اس علم مبارک کی پوچھی اس نے تمام و کمال کیفیت اس علم مبارک کے برآمد ہونے کی بیان کی۔ نواب آصف الدولہ از بسکہ شیدائے جناب عباسؑ کے تھے اپنے کسی معتبر کو مرزا فقیرا کے مکان پر بھیجا اور ایک ہزار روپیہ بھی نذر کیا۔

نواب کے آدمی نے واپس آکر تمام کیفیت علم مبارک بیان کی، زیارت کو گئے۔ ایک گنبد اینٹوں کا وہاں تعمیر کرایا جب مرزا فقیرا نے قضا کی تو ان کے صاحبزادے نے یہ طریق حاضری جاری رکھا۔ اور اس آمدنی سے اپنی بسر اوقات کرتا تھا۔ عشرۂ محرم میں زیادہ رونق ہوتی تھی ۱۲۱۲ھ عہد نواب آصف الدولہ بہادر نواب اور اس کی عمارت خشتی رہی۔

نواب آصف الدولہ بہادر سے صفائی قلبی شاید نواب سعادت علی خاں سے نہ تھی اور انھوں نے منت مانی تھی کہ اگر سلطنت حق بحقدار رسید ہو گی تو اس جگہ گنبد طلائی تعمیر کراؤں گا۔ چنانچہ جب سربرآرائے سلطنت ہوئے اور علیل بھی ہو گئے تھے بعد غسل صحت درگاہ میں حاضری دی۔ دسترخوان بڑے تکلف سے بچھا کی دین منہیات سے اجتناب کلی فرمایا ہم آخر بھی انھیں سے امانت

چاہتے تھے لب پر نام عباسؑ تھا خلاصہ بعد اس کے تیاری
درگاہ میں خصوصیت ہوئی۔ تیاری درگاہ میں گنبد طلائی
ہوا مرزا محمد حسن قتیل نے مادہ تاریخ اس گنبد کی کہی۔
"ایں گنبد جدید بنائے سعادت است" مکان عالیشان
و دروازہ سب طرح سے درست ہوا۔ جب سے پہرہ
سرکار اور ایک داروغہ بھی سرکار سے مقرر ہوا اور
صندوق نقرہ و علم ہائے طلائی و نقرہ مع فرش
شیشہ آلات و منبر نقرہ رکھا گیا۔ مگر بانی مبانی
درگاہ کو سب نذر ملتی رہی۔

نواب سعادت علی خاں کے بعد ان کے
صاحبزادے نواب رکن الدولہ بہادر کے بڑے
بیٹے نواب امیر الدولہ نے ایک حوض اندرون صحن
درگاہ بنوایا جس کی تعمیر کی تاریخ سلطان خاں اسد
نے اس طرح نظم کی ہے:-

چشمۂ فیض چوں نواب امیر الدولہ
کرد نقرپے نذر امام دوسرا
گشت مشہور جہاں ہمت آں بحر سخا
حرف زد شد چو درایں وجہ حسنؑ بہر حسینؑ
حاصلش دیں شد و ہم نام بکو در دنیا
اسد از بہر تماشش بہ طہارت تاریخ
قسم کرد بہ قسم ثانی کوثر بادا

نواب سعادت علی خاں کے بعد جب حسب
شرع شریف ان کے سب سے بڑے صاحبزادے
غازی الدین بہادر تخت نشین ہوئے ان کے حال
میں لکھا ہے کہ درگاہ [illegible] سے تجمل اور احتشام سے
تے تھے اکثر دستر خوان درگاہ میں ہوتا تھا۔
آراستگی درگاہ خوب کی تھی جلوہ خانہ وسیع بنوایا
ہوا انھیں کا ہے نذر نوبت نقارہ بال رکھا گیا۔
آج تک ان کی بنوائی ہوئی ضرب نقارے [illegible]

جلوہ خانہ پر ہے۔ انھوں نے اندرون درگاہ منبر و دوسرا
سامان عمارت سب درست کیا اور درگاہ کے دروازہ
پر چاندی چڑھوائی۔ منظور تھا کہ اولاد محبت جنگ
وزیر باغ میں رہے جو قریب درگاہ واقع ہے اس
لئے کہ اکثر محرم میں فساد ہوا کرتا تھا جاتا رہے اور
اس جگہ عباس گنج آباد کیا جائے۔

ملکہ زمانیہ نصیر الدین بادشاہ کی بیوی ہر نوچندی
جمعرات کو درگاہ حاضر ہوتی تھیں۔ اس ستی کے
زمانہ میں مبلغ دس ہزار صرف دستر خوان درگاہ
ہوا کرتے تھے۔ انھوں نے باورچی خانہ درگاہ
مذکور تعمیر کرایا۔

جس دن نواب فضل علی خان جن کا خطاب منجانب
بادشاہ نصیر الدین حیدر اعتماد الدولہ تھا نائب بادشاہ
ہوئے مرزا آغا جان کو داروغہ درگاہ کیا اس واسطے
کہ بڑا امام باڑہ آصف الدولہ بہادر کا اہتمام و انتظام
انھیں کے اختیار میں تھا اور کرتے تھے۔ یہ دستور تھا کہ آمدنی
درگاہ مردانی سرکار میں جاتی تھی جس سے داروغہ چوکی پہرہ
وغیرہ مقرر تھا اور آمدنی زنانی درگاہ مرزا فقیرا کی اولاد
کو ملتی تھی۔ زمان شاہی تک یہی دستور رہا۔ غدر میں جس
طرح لوٹ مچی اس کا حال سب کو معلوم ہے۔ اس لوٹ میں
جملہ سامان مع علم جو برآمد کردہ مرزا فقیرا تھا تلف ہو گیا اور
درگاہ سرکار برطانیہ میں نزول ہو گئی۔ بعد دو ایک سال
کے شرف الدولہ غلام رضا خاں جس کی تعمیر سے روضۂ کاظمین
شریفین لکھنؤ ہے اور مرزا جعفر علی شاہ جو اس وقت کلکتہ میں
تھے معرفت مسیح الدولہ قبل الملک حکیم سید مرزا خان بہادر
کے رجسٹر نزول سے واگذار کر دیا۔ غلام رضا خاں نے کچھ
مزید سامان اپنی طرف سے چڑھایا۔ اولاد مرزا فقیرا کو درگاہ
سے بالکل خارج کیا اور کل آمدنی درگاہ کو لیکر اس پر صرف
کرتے تھے۔ بعد انتزاع سلطنت اودھ حضرت سلطان عالم

محمد واجد علی شاہ نے اپنا تاج و تلوار بھی اسی درگاہ میں چڑھا دیا تھا ایام غدر میں یہ بھی تلف ہو گیا۔

شرف الدولہ غلام رضا خاں کے انتقال پر نواب پیارے صاحب خلف نواب حسن علی خاں درگاہ کے متولی ہوئے جس کو محمد واجد علی شاہ نے متولی کیا تھا زمانہ غدر کے بعد اکثر حکام نے چاہا کہ درگاہ میں جو اسباب چاندی، سونے کا ہے اسے بھی ضبط کر لیں مگر مفتاح الدولہ نے عرض کیا کہ تصرف مال وقف جائز نہیں اس لئے محفوظ رہا۔

غدر کے محرم کے حالات میں لکھا جا چکا ہے کہ برجیس قدر رمضان علی مرزا پسر حضرت سلطان عالم محمد واجد علی شاہ جو انگریزوں سے بعد روانگی واجد علی شاہ در سمت کلکتہ زائد عرصہ از ۱۵ ماہ لکھنؤ لیتے رہے ان کا تعزیہ جواہرات سامان جلوس جو اس درگاہ سے زمانہ برجیس قدری اٹھا تھا سب لٹ گیا۔ اس واقعہ کو فاربس صاحب نے زبان انگریزی اپنی کتاب "HISTORY OF INDIAN MUTINY" by R.W. Forbes. بہ تشریح تمام لکھا ہے۔ اس نوٹ میں صرف کلغی نقرئی جو لٹی تھی اس کو مبلغ ڈیڑھ لاکھ روپیہ میں ولایت میں جا کر فروخت کیا گیا تھا۔

شرف الدولہ محمد ابراہیم جن کے متعلق وثیقہ حریت حضرت محمد علی شاہ بادشاہ اودھ بابت پنشن امام حسینؑ باد مبارک لکھنؤ تھا غدر میں قتل ہوئے۔ اس کی تشریح تمام صفحہ ۲۰۵ جلد دوم تاریخ اودھ جلد دوم مصنف سید کمال الدین حسنی الحسینی اس طرح درج ہوئی ہے "خلاصہ بروز جمعہ ۲ شعبان ۱۲۷۳ھ جب کارنیگی صاحب " Carnagie " صاحب ڈپٹی مجسٹریٹ، گورے لے کر کوٹھوں پر سے ہو کر داخل درگاہ ہوئے دو ظالم جو ننگی تلوار لئے کھڑے تھے انھوں نے دوڑ کر پوچھا کہ اس اسیر کو کیا حکم ہوتا ہے، کہا مار ڈالو جب نامرد ازلی پھرے نواب نے عنایت علی خدمتگار کو بازو سے جوشن بند اتار کر دیئے، کہا یہ میری نشانی ہے میرے گھر پہونچا دینا اس نے خوف سے انکار کیا۔ کہا وہ دیکھو میرے قاتل آ پہونچے یہ کہہ کر پہلوئے منبر نماز کو کھڑے ہو گئے۔ ایک نامرد نے بندوق دو سکر نے تلوار ماری مقام سجدہ پر گر پڑے سسک رہے تھے اس عرصہ میں کارنیگی صاحب بھی آ گئے عنایت خدمت گار سے پوچھا یہ کس کی لاش ہے، کہا شرف الدولہ محمد ابراہیم خاں کی۔ کارنیگی " Carnagie " صاحب نے خاکروبوں کو حکم دیا کہ سب لاشوں کو اٹھا کر صاف کر دو فوراً، "باورچی خانہ درگاہ میں ہے اور مقتولین متوسلین کی دیگر لاشوں کو پیوند خاک کر دیا"۔ یہ شرف الدولہ محمد ابراہیم وہی ہیں جنھیں ملکہ حضرت محل صاحبہ نے اپنا مشیر خاص بنایا تھا اور جو کورٹ (Count) ملکہ حضرت محل صاحبہ نے قائم کیا تھا اس کے کرتا دھرتا تھے ملکہ حضرت محل صاحبہ اور ان کے صاحبزادے نے زائد از پندرہ ۱۵ ماہ واجد علی شاہ کے بعد حکومت کی۔ ہزار ہا لڑائیاں ان کی سپاہ نے انگریزوں سے لڑیں ہزار ہا انگریز اور میم صاحبان مارے گئے۔ مگر مرزا برجیس قدر کا تھا اور یہ بادشاہ تھے۔

راقم الحروف نے شرف الدولہ محمد ابراہیم کا حال اس لئے لکھا کہ غفلت میں حضرات کوئی اور استعمال نہ کر بیٹھیں بلکہ شرف الدولہ محمد ابراہیم وغیرہ اور جو دوسرے شہید یہاں دفن ہیں احترام کریں۔

بہادر شاہ ظفر اور اہلبیت سے عقیدت

مسز عندلیب زہرا کاظمی (کاموں پوری) ایم اے علیگ

ہندوستان کی مغل حکومت کے آخری بادشاہ سراج الدین شاہ ظفر سے متحدہ ہندوستان کی تاریخ کا ہر طالب علم واقف ہے۔ ۱۷۷۵ء میں پیدا ہوئے اور ۱۸۳۷ء میں دودمان تیموریہ کا یہ آخری چشم و چراغ تخت نشین ہوا۔ ان کی حکومت کی بساط ۱۸۵۷ء میں الٹ گئی۔ بہادر شاہ ظفر پر ہندوستان کی مسلم حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ رنگون میں جلا وطنی کی حالت میں آپ کا ۱۸۶۲ء میں انتقال ہو گیا۔

بہادر شاہ ظفر فن کار۔ شاعر۔ مصنف۔ خطاط اور خوش نویس ہونے کے ساتھ فن سپہ گری، تیر اندازی اور شہسواری میں کمال رکھتے تھے یہ اہل بیت کرام سے عقیدت رکھتے تھے ان کی نظمیں ان کے دلی ارادت کی گواہ ہیں۔ ان کی زندگی کی تاریخ شاہد ہے کہ انھیں اہل بیت طاہرین سے کس قدر خلوص و عقیدت تھی ان کی شاعری اور ان کی زندگی کے واقعات سے اس خلوص و عقیدت کی تراوش ہوتی ہے۔ "کتاب بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد تالیف" رئیس احمد جعفری ندوی مطبوعہ لاہور ۱۹۵۵ء اس وقت میرے سامنے ہے۔ اس میں سے کچھ اقتباسات نقل کئے جاتے ہیں، جن کی روشنی میں، ظفر کی عقیدت و احترام اندازہ کیا جا سکتا ہے:—

" آج کے دن جہاں پناہ کے محلات میں حضرت علیؑ کے دسترخوان کی نیاز ہوتی ہے جو کہ ستو بڑے بڑے خوانوں میں چوٹی تک بھر کے دسترخوان پر رکھ دئے جاتے ہیں اور پر پردہ گرا دیا جاتا پھر باہر بیٹھ کر نیاز دی جاتی ہے پھر پردے باندھ دیئے جاتے ہیں اور شمع کی روشنی میں ستوؤں کو دیکھا جاتا ہے۔ آج ایک خوان کے ستوؤں پر حضرت علیؑ کی تسبیح کے دانے کا نشان نظر آیا اور حضور جہاں پناہ نے اس خوان کے ستوؤں کو خود بطور تبرک نوش فرمایا۔ پھر اپنے دست مبارک سے وہ ستو شہزادوں اور بیگمات کو تقسیم کئے۔ اور اس کے بعد سب نے بارگاہ جہاں میں نذریں پیش کیں۔ کہا جاتا ہے کہ اگر دسترخوان یا کھانوں پر کوئی خاص نشان نظر آجاتا تو سمجھتے تھے کہ حضرت علیؑ نے یہ نیاز قبول فرمائی ہے اور اس پر اپنی انگلی کا نشان ثبت کر لیا ہے۔ دسترخوان پر ہر قسم کے کھانے ہوتے اور جو کے ستو بھی۔ حضرت علیؑ کی تسبیح کا نشان صرف جو کے ستوؤں پر ظاہر ہوتا تھا۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ ان ستوؤں کو اس طرح چوٹی دار بھرا جاتا تھا کہ کہیں کسی چھوٹے بڑے نشان کی گنجائش نہیں رہتی تھی۔ مگر جب تسبیح کا نشان اس میں نظر آیا تو سب کو بیحد خوشی ہوئی کہ حضرت نے اس ستو کو قبول فرمایا۔

(رسالہ اس شکات کی ڈائری صفحہ ۱۰۹)

حضرت علیؑ اور امام حسینؑ سے ظفر کی عقیدت

بہادر شاہ ظفر کی حضرت، امام حسین سے گہری عقیدت کا اظہار ان کے کیف و اثر میں ڈوبے ہوئے اشعار سے ہوتا ہے محرم کی رسمیں بھی مناتے اور ہر طرح سے اپنے جذبے کا اظہار کرتے تھے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:—

جو اس امام کا ہے دوست ہے خدا کا دوست
قبول ہوتی ہے اس کی علی الدوام نماز
جو ہو حسینؑ کا دشمن اسے کہاں ایمان
اگرچہ پڑھتا بھی ہو وہ برائے نام نماز
نماز پڑھ کے سدا سجدہ و قیام کے ساتھ
وظیفہ چاہیئے ذکرِ غمِ امام کے ساتھ

نہیں در دولت سے ہوتے بہرہ ور شاہ و گدا
پھر بھلا اس در کے ہوتے کس سے کیجئے التجا
آپ سمجھیں یا نہ سمجھیں پر ظفر ہے آپ کا
آیئے اب تو مدد کو واسطے رب خدا
یا حسین ابن علی بندہ بہت ناچار ہے
مستغنی کونین ہی رکھ اپنے ظفر کو
محتاج نہ رکھ حیدر کرار کسی کا

محرم میں بادشاہ فقیر بنتے، سبز کپڑے پہنتے اور گلے میں سبز جھولی ڈالتے تھے۔ چھٹی تاریخ کو تھوڑی دیر کے لئے بند ہاتھ میں لیکر اور چاندی کی زنجیر کمر میں ڈال کر گشت کرتے تھے۔ ساتویں کی مہندی بڑی دھوم دھام سے اٹھتی تھی اور بادشاہ بنفس نفیس اس کی مشایعت کرتے تھے آٹھویں میں حضرت سقائے حرم کی یادگار لال کھاروے کی لنگی باندھ کر بھشتی بنتے اور شربت کی بھری پوستک کندھے پر رکھ کر معصوموں کو شربت پلاتے تھے۔ دسویں تاریخ کو موتی مسجد میں عاشورہ کی نماز پڑھ کے ظہر کے وقت حاضری کے دسترخوان پر نیاز دیتے تھے۔ دسترخوان پر شیرمالیں چنی ہوتی تھیں۔ شیرمال کے اوپر کباب، پنیر، پودینہ اور ادرک، مولیاں کتر کے رکھی جاتی تھیں

(بزم آخر منشی فیاض الدین مرحوم)

عاشورہ

حضور انور عاشورہ کے دن درگاہ شریف کے آثار کی زیارت کو تشریف لیجاتے تھے۔

مرزا جہاندار شاہ متولی کی خلعت قبائے خاص سہ رقم جواہر دستار سربستہ گوشوارے مرصع اور حافظ قطب الدین کو خلعت پارچہ سہ رقم اور ان کے لڑکے کو سہ پارچہ اور دو رقم جواہر اور سادات عالی درجات کو پہننے کو کپڑے اور زر نقد اور فقرا و مساکین کو نیاز کا کھانا مرحمت فرمایا۔

(۲۳ جنوری ۱۸۴۶ء - بہادر شاہ کا روزنامچہ)

بہادر شاہ اپنے آباؤ اجداد کے برعکس خود شیعہ مذہب رکھتا تھا۔ اس نے لاہور کے مقام پر چاہا کہ خطبہ شیعہ طریقے پر پڑھا جائے اور اس عظیم الشان کو اس کام کی انجام دہی پر مامور فرمایا۔ لیکن کامیابی نہ ہوئی بلکہ ہر طرف شورش برپا ہو گئی اور اچھے بُرے سب لوگوں نے متحد ہو کر خطیب کو منبر پر سے کھینچ لیا اور خوب لاتیں ماریں۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ چونکہ عظیم الشان بھی یہ نہیں چاہتا تھا کہ شیعوں کی طرح خطبہ پڑھا جائے اس لئے اس نے بھی اس شورش کو بہت زیادہ ہوا دی۔ اس واقعہ کے بعد بہادر شاہ ستّر سال کی عمر میں ۱۱۲۴ھ میں ایک ماہ پانچ سال سلطنت کرنے کے بعد لاہور ہی میں انتقال کر گیا۔

(ترجمہ فارسی "گلستان ہند" مصنفہ راجہ درگا پرشاد مطبوعہ ۱۸۹۷ء)

تاریخ عزاداری تاج پور

(جناب سید عیسےٰ شیر مضطر تاج پوری - تاج پور ڈیہہ ضلع غازی پور)

بانیٔ موضع

جناب سید تاج الدین سبزواری قدس اللہ سرہٗ کا آبائی وطن مملکت ایران کا سبزوار شہر تھا۔ صاحب موصوف موسوی سید تھے۔ میر صاحب مذکور کا سلسلہ نسب چودہ واسطوں سے حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سے جا ملتا ہے۔ سلسلۂ نسب اس طرح ہے:—

سید تاج الدین ابن سید قاسم ابن سید ابراہیم زاہد ابن سید حبیب اللہ ابن سید میکائیل ابن سید پیر محمد ابن سید ہاشم ابن سید حسین زاہد المحدث ابن سید علی نقی ابن سید فخر الدین ابن سید حسین ذوالکرامت ابن سید زید شہید ابن سید میرزا اشرف ابن سید عبید اللہ ابن حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام (از نسب نامہ سادات غازی پور بہ تحویل عالیجناب سید شبیر حسن صاحب بدری ایڈووکیٹ غازی پور و از نسب نامہ مولوی محمد شفیع صاحب مرحوم بہ تحویل عالیجناب مولانا سید مشتاق حسین صاحب خطیب تاج پوری ممتاز الافاضل تاج پور ضلع غازی پور)

ورود برزمین ہندوستان

جب کہ ایران اور ترکستان میں سادات پر عرصۂ حیات تنگ تھا۔ زندگی بسر کرنا دوبھر تھی۔ اسی زمانے (تقریباً ۱۲۱۱ء تا ۱۲۳۶ء) میں مملکت ہندوستان پر سلطان شمس الدین التمش کی حکومت تھی جس کی ادب نوازی اور علم دوستی کا شہرہ ہندوستان سے باہر دیگر ممالک سے بھی خراج تحسین لے رہا تھا۔ چنانچہ میر صاحب مذکور کے ساتھ عالم و فاضل حضرات کی ایک وافر تعداد نے ہندوستان پناہ لینے آئی۔ سلطان مذکور نے بڑی قدر و منزلت کی۔ اور حسب لیاقت صاحب کے ہمراہیوں کو انتظامیہ عدلیہ اور فوج کے اعلیٰ عہدوں سے سرفراز کیا۔ سید تاج الدین سبزواری کو فوج کے پنج ہزاری سپہ سالار کا عہدہ تفویض ہوا۔ سید صاحب موصوف نے حکومت کے دفاعی محکمے کا کام بڑی خوش اسلوبی سے نبھایا۔

بنائے تاج پور

جب سید تاج الدین سبزواری دفاعی سرگرمیوں کے تحت مہاجہ بلدی سے خراج وصول کرنے کے کام پر مامور ہوئے۔ سید صاحب موصوف جب مختلف علاقوں سے گزر کر سرزمین تاج پور (جو پہلے غیر آباد علاقہ تھا) پر وارد ہوئے تو موصوف کا لشکر پیاس کے مارے تباہ حال تھا۔ سید صاحب کے ماتحت سرداروں نے بہت دوڑ دھوپ کی لیکن پانی کوسوں نایاب تھا۔ تمام علاقہ جنگل جھاڑیوں سے پٹا پڑا تھا۔ فوج پانی کی نایابی سے جاں بلب تھی جب تمام کوششیں رائیگاں گئیں تو سید صاحب موصوف نے تیمم کر کے بارگاہ ایزدی میں سر جھکایا اور خضوع و خشوع سے پانی کے لئے دست بدعا ہو گئے۔ صاحب موصوف نے اپنے سر کا تاج اتار کر سامنے رکھ دیا تھا۔ بفضل خدا وندی تعالیٰ حال ہوا اور اسی تاج کے نیچے سے پانی کا ایک چشمہ ابل پڑا (جو بعد میں بند ہو گیا) موصوف کا سارا لشکر سیراب ہوا۔ بلدی کے راجہ سے بھی مصالحت ہو گئی اور سید صاحب موصوف

اپنے لشکر کے ساتھ دہلی واپس چلے گئے۔ (الجواد بنارس محرم نمبر ۱۹۵۹ء)
۶۳۴ھ میں سلطانہ رضیہ بیگم کے مارے جانے کے بعد دہلی کی مرکزی حکومت اپنے وقار کو قائم نہ رکھ سکی اور ۱۲۶۶ء تک لاقانونیت کا راج رہا۔ اس خلفشار اور افراط و تفریط سے بچنے کے لئے سید صاحب اپنے ماتحت سرداروں سمیت اس جگہ (تاج پور) واپس آ گئے اور ۶۶۳ھ مطابق ۱۲۶۴ء میں تاج پور کی بنیاد رکھی۔ جہاں سے پانی کا سوتا چھوٹا تھا، اُسے تالاب کی شکل دے کر اُس کا بھی نام تاج سر رکھا۔ اپنے نام کی رعایت اور "تاج سر" کی مناسبت سے موضع کا نام تاج پور رکھا۔ تالاب "تاج سر" آج بھی باقی ہے۔ جسے عرف عام میں اب "تاسر" کے نام سے پکارا جاتا ہے۔

سید صاحب موصوف کے ماتحت سردار شری غوث رائے، شری ڈابھم لال، شیخ مصطفٰے اور جناب حسن خان نے علی الترتیب غوث پور ڈبہہ، شیخ علی پور اور حسن پورہ مواضعات آباد کئے۔ سید صاحب موصوف نے ان مواضعات کی زمینداریاں انھیں سرداروں کو دے دیں۔ اور کچھ مواضعات اپنے تصرف میں رکھے، جن میں کوٹھیاں، سنبریاں، مرچی، مہریواں اور بہیرا وغیرہم خاص اہمیت رکھتے ہیں (ماہنامہ الجواد بنارس محرم نمبر ۱۹۵۹ء و ہفتہ وار پیام اسلام لکھنؤ ۲۰ مارچ ۱۹۵۹ء)

آبادکاری موضع

جب سید صاحب موصوف یہاں آنے لگے تھے تو اُن کی فوج کے کافی افراد اُن کے ساتھ چلے آئے تھے۔ چنانچہ اُن لوگوں نے یہاں کے غیر آباد علاقہ کو کھیتی باڑی کے قابل بنایا۔ جنگل جھاڑیوں کو کاٹ کر صاف کیا۔ خالی زمینوں کو آباد کیا۔ زیادہ تر لوگوں نے زراعت کے ہی پیشے کو اپنایا۔ کچھ لوگوں نے اپنے آبائی پیشے کو ہی اختیار کیا۔ اس طرح کچھ لوگ کپڑا بُننے لگے اور کچھ لوگ دوسرے کام کرنے لگے۔ موضع کی تعمیر میں کافی وقت صرف ہوا۔ اور بڑی محنت و جفاکشی کی پڑی۔ دوسرے علاقوں سے اہل حرفہ لا کر بسائے گئے۔ اُن کو مکان بنانے کے لئے زمین اور زراعت کرنے کے لئے معافیاں دی گئیں۔ موضع میں ہر قوم و ملت کے لوگوں کو ہر طرح کی سہولت مہیا کی گئی۔ صرف چھتری خاندان کے لوگ موضع میں نہیں بستے۔ اس کمی کو بعد کے لوگوں نے پورا کر دیا۔ اس طرح موضع مختلف اقوام و ملت کا گہوارہ بن گیا۔ ہر شخص کو اپنے مذہبی فرائض کے انجام دہی کی پوری آزادی تھی۔ کسی کے ساتھ ناانصافی اور ظلم و ستم روا نہیں رکھا گیا۔

دسویں صدی ہجری تک موضع کی آبادی تقریباً دس ہزار افراد پر مشتمل تھی۔ یہ موضع فتح پٹی، منصور پٹی، قاسم پٹی اور ادھیار پٹی پر منقسم تھا۔ بعد میں سید دریا ابن سید قاسم نے ایک الگ محلہ قائم کیا جس کا نام دریا پٹی رکھا۔ لیکن یہ نام اب معدوم ہو چکے ہیں۔

مساجد و معابد

سید تاج الدین صاحب نے قلب موضع میں ایک مسجد کی بنیاد ڈالی جو لاہوری اینٹوں سے بنی ہے۔ گو کہ مومنین نے سیمنٹ کا پلاسٹر چڑھا دیا ہے مگر کھپریل اب بھی اپنی قدامت کا ثبوت دیتی ہے۔ سید عابد حسین ابن سید خیرات حسین عرف میر ساون کے زمانے تک لوگ اس مسجد کے راستے سے بعد غروب آفتاب گذرنا پل صراط سے گذرنا سمجھتے تھے۔ اس زمانہ تک یہ مسجد جنات کا گہوارہ تھی۔ اس مسجد میں سید ریاضت حسین مرحوم ہی جیسے لوگ نماز پنجگانہ ادا کرتے تھے۔ لیکن اب وہ باتیں ختم ہو چکی ہیں۔ اور اب ہر بچہ بوڑھا بغیر کسی جھجک کے آتا جاتا ہے۔ موضع میں اس مسجد کے علاوہ اور کوئی مسجد بنا کردۂ مورث اعلیٰ نہیں ہے۔ اہل تسنن حضرات کی بھی ایک مسجد ہے جسے حاجی شیخ جمن انصاری نے بیسویں صدی عیسوی کے اوائل میں تعمیر کرایا تھا۔ اہل تسنن حضرات کی عیدگاہ تعمیر کردہ حاجی جمن انصاری شیعہ قبرستان کے متصل تاج سر کے شمالی کنارہ پر ہے (ماہنامہ الجواد محرم نمبر ۱۹۵۹ء)

شیعہ قبرستان اور تاج سر کے مغربی کنارے پر ایک کربلا بھی تعمیر کردہ مورث اعلیٰ تھی۔ جس کی چہار دیواری کی تعمیر

اور کربلا کی از سر نو تعمیر جناب متین الدین مرحوم منصف کار برطانیہ زوج سماۃ واحد النساء بی بی مرحومہ کے معتمد ہاتھوں سے ہوئی۔ ۱۳۰۹ھ میں منصف مرحوم نے اپنے نفقے کے مطابق کربلا کی از سر نو تعمیر کی۔ موصوف نے کربلا کی چہار دیواری کے اندر ایک مسجد بھی بنوائی، جو اب منہدم ہو چکی ہے۔

(ماہنامہ الجواد محرم ۱۳۵۹ھ)

امام باڑے اور چوک

موضع کی ترقی کے ساتھ عزاداری کی طرف بھی لوگوں کا رجحان بڑھتا گیا۔ اور رسم زمانہ کے مطابق مراسم عزاداری ادا ہوتے رہے۔ دسویں صدی ہجری کے آخر میں حسب ذیل تین امام باڑوں کا تذکرہ ملتا ہے۔

بڑے نیم تلے کا امام باڑہ

اس امام باڑے کی بنیاد سید قاسم حسین ابن سید سالار زنانی نے ڈالی تھی۔ جسے سید اکبر ابن سید قاسم حسین مرحوم کے بعد تک کافی عروج حاصل تھا۔ اس امام باڑے میں اہل اسلام کے دیگر فرقے بھی دامے، درمے، قدمے، سخنے مدد دیا کرتے تھے۔ لیکن چودھویں صدی ہجری کے وسط سے اس کی طرف لوگوں کا رجحان کم ہو گیا۔ امام باڑہ منہدم ہو گیا۔ سید اکبر مرحوم کے وارث سید سخاوت حسین مرحوم نے امام باڑے کی زمین ایک کلوار کے ہاتھ فروخت کر دی۔ اب ایک چوک باقی ہے جس کا انتظام سید اکبر مرحوم کے وارثان اب بھی کرتے ہیں۔

بیچلا امام باڑہ

اس امام باڑے کو سید قاسم حسین ابن سید سالار زنانی کے لڑکے سید دربار مرحوم نے قائم کیا تھا۔ جسے چودھویں صدی ہجری کے اوائل تک کافی شہرت حاصل تھی۔ لیکن امام باڑہ کی مرمت نہ ہو سکنے کے باعث عمارت منہدم ہو گئی۔ زمین افتادہ ہے۔ میر عبادت حسین کے زمانے تک یہ امام باڑہ اپنی شان و شوکت میں جواب نہیں رکھتا تھا لیکن ان کے وارثان نے عدم توجہی برتی۔ ایک چوک باقی ہے جس پر تعزیہ رکھا جاتا ہے۔ اور ۸ محرم کو ایک مجلس بھی ہوتی ہے۔

بڑکے برتلے کا امام باڑہ

اس امام باڑے کو سید منصور مرحوم ابن سید سالار زنانی نے قائم کیا تھا جسے سید اجمل مسلی ابن سید قادر بخش کے زمانے تک بڑا عروج حاصل تھا۔ لیکن وارثان موصوف کی عدم توجہی کے باعث امام باڑہ منہدم ہو گیا۔ اب صرف چوک باقی ہے۔ جس پر تعزیہ رکھا جاتا ہے۔ سید علی حسین مرحوم کے متبنیٰ سید فدا حسین کے وارثان اب بھی بڑی دلچسپی سے تعزیہ رکھتے ہیں۔

مندرجہ بالا امام باڑوں کے علاوہ حسب ذیل امام باڑے ابھی عالم وجود میں ہیں:-

مولوی محمد شفیع صاحب کا امام باڑہ

مولانا مذکور کے آبا و اجداد موضع گنگولی سے یہاں آکر آباد ہوئے۔ اور انھوں نے تقریباً بارہویں صدی ہجری میں ایک امام باڑہ قائم کیا۔ جو اب مولانا کے نام کے ساتھ پکارا جاتا ہے۔ جسے مرحوم کے فرزند مولانا سید مشتاق حسین عابدی ممتاز الافاضل صدر انجمن عباسیہ آباد کئے ہوئے ہیں۔ اس امام باڑے میں ایام عزا میں پورے عشرہ مردانی مجلس ہوتی ہے۔

سید محمد غفور مرحوم کا امام باڑہ

سید محمد غفور مرحوم کے آبا و اجداد نے اواخر بارہویں صدی ہجری میں اس امام باڑے کو قائم کیا۔ ایام عزا میں مردانی و زنانی مجالس پورے عشرہ میں ہوتی ہیں۔ اس امام باڑے کا انتظام سید نذیر حسن صاحب کرتے ہیں

امام باڑہ وقف

سید بندہ علی عرف میر بدلن نے ایک امام باڑہ قائم کیا تھا۔ جس کے قیام کو تقریباً دو سو برس ہوئے۔ ۱۹۰۲ء میں جناب متین الدین مرحوم منصف متوطن بنارس نے امام باڑہ پختہ کرایا اور کچھ جائداد وقف کر دی۔ تب سے یہ امام باڑہ "امام باڑہ وقف" کے نام سے مشہور ہوا۔ جو بحمد اللہ اچھی حالت میں ہے۔

میر سید حسن صاحب مرحوم کا امامباڑہ

اس امام باڑے کے قیام کی مدت نہ معلوم ہو سکی، صرف اتنا ہی معلوم ہو سکا کہ میر سید صاحب مرحوم کا امام باڑہ بہت ہی اہمیت کا حامل تھا۔ ایام عزا میں بڑا اہتمام برتا جاتا تھا۔

جناب ظہیر حسن مرحوم کا امامباڑہ

۱۹۳۵ء میں سید ظہیر حسن مرحوم سابق صدر انجمن عباسیہ تاج پور نے ایک عزا خانہ قائم کیا تھا صاحب موصوف کے ۱۹۴۰ء میں فوت ہو جانے کے بعد بھی مرحوم کی بیوہ تا انتقال پاکستان (۱۹۶۰ء) بڑے خلوص کے ساتھ مراسم عزاداری انجام دیتی تھیں۔ موصوفہ زنانی و مردانی مجالس برپا کرتی تھیں لیکن صاحبہ مذکورہ کے چلے جانے کے بعد اُن کے اعزا نے عدم توجہی برتی۔ جس کے باعث یہ عزا خانہ ختم ہو گیا۔

متذکرہ بالا امام باڑوں کے علاوہ موضع میں بہت سے چوک ہیں۔ شیخ قادر بخش کا چوک اب غیر آباد ہو چکا ہے میرزا یارت حسین مرحوم اور میر بھیکھو مرحوم کے چوک علی الترتیب جناب شیخ محمد عمر چوڑی فروش اور شری سادھو کلوار آباد کئے ہوئے ہیں۔ بیگم بی بی کے چوک کو حکیم محمد صوبیدار آباد کئے ہوئے ہیں۔ جو بھال کے چوک کو ماسٹر محمد حلیم آباد کئے ہوئے ہیں۔ میر ابو الحسن کے چوک کو اُن کے بھتیجے سید احمد حسن کاظمی پرنسپل آباد کئے ہوئے ہیں۔ میر تیغ علی کے چوک کو سید واجد حسین و سید حسین اصغر صاحبان آباد کئے ہوئے ہیں۔ سید تاج الدین سبزواری کے چوک کو سید ابن حسن ابن سید محمد تقی آباد کئے ہوئے ہیں۔ شری چندر دیو کانذو اور جناب شیخ عنایت اللہ اپنے اپنے چوک پر تعزیہ رکھتے ہیں شیخ نصیر مرحوم کا چوک ہری گوری کے مکان میں پڑ جانے کے باعث کچھ دنوں تک غیر آباد رہا لیکن جب ہری گوری نے ترک سکونت کر دی تو اس چوک کو عرصہ دس سال سے سید ذوالفقار حسین ابن سید عبادت حسین مرحوم آباد کئے ہوئے ہیں۔ جولہپورہ اور پھولی کے چوک پر بھی وہاں کے مومنین تعزیہ رکھتے ہیں۔

مجالس عزا

اوائل چودھویں صدی ہجری تک صرف چار مجالس کا تذکرہ ملتا ہے۔ اس کے بعد سید ظہیر حسن مرحوم سابق صدر انجمن عباسیہ کی مساعی جمیلہ سے مجالس کی تعداد میں اضافہ ہوا۔ وسط چودھویں صدی ہجری میں مجالس کی تعداد تیرہ تک ہو گئی تھی۔ اب بھی حسب ذیل مجالس اپنے وقت معینہ سے اختتام پذیر ہوتی ہیں:—

۱۔ جناب سید محمد شکور مرحوم کی مجلس
۲۔ امام باڑہ وقف کی مجلس
۳۔ جناب سید ابن حسن کی مجلس
۴۔ 〃 سید مظہر عباس عابدی کی مجلس
۵۔ 〃 سید شبیر حسن کاظمی کی مجلس
۶۔ 〃 سید رازق حسین کی مجلس
۷۔ 〃 سید احمد حسن کاظمی صاحب پرنسپل کی مجلس
۸۔ 〃 سید مختار حسین صاحب کی مجلس
۹۔ 〃 سید توقیر حسن کی مجلس
۱۰۔ 〃 سید نذیر حسن کی مجلس
۱۱۔ 〃 مولوی سید مشتاق حسین صاحب عابدی کی مجلس

مندرجہ بالا مجالس کے علاوہ سید ذوالفقار حسین صاحب سوزخواں کی چاند رات کی مجلس اور ۱۴ر محرم کی ۱۰ بجے دن کی مخصوص مجلس، بچلا امام باڑہ کی ۵ر محرم کی ۷ بجے شام کی مجلس، ماسٹر محمد حلیم کی ۵ر محرم کی دوپہر کی مجلس، سید احمد حسن کاظمی کی شب عاشور کی مجلس اور سید مظہر عباس عابدی کی شام غریباں کی مجلس بھی اپنی خصوصیت کی حامل ہے۔

مندرجہ ذیل زنانی مجالس بھی عشرۂ محرم میں منعقد ہوتی ہیں۔

۱۔ جناب سید واجد حسین صاحب کی زنانی مجلس
۲۔ 〃 سید توقیر حسن صاحب 〃 〃

۳- جناب سید احمد حسن صاحب کاظمی زنانی مجلس
۴- " سید آغا حسن صاحب " "
۵- " سید مظہر عباس صاحب " "
۶- امام باڑہ وقف کی " "
۷- جناب سید نذیر حسن صاحب " "

جلوس عزا

زمانۂ سابق میں ۴ر محرم کو چوکی کا گشت اٹھتا تھا اور ۹ر محرم کو شب میں ذوالجناح کا گشت ہوتا تھا۔ لیکن اب یہ گشت موقوف ہو گئے۔ اور اب حسب ذیل پانچ گشت مختلف تاریخوں میں اٹھتے ہیں:-

۱- چاندرات کا گشت

محرم کی چاندرات کو تاج سر سے مٹی لانے کا گشت زمانۂ قدیم سے اٹھتا چلا آرہا ہے یہ گشت میر وکیل احمد مرحوم کے دروازے سے اٹھتا تھا۔ لوگ ماتم و نوحہ خوانی کرتے ہوئے صلکانی نور باف اور حاجی جمن انصاری مرحوم کے راستے سے ہوتے چوک چوپال ہو کر کربلا جاتے تھے اور مٹی لے کر اپنے اپنے گھروں کو واپس ہو جاتے تھے۔ لیکن راقم الحروف نے گشت میں ایک علم کا اضافہ کیا اور انجمن کا ماتمی دستہ سید ذوالفقار حسین سوزخواں کے یہاں ایک مجلس کرکے رخصت ہوتا ہے۔

۲- حضرت علی اکبرؑ کے تابوت کا گشت

۴ر محرم کو شب میں ۹ بجے نوجوان بچوں کی طرف سے یہ گشت عرصہ دس سال سے اٹھایا جا رہا ہے۔ سید مختار حسین صاحب کے عزاخانے سے یہ گشت اٹھتا ہے۔ یہ گشت چوک سید ابوالحسن مرحوم و چوک میر زیارت حسین مرحوم ہو کر بازار میں آتا ہے۔ وہاں سے چوک میر بھیکھو ہو کر بنواں کا ندو اور رام لچھمن کلوار کی درمیانی گلی میں ہوتا ہوا چوک بڑکی نیم تلے آتا ہے۔ وہاں سے سجگ کا ندو اور سوہن کلوار کی درمیانی عام شاہراہ پر آتا ہے۔ چوک شیخ نصیر مرحوم پر آکر پھر ڈاک خانے کی طرف جاتا ہے۔ وہاں سے عام شاہراہ سے گاجر و طوبی اور مسجد سید تاج الدین سبزواری کے راستے سے امام باڑہ مولوی سید مشتاق حسین صاحب آتا ہے۔ پھر وہاں سے پلٹ کر چوک مسجد مذکور و چوک سید محمد تقی مرحوم پر آتا ہے۔ وہاں سے عام شاہراہ سے گلاب چند تنبولی اور گورکھ تنبولی کے راستے سے امام باڑہ میر محمد غفور مرحوم آتا ہے۔ پھر وہاں سے چوک بچلا امام باڑہ ہو کر جناب محمد عنایت اللہ ریٹائرڈ اسٹیشن ماسٹر کے دروازے سے ہوتا ہوا چوک سید تیغ علی مرحوم و چوک بڑ کے پیڑ تلے آکر امام باڑہ وقف آتا ہے۔ وہاں سے صلکانی نور باف کی گلی سے چوک چوپال آتا ہے۔ وہاں سے چوک بیگن بی بی بیگم بابی ہو کر مسجد حاجی جمن انصاری کے شمالی راستے سے عزاخانہ سید مختار حسین میں واپس جاتا ہے۔

۳- حضرت علی اصغرؑ کے تابوت کا گشت

۵ر محرم کو ۹ بجے شب میں انجمن عباسیہ کی طرف سے ۱۹۳۲ء سے یہ گشت نکالا جاتا ہے۔ تاریخ مذکورہ میں یہ گشت مولوی سید مشتاق حسین صاحب قبلہ عابدی صدر انجمن عباسیہ کے عزاخانے سے اٹھتا ہے۔ مولانا کے عزاخانے سے یہ گشت چوک سید محمد تقی مرحوم پر آکر منشی گلاب چند معاون اسٹیشن ماسٹر اور گورکھ تنبولی کے مکان کے درمیانی راستے سے امام باڑہ میر محمد غفور مرحوم آتا ہے۔ وہاں سے چوک بچلا امام باڑہ و دروازہ محمد عنایت اللہ ریٹائرڈ اسٹیشن ماسٹر ہو کر بڑ کے پیڑ تلے آتا ہے وہاں سے امام باڑہ وقف ہوتا ہوا صلکانی نور باف کی گلی سے چوک چوپال آکر چوک بی بی بیگم پر آتا ہے۔ پھر وہاں سے حاجی جمن انصاری مرحوم کی مسجد کی شمالی گلی سے ہوتا ہوا چوک ابوالحسن مرحوم پر آتا ہے۔ پھر وہاں سے چوک میر زیارت حسین مرحوم پر آکر بازار ہوتا ہوا چوک میر بھیکھو مرحوم پر آتا ہے۔ وہاں سے رام لچھمن کلوار اور دواتی تیلی کی درمیانی گلی سے چوک بڑکی نیم تلے آتا ہے۔ وہاں سے عام راستے سے چوک شیخ نصیر پر آتا ہے۔ پھر وہاں سے

پلٹ کر ڈاک خانے کے پاس عام شاہراہ اختیار کر لیتا ہے اور مسجد سید تاج الدین کے چوک پر آ کر مولانا مذکور کے امام باڑے میں واپس آ جاتا ہے۔

علم کا گشت

یہ گشت زمانۂ قدیم سے قائم ہے یہ گشت بھی ۷ محرم کو ۱۲ بجے دن میں انجمن عباسیہ کے اہتمام سے اُٹھایا جاتا ہے۔ یہ گشت بڑکے برتلے سے اُٹھ کر حضرت علی اصغرؑ کے تابوت کے گشت کا راستہ اختیار کر لیتا ہے۔ چوک میر بھیکھو مرحوم پر آ کر پھر یہاں سے بازار میں پلٹ آتا ہے اور کیلاش تیلی کی گلی سے جولاہا پورہ چلا جاتا ہے۔ وہاں جناب شیخ ٹھگ انصاری ایک مجلس کرتے ہیں، بعد مجلس یہ گشت واپس آ کر دینی تیلی کے باغ کے شمالی راستے اور چھاؤنی سابق زمیندار مرزا نذیر الدین بیگ کی پشت کے راستے سے ہوتا ہوا جناب عبد الکریم انصاری کے دروازے سے عام شاہراہ ہو کر بڑکی نیم تلے آتا ہے پھر وہاں سے ۴ محرم کے تابوت کے گشت کا راستہ اختیار کر لیتا ہے چوک بڑکے برتلے آ کر یہ گشت مصری کوٹھری اور چھبیلا کوٹھری کے درمیانی راستے سے کربلا جاتا ہے۔ وہاں امام باڑہ وقف کی طرف سے ایک مجلس ہوتی ہے اس کے بعد مومنین اپنے اپنے گھروں کو رخصت ہو جاتے ہیں۔

تعزیہ کا گشت

عاشورا کے دن ۹ بجے صبح سے زیر انتظام انجمن عباسیہ تعزیہ کا گشت اُٹھتا ہے۔ کربلا پر اختتام کرنے کے بعد تعزیہ دار دو گروہ میں منقسم ہو کر بھولی اور جولاہا پورہ چلے جاتے ہیں۔ بھولی کا تعزیہ اسٹیشن کے مغربی کنارے سے لائن پار کرتا ہے اور بچلا امام باڑہ پر آ کر رک جاتا ہے جولاہا پورہ کا تعزیہ سومیرا اہیر کی گلی سے ہوتا ہوا چوک میر ابوالحسن مرحوم و چوک میر زیارت حسین مرحوم کا تعزیہ ساتھ لے کر چوک میر بھیکھو پر آتا ہے۔ وہاں کا تعزیہ لے کر چوک بڑکی نیم تلے براہ گلی رام لچھمن کلوار آتا ہے پھر چوک بی بی بیگم کا تعزیہ لے کر چوک چوپال و امام باڑہ وقف اور چوک بڑکے برتلے کا تعزیہ لے کر جناب محمد عنایت اللہ صاحب کے دروازے سے ہوتے ہوئے چوک بچلا امام باڑہ کا تعزیہ اُٹھایا جاتا ہے۔ اور امام باڑہ میر غفور علی مرحوم کا تعزیہ لے کر عزا خانہ مولوی سید مشتاق حسین صاحب قبلہ کا تعزیہ اُٹھا کر چوک مسجد سید تاج الدین و چوک میر محمد تقی مرحوم و چوک شیخ نصیر کا تعزیہ لے کر چوک بڑکی نیم تلے اکٹھا کیا جاتا ہے۔ چوک بڑکی نیم تلے ایک مجلس ہوتی ہے جس میں جناب محمد عنایت اللہ صاحب اپنے مخصوص انداز میں "حیدری" پڑھتے ہیں۔ بعد مجلس تعزیئے ترتیب سے جلوس میں شامل ہوتے ہیں، اس کے بعد نوحہ خوانی اور ماتم کا سلسلہ شروع ہوتا ہے، تعزیہ اکٹھا کرنے کے دوران سید ذوالفقار حسین صاحب سوز خوانی کرتے ہیں۔ جو گشتی مرثیے کہے جاتے ہیں۔ انجمن عباسیہ کا ماتمی دستہ نوحہ ماتم کرتا ہوا عام شاہراہ پر پہنچ کر سکھاری تیلی اور گاجر دھوبی کے راستے سے سادھو کلوار کے مکان کی طرف جاتا ہے۔ سادھو کلوار کے دروازے پر ایک تقریر بزبان ہندی واقعات کربلا پر ہوتی ہے۔ بعد تقریر یہ جلوس سندر بھڑبھونج کے راستے سے حکیم جناب نور محمد انصاری کے دروازے پر آتا ہے وہاں ایک تقریر بزبان اُردو بسلسلہ واقعۂ کربلا ہوتی ہے یہاں حکیم محمد صوبیدار صاحب سبیل رکھتے ہیں۔ یہاں سے جلوس امانت اللہ انصاری اور رام لچھمن گری کے راستے سے ہوتا ہوا براہ سندری تالاب عیدگاہ پر آتا ہے۔ وہاں سے تاج سر کے مشرقی کنارے سے ہو کر جنوبی کنارے ہوتا ہوا کربلا جاتا ہے۔ سہرہ دفن کرنے کے بعد امام باڑہ وقف کی طرف سے ایک مجلس ہوتی ہے۔ اس کے بعد عزادار شام غریباں کی مجلس کرنے سید مظہر عباس عابدی کے عزا خانے میں آ جاتے ہیں۔ اس طرح دن بھر کا یہ جلوس اختتام پذیر ہوتا ہے۔

⁂

ذاکرین و مدح خوان معصومینؑ

زمانہ قدیم کے حالات صرف سنی سنائی کا درجہ رکھتے ہیں اس لئے ان کا ذکر لاحاصل ہے۔ لیکن بعد کے زمانے میں اچھے ذاکرین کا پتہ چلتا ہے۔

مولوی سید رمضان علی مرحوم

بڑے ہی علم دوست اور ادب نواز اور ذی علم ہستی تھے۔ مرحوم کی قابلیت مسلم تھی بڑے اچھے ذاکر تھے۔

سید ریاضت حسین مرحوم

مرحوم بہت ہی ذی علم سنجیدہ اور منکسر المزاج تھے۔ عزاداری امام مظلوم کے شیدا اور اپنے وقت کے اچھے سوزخواں تھے۔

مولوی سید علیق اللہ مرحوم

مرحوم بہت ہی نیک نفس اور پاک طینت انسان تھے علمی و ادبی استعداد کافی تھی۔ ذاکری بھی کرتے تھے۔

شیخ پیر علی فدا مرحوم

اچھے شاعر تھے۔ مدح معصومینؑ خوب فرماتے تھے ۱۳۳۳ھ میں انتقال کیا۔ طرز تحریر بڑا ہی اچھا تھا۔ شاعری کا ذخیرہ اب بھی موجود ہے۔ بہت ہی خوشنویس تھے۔

مولوی سید محمد شفیع مرحوم

بڑے ہی عالم و فاضل بزرگ تھے۔ خطابت کے دلدادہ تھے ذاکری بڑے ہی اچھے انداز میں کرتے تھے۔ اچھے حکیم بھی تھے۔

شیخ علاؤالدین مرحوم

بڑے اچھے سوزخوان تھے بہت ہی نیک نفس اور خلیق اللسان تھے۔

میر سید صاحب مرحوم

سوزخوانی خوب فرماتے تھے۔ میر صاحب ساتھ میر زیارت حسین مرحوم اور سید وکیل احمد مرحوم سوزخوانی کیا کرتے تھے۔

سید ابرار حسین مرحوم

اچھے سوزخواں تھے۔ علم دوست انسان تھے۔

سید ظہیر حسن مرحوم

بڑے ہی متقی اور پرہیزگار انسان تھے سنہ ۱۹۱۳ء میں انجمن عباسیہ قائم کر کے باعث ترقی عزاداری امام مظلوم ہوئے۔ حدیث خوانی کا انداز بڑا ہی نرالا تھا۔ سنہ ۱۹۴۱ء میں انتقال ہوا۔

سید محمد غفور مرحوم

بڑے اچھے سوزخوان تھے نہایت نیک اور سنجیدہ طبیعت کے مالک تھے۔ امام باڑہ اپنے ہاتھ سے سجاتے اور پورے عشرہ سوائے مجلس ماتم کے کوئی کام نہ کرتے تھے۔

سید حسن نواب مرحوم

مرحوم بڑی خوبیوں کے مالک تھے سنہ ۱۹۵۲ء تک انجمن عباسیہ کے سکریٹری رہے۔ ذاکری خوب کرتے تھے۔

شیخ عطا حسین مرحوم

فارسی و عربی پر کافی دسترس تھی۔ اچھے حکیم تھے۔ مدح معصومینؑ خوب کرتے تھے۔

فی زمانہ مولوی سید مشتاق حسین صاحب قبلہ، سید احمد حسن کاظمی برجستہ ذاکری و حدیث خوانی خوب کرتے ہیں۔ سید ذوالفقار حسین صاحب سوزخوانی اور سید شاکر حسین صاحب، سید بشیر محمد کاظمی صاحب، سید آغا حسن صاحب و سید رازق حسین صاحب اچھی نوحہ خوانی کرتے ہیں۔

ایام عزا میں اہل اسلام کے دیگر فرقے اور اہل ہنود حضرات مجالس و جلوس میں برابر شریک رہتے ہیں۔ اہل ہنود کی مستورات چھڑ چڑھاتی ہیں اور منتیں مانتی ہیں۔ کئی ہندو تعزیہ دار بھی ہیں۔ اس طرح ہندوستان بھی مل کر ایام عزا کے پُرعظمت دنوں کو مناتے ہیں۔

تعلقہ نوں ضلع جونپور کی عزاداری

.... مقالہ: مولوی محمد یحییٰ صاحب فاضل، بی۔ اے، بی ٹی۔ (وائس پرنسپل گورنمنٹ ٹریننگ اسکول رانچی)
(رکن اعلیٰ انجمن ذوالفقار حیدری، نوں جونپور۔)

تعلقہ نوں شہر جون پور سے ۱۷ میل مغرب جونپور، سلطان پور روڈ پر واقع ہے۔ یہ تعلقہ سات موضعوں میں تقسیم ہے۔ موضع نوں نیز جونپور واعظم گڈھ کے تقریباً ۲۵ مواضع، مثلاً لیری، کیسواں، راجہ پور، دیبا پور وغیرہ، علی بیرم خاں مرحوم کی اولاد سے ہیں۔

خان مرحوم بایماء شہنشاہ ایران بادشاہ ہمایوں کی امداد کے لئے اپنی فوج لیکر آئے تھے۔ خان مرحوم مجتہد اثنا عشری شیعہ مومن تھے۔ ان کی اولاد جہاں جہاں بھی آباد ہوئی ہیں سبھی زمیندار تھے۔ نیز مذہبی معاملات میں ہمیشہ پیش پیش رہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ بعد خاتمۂ زمینداری دیگر حالات میں جو کچھ بھی ہو لیکن عزاداری میں روز افزوں ترقی ہے۔ افراد قوم بھی شیعہ ہیں۔ بے شک چند گھر اہل سنت کے بھی ہیں لیکن سب ہی محبان اہلبیت و عزادار ہیں۔ دونوں میں شادی بیاہ اب بھی ہوتا ہے۔ موجودہ تعصب کا گویا یہاں کے شیعوں پر کوئی اثر نہیں ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عزاداری کا مستقل سلسلہ اور ذریعہ بزرگوں نے ایسا رکھ دیا تھا جو آئندہ نسلوں کے لئے بوجھ نہ بن سکے وہ یوں کہ ہر گاؤں میں نذر حسینؑ کے نام سے کچھ جائداد مشترکہ طور پر وقف ہے جس کی پوری آمدنی صرف عزاداری پر خرچ کی جاتی ہے ہر گاؤں کا مشترکہ سرکاری امام باڑہ و چوک ہے جو تمام اہل موضع کے خرچ سے بنا ہے۔ اہتمام مجالس و جلوس، کا انتظام یوں ہے کہ روزانہ کم از کم ایک بڑی مجلس ہو۔ جس میں ساتوں مواضع کے مومنین نیز مومنین قصبہ بھی شرکت کر سکیں۔ اسکے علاوہ ہر گاؤں کی اپنی اپنی مقامی مجلسیں بھی گاؤں کے امام باڑے میں ہوتی ہیں جس میں صرف اس گاؤں کے لوگ ہی شرکت کرنے آتے ہیں۔ مجالس کی کثرت کی وجہ سے دوسرے کاموں کے لئے وقت ہی نہیں بچتا۔ اور دس دن تک پورے تعلقہ کا سارا کام معطل رہتا ہے۔ دس روز ہی مرد امام باڑے میں سوتے ہیں۔ عورتیں تا یوم عاشورہ گھر ہی میں چارپائی الٹ کر سوتی ہیں۔ سارا ماحول سوگوار ہو جاتا ہے۔

طبل و تاشہ کی تیاری۔ شہر و ضلع جونپور کے تعلقات میں ایام عزا کی تبلیغ، تشہیر کے لئے بڑے بڑے طبل بنائے جاتے ہیں۔ جن کی لمبائی ۴ فٹ اور قطر تین فٹ ہوتا ہے۔ ایسے ۵ یا سات طبل ہر موضع میں تیار ہوتے ہیں۔ جن کی تیاری اور بناوٹ دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ طبل صرف ایام عزا، محرم اور صفر میں بجائے جاتے ہیں۔ باقی دنوں میں نہیں۔ ہوتا یہ ہے کہ بقر عید کے دوسرے دن سے سرکاری تعزیہ (ضریح) اور طبل کی تیاری میں سبھی اہل موضع لگ جاتے ہیں۔

شیعہ سنی اور ہندوؤں کا بے نظیر اتحاد

محرم کا چاند نمودار ہوا اور ادھر طبل غم پر چوب پڑی۔ طبل بجتے ہی قرب وجوار کے تمام ہندو مسلم کو معلوم ہو جاتا ہے کہ آج سے محرم شروع ہو گیا۔ اسی دن سے تمام خوشی کی تقریبات موقوف ہو جاتی ہیں۔ آس پاس کی تمام ہندو مسلم عورتیں امام چوک پر آکر اپنی چوڑیاں بڑھاتی ہیں اور سوگ نشین ہو کر تاسی اہل بیتؑ میں مصروف ہو جاتی ہیں ایسا دیکھا گیا ہے کہ بعض عورتیں دس روز شب و روز زیر آسمان ہی رہ کر سنت جناب رباب پر عمل پیرا ہوتی ہیں غیر مسلم عورتوں کا گروہ جب راہی (عزائیہ گیت) پڑھتا ہوا امام چوک پر آتا ہے تو زبان بیان؛ طرز اتنا رقت خیز ہوتا ہے کہ بے اختیار آنکھوں سے سیلاب اشک جاری ہو جاتا ہے اسے مظلومیت کا اثر کہئے یا بزرگوں کی رواداری اور برادران ہنود اور برادران اہل سنت سے برادرانہ تعلقات کی استواری کہ باوجود سب کچھ ہو جانے کے آج بھی ہندو بھائی بھی عزاداری سے ویسا ہی شغف رکھتے ہیں جیسا کہ پہلے!

طبل بجتے ہی دیہی سوگواریت تمام ماحول پر چھا جاتا ہے۔ سارے گاؤں، شادی بیاہ خوشی کی تقریبات موقوف ہو جاتی ہیں مجلسوں اور دیگر رسوم عزا میں بڑھ چڑھ کر اور دیگر مذہب و ذات کے لوگ اپنے اپنے ذمہ کا کام سنبھال لیتے ہیں۔ امداد باہمی کا ایسا نقشہ کسی بھی دوسرے موقع پر نظر نہیں آتا۔

تعزیہ:- ہر امام باڑہ کا ایک سرکاری تعزیہ (ضریح) ہوتا ہے جس کی تیاری گاؤں کے لوگ ہی کرتے ہیں۔ بناوٹ اور سجاوٹ میں تقابل کی نیت تو ضرور ہوتی ہے لیکن تعمیری تقابل نے نتیجہ میں خوشنمائی اور زیبائی ہمیشہ نئے زاویئے اختیار کرتی جاتی ہے۔ بحمد اللہ تعزیہ بنانے میں جدید تعلیم یافتہ حضرات [illegible] [illegible]یوں کا اضافہ کیا ہے۔

تبرک:- ہمارے بزرگوں نے تقسیم تبرک کے سلسلہ میں جو راستے اپنائے ہیں وہ آج تک روزافزوں ترقی پر ہیں۔ وہ یوں کہ اگر کوئی شخص تعلق کی سبھی مجلسیں کرے تو پورا سے کھانا پکانے کی زحمت نہ کرنا پڑے۔ ہر طرح کے تبرک کی تقسیم عمل میں آتی ہے۔ روٹی، سالن، پلاؤ، شیرینی، چائے، شربت وغیرہ،

اسی طرح مومنین کو مجلسوں میں شرکت کا پورا وقت ملتا ہے۔ نیز دیگر اقوام پوری تعداد میں شرکت کر کے عظمت اہلبیتؑ اور حقانیت اسلام سے روشناس ہوتے ہیں۔

ماتمی دستہ:- ہر موضع کا اپنا ماتمی دستہ ہوتا ہے۔ جو بقرعید کے دوسرے روز سے نوحوں اور ماتم کی مشق میں لگ جاتا ہے۔ نوحے مقامی اور بیرونی شعراء کے پیش کئے جاتے ہیں۔ نوجوان اراکین انجمن، اور صاحبان بیاض کے ریاض کو دیکھ کر بے اختیار دل سے دعائیں نکل جاتی ہیں۔ یہاں پر بزرگوں اور نوجوانوں میں نوحوں کو لیکر ضرور کچھ اختلاف ہے۔ بزرگ حضرات نوحوں کا سبکی ہونا شرط اول قرار دیتے ہیں۔ جبکہ نئے طبقے کے لوگ ہر طرز و ادا کے نوحوں میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ خصوصاً جدید شعراء جیسے نجم، فضل، نظمی، ناطق، یحیٰی، ناصری صاحبان کے نوحے بہت مقبول ہیں۔

(خدا کرے یہ اختلاف تعمیری حد تک ہی محدود رہے کبھی کوئی ناخوشگواری کی صورت پیدا نہ ہو)

سرفراز

بہر حال مشترکہ مفادات اور دل پسند کسی طرح بھی نفس نوحہ خوانی اور نظم انجمن میں مخل نہیں ہوتی۔

اس سلسلہ میں رحمن پور کی انجمن ذوالفقار حیدری نے ماشاء اللہ بڑی ہی ترقی کی ہے۔

سبیلی باغ:- موضع نصیرپور میں یہ باغ جونپور روڈ پر واقع ہے۔ جہاں ایک مسجد پختہ بھی ہے۔

محرم میں دس روز سبھی ہندو مسلمانوں کے لئے ۲۴ گھنٹہ ٹھنڈے پانی اور شربت کا انتظام رہتا ہے۔ سبیل نذر حسینؑ کوئی پیاسا نہ جائے۔

پانی پیو تو یاد کرو پیاس امامؑ کی
پیاسو سبیل ہے یہ شہیدوںؑ کے نام کی

چاروں طرف آویزاں کتبے لوگوں کو مظلوم کی پیاس یاد دلاتے ہیں اور امامؑ کے مشن سے روشناس کرتے ہیں۔

خاص مجلسیں اور جلوس:- صدرالدین پور یا چانہ رات وقف بچن خاں مرحوم، شب دویم، مجلس وارث حسین خاں مرحوم، شب سوم مصطفیٰ حسین صاحب کی مجلس، ذوالجناح کی شبیہ برآمد ہوتی ہے۔ شب پانچویں، مجلس اور شبیہ تابوت شبیہ پیغمبرؐ، تبرک کی تقسیم سبھی میں اعلیٰ درجہ کی ہوتی ہے، پلاؤ، امرتی وغیرہ۔

دکنی پٹی:- شب چہارم میں مجلس کے بعد جلوس تابوت شبیہ پیغمبرؐ برآمد ہوتا ہے۔ اسی شب کو انجمن ذوالفقار حیدری دہکتے ہوئے انگاروں پر ماتم کرتی ہے اور جوناپی کفنی پہنے ہوئے ماتمدار آگ پر چلنے کے لئے امام باڑے سے یا حسینؑ یا حسینؑ کہتے نکلتے ہیں۔ ان کے ساتھ ہزاروں ہندو مسلم ماتمدار یا حسینؑ کا نعرہ بلند کرتے ہیں۔ اور ماتمداروں پر پھولوں کی بارش کرتے ہیں۔ ماتمدار خلیل کربلا کی تاسی میں انگاروں پر چل کر یا نار کونی بردا کا منظر پیش کرتے ہیں۔

اس موضع کی ساتویں کی مجلس نہایت شاندار ہوتی ہے جو وقف شیدہ بی بی کی طرف سے ہوتی ہے۔ نویں کی مخصوص مجلس جناب ظہور حسین خانصاحب کی قائم کردہ نہایت مقبول ہوتی ہے۔ دونوں میں شبیہ ذوالجناح اور تابوت برآمد ہوتے ہیں۔

بڑی پٹی:- جناب علی رضا خاں صاحب کے امام باڑہ میں پورے عشرے میں بڑی مجلسیں ہوتی ہیں جن میں بیرونی ذاکرین کا بیان ہوتا ہے۔ مجلس کا تبرک اور دیگر امور نہایت اولوالعزمی کے حامل ہوتے ہیں۔ خصوصاً پانچویں کی مجلس میں پورا کھانا تقسیم ہوتا ہے اور حاضری ہوتی ہے۔

محمد پورہ:- پہلی اور ساتویں کی مجلسیں اور نویں رات نہایت اہتمام سے ہوتی ہیں۔ ساتویں کی مجلس جناب بوعلی خاں صاحب مرحوم کی طرف سے ہوتی ہے اور پورا کھانا اب بھی تقسیم ہوتا ہے۔ نہایت اولوالعزمی سے مجلس کرتے ہیں۔

انڑ پٹی:- قائم علی خاں، انور حسین، خانصاحبان کی مجلسیں بڑے اہتمام سے ہوتی ہیں۔

پورہ شیر خاں:- گو کہ موضع بہت چھوٹا ہے۔ لیکن یہاں موضع زراخدلی میں اور دو بڑی مجلسیں مرحوم یادعلی خاں صاحب اور محمد تقی خاں صاحب کی طرف سے ہوتی ہیں جس میں پلاؤ تقسیم ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ تمام موضعات میں پورے عشرہ محرم مجالس کا بہت بڑا سلسلہ جاری رہتا ہے جس کا بیان طوالت کا باعث ہوگا۔

شب عاشورہ:- سبھی موضعات میں انفرادی اور اجتماعی طور پر اعمال عاشورہ شب بیداری کا انتظام ہوتا ہے۔ شب عاشور لگاتار لاؤڈ اسپیکر پر مجلسیں اور نوحہ خوانی نشر ہوتی رہتی ہے۔ بعد نصف شب سبھی سرکاری امام باڑوں میں مجلسیں ہوتی ہیں بعد مجلس نوحہ وماتم کے ساتھ چوک پر تعزیہ رکھا جاتا ہے۔ پائیں شب سبھی گھروں سے نذر امام کے کھانے اور شربت آتے ہیں اور امام چوک پر نذر کی جاتی ہے رات بھر ہندو خواتین داہیہ (عزائیہ گیت) پڑھتی اور اپنے ہاتھوں میں موم بتی یا چراغ لیکر لگاتار ایک چوک سے دوسرے چوک تک آتی جاتی اور طواف میں مصروف رہتی ہیں۔ اور بہ جذبات شہید

اپنی مرادیں پوری کراکے رہتی ہیں۔

اعمال روز عاشورہ:- عاشورہ کس میدان میں سبھی مواضع میں اعمال بجالائے جاتے ہیں۔ دکھن پٹی میں نئی باغ مسجد میں اعمال عاشورہ کا انتظام علی الخصوص ہوتا ہے۔ جس میں دیگر مواضعات کے حضرات بھی شرکت کرتے ہیں۔ جس کی قیادت عموماً مولوی محمد یحییٰ صاحب کرتے ہیں۔

بعد نماز ظہر سارے مواضع کے سبھی تعزیے اور علم کے جلوس بعد الوداعی مجلس اٹھائے جاتے ہیں۔ سب سے آگے طبل، پھر علم اس کے بعد ماتمی دستے پھر تعزیے، اس طرح یہ جلوس مخدوم شاہ کے باغ میں ملتے ہیں۔ یہاں پر سبھی مواضع کے طبل نواز حضرات اپنے اپنے فن اور ریاض کا نمونہ پیش کرتے ہیں۔ یہاں پر تقریباً مجمع دس ہزار کا ہوتا ہے۔ یہاں سے یہ ہندو مسلم کا مشترکہ مجمع صدر امام باڑہ کی جانب بڑھتا ہے۔ صدر امام باڑہ سے کچھ دور پر مورث اعلیٰ بیرم خاں مرحوم کی قبر پر سبھی فاتحہ پڑھتے ہیں۔ اسی دوران انجمن ذوالفقار حیدری زنجیر اور قمع کا ماتم شروع کرتے ہیں۔ صدر امام باڑے تک پہونچتے پہونچتے اہل ماتم خون سے شرابور ہو جاتے ہیں۔ یہاں پر مجمع کا یہ عالم ہوتا ہے کہ راستہ ملنا مشکل ہو جاتا ہے۔ سیکڑوں دوکانیں لگ جاتی ہیں۔ عوام کچھ خرید و فروخت تو ضرور کرتے ہیں۔ لیکن مومنین قطعاً پرہیز کرتے ہیں۔ پان کی دوکانیں بند رکھی جاتی ہیں۔ کسی مذہب کے لوگ سر و پا برہنہ رہتے ہیں حتیٰ کہ انتظامیہ پولیس بھی اسی احترام کو مد نظر رکھتی ہے۔ صدر امام باڑے پر مرحوم شبیر علی خاں صاحب کی طرف سے سبیل کا انتظام ہوتا ہے۔ علی الخصوص ہندوؤں کے لئے۔ جناب علی رضا خاں صاحب کی طرف سے یہاں پر فاقہ شکنی کا بہترین انتظام ہوتا ہے۔ تعزیہ دفن کرنے کے بعد فاتحہ خوانی ہوتی ہے۔ اور مومنین اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہو جاتے ہیں۔ بعد نماز مغرب ہر موضع میں مجلس شام غریباں ہوتی ہے۔ ادر ادھر چند برسوں سے کراچی اور لکھنؤ کی مجلسیں بھی ریڈیو سے سنانے کا انتظام کیا جاتا ہے۔ سارا مجمع خاک نشین اور سوگوار ہوتا ہے۔ یہ مجلس اتنی رقت آمیز ہوتی ہے کہ لوگ بے ہوش ہو جاتے ہیں۔

۱۲ محرم کو سوئم شہیدائے کربلا کی مجلس ہوتی ہے۔ سبھی گھروں سے نذر امام کے کھانے اور شربت آتے ہیں۔ جو غریبوں کو تقسیم کر دیئے جاتے ہیں۔

امام باڑے کا اور دیگر اوقات کا سالانہ حساب مومنین کے سامنے پیش کر کے متولی صاحبان آئندہ عشرہ (چہلم) کا بجٹ پیش کرتے ہیں۔ اس طرح عشرہ محرم ختم ہوتا ہے۔

ذاکرین:- ایام عزا میں بیرونی ذاکرین تو آتے ہی ہیں۔ لیکن مقامی ذاکرین کی باوجود مصروفیت کار، محنت اور رقت وہی کی داد دینی پڑتی ہے۔ ان کے اسمائے گرامی بھی لکھ دینا چاہئے۔

ذاکرین۔ الحاج مولوی قمر حسن خاں صاحب ریٹائرڈ، رجسٹرار کوآپریٹو، سوسائٹیز۔ ۲۔ ناچیز راقم الحروف محمد یحییٰ خاں ——، مولوی علی احمد صاحب تاجر۔ مولوی غلام عباس صاحب رئیس بڑے پٹی۔ مولوی علی امام صاحب میں پٹی

مرثیہ خواں:۔ جناب انور حسین خاں صاحب ذاکر کلام مرزا دبیر مولوی علی امام صاحب ذاکر میرانیس۔ جناب اصغر صاحب عموماً اپنے جد امجد جناب جعفر خاں صاحب کا کلام پڑھتے ہیں۔

نوحہ خوان:- یحییٰ ناصری صاحب عموماً خود اپنے تصنیف کردہ نوحے انجمن ذوالفقار حیدری کی طرف سے پڑھتے ہیں۔

(۱) جناب دلنشین حسین خاں صاحب۔ صدر الدین پور۔
(۲) ،، ،، انور حسین خاں صاحب، اتر پٹی۔
(۳) ،، علے حسین خاں صاحب ۔ دکھن پٹی
(۴) ،، ،، واصف حسین ،، ،،

(۵) جناب انور حیدر صاحب ۔ دلہن پٹی ۔
(۶) " آل حسن خاں صاحب " "
(۷) " ابرار حسن صاحب (اسسٹنٹ ماسٹر ضلع اسکول ہزاری باغ ۔
(۸) " مشتاق احمد صاحب ۔ انجینئر اسندری کارپوریشن (بہار)

سوز خوان :- قربان علی خاں صاحب ۔ دلہن پٹی ۔
علی رضا خاں صاحب ۔ صدر الدین پور ۔

اس کے علاوہ دیگر حضرات ذاکرین بھی ذکر و فضائل و مصائب سے مومنین کو مستفیض کرتے ہیں ۔

اس موقع پر جناب محمد جعفر خاں صاحب مرحوم اور جناب فیاض حسین خاں صاحب مرحوم بہت یاد آتے ہیں ۔ جو دس روز محرم میں شانی ذکر الحسین ہونے والی ہر مجلس کی شرکت و بے تکلف ذاکری سے ایک امید حسنہ قائم کر گئے ۔

خصوصیات ایام عزا ارنول

۱۔ علمی اور نظری امور میں خود کفیل ۔
۲۔ مجالس میں کمی سے اوقات کی پابندی ۔
۳۔ ہندو مسلم اور تمام فرقوں میں اتفاق باہمی یگانگی اور جذبہ امداد باہمی ۔
۴۔ سبھی مذاہب کے مطابق سبیل کا انتظام ۔
۵۔ نوحہ خوانی اور ماتم میں بھی بچوں کے لوگوں کی لازمی شرکت ۔
۶۔ جلوس عزا میں سبھی کا سر و پا برہنہ رہنا ۔ ایام عزا کا احترام ۔
۷۔ تعزیہ اپنے ہاتھ سے بنانا ۔

امامیہ مشن کے مندرجہ ذیل جواہر پارے ضرور ملاحظہ فرمائیے

نمبر	کتاب	قیمت
۱	قاتلانِ حسینؑ کا مذہب (مجلد گرد پوش)	قیمت تین روپیہ
۲	تحریف قرآن کی حقیقت	تین روپیہ
۳	اسوۂ حسینی	دو روپیہ
۴	رسول کی حکیمانہ زندگی	دو روپیہ
۵	لا تفسدوا فی الارض	دو روپیہ
۶	متعہ اور اسلام	چار روپیہ
۷	صحیفۂ اعمال (مجلد مع گرد پوش) سال بھر کے ہر ماہ کے اعمال موثر بہ	قیمت پانچ روپیہ
۸	رہنمایانِ اسلام	دو روپیہ
۹	تاریخ اسلام حصہ اول	دو روپیہ
۱۰	تاریخ اسلام حصہ دوم	دو روپیہ
۱۱	تاریخ اسلام حصہ سوم (زیر طبع)	دو روپیہ

ملنے کا پتہ :- سکریٹری امامیہ مشن ، لکھنؤ نمبر ۳ ۔ (ہندوستان)

شاہانِ اودھ کے عہد میں جلالی کی عزاداری کا فروغ

(حاذق الاطبا جناب حکیم سید محمد کمال الدین حسینی ہمدانی صاحب)
متولی امام باڑہ حصار جلالی ضلع علی گڑھ

شاہان اودھ کے عہد میں فیض آباد اور پھر لکھنؤ مرکز عزاداری بنا۔ شاہان اودھ نے عزاداری کے فروغ کے لئے جو انتظام و اہتمام کیا وہ تاریخ شیعیت میں اظہر من الشمس ہے عظیم الشان امام باڑے، کربلائیں اور روضات مقدسہ کی شبیہیں تعمیر کرائیں اور ان کو [illegible] بیش قیمت سامان عزا سے مزین فرمایا سونے کے تعزیے اور ضریحیں سجائیں محرم سے چہلم تک عزاداری کا سلسلہ قائم کیا۔ نہایت شاہانہ کروفر کے ساتھ جلوس عزا نکالے۔ مصارف عزا کے لئے بڑے بڑے اوقاف کئے خود مرثیہ خوانی اور مرثیہ گوئی کی اور دیگر ماہرین مرثیہ خواں و مرثیہ گو حضرات کی سرپرستی فرمائی۔ حتیٰ کہ شاہان اودھ کے عہد زریں میں اودھ کا مرکز لکھنؤ اعلیٰ پایہ کا بے مثال مرکز عزا بن گیا۔ اور دنیائے شیعیت میں عزاداری کے لحاظ سے ممتاز ہو گیا۔ اور در حقیقت ہے کہ شاہان اودھ جو ایرانی النسل تھے عزاداری میں نمایاں کارنامہ انجام دیا جو شاہان صفویہ نے ایران میں انجام دیا۔

تاریخ اودھ میں شاہان اودھ کے اُن کارناموں کا ذکر تو واضح طور پر کیا جاتا ہے جو لکھنؤ سے متعلق ہیں لیکن اُن کارناموں پر روشنی نہیں ڈالی جاتی جو لکھنؤ کے علاوہ اودھ کے مختلف گوشوں کے فروغ عزاداری سے متعلق ہیں حالانکہ تاریخ شیعیت اور تاریخ عزاداری کے لحاظ سے یہ کارنامے بھی بڑی اہمیت رکھتے ہیں اس لئے کہ ان کارناموں کی روشنی میں شاہان اودھ کے جذبہ تبلیغ شیعیت کی وسعت کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ شیعیت و عزاداری کا عروج صرف مرکز اودھ لکھنؤ ہی میں نہ دیکھنا چاہتے تھے بلکہ اودھ اور اودھ سے باہر ملک کے ہر گوشہ میں شیعیت اور عزاداری کے فروغ کے حامی تھے۔ اور اسی مقصد کے تحت انھوں نے لکھنؤ ہی کی عزاداری میں دلچسپی نہیں لی بلکہ لکھنؤ سے دور دراز دیہات و قصبات کی عزاداری میں بھی دلچسپی لی اور عزاداری کی معاونت اور ہمت افزائی فرمائی۔ بقول جناب صادق حسین صاحب یہ ایک قابل انکار حقیقت ہے کہ آج جس اہتمام سے ہم عزاداری کرتے ہیں اور جو انہماک و وسعت عزاداری کے سلسلہ میں نظر آتی ہے یہ سب شاہان اودھ کی رہین ہے ورنہ ممکن نہ تھا کہ عزاداری اس منظم طریقہ پر کرنے کے ہم لوگ اہل ہوتے۔

جلالی (ضلع علی گڑھ) مرکز اودھ سے بہت دور ایک قریہ ہے جو زمانہ قدیم میں سرکار کول کے ماتحت تھا اور یہ اُن قریات میں سے ہے جن کو شاہان اودھ کی خصوصی توجہ اور معاونت عزاداری کے سلسلہ میں حاصل ہوئی ہے اور جن کو سلسلہ عزاداری مرکز اودھ

لکھنؤ سے خصوصی فیض پہونچا ہے چنانچہ پیش نظر مضمون میں اسی تاریخی حقیقت پر اختصار کے ساتھ روشنی ڈالنا مقصود ہے۔

جلالی

سادات ہمدانی شیعہ اثنا عشری کی ایک قدیم بستی ہے جو علی گڈھ میں جانب شرق کالی ندی کے کنارے پُر فضا مقام پر آباد ہے یہاں قدیم ترین تاریخی عمارت مسجد حصار جلالی ہے جو بعہد سلطان غیاث الدین بلبن ۶۶۵ھ میں تعمیر ہوئی، جلالی میں اس مسجد کی بنا کا سبب یہ تھا کہ سلطان غیاث الدین بلبن نے دوابہ کے رہزنوں کی سرکوبی کے بعد یہاں ایک چھوٹا قلعہ "حصار جلالی" کے نام سے تعمیر کرایا اور اس میں افغان فوج رکھی تھی چنانچہ بغرض عبادت یہ مسجد متصل حصار تعمیر ہوئی۔ جلالی کے نزدیک کالی ندی کے کنارے سلطان جلال الدین فیروز خلجی نے ایک محل بھی تعمیر کرایا تھا جو تاریخ میں کوشک فیروز کے نام سے مشہور ہے اور جہاں سلطان سکندر لودھی کی تاج پوشی ہوئی عوام اس مقام کو کٹ کھیر کہتے ہیں۔ افغانوں کے بعد ہندوستان میں مغلوں کی حکومت قائم ہوئی۔ مغلوں نے افغانوں کا اقتدار توڑا اور اپنا اثر و اقتدار قائم کیا۔ چنانچہ اسی سلسلہ میں حصار جلالی بھی افغانوں کے ہاتھ سے نکل کر مغلوں کے قبضہ میں پہونچا اور مغلوں نے یہ قلعہ سادات ہمدانی کو عطا کیا سادات ہمدانی نے حصار جلالی کو از سر نو آباد کیا حصار یعنی گڈھی کے علاوہ دیگر محلے سادات کے ناموں کے ساتھ منسوب ہوئے مثلاً محلہ جانان بنام سید جان محمد محلہ نصیر بنام سید نصیر محلہ مبارک بنام سید مبارک محلہ امیر بنام سید امیر اور محلہ ابوالفضل بنام سید ابوالفضل آباد ہوئے۔

مسجد حصار جلالی بھی سادات ہمدانی کی تولیت میں درست و بہتر حالت میں رہی۔ الحاج سید مہدی علی مغفور نے بیش قیمت مسی کلس طلائے خالص سے مطلا کرا کے نذر مسجد کئے۔ دیگر سادات جلالی نے جو اوقاف رجسٹرڈ کرائے ان میں اس مسجد کے لئے بھی رقم مخصوص فرمائی جس سے مسجد کے مصارف پورے ہوتے رہے۔ مسجد کے متصل مسجد کے احاطہ میں ایک امام باڑہ بھی تعمیر ہوا جس کے متولی سید ظہیر محمد صاحب سوز خواں ہیں۔

جلالی ضلع علی گڈھ میں عزاداری کے لئے قدیم سے مشہور و معروف ہے۔ سادات ہمدانی شیعہ اثنا عشری قطب ربانی میر سید علی ہمدانی علیہ الرحمہ صاحب مودۃ القربیٰ کی نسل سے ہیں۔ قرائن تاریخی سے واضح ہوتا ہے کہ آپکے پوتے میر کمال الدین عز ہمدانی دور ہمایوں میں آئے اور آپ کو حصار جلالی عطا کیا گیا۔ اور مسجد حصار جلالی بھی آپ کی تولیت میں آئی۔ آپ اور آپ کے فرزندان نے جلالی میں عزاداری کی ابتدا فرمائی اور ایرانی رسم عزا روضہ خوانی (بزبان فارسی) کو رواج دیا۔ اور فارسی مرثیہ ملا محتشم کاشی علیہ الرحمہ کو رواج دیا۔ یہ رسم بعد کو مجلس اردو میں تبدیل ہوگئی اور فضل علی فضلی کے اردو ترجمہ ۱۱۴۵ھ کے بعد جلالی میں بھی وہ مجلس اردو زبان میں رائج ہوئی اور یہ رسم قدیم جس سے جلالی میں سادات ہمدانی کے عزاداری کی قدامت واضح ہے بحمداللہ اس دور میں بھی جاری ہے۔ سادات ہمدانی کے امام باڑوں میں محرم میں ہر مجلس کی ابتدا دہ مجلس سے کی جاتی ہے۔ تفصیل کے لئے میرا مقالہ "روضہ خوانی اور دہ مجلس" ملاحظہ ہو جو شیرازہ سرینگر ماہ مارچ ۱۹۷۵ء میں شائع ہوچکا ہے۔

دہ مجلس کے علاوہ ۱۱۵۹ھ کی کاتب علیہ الرحمہ کی تصنیف کردہ منظوم اوراق بھی ۱۱۵۹ھ جلالی میں

قدیم سے رائج ہے۔ صبح عاشورہ بڑا امام باڑے میں پڑھی جاتی ہے جس کا مطلع ہے سے جب حسینؑ رن کو چلے رو رو کہا بیت الوداع۔ جلالی کے امام باڑوں میں جو علم سجائے جاتے ہیں ہو بہو یہ علم اُن علم مبارک سے مشابہت رکھتے ہیں جو خانقاہ معلیٰ سری نگر کشمیر میں تبرکات میر سید علی ہمدانی علیہ الرحمۃ ہیں اور حجرۂ مبارک کے متصل شیشہ کی الماری میں مزین ہیں اور جن کی زیارت سے احقر بھی مشرف ہو چکا ہے۔ علم مبارک پر اللہ محمدؐ اور علیؑ اسمائے مبارکہ منقوش ہیں۔

تاریخی روشنی میں واضح ہے کہ جلالی میں عزاداری کی ابتدا تو شاہان مغلیہ کے ابتدائی دور میں ہو چکی تھی ہمایوں ایرانی بادشاہ طہماسپ صفوی کی امداد سے فتحیاب ہوا تھا۔ اس لئے ایرانیوں کے لئے حکومت مغلیہ کے دروازے کھل گئے۔ اور ایرانی اعلیٰ منصب سے نوازے گئے۔ میر کمال الدین حسین ہمدانی اسی دور میں تشریف لائے۔ معاہدہ کے مطابق مذہبی آزادی شیعوں کو حاصل تھی چنانچہ آپ نے مذہب شیعہ کی تبلیغ عزاداری کے ذریعہ جلالی میں شروع کر دی۔ اور ایرانی مراسم عزا کو رواج دیا۔ لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جلالی کی عزاداری کا فروغ شاہان اودھ کے عہد میں ہوا اس سلسلہ میں تاریخی حقائق حسب ذیل ہیں۔

نواب شجاع الدولہ مرزا جلال الدین حیدر کے عہد میں سادات ہمدانی مسکونہ جلالی سے ایک بزرگ قطب الدین [illegible] سید شاہ خیرات علی ہمدانی [illegible] کو دربار اودھ میں تشریف [illegible] باریابی حاصل ہوا۔ آپ صاحب علم و حکمت اور صاحب کشف و کرامت تھے۔ نواب صاحب کو آپ کی ذات ستودہ صفات سے عقیدت پیدا ہو گئی اور آپ کی سفارش پر نواب صاحب [illegible] جلالی پہونچے اور محرم کی عزاداری جلالی ہی کی نواب صاحب کے ہمراہ نواب فرخ آباد نواب مظفر جنگ بھی تھے۔ دوران عزا امام باڑہ شاہ موصوف میں ایک معجزہ رونما ہوا۔ اور وہ یہ کہ ابتدائے مجلس میں سخت آندھی آگئی جس سے تمام چراغ گل ہو گئے۔ مگر وہ چراغ کہ جس کی روشنی میں شاہ موصوف مصروف روضہ خوانی تھے مسلسل روشن رہا۔ نیز نواب صاحب کے خیام کو بھی کچھ گزند آندھی سے نہ پہونچا۔ اس معجزہ کو دیکھ کر نواب مظفر جنگ شیعہ ہو گئے۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو۔ لوح تاریخ منور علی خاں، تاریخ فرخ آباد ولیم ارون اور تاریخ اودھ حکیم مولوی نجم الغنی رام پوری۔ نواب شجاع الدولہ بہادر کے بعد نواب غفراں مآب آصف الدولہ بہادر نے امام باڑہ سید شاہ خیرات علی علیہ الرحمہ کے مصارف کے لئے پانچ مواضعات مال پور، کمال پور، نورنگا، نرولی اور مبارکپور معافی ضلع بدایوں (حال ضلع ایٹہ) وقف و معاف علی الدوام باسم سید شاہ خیرات علی مع فرزندان فرمائے۔ جن میں اول الذکر چار مواضعات انگریزی دور حکومت میں ضبط ہو گئے۔ مگر موضع مبارکپور واگذاشت ہوا جیسا کہ تجویز کمشنر خاص الضلاع عظیم آباد بنارس وغیرہ مرقومہ ۲۳ اگست سنہ ۱۸۳۲ء سے واضح ہے۔ وقف مبارکپور کے متعلق ایک پروانہ کی نقل حسب ذیل ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مہر نواب آصف الدولہ بہادر

برائے نیاز حضرات ائمہ معصومین صلوات اللہ علیہم اجمعین

پروانہ بجناب صاحب المناقب علی خاں صاحب

مرقومہ بست و ہشتم شہر محرم الحرام ۱۲۰۳ھ منصرمان حال و استقبال [illegible] موضع مبارک پور باسم سید شاہ خیرات علی صاحب مع فرزندان

از قدیم مقرر و معاف واگذاشت است لہذا نگارش میرود کہ الحال ہم موضع مذکور در تعلق دلعرفت مشارٌالیہ معافی فرزندان واگذاشت دارند حسب این حید بعمل۔

مُہر حاکم

نواب شجاع الدولہ بہادر کے جلالی میں مع لشکر عزاداری کرنے، نواب مظفر جنگ کے شیعہ ہو جانے اور نواب آصف الدولہ بہادر کے موضع مبارکپور کو برائے مصارف امام باڑہ حصار جلالی باسم قطب العارفین حکیم سید شاہ خیرات علی علیہ الرحمہ وقف فرمانے سے جلالی کا وقار بحیثیت شیعیت اور عزاداری اودھ میں ممتاز ہو گیا۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو تاریخ الشیعہ تیب قال باخذ۔ نیز حکیم سید شاہ خیرات علی علیہ الرحمہ کا یادگار کارنامہ شائع کردہ ادارہ ہمدانیہ حسینیہ گڑھی جلالی ضلع علی گڑھ۔

امام باڑہ حصار جلالی المعروف چھوٹا امام باڑہ کے تاریخی حالات کو استاد الشعراء جناب سید محمد حسین صاحب قمر جلالوی نے ایک مثنوی میں نظم فرمایا ہے، جو ہدیۂ ناظرین ہے:—

جوشِ عشقِ شہ مظلوم عیاں کرتا ہوں
اس عزاخانہ کے حالات بیاں کرتا ہوں
پیش کرتا ہوں حقیقت کی بنا پر تصویر
سب سے پہلے یہ عزاخانہ ہوا ہے تعمیر
اب بھی موجود ہیں شاہانِ اودھ کے اسناد
اہلِ تاریخ نے اس طرح لکھی ہے روداد
فرخ آباد سے اٹھا جو نزاعی شعلہ
لے کے لشکر چلے نواب شجاع الدولہ
سپہ سالار مظفر بھی تھے ہمراہِ سفر
اور وزیروں میں اک الماس علی نیک سیر
جب کہ نزدیک جلالی کے یہ لشکر پہونچا
ناگہاں چاند محرم کا فلک پر دیکھا
حکم شاہی ہوا دس روز رہا جائے یہیں
نصب خیمہ ہوئے آخر کو جلالی کے قریں
پھر دیا حکم کہ مولا کا عزاخانہ بنے
اور اس میں علم و تعزیہ چاندی کا سجے
تھا جو ہمراہ وہ کپڑے کا عزاخانہ سجا
دل سے ہر ایک تماشائی تھا دیوانہ بنا
تھی نہ تفریق کوئی اپنے و بیگانے میں
مجلسیں ہوتی تھیں مولا کے عزاخانے میں
ایک شب شرکتِ مجلس کے لئے دعوت پر
اس عزاخانہ میں وارد ہوا شاہی لشکر
ابتدا جب ہوئی مجلس کی تو طوفان آیا
شمعیں گل ہو گئیں ہر سمت اندھیرا چھایا
اس پریشانی میں لوگوں نے عجب دیکھا حال
روضہ خوانی میں بزرگ اک ہیں مصروفِ کمال
ظاہر اوصافِ شرافت ہر اک بات سے ہیں
میر خیرات علی نام ہے سادات سے ہیں
سجدۂ حق کا عیاں نور ہے پیشانی سے
سلسلہ ملتا ہے سید علی ہمدانی سے
ذکر بربادیٔ شاہِ شہداء کرتے ہیں
گاہ سینہ زنی گہہ آہ و بکا کرتے ہیں
سامنے شمع ہے آندھی میں مسلسل روشن
گو کہ ہے معجزۂ ذکر شہنشاہِ زمن
دیکھ کر معجزۂ خانۂ فرزندِ رسولؐ
شیعہ مذہب کیا نواب مظفر نے قبول
اور نواب اودھ نے یہ منّ فرمایا
نذر کیا ہے کچھ اس جا کیلئے باہر سرور
مختصر یہ کہ ہوئے ختم جو ایامِ عزا
فوج کا منزلِ مقصد کی طرف کوچ ہوا

جنگ میں فتح جو نواب اودھ نے پائی
لکھنؤ جا کے نیاز شہ دیں یاد آئی
فوراً اک بھیجا جلالی کے لئے ناقہ سوار
میر خیرات علی پہونچے بصد عزو وقار
کی بہت آپ کی نواب اودھ نے عزت
سر دربار کئے پیش خطاب و خلعت
اور جلالی کے عزا خانہ کو دی نذر جبین
تا ابد ہوتی رہے جس سے نیاز شہ دیں
مذہب و عہد یہ نواب نے آنے نذری آ پنچ
پیرو پنجتن پاک تھا گاؤں لکھے پانچ
وقف نامہ بھی لکھا سید موصوف کے نام
اختیار ان کو دیئے نذر و مجالس کے تمام
تھا اسی میں متولی کے لئے یہ ارشاد
پہلے خیرات علی بعد میں ان کی اولاد
ابھی تکمیل کو پہونچا تھا نہ کار مولا
خلق سے اٹھ گئے نواب شجاع الدولہ
بعد کچھ دن کے نہ باقی رہا تنظیم میں ربط
چار گاؤں گئے انگریز سلاطین نے ضبط
صدف وقف میں فی الحال ایک دُر ہے
یعنی اس وقت مواضی میں مبارک پور ہے
مہتمم وقف کے اب ایک وحید فن ہیں
یعنی سن ستر میں حکیم احسن ہیں
سن تعمیر عزا خانہ سے واقف ہے علیم
سند بارہ سو نوے میں نقط لفظ قدیم
اُس عزا خانہ کی تاریخ معہ زیر و زبر
میں نے اسناد اودھ دیکھ کے لکھی ہے قمر

بہر حال نوابان اودھ نے لکھنؤ کو مرکز حکومت بنانے کے ساتھ مرکز عزاداری بھی بنایا اور عزاداری کو بام عروج پر پہونچایا تو یہ مرکز عزاداری صرف اودھ بلکہ سارے ہند کے لئے مشعل راہ بنا۔ چنانچہ سادات جلالی کا جوش عزا بھی فروغ عزاداری کی طرف راغب ہوا اور انھوں نے لکھنؤ سے بیش از بیش استفادہ فرمایا اور پھر جلالی کی عزاداری کو بھی فروغ حاصل ہوا کہ جلالی کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا اور آئندہ نسلوں کے لئے مشعل راہ ثابت ہوگا۔

نوابان اودھ نے عالیشان امام باڑے لکھنؤ میں تعمیر کرائے تو سادات جلالی نے بھی اس سلسلہ میں اقدام کیا اور لکھنؤ کے امام باڑوں کے طرز تعمیر پر امام باڑے تعمیر کرائے اور لکھنؤ کے امام باڑوں کے مثل اعلےٰ بیش قیمت ساز و سامان عزا سے سجایا۔

جلالی کا سب سے بڑا عظیم الشان امام باڑہ محلہ ابوالفضل میں ہے جو جناب میر فرزند علی مغفور نے ۱۲۳۶ھ میں تعمیر کرایا ہے۔ اس کا نقشہ لکھنؤ کے امام باڑہ آصفی سے مشابہت رکھتا ہے۔ مرزا مکھو بیگ لکھنوی کے اہتمام سے تعمیر ہوا عشرہ محرم کی عزاداری کے لئے مخصوص ہے۔ عمارت کے علاوہ ساز و سامان بھی اس عزا خانہ کا نہایت بیش قیمت ہے۔ نو محرم کی مجلس اعلیٰ پیمانہ پر ہوتی ہے۔ جس کے بعد تابوت و ذوالجناح کا جلوس امام باڑہ میں آتا ہے اس امامباڑے کی ضریح مقدس بھی بیش قیمت اور قابل زیارت ہے۔ اور علم مبارک بھی نایاب اور قیمتی ہیں۔ مولانا مولوی سید ابوالقاسم صاحب قبلہ اعلی اللہ مقامہ نے اس امام باڑہ کو بہت فروغ دیا۔ اس امام باڑہ کے تاریخی کتبہ پر حسب ذیل قطعہ کندہ ہے:

باصدق دل چو سید فرزند علی نمود ؛ قصر امام باڑہ عالی بنا بہا
سال بناش ز تقف غیبی ز شوق گفت ؛ بیت العزا باسم شہیدان کربلا

دوسرا عالیشان امام باڑہ جناب مفتی سید جواد علی مغفور نے محلہ نصیرہ میں تعمیر کرایا جو شاہان اودھ کے امامباڑہ سے مشابہت رکھتا ہے۔ اس میں ضریح کے علاوہ

علم مبارک بھی بیش قیمت ہیں اور روشنی کا ساز و سامان جھاڑ فانوس وغیرہ نیز باجے مختلف قسم کے بیش قیمت ہیں۔ یہ امام باڑہ عشرۂ چہلم کی عزاداری کے لئے مخصوص ہے۔ میر مہدی حسن نے اس امام باڑہ کے مصارف کیلئے کثیر آراضی وقف فرمائی۔ یہ امام باڑہ ۱۲۷۹ھ میں تعمیر ہوا تاریخی کتبہ پر حسب ذیل ابیات کندہ ہیں:-

جواد عیلے سید نیک ذات ؛ بر آرندہ حاجت مومناں
بدل راغب طاعت کردگار ؛ بجاں دوستدار شہ انس و جاں
جلالی کہ ایں قصبۂ دلکشا است ؛ بود مسکن آساشریف زماں
بنا کردہ بیت عزائے حسینؑ ؛ دریں قصبۂ پاک جنت نشاں
چنیں گفت سال بنائش لقی ؛ عزا خانۂ سرور دوجہاں

تیسرا عالی شان امام باڑہ منظر علیے معروف بڑا امام باڑہ محلہ گڑھی میں واقع ہے اور محرم کی عزاداری کے لئے مخصوص ہے جناب میر احسان حسین اور جناب میر پرورش حسین مغفور نے اس امام باڑہ کو بہت فروغ دیا۔ میر پرورش حسین صاحب کی جائداد سے آراضی اس امام باڑہ کے لئے وقف ہوئی۔ متولیان و ممبران وقف نے بھی اس امام باڑے کی تعمیر و تزئین میں بڑی دلچسپی لی۔ جناب سید نور الحسن ریٹائرڈ میجر سردار بہادر نے مسجد تعمیر کرائی اور اس طرح یہ ایک عالی شان امام باڑہ بن گیا۔ یوم عاشورہ بلند ترین نشان اسی امام باڑہ سے اٹھ کر جلوس عزا میں شریک ہوتا اور چھوٹی کربلا تک جاتا ہے اور وہیں بڑھایا جاتا تھا۔ اس امام باڑہ کی تعمیر بھی لکھنوی انداز پر ہوئی اور بیش قیمت ضریح مقدس و علم مبارک سے سجایا گیا۔ روشنی کا سامان بھی بیش قیمت ہے۔

چوتھا شاندار امام باڑہ محلہ نصیر میں واقع ہے قدیم عمارت مغربی رُخ پر اور جدید عمارت شمالی رُخ پر ہے جسے الحاج سید محمد حسین مغفور نے تعمیر کرایا۔ یہ امام باڑہ عشرۂ محرم کی عزاداری کے لئے مخصوص ہے ساز و سامان بھی بیش قیمت ہے اس کی شہ نشین بھی دالان کے اندر بلند ہے جس میں تعزیہ و علم مبارک سجائے جاتے ہیں۔

پانچواں شاندار امام باڑہ محلہ جاماں میں تھا جس کی بنا جناب میر باقر حسین مغفور نے ڈالی تھی محرم کی عزاداری کے لئے مخصوص تھا مگر بانی امام باڑہ کی وفات کے بعد منہدم ہو گیا۔ آثار باقی ہیں۔ جو اس کی شان رفتہ کی شہادت کے لئے کافی ہیں۔ اس کی شبیہ بھی لکھنوی طرز کی تھی۔

مذکورہ پانچ امام باڑے وہ ہیں جو لکھنوی طرز تعمیر کا نمونہ ہیں۔ اور جن کی تزئین بھی لکھنوی انداز پر ہوئی ہے۔ لیکن ان کے علاوہ جلالی میں متعدد شاندار امام باڑے تعمیر ہوئے جن کا نقشہ لکھنوی طرز سے مختلف ہے۔ لیکن ان کی بھی تزئین لکھنوی انداز پر ہوئی ہے۔ ان امام باڑوں میں ایک عالیشان امام باڑہ الحاج میر خورشید علی مغفور نے ۱۳۵۵ھ میں بحالت بیماری ایک خواب کی بنا پر اپنے کمرۂ نشست کو امام باڑہ میں تبدیل کر دیا جس پر دو عالی ہمت جناب ذاخر لکھنوی کے تصنیف کردہ ابیات بصورت کتبہ نصب ہیں جو حسب ذیل ہیں:-

اب قصبۂ جلالی عالم کا مدعا ہے
ماننِ طور سینا جلوہ دکھا رہا ہے
کس درجہ ہے محبت خورشید علی کو
مسند نشین دولت دنیا جن کر دیا ہے
کرسی نہ کیوں بچھائیں رویا صادقہ میں
گھر میں امام سوئم تشریف لا رہا ہے
شرمندہ ہیں جواہر کچھ ایسے ہیں نگینے
اس کرسی زمیں کا تا عرش مرتبہ ہے

یاں پر حسین ہو رہا ہے تو جہاں پر
خادم سے ضبط احمد ارشاد کر رہا ہے
آنکھوں سے حکم حضرت منظور کرنے اٹھا
اہل زمیں کا عظمت اس خاک پر فدا ہے
ہے کیا عجیب اک ہی تعمیر کربت جہاں
اب وہ امام باڑہ تیار ہو چکا ہے
تعمیر کو دیکھتے ہیں جھک جھک کے اہل گردوں
تم امام باڑہ سے اتنا شرف ملا ہے
تم کہدو سال ہجری ذاکر اسی جگہ پر
یاں پر بھی تحت قبہ مقبول ہر دعا ہے
روضہ سے ہے مشابہ ایک ایک گوشہ گوشہ
کامل امام باڑہ تصویر کربلا ہے

اس امام باڑہ کے متصل جانب شمال الحاج خان بہادر میر محمد عباس صاحب نے ایک شاندار امام باڑہ تعمیر کرایا اور بیش قیمت ضریح رامپوری نیز دیگر قیمتی سامان سے مزین فرمایا ہے۔ یہ عزاخانہ بھی محرم کی عزاداری کے لئے مخصوص ہے۔ ۸ محرم کو بعد مجلس مہندی اور تابوت حضرت قاسمؑ اس امام باڑے میں جناب میر عسکری سوز مغفور کے زمانے سے آتا ہے۔

محلہ ابوالفضل میں امام باڑہ جناب میر محمد حسن مغفور امام باڑہ جناب میر اکرام علی مرحوم اور امام باڑہ جناب میرزا صفدر علی مغفور محرم کی عزاداری کے لئے اور امام باڑہ مولوی میر محسن علی اختر حیدری الجلالی عزائے اربعین کے لئے قدیم سے مخصوص ہیں۔ مولوی میر محسن علی اختر کے زمانے اس باڑے سے تابوت اٹھ کر امام باڑہ مسجد حصار جلالی کو بعد مجلس جاتا ہے۔

امام باڑہ میر اسحاق حسین صاحب مرحوم المعروف امام باڑہ چوک عشرۂ محرم کی عزاداری کے لئے اور محلہ جانان میں امام باڑہ الحاج میر مہدی علی مغفور عشرۂ چہلم کی عزاداری کے لئے اور امام باڑہ جناب میر ہادی علی محرم کی عزاداری کے لئے اور محلہ نصیر میں امام باڑہ تکیہ محرم کی عزاداری کے لئے قدیم سے مخصوص ہیں اور ان امام باڑوں کے علاوہ اور بھی امام باڑے ہیں جن کا ذکر راقم نے تاریخ عزاداری میں کیا ہے۔ یہ سب امام باڑے ایام عزا میں سامان عزا سے سجائے جاتے ہیں اور نہایت حسن عقیدت کے ساتھ عزاداری کے فرائض انجام دیئے جاتے ہیں۔

مردوں کے علاوہ مستورات کا جوش عزا بھی اس درجہ بڑھا کہ مستورات نے بھی مستقل عزاداری قائم کی۔ بی بی محمدی بیگم زوجہ میر ہاشم علی رسالدار نے گڑھی میں ایک امام باڑہ مستقل مستورات کی عزاداری کے لئے قائم فرمایا اور اس کو محرم کی عزاداری کے لئے مخصوص فرمایا اور آپ کی صاحبزادی بی بی انتظام فاطمہ حدیث خواں نے اپنی زمینداری سے معتدبہ اراضی اس امام باڑے کے مصارف کے لئے وقف فرمائی۔ یہ وقف شیعہ سنٹرل وقف بورڈ لکھنؤ میں رجسٹرڈ ہے۔

غرضیکہ سادات ہمدانی نے شاندار امام باڑوں کی تعمیر نیز جن بہت کچھ لکھنوی انداز پر اور شاہان اودھ کے مثل اپنی جائدادیں مصارف عزا کے لئے وقف بھی کیں۔ اور جلالی کو عزاداری کے لحاظ سے لکھنؤ کا ایک مرقع بنا دیا۔ جس طرح شہر لکھنؤ ایام عزا میں ایک مرقع عزا بنجاتا تھا اسی طرح قریہ جلالی بھی ایام عزا میں ایک مرقع عزاداری بن جاتا تھا۔ اور سارے قصبہ میں ایک غم کی فضا چھا جاتی تھی ہر شخص سوگوار نظر آتا تھا اور یہ حالت چہلم تک قائم رہتی تھی۔

امام باڑوں کی تعمیر و تزئین کے علاوہ فن مرثیہ خوانی اور مرثیہ گوئی میں بھی بزرگان سادات لکھنؤ سے استفادہ فرمایا۔ شاہان اودھ کے عہد میں فن مرثیہ خوانی اور

مرثیہ گوئی معراج پر پہنچ چکے تھے۔ چنانچہ سادات ہمدانی بھی ان فنون کے حصول کے لئے لکھنؤ کی طرف متوجہ ہوئے اور ان فنون کو باقاعدہ حاصل فرمایا فن سوزخوانی میں استاد محب حسین جلالوی نے بڑا کمال پیدا کیا میں نے اکثر بزرگوں کو آپ کی تعریف کرتے سنا ہے آپکے متعدد شاگرد جلالی میں مشہور و معروف ہوئے۔ تحت اللفظ مرثیہ خوانی میں ضیا، محمد صاحب، میر حکمت علی صاحب اور میر انعام حسین صاحب نے بڑا عروج پایا۔ آج تک ان کی ادائگی کی تعریف کی جاتی ہے فن مرثیہ گوئی میں جناب سید ظل حسین صاحب فصاحت مغفور نے کمال حاصل فرمایا، فصیح و بلیغ مراثی لکھنوی طرز میں تصنیف فرمائے۔ آپنے جو سلام لکھے ان کا مجموعہ گلدستہ فصاحت کے نام سے مطبع یوسفی دہلی سے شائع ہو چکا ہے۔ آپکے جملہ مراثی آپ کے فرزند جناب سید اشرف علے صاحب بقا جلالوی کے پاس محفوظ ہیں آپ کا شاہکار مرثیہ سے عندلیب گل گلزار رسالت ہوں میں۔ بہت مقبول ہوا۔ اور جلالی میں اکثر پڑھا جاتا ہے۔ آپکے بعد لکھنوی طرز مرثیہ گوئی میں استاد الشعراء جناب سید محمد حسین صاحب قمر جلالوی نے کمال حاصل فرمایا۔ جلالی میں مجالس عزا کا دارومدار اساتذہ لکھنؤ کے منتخب مراثی پر قدیم سے ہے جو سوزخوانی اور تحت اللفظ مرثیخوانی کے طور پر مجالس عزا میں پڑھے جاتے ہیں۔ سادات جلالی نے ہر تاریخ اور ہر موقعہ کا منتخب مرثیہ لکھنؤ سے حاصل کیا اور جلالی میں اس کو رواج دیا اور یہ حقیقت ہے کہ اکثر مراثی طباعت سے قبل قلمی صورت میں لکھنؤ سے جلالی منتقل ہوئے ہیں آج بھی ذاکرین جلالی کے پاس ایسے قلمی مراثی مفقود ہیں جو آج تک طبع نہیں ہوئے اساتذہ لکھنؤ کے مراثی کا ایک بڑا ذخیرہ جلالی میں محفوظ ہے۔

سادات ہمدانی نے شاہان اودھ کے جاری کردہ طرز پر علم مبارک اور تابوت و ذوالجناح کے جلوس عزا بھی نہایت شان سے باجوں کے ساتھ قصبہ میں نکالے۔ ہشتم محرم، آٹھویں محرم، امیرالمؤمنین [illegible] اور اکیس رمضان کے علموں کے جلوس قدیم سے مشہور ہیں۔ جنمیں لکھنؤ کے مرثیہ گو اساتذہ نواب مونس میاں دلگیر یا میر خلیق وغیرہ کے منتخب مراثی پڑھے جاتے ہیں اور ان تاریخوں کی رونق عزا کا دارومدار بھی لکھنوی مرثیہ گو اساتذہ کے منتخب مراثی پر ہی رہا ہے جن کو بڑی شان سے پڑھا جاتا ہے۔

عشرۂ محرم کی عزاداری تو جلالی میں قدیم سے جاری تھی اور اس کی ابتدا میر کمال الدین حسین ہمدانی اور آپکے خاندان نے کی تھی مگر عشرۂ چہلم کی عزاداری شاہان اودھ کی متابعت میں جاری ہوئی۔ شاہ اودھ نصیرالدین حیدر نے ۱۸۳۷ء میں لکھنؤ میں محرم کی عزاداری کو اربعین تک بڑھایا تو سادات جلالی نے بھی عشرۂ اربعین کی عزاداری کو بڑھادیا اور چہلم کی عزاداری کے لئے مخصوص امامباڑے تعمیر کرائے۔ جلالی میں امامباڑہ منشی سید جواد علی مغفور اور امامباڑہ جناب میر اسمعیل مغفور عشرۂ چہلم کی عزاداری کیلئے خاص طور پر مخصوص ہوئے۔ ان کے علاوہ دیگر امام باڑوں میں بھی عزا داری چہلم جاری ہوئی جس کی تفصیل تاریخ عزاداری میں لکھ چکا ہوں۔

محرم و چہلم کی عزاداری کا دارومدار اساتذہ لکھنؤ کے منتخب مراثی پر رہا اور یہ تاریخی حقیقت ہے کہ فن مرثیہ گوئی نے شاہان اودھ کی سرپرستی اور ہمت افزائی ہی میں عروج پایا اور پھر ان فنون سے سادات ہمدانی نے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا۔ اور عزاداری کو فروغ دیا۔ جو ہند کی تاریخ عزا میں یادگار رہے گا۔

سادات جلالی نے [illegible] بھی [illegible] ایک نمونہ کربلا یعنی کربلائے حسینی جو زیادہ قدیم ہے اور دوسری بڑی کربلا یعنی کربلا شاہ مردان۔ کربلا میں محرم اور چہلم کے جلوس عزا ختم ہوتے تھے۔ اور کربلا شاہ مرداں میں [illegible] اکیسویں رمضان تمام ہوتے ہیں۔ بڑی کربلا کی عمارت منہدم ہوگئی تو قدیم بنیاد پر الحاج سید علے اوسط صاحب نے نئی کربلا تعمیر کرادی۔

یہ حقیقت ہے کہ جلالی میں عزاداری کا عروج شاہان اودھ [illegible] ہوا [illegible] اس عہد سے قبل تھا اور [illegible] شاہان اودھ سے قبل جلالی کی عزاداری [illegible] شاہان اودھ کے عہد میں عزاداری عام ہوگئی سادات ہمدانی نے اودھ [illegible]

عزاداری ضلع مظفرنگر یو۔پی

از فاضل خبیر جناب سید محمد امیر کاظمی صاحب

مٹا کر اپنی ہستی نقش باطل محو کر ڈالے ؎ شہیدوں کا بڑا احسان ہے دنیائے ایماں پر

قبل ضبط واقعات عزاداری سادات باہرہ ضلع مظفرنگر یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تمہیداً کچھ بطور مقدمہ تعویلیش تمام کیا جائے جو خبر و حالات عزاداری جو اپنے موضوع کے لئے جو مناسب ہو وہ اس تحریر سے اخذ کر لیا جائے۔ حالات بالاجمال و بالایجاز تحریر کئے جاتے ہیں گو یہ اجمال و ایجاز بھی باعث تطویل ہے مگر ضرورت اس کی داعی ہے۔ ضلع مظفرنگر جہاں سادات باہرہ و شیعہ جماعت کی بستیاں ہیں چار تحصیلوں پر مشتمل ہے۔ (۱) مظفرنگر خاص (۲) جانسٹھ (۳) کیرانہ (۴) بڈھانہ زیادہ تر سادات و شیعہ تحصیل مظفرنگر و تحصیل جانسٹھ میں سکونت پذیر ہیں۔ بحیثیت مرکز سادات جانسٹھ قصبہ میرانپور۔ ککروالی۔ بہیڑہ سادات۔ تسنگ۔ ججولی۔ مجہیڑہ۔ سکرٹی۔ سدوڑی۔ گنگیرو۔ سنبھل ہیڑہ۔ سنبلہیڑہ اختصاصی درجہ رکھتے ہیں۔ عزاداری کے لحاظ سے بھی ان مواضعات کو خصوصیت حاصل ہے۔ کوئی موضع یا قریہ ایسا نہیں ہے جس میں سادات یا شیعہ افراد رہتے ہوں اور عزاداری نہ ہوتی ہو۔ گو وسیع پیمانہ پر نہیں تو وجود تعزیہ داری کا فقدان بھی نہیں۔ ضلع ہذا میں زیدی و کاظمی سادات ہیں۔ مقدم الذکر اکثر مواضعات میں ہیں اور موخر الذکر محض چار یا پانچ بستیوں تک محدود ہیں

سادات کاظمی اولاً موضع ججولی میں آ کر آباد ہوئے۔ بقیہ مواضعات رسول پور بروکی، سکر ہیڑہ، رہکیڑہ وغیرہ توابعات موضع ججولی ہیں اور ججولی ہی سادات کاظمی کا مرکز ہے۔ اگر ضلع میں اگر کوئی فرد کاظمی دوسرے گاؤں میں آباد ہے وہ بھی ججولی سے ملحق و وابستہ ہے۔ بقیہ کل قریوں اور مواضعات میں سادات زیدیہ اکثریت لئے ہوئے ہیں۔ مرادپورہ موضع میں مغل حضرات شیعہ ہیں جو خلوص سے تعزیہ داری کرتے ہیں۔ اور بگہیڑہ اور قصبہ بوڑھانہ میں عامت شاہی شیوخ کے ہاں چند جگہ امام باڑوں میں بڑے ہی اخلاص و حسن عقیدت سے عزائے امام مظلومؑ ہوتی ہے۔ امام باڑہ خاص میں بڑی شان و رونق رہتی ہے۔ یہ لوگ ہر سال اپنی ملازمت اور جائے کاروبار سے ایام عشرہ محرم میں اپنے وطن میں آجاتے ہیں اور ان کی برادری کا یہ عام قاعدہ ہے کہ کوئی فرد عشرہ میں باہر نہ رہے۔ کل ضلع مظفرنگر کی آبادی جس میں کم و بیش گیارہ سو موضع اور قریئے ہوں گے بالحاظ مذاہب و ملل بروئے مردم شماری ۱۹۵۱ء دس لاکھ سے کچھ زیادہ ہوگی۔ ضلع ہذا میں سادات و شیعہ کی آبادی کا تخمینہ ۴۰ ہزار نفوس کا ہے کیونکہ پاکستان کی جدید تقسیم موجودہ آبادی سادات شیعہ کی

اثرانداز ہوئی ہے پھر بھی اس کا کوئی ناخوشگوار اثر تعزیہ داری پر نہیں ہوا جو جناب امام حسین علیہ السلام کی روحانیت کا مظہر ہے۔ اور درحقیقت یہ حیرت ناک و تعجب خیز بات ہے۔

سادات شیعہ آبادی حسب ذیل مواضعات میں ہے جہاں تعزیہ داری مظلوم کربلا کا وجود رہے شاید ہی شاذ و نادر کوئی موضع ہو جو اس سعادت و برکت سے محروم ہو۔

تحصیل مظفر نگر (۱) مظفر نگر خاص (۲) قصبہ پور قاضی (۳) رتیانہ (۴) کھیڑی پچھنڈہ (۵) رکھیڑی (۶) سندھاولی (۷) بلاس پور (۸) دہلت (۹) بہادر پور (۱۰) بہاری (۱۱) سکھرڑہ (۱۲) ککّی (۱۳) گجرہ (۱۴) مراد پورہ (۱۵) سید پور خورد (۱۶) سید پورہ کلاں (۱۷) کسولی (۱۸) لڈوہ (۱۹) بیت پور (۲۰) ڈھنڈھول (۲۱) بوڑینہ کلاں (۲۲) کوٹیسرہ (۲۳) چرتھاول (۲۴) سکندر پور

تحصیل جانسٹھ (۱) جانسٹھ خاص (۲) میران پور (۳) سکھیڑہ مراچپور (۴) اشرف پور (۵) مجہیڑہ (۶) سنبلہیڑہ (۷) بلی پور (۸) سالارپور (۹) چوڑیالہ (۱۰) جٹواڑہ (۱۱) کچہیڑہ (۱۲) منڈہیڑہ (۱۳) نگلہ (۱۴) رتہ (۱۵) بہیڑہ سادات (۱۶) تیوڑہ (۱۷) سورنہ (۱۸) جولی (۱۹) ہانسری کہیڑہ (۲۰) کھیڑی نیرزہ آباد (۲۱) یوسف پور (۲۲) بیلڑہ (۲۳) مکڑوہ (۲۴) بہیڑہ ٹھٹری (۲۵) ررکنپور (۲۶) بروکی (۲۷) گادلہ (۲۸) کوال (۲۹) سنہیڑہ (۲۹) چتوڑہ (۳۰) سجھوڑہ (۳۱) منصور پور (۳۲) پال (۳۳) پور (۳۴) خانجہاں پور (۳۴) سرائے رسول پور (۳۵) چنڈورہ (۳۶) چنڈوری (۳۷) تسنگ (۳۸) غالب پور (۳۹) کوٹ کلاں (۴۰) بہناول (۴۱) قصبہ کھاتولی (۴۲) سنبھل پورہ (۴۳) سیدی پور (۴۴) بلڑی۔

تحصیل کیرانہ (۱) تحصیل کیرانہ خاص (۲) جھنجھانہ۔ (۳) تھانہ بھون (۴) جلال آباد (۵) قصبہ بڈولی (۶) قصبہ شاملی۔

تحصیل بوڑھانہ (۱) بوڑھانہ خاص (۲) گنگیرو۔ (۳) قصبہ شاہ پور (۴) شورون۔ (۵) کاندھلہ (۶) عمرپور۔

"ہندوستان میں سادات زیدی کے مورث اعلیٰ کی آمد"

عبداللہ معین الملکی ابوالفرح واسطی۔ مورث اعلیٰ سادات زیدی بارہویں سلسلہ میں جناب زید شہید علیہ الرحمہ سے منسلک ہیں۔ جناب کی شہادت فائز السعادت ۱۲۲ھ میں ہوئی جس کا مصرع تاریخ سہ بگفتا خرد صاحب راد بود۔ جناب زید شہید کی شہادت کے بعد اکناف و جوانب بلاد عرب و عجم وغیرہ میں اُن کی اولاد اخلاف نہایت مضطرب و عبرتناک احوال میں منتشر ہوئی۔ چنانچہ جناب ابوالفرح واسطی باجازت سید شہاب الدین سہروردی خال (خود) سنہ ۳۹۱ھ میں بمعیت سلطان محمود غزنوی وارد ہندوستان ہوئے اور بعد فتح یابی پایہ تخت کو ہمراہ بادشاہ موصوف مراجعت کی اور اپنے چار پسران عدیم الاقران کو ہندوستان میں اپنا جانشین چھوڑا۔ چاروں صاحبزادے مظفر نگر ہوکر پنجاب میں سکونت پذیر ہوئے۔ ابوداؤد موضع کونڈلی۔ ابوالفراش موضع جھنجیر۔ نجم الدین موضع تہن پور اور ابوالفضل موضع چھاتبروڑ میں سکونت گزیں ہوئے۔ نجم الدین نہایت شکیل و خوش رو تھے بادشاہ اُن سے بہت مانوس تھا۔ اپنی دختر نیک اختر کا اُن سے عقد کردیا۔ یہ آغاز آمد سادات زیدی کا ہندوستان میں ہے۔

عزاداری کی صحیح تاریخ و سنہ کا پتہ

جناب ابوالفرح کی آمد کے آخر عشرہ صدی کے اندر اندر کم و بیش تعزیہ داری کی ابتدا ہوئی جسکی کسی قدر تفصیل و توضیح حسب ذیل سطور میں سپرد قلم کی جاتی ہے:—

۲۔ مظفر نگر خاص

معمرین جلیل القدر کے اخبار فیض آثار اور تاریخی بیان

مظفر نگر کو قصبہ مظفر نگر کو مورث اعلیٰ سادات مظفر نگر سید منور علی خاں مرحوم نے بعہد عالمگیر بادشاہ آباد کرکے اپنے پدر ذوالقدر جناب سید مظفر عرف نواب خانجہاں کے نام نامی کے ساتھ موسوم کیا اور مظفر نگر نام رکھا۔ مظفر نگر میں تعزیہ امام حسینؑ مظلوم کربلا کا اسی زمانہ سے شروع ہوا ہے۔ جناب سید مظفر عرف نواب خانجہاں بادشاہ شاہجہاں کے وزیر تھے۔ قدیم امام باڑے حسب ذیل ہیں:۔ پٹی نصراللہ خاں میں امام باڑہ سید ذوالفقار علی خاں مرحوم معروف ندی والا۔ یہ امام باڑہ سب امام باڑوں سے مقدم ہے۔ ایام غدر ۱۸۵۷ء سے قبل کاغذات سرکاری میں درج تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ بانی مظفر نگر نے عزاداری کی بنیاد کچھ سال کے بعد قائم کی۔ امام باڑہ پچیدرہ۔ امام باڑہ تکیہ والا۔ پٹی وجیہہ الدین خاں میں، امامباڑہ موتی محل پٹی ابوسعید خاں میں، امام باڑہ کٹہرہ، امام باڑہ سید نیاز علی صاحب مرحوم معروف پیر والا۔ موخرالذکر امام باڑہ بیس سال سے کچھ زائد سے بذریعہ وقف قائم ہے۔ حال میں قریب بیس پچیس سال سے ایک امام باڑہ محلہ گدھی روان موسومہ بہ محلہ جھوکا کا اضافہ ہوا ہے۔ سب سے بہتر مجالس عشرہ ماہ عزا میں بلحاظ اجتماع مومنین سامعین یہاں پر ہوتی ہیں۔ راجہ اقبال رضا صاحب مرحوم کی کوٹھی پر علم و تعزیہ داری ایام عزا میں تقریباً ساٹھ سال سے قائم تھی اور ضریح سڑک جھوکا پر ان کے امام باڑے سے نکل کر ان کی جداگانہ کربلا میں مدفون ہوتی تھی۔ اب انقلاب کے اس کا سلسلہ ختم ہو گیا ہے۔ راجہ صاحب پاکستان چلے گئے تھے وہ اب مرحوم ہیں ان کے پسماندگان زیادہ تر وہ میں مقیم ہیں۔ ۷ و ۸ محرم کو دُلدل امام باڑہ موتی محل و امام باڑہ پچیدرہ سے نکلتا ہے۔ یوم عشرہ امام باڑہ سے ضریح و تعزیہ و علم اٹھتے ہیں اور کربلا میں ندی پار دفن کئے جاتے ہیں۔ بلا لحاظ مذاہب و ملت خلقت کا ہجوم اس قدر ہوتا ہے کہ راستوں میں گذرنا دشوار ہو جاتا ہے۔ پانی کی مشکوں کا چھڑکاؤ سامنے ضریح و جلوس کے بیادگار تشنگان کربلا عوام الناس کی طرف سے کیا جاتا ہے۔ علاوہ مسلمانوں کے غیر مذاہب والوں کی جانب سے بھی مہندی و علم اور چڑھاوہ اپنی مرادوں کے لئے نذر کئے جاتے ہیں۔ نامعلوم زمانہ سابق سے چالیس پچاس برس پیشتر اطراف میں قصاب نوربان خاں اور پیرزادوں وغیرہ کے پچاس ساٹھ تعزیئے نکلتے تھے۔ کسی لحاظ سے یہ ہوں مگر نکلتے تھے اور بڑے زور شور دھوم دھام [illegible] کے ساتھ، مگر کچھ عرصہ سے بوجہ کشمکش بند ہو گئے مگر رونق عزاداری پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔

علاوہ شیعہ سادات کے مسلم احناف کا زمانہ حال میں شغف تعزیہ داری

میرو پسر کوڑا نوربان کے مکان پر علم و تعزیہ ایام عشرہ میں رکھے جاتے ہیں اور برابر اُس کے بزرگوں سے یہ رسم تعزیہ داری جاری رہی۔ سو برس سے زائد کا زمانہ ہو گیا باوجود موانع کے کوئی اثر نہیں لیا۔ مواعظ سد باب تعزیہ داری اُس کے قلب پر غیر موثر رہے اس کے باپ کوڑا نے مرنے کے بعد میرو کو خواب میں سخت تاکید تعزیہ داری کے لئے کی جس کو اُس نے خود حقیر سے بیان کیا۔ اور کہا کہ ہمارے بزرگوں سے تعزیہ داری چلی آتی ہے ہم اس کو کبھی ترک نہیں کر سکتے۔ امام الدین مستری جو نجاری کا کام کرتا ہے۔ تعزیہ و علم اُس کے مکان پر بھی مثل میرو مذکور رکھے جاتے ہیں۔ سادات کے تعزیوں کے ساتھ ساتھ ماتم و نوحوں کے ساتھ گشت کرتے ہیں اور جلوس کربلا میں جاکر

دفن ہوتے ہیں۔ یہ شخص منڈاور ضلع بجنور کا ساکن ہے اور مظفرنگر میں پندرہ بیس سال سے مقیم ہے۔ کسی جذبہ کے ماتحت اس کا خلوص تعزیہ داری کے لئے ہے۔ زنانی مجالس بھی متعدد جگہ ہوتی ہیں۔

کوڑیسرہ تحصیل مظفرنگر | بیس گھر سادات کے ہیں۔ اسی نفوس کا کل مجموعہ ہوگا۔ اندازاً پچاس ساٹھ سال سے زائد سے تعزیہ داری ہوتی ہے۔ قبل اس کے نورباخان حنفی المذہب تعزیہ داری کرتے تھے۔ سادات نے جب سے تعزیہ داری کی انہوں نے ترک کر دیا۔ نورباخان وغیرہ تعزیہ بناتے تھے۔ یہاں سادات مواضعات سورنہ و گکرولی سے آئے ہوئے ہیں احناف بھی مجالس و جلوس تعزیہ داری میں شرکت کرتے ہیں۔ مہندیاں منتی بھی حسب ضرورت سو تو چڑھ جاتے ہیں سادات زیدی ہیں۔ سادات ستّر سال سے زائد ہوئے جب یہاں آباد ہوئے۔ ایک جگہ امام باڑہ میں علم و تعزیہ رکھے جاتے ہیں۔ آٹھویں محرم کو علم کا گشت ہوتا ہے۔

کھلاوڑہ کلاں تحصیل جانسٹھ | یہ موضع بہت پرانا ہے سید ابوالفضل خلف ارشد سید ابوالفرح واسطی کی طرف سادات موضع کھلاوڑہ کا سلسلہ منتہی ہوتا ہے۔ ان کی اولاد میں سید عبدالرحمٰن مورث اعلیٰ کھلاوڑہ میں آباد ہوئے اور ان کے سات صاحبزادوں نے مختلف جگہ قرب و جوار کے مواضعات پمناولی و جوڑیالہ وغیرہ میں سکونت اختیار کی۔ یہ موضع مسلم کلالوں کا مسکن و مرجع تھا نہایت قابو یافتہ تھے سادات کے استعمال پر کمر باندھی مگر سادات کے شجاع مورث اعلیٰ نے شجاعت و دلیرانہ مقابلہ کرکے سب کلالوں کو کھلاوڑہ جو اصل میں کلال رہ تھا جلاوطن کر دیا اور موضع پر قبضہ کر لیا اور جستہ جستہ اقتدار کلی ان کو حاصل ہو گیا جیسا کہ بزرگوں سے اور سینہ بسینہ روایات سے معلوم ہوتا ہے یہاں عزاداری کی ابتدا سادات کی آمد سے ہو گئی تھی۔ مگر کس طرح ہوئی اور کیا طریقہ اختیار کئے گئے اس کے متعلق کچھ نہیں معلوم۔ سید پرورش علیخاں عرف نور محمد کے زمانہ میں گڑھی کھلاوڑہ کی بنا رکھی گئی اور ان کے پسر سید دلیر علیخاں عرف محبوب شاہ والی اجمیر شریف تخت نشین گڑھی کی تکمیل کی۔ دروازہ فیض سے مادہ تاریخ کا استخراج ہے اس مادہ تاریخ سے سنہ ۱۱۱۲ھ نکلتا ہے۔ یہ بعہد شہنشاہ عالمگیر تعمیر ہوئی۔ اس وقت سے مستقل تعزیہ داری کی ابتدا صحت کے ساتھ شروع ہوتی ہے مگر اس کا رجحان کم و بیش پیشتر سے بھی تھا۔ قبل تقسیم ہندوستان و پاکستان ۲۵۰ -- ۳۰۰ نفوس اس بستی میں پُرامن زندگی گذار رہے تھے۔ مگر اس ناخوشگوار اور تباہ کن تقسیم سے اب یہ بستی ۱۵ -- ۲۰ نفوس تک محدود ہے چار امام باڑوں میں عزاداری ہوتی تھی جلوس عشرہ محرم میں نکلتا تھا اب صرف دو جگہ مجالس عشرہ محرم میں ہوتی ہیں۔ موضع کی موجودہ آبادی کے لحاظ سے عزاداری اب بھی اچھی ہوتی ہے۔

پمناولی | یہ موضع سادات کھلاوڑہ کے مورث اعلیٰ سید عبدالرحمٰن کا مسکن تھا اور ان کے صاحبزادے سید عبدالستار و عبدالمعانی کھلاوڑہ سے آکر یہاں سکونت پذیر ہوئے تھے اور ان کی وجہ سے پندرہ بیس گھر سادات کے آباد ہو گئے تھے۔ مسجد بھی تعمیر کی اور امام باڑہ بھی مجالس کے لئے ایک مکان میں قرار دیا گیا۔ لیکن استداد زمانہ سے نہ مکیں رہے نہ مکان رہے۔ جملہ چیزوں کا وجود ختم ہے نہ کوئی سید ہے نہ سامان عزا ہے۔ مسجد بند ہے۔ متولی صاحب امام باڑہ کچھ نازیبا حرکت امام باڑہ کے متعلق کرکے پاکستان چلے گئے۔ یہ موضع کھلاوڑہ سے کوئی ۳ میل ہے۔

آغاز تعزیہ داری | امام باڑہ کے متعلق ایک عجیب

اور دلکش عبرت ناک وحیرت افزا ساتھ معمرین کی زبانی سینہ بسینہ صحیح شواہد کے ساتھ سنا گیا ہے یہ موضع اب ہندو راجپوتوں سے آباد ہے۔ سید عیسےٰ شیر بعہد عالمگیر شاہ محی الدین اورنگ زیب یہاں آباد ہوئے۔ بڑی جاہ و جلال کے ساتھ فرماں روا رہے۔ ایک دن سید عیسےٰ شیر مرحوم نے دیکھا کہ دفعتاً ایک قبر شگافتہ ہوئی ایک بزرگوار کفن تازہ پہنے ہوئے نکلے جن کے دانت مثل دُرِ آبدار چمکدار ہیں عیسےٰ شیر مرحوم نے ان کے دو دانت نکال لئے فوراً مجنون و پاگل ہو گئے اُن کو کوٹھری میں بند کر دیا گیا۔ نہایت قوی ہیکل اور شہ زور تھے۔ کوٹھری میں پتھر کی جالی لگی ہوئی تھی اُس کو ہاتھ ڈال کر توڑ دیا۔ اُن کی بہن زیب النساء نے منت مانی کہ اگر بھائی کو اس جنون سے صحت ہو جائے تو تعزیہ داری کروں گی۔ کچھ دنوں بعد اچھے ہو گئے تعزیہ داری کا آغاز ہو گیا۔ تعزیہ بننے لگا۔ ایام عشرہ میں مجالس عزا ہونے لگیں۔ یہ بھی معتبر شہادت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ ایک علم نقرئی بھی حجرہ تعزیہ داری میں نمودار ہوا تھا۔ ایک منقش زر کی پلیٹ بھی جس میں تبرک تقسیم کیا جاتا تھا۔ تعزیے کے متعلق ایک عجیب واقعہ تواتر کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے کہ یوم عشرہ جب کسی سال تعزیہ دفن کے لئے جلوس کے ساتھ نکالا گیا گاؤں میں آگ لگ گئی راجپوت ہندو مانع آئے چنانچہ تعزیہ واپس لے آئے جو حجرہ تعزیہ تھا وہاں رکھ دیا اب سنا جاتا ہے کہ یہ ضریح اُسی کوٹھری میں جہاں سامان عزا ہوتا تھا دفن کر دی گئی ہے۔

چوڑیالہ

اس موضع میں کملا وڑہ سے سید تاج الدین مورث اعلیٰ اور سید عبدالرحمٰن آکر دو سو ڈھائی سو سال پہلے بسے تھے۔ فی الحال سادات کی آبادی تقریباً ایک سو بیس افراد سے زیادہ نہیں۔ تین جگہ شب و روز میں مجالس عزا ہوتی ہیں۔ ایک امام باڑہ میں تعزیہ و علم رکھے جاتے ہیں بقیہ دو میں صرف علم نصب کئے جاتے ہیں۔ موقوفہ کسی امام باڑہ کے متعلق نہیں۔ ذوالجناح بھی نکلتا ہے۔ عاشورہ کے روز تعزیہ کا جلوس نکلتا ہے۔ اور تعزیہ کربلا میں دفن کیا جاتا ہے۔ سنی احناف و اہل ہنود بھی چڑھاوا چڑھاتے ہیں اور منت کی مجالس بھی کرتے ہیں اور منتی مہندیاں بھی چڑھاتے ہیں سو برس سے زیادہ عرصہ ہوا امام سید امیر حسن صاحب میں مجالس عشرہ محرم ہوتی ہیں۔ دیگر دو امام باڑوں میں ساٹھ ستر سال سے ہوتی ہیں۔ زمانہ سابق میں جلیسر سے بھی سادات یہاں آکر آباد ہوئے۔

بعید ترین زمانوں اور بعید ترین ملکوں میں بھی حسینؑ کی موت کے اندوہناک منظر
ٹھنڈی سے ٹھنڈی طبیعت کے آدمی میں
ہمدردی کے شعلے پیدا کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

(تاریخ زوال سلطنت روم از گبن)

لداخ میں عزاداری

لداخ ہندوستان کا ایک اہم حصہ ہے جو لداخ، گلگت، چین اور روس کی سرحد پر واقع ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ لداخ پر حکومت ہند کا قبضہ ہے مگر بلتستان پاکستان کی غلامی میں ہے۔ یہ علاقہ تبت خورد کہلاتا ہے اور آٹھ ہزار پانچ سو بائیس مربع میل پر مشتمل ہے۔ دریائے سندھ، دریائے شیوق اور دریائے شگر یہاں سے گذرتے ہیں۔ سر بفلک برف پوش پہاڑ کوہ پیماؤں کو دعوت جرأت آزمائی دیتے ہیں اسکردو، دادر لیسہ اور گھر منگ، تولتی، پرکوتہ، کوارود، تقول، تہنری، اور سق دریائے سندھ کے کنارے کی آبادیاں ہیں، چونکہ پورا بلتستان شیعہ اثنا عشری ہے اس لئے شب و روز ذکر محمدؐ و آل محمدؐ کے علاوہ کوئی شغل نہیں۔

بلتی زبان گلگت، لداخ اور بلتستان کی مشترک زبان ہے۔ اس زبان کا رسم الخط پہلے کچھ اور تھا لیکن اب نسخ ہے۔ بلتی کا لٹریچر زیادہ تر قصائد و مراثی، مدح اہل بیتؑ اور فضائل محمدؐ و آل محمدؐ پر مشتمل ہے۔ آبادی کم، پیداوار بھی کم۔ وسائل آمد و رفت بھی نہیں، اس کے باوجود قدم قدم پر مسجد و امام باڑہ دیکھ کر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ لوگ غریب ہیں، عربی و فارسی کا عام رواج ہے۔ طلباء و علماً نجف، کربلا، مشہد و لکھنؤ کے مدارس سے تعلیم یافتہ ہیں۔ شاید ہی کوئی گاؤں ایسا ہو جہاں کوئی عالم دین نہ ہو۔

مقپون خاندان بلتستان کا پہلا حکمران خاندان ہے۔ جو مغلوں سے روابط بلکہ قرابت بھی رکھتے تھے۔ علی شیر خان رنچن اعظم (۱۴۳۳ء۔ ۱۵۹۶ء) کے فتوحات شمالی کشمیر لیہ سے چترال تک پھیل گئے۔ اسکردو میں راجدھانی تھی۔ جہاں شیر شاہ اور علی شاہ نے اپنی عظمت و فتح مندی کے پرچم لہرائے۔ ان کے بعد بیگو اور عماچہ حکمرانوں نے حکومت کی۔ ان میں سے اکثر حکمران شاعر، مرثیہ گو اور مداح اہل بیت تھے۔

لداخ، ایمانداری، مذہب کی پابندی، واقفیت مسائل، شجاعت و دلیری میں مشہور ہیں۔ موجودہ قومی حکومت نے یہاں کے عوام کی ترقی کے بہت سے منصوبے شروع کر رکھے ہیں۔

بلتستان میں ہر شخص عزادار ہے۔ محرم کا چاند دیکھتے ہی برف پوش پہاڑیاں، پتھریلی وادیاں، نوحہ و ماتم کی صداؤں سے گونجنے لگتی ہیں، مرد و زن، جوان اور بچے سب کے سب سوگوار نظر آتے ہیں۔

راجہ حسین علی خاں محب بلتی زبان کے امیر انیسؔ مانے جاتے ہیں۔ آپ مقپون خاندان کے آخری تاجدار احمد شاہ کے چھوٹے صاحبزادے اور ۱۸۴۱ء میں گلاب سنگھ سے لڑتے ہوئے گرفتار ہوئے اور قید ہی میں جاں بحق ہوئے۔

ان کے علاوہ راجہ لطف علی خاں عاشق، راجہ امیر حیدر مخلص۔ راجہ ملک حیدر بیدل۔ راجہ محمد علی خاں ذاکر۔ راجہ حیدر خاں حیدر، عماچہ وغیرہ بڑے بڑے مرثیہ گو، ذاکر اور

نوحہ خوان ہیں۔ ان لوگوں کے ملبتی، عراقی اور فارسی دانوں کی فارسی تقریریں مخصوص طرح کا سینہ شگاف ماتم ملبتوں کا طرۂ امتیاز ہے۔

بنگال کی عزاداری

خلیج بنگال کے کنارے ہندوستان و برما کے بیچ میں ایک چھوٹا سا قطعۂ ارضی اور پاکستان کا بڑا حصہ ہے۔ جو اب مشرقی پاکستان یا بنگال کہلاتا ہے۔ مشرقی پاکستان تاریخ برصغیر میں مختلف قوموں، بنگلہ زبان اور رنگا رنگ اسلامی تحریک کی بناء پر خاص اہمیت رکھتا ہے۔

محمد بختیار پہلا فاتح ہے جس نے بنگال کو ۵۹۹ھ میں مسخر کیا اور لکھنوتی کو پایہ تخت بنایا۔ اس کے بعد سے مغلوں تک یہ صوبہ ایک نیم خود مختار مکمل خود مختار اور پھر مغلوں کے ماتحت آ گیا۔

۱۴ اگست ۱۹۴۷ء سے پہلے یہ پورا صوبہ بنگال کہلاتا تھا۔ شیعی تاریخ میں بنگال کے چند شہر بڑی خصوصی نظر کے محتاج ہیں۔ جس کے لئے کوئی مکمل کام تو وہاں کے رہنے والے ہی کر سکتے ہیں۔ مگر ہم پر اس کا کچھ حق ہے۔ ماخذ و اطلاعات کی نایابی کے باوجود ہم مختصر طریقے سے کچھ اشارے کریں گے۔

ڈھاکہ، کلکتہ، مرشد آباد۔ ہوگلی۔ متحدہ بنگال کے یہ چاروں بڑے شہر عزاداری کے مرکز ہیں۔

ڈھاکہ:- جہانگیر کے نامور سپہ سالار اسلام خان نے اس شہر کو "جہانگیر نگر" کے نام سے آباد کیا۔ مغلوں کے زمانے میں ڈھاکہ بہت خوبصورت اور اہم شہر تھا آج بھی اس دور کی عمارتیں ڈھاکہ کی عظمت میں چار چاند لگا رہی ہیں۔ ان عمارتوں میں میر مراد کا مشہور امام باڑہ "حسینی دالان" ہے۔

خواجہ ناظم الدین روڈ پر پرانے ریڈیو اسٹیشن کی داہنی طرف ایک کشادہ سڑک پر یہ عزا خانہ واقع ہے۔ دور سے دیکھئے تو معلوم ہوتا ہے۔ جیسے آصف الدولہ اور حسین آباد کے امام باڑے اسی کا عکس ہیں۔ امام باڑے میں داخل ہوں تو سنگ موسیٰ پر یہ قطعہ لکھا ہے۔

"در زمان بادشاہ ذی وقار آن عظیم الشان
شاہ نامدار ساخت این ماتم سرا سید مراد
در سن پنجاہ و دو و بر یک ہزار"

۱۰۵۲ھ و ۱۶۴۲ء میں دہلی کی راجدھانی پر شاہجہان اور بنگال کی صوبہ داری شاہ شجاع کے ماتحت تھی۔ میر مراد نظامت کے داروغہ، امیر اور صاحب دین و دل رئیس تھے۔ مشہور ہے۔ انھوں نے ایک مرتبہ حضرت امام حسینؑ کو خواب میں دیکھا۔ کہ حضرت فرما رہے ہیں کہ اگر میری خوشنودی چاہتا ہے تو ایک امام باڑہ میرے نام پر تعمیر کر۔ چنانچہ خواب سے بیدار ہوتے ہی میر مراد نے امام باڑے کی تعمیر کا اہتمام شروع کر دیا اور اس کی تعمیر پر بے دریغ روپیہ صرف کیا۔

یہ ایک دو منزلہ عمارت ہے۔ جس پر دو برجیاں بنی ہوئی ہیں۔ اس کی پشت پر ایک بڑا تالاب ہے۔ مغربی سمت میں ایک بڑا سا میدان ہے۔ جس کے اختتام پر دو منزلہ ڈیوڑھی ہے۔ جو پہلے نقار خانہ کا کام دیتی تھی۔ اب بھی محرم کے زمانے میں اس پر شہنائی وغیرہ کی جوڑیاں بیٹھتی ہیں اور اپنے اپنے کمال کا مظاہرہ کرتی ہیں۔ اصل عمارت ایک بڑے ہال کی طرح ہے۔ جس میں تعزیے، علم نشان ڈھال اور تلوار یں وغیرہ رکھی ہیں۔ عمارت کا اندرونی حصہ تارکول سے سیاہ کر دیا گیا ہے جس سے اظہار رنج و الم مقصود ہے۔

امام باڑے پر میر مراد نے بہت بڑی رقم وقف کی تھی

آج بھی یہی وقف اسی خاندان کی نگرانی میں اخراجات کا کفیل ہے۔ محرم میں مراسم عزا، اور عموماً جمعہ و جماعت کا انتظام رہتا ہے۔

۱۸۹۷ء میں زلزلے سے یہ عمارت بہت زیادہ شکستہ ہو گئی تھی۔ لیکن نواب سر احسن اللہ خاں صاحب مرحوم نے ایک لاکھ روپے کے خرچ سے اس کی مکمل مرمت کرائی۔"

میرپور اور طباطبائی خاندان مدتوں سے یہاں نام حسین چلاتے ہیں۔ اور اب تو تقسیم کے بعد ہندوستانی شیعہ بھی ڈھاکہ میں جا کر بس گئے ہیں۔ اور ڈھاکہ کا محرم بالکل نئے انداز اور سابق سے مختلف شکل میں منایا جانے لگا ہے۔

باقر گنج بھی ڈھاکے کے طباطبائی خاندان کا آباد کردہ شہر ہے۔ اور یہاں بھی عزاداری ہوتی ہے۔

مغربی بنگال کا مرشد آباد بھی شیعہ تاریخ کا ایک مرکز ہے۔ یہاں ایک مدت دراز سے شیعہ ریاست قائم ہے۔ شیر بنگال نواب غازی سراج الدولہ بہادر رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد ۱۹۴۷ء تک مرشد آباد میں حکمران رہی۔ قلعہ، امام باڑہ اور اوقاف اب بھی باقی ہیں۔ عزاداری و محرم اب تک بڑی شان سے ہوتا ہے۔

تیسرا مرکزی شہر کلکتہ ہے۔ جس کی آبادی کے ساتھ ہی عزاداری شروع ہو گئی تھی۔ انگریزی ملازمین یعنی علماء فورٹ ولیم کالج میں بہت سے شیعہ تھے۔ محرم کے دنوں میں یہ سب مجلس و ماتم کرتے تھے۔ کلکتہ کی تاریخ میں یہ بات بھی یادگار رہے گی کہ اسی کے پریس نے مجلس خوانی کی قدیم ترین کتاب، حیدر بخش حیدری متوفی ۱۸۲۳ء کی "گل مغفرت یا دہ مجلس" چھاپی ہے۔

اسی کلکتہ میں حضرت خلد آشیان، سلطان عالم محمد واجد علی شاہ اختر تاجدار اودھ مقیم رہے۔ مٹیا برج اور فورٹ ولیم اسی بادشاہ کی وجہ سے جلوس عزا و مجلس میں تاریخ کا ایک خاص شہر قرار پایا۔ واجد علی شاہ اور ان کے حرم ہر جگہ مجلس کرتے تھے۔ خصوصیت سے اسد منزل اور سبطین آباد تو امام باڑے ہی تھے۔ ان امام باڑوں میں بادشاہ عشرے کرتے تھے۔ علماء واکابر ذاکری اور خود بادشاہ بہ نفس نفیس مرثیہ پڑھتے تھے۔ لکھنؤ کے شاہانہ مراسم کے مطابق یہاں جلوس نکلتے تھے۔ چنانچہ لکھنؤ کے بیلی گارڈ میں تقریباً بتیس گز کی قلمی لمبی تصویر جلوس تعزیہ دیکھنے والے جانتے ہیں کہ میلوں لمبا یہ جلوس شاہی مراتب باجے، ہاتھی، اونٹ، گھوڑوں سے کس طرح آراستہ ہوتا تھا۔

سبطین آباد کا امام باڑہ اب تک باقی ہے اور اس میں شاہی انداز کی مجلسیں اب بھی ہوتی ہیں۔ خود کلکتہ میں شیعوں کی کافی تعداد ہے جو ایام عزا میں جلوس نکالتے، مجلسیں کرتے اور سوگ مناتے ہیں۔

ہوگلی:۔ بنگال کا ایک بڑا شہر ہے۔ اس شہر میں حاجی محمد محسن مرحوم کا بنا کردہ عظیم الشان امام باڑہ اور بہت بڑا وقف ہے۔ جس کی آمدنی حسین آباد لکھنؤ کے وقف سے بھی زیادہ ہے۔ ہوگلی تو ہندوستان میں ہے لیکن اس کی املاک، زمین اور کچھ عمارتیں پاکستان کی طرف نکل گئیں۔ جیسور سے تین میل کے فاصلے پر مرلی ڈاک خانہ راجہ ہاٹ میں ایک امام باڑہ بھی حاجی صاحب مرحوم کا ہے۔ جیسور کے تمام جلوس اسی امام باڑے میں آکر ختم ہوتے ہیں۔

۲۵ ہزار سے زائد سالانہ آمدنی کا یہ وقف مدتوں سے انگریزوں نے اپنے مصارف کے لئے مخصوص کر رکھا تھا۔ شیعوں نے مقدمہ کے ذریعہ وقف کو آزاد کرانے کی بھی کوشش

۱؎ وحید قیصر، "دو مشرقی پاکستان کا ایک مشہور گھرانا ہے: ڈھاکہ" ریڈیو اور ٹیلیویژن، ریڈیو پاکستان کراچی ماہ دسمبر ۱۹۶۰ء ص ۱۲۔

ہیں لیکن کامیابی نہ ہو سکی۔ اب تک اس سے بے شمار طلباء کئی اسکول اور رفاہی ادارے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔

پاکستان میں اس وقت سے محرم کے مراسم اور مجالس وغیرہ کا انتظام ہوتا ہے۔ اگر اس وقت کا انتظام شیعوں کے ہاتھوں ہوتا تو بنگالی میں عزائے مظلوم کربلا کی ترویج و اشاعت کا بڑا کام ہوتا۔

بنگالی ثقافت اور وہاں کی تہذیبی علامتیں ہماری رسموں سے جداگانہ ہیں۔ ایک زمانے میں یہاں محرم عید کے طریقے سے منایا جاتا تھا۔ عاشور کے روز لوگ کھیلتے کودتے تھے نئے کپڑے پہنتے اور طرح طرح کے کھانے پکاتے تھے۔ مگر ۱۹۴۷ء کے بعد یہ رسمیں کم ہوتی جا رہی ہیں۔ بہار اور یو۔پی کے مہاجرین نے عزاخانوں اور امام باڑوں کو مرکز علم تحریک نیابت عزا قرار دیا ہے۔ مختلف عزاخانے فرید پور، کھلنا، خالص پور، جمشید پور، کرنافلی، چٹاگانگ وغیرہ میں ڈھاکے کی طرح دس دنوں تک پوری شان سے سوگ منایا جاتا ہے۔

[illegible] اصفہانی خاندان نے ایک نیا حسینیہ تعمیر کرایا ہے [illegible] خرم کے علاوہ دوسرے ایام ولادت و وفات آئمہ میں [illegible] و مجلس کا انتظام اور شیعہ مراسم کی انجام دہی ہوتی ہے۔

پورے بنگال میں شیعوں کی تعداد کم تھی اس لئے وہ بات تو نہیں جو مغربی پاکستان میں ہے مگر پھر بھی عاشور اربعین میں ہر چھوٹے بڑے شہر، بعض قصبوں اور دیہاتوں میں سر برہنہ ماتم کی رسم۔ تعزیہ و علم کے جلوس۔ ہندو مسلمانوں کی سبیلیں۔ بہار، یو۔پی، ایرانی و بری، مرشد آبادی شیعوں کے جلوس پوری شان سے برآمد ہوتے ہیں۔

یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ بنگال میں بھی واقعہ کربلا کا تذکرہ لٹریچر کی جان ہے۔ دکنی زبان کے مرثیوں کی قدامت میں شریک بنگالی زبان کا ایک اور شاہکار "مقتل حسین" ہے۔

محمد خاں نامی بنگلے کا شاعر میر مراد کا ہم عصر اور "مقتل حسینؑ" منظومے کا مصنف ہے۔ "مقتل حسینؑ" بنگلہ لٹریچر کا شاہکار مانا جاتا ہے۔ یہ کتاب ۱۰۵۲ھ مطابق ۱۶۴۵ء یا ۱۶۴۲ء میں لکھی گئی۔ گویا شاہجہان کے عہد اور حسینی دالان کی تعمیر کے وقت محمد خاں بنگال کا ذاکر امام حسینؑ تھا۔ اسی کے طفیل میں بنگلہ زبان کو یہ شرف حاصل ہوا کہ وہ بھی اردو، ہندی، فارسی، تامل وغیرہ کی طرح ذکر و نوحہ کربلا تاریخ ادب میں قدم رکھتی ہے۔

دسویں صدی کا خطیب اعظم

ملا حسین کاشفی

جناب علامہ سید مجتبیٰ حسن صاحب کامون پوری، ناظم دینیات مسلم یونیورسٹی علیگڑھ

کاشفی کا تعارف

جن حضرات نے واقعہ کربلا کے سلسلے میں خطابت و تالیف میں نمایاں حصہ لیا ہے۔ اور تاریخ عزاداری میں جن کے نام اور کام کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، اُن میں ملا حسین واعظ کاشفی سنہ ۹۱۰ھ کو ایک مخصوص درجہ حاصل ہے۔

واعظ کاشفی سبزوار کے علمی گھرانے میں پیدا ہوئے، ان کے والد صاحب علم و فضل تھے۔ سبزوار خود بھی علم و ادب و تشیع کا مرکز تھا۔ اس خطے میں اثنا عشریوں کے سوا کوئی دوسرا فرقہ آباد نہ تھا۔

مولوی روم اپنی مثنوی میں لکھتے ہیں۔

سبزوار است ایں جہاں و مرد حق
اندریں عالم غریب است و قلق (؟) — [پڑھنا مشکل: سبزوارانہ رابوبکری مجو (دفتر پنجم)]

ان تمام مناسب حالات نے کاشفی کو اس عہد کے علوم متداولہ کی دولت سے مالا مال کر دیا۔ اور ان کی فطری صلاحیتوں کے ظہور کا پورا موقع دیا۔ تشیع ایک تبلیغی نظریہ زندگی ہے۔ خطابت و ادب سے اسے ہمیشہ کام پڑا۔ سبزوار کی فضا خطابت نواز و ادب پرور تھی۔ کاشفی نے اس فن سے دلچسپی لی اور اسے آسمان ترقی پر پہونچا دیا۔ استفادہ و افادہ اور خطابت کی غرض سے کاشفی دوسرے شیعہ مراکز میں بھی جاتے رہے۔ نیشاپور گئے۔ وہاں بھی انھوں نے خطابت کی گلپاشی کی۔ مشہد مقدس (خراسان) آئے کچھ عرصہ تک مصروف رہے۔ لیکن اس وقت تک ان کو ایسا کوئی مربی نہیں ملا جو ان کے فن خطابت کو چمکاتا اور فکر معاش سے آزاد کر دیتا —— یہاں سے ان کی زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے —— وہ سنہ ۸۶۰ھ میں قسمت آزمائی کے لئے ہرات چلے آئے۔ ہرات[1] ایران کا ایک قدیم شہر ہے۔ جغرافیائی و اقتصادی و تجارتی و علمی اعتبار سے اسے کافی شہرت حاصل رہی ہے۔ یہ مقام ہمیشہ شاہان ایران کی دلچسپی کا مرکز رہا ہے۔

کاشفی کے سفر ہرات کا سبب ابھی تک راز سربستہ بنا ہوا ہے۔ خود کاشفی کا خاندان اور وطن سب شیعہ تھے

[1] آثار ہرات از آغا خلیل نظامی افغانی مطبوعہ کابل سنہ ۱۳۱۳ھ شمسی تاریخ نامہ ہرات سیف الدین بن محمد ہروی (اوائل قرن ہفتم) مطبوعہ کلکتہ سنہ ۱۳۱۳ء روضۃ الصفا ج ۷ ص ۴ مطبوعہ نول کشور پریس لکھنؤ سنہ ۱۹۰۲ء

ہرات میں سواد اعظم کی تہذیب اور حکومت تھی ——

علامہ نور اللہ شوستری (م ۱۰۱۹ھ) تو مجالس المومنین (صفحہ ۵ مطبوعہ ۱۲۹۹ھ) میں لکھتے ہیں۔ میں نے مشہد میں تحصیل علم کے زمانے میں سنا تھا کہ کمال الواعظین مولانا حسین کاشفی سبزواری بعض مصالح دنیاوی کی بنا پر دار السلطنت ہرات گئے اور ایک عرصہ تک عذاب صحبت میر علی شیر اور ملا جامی کی ہمراہی میں گرفتار رہے ——" حاجی زین العابدین شیروانی م ۱۲۵۳ھ ریاض السیاحہ (مطبوعہ طہران ۱۳۳۹ھ) میں لکھتے ہیں بمقتضائے تقدیر ہرات گئے —— خود کاشفی نے بھی کوئی معقول وجہ نہیں بیان کی ہے خود تو وہ اس ہجرت کا محرک اپنا ایک خواب بتاتے ہیں۔ بقول ان کے مشہد مقدس میں انھوں نے سعد الدین کاشغری کو خواب میں دیکھا وہ کہتے ہیں تم جلد میرے پاس چلے آؤ۔ وہ کاشغری کی تلاش میں ہرات گئے۔ مولانا نور الدین عبد الرحمٰن جامی سے ملے۔ ان سے اپنا خواب بیان کیا۔ جامی نے پوچھا آپ نے خود اس کی کیا تعبیر دی ہے کاشفی نے کہا میرا خیال ہے سعد الدین کے مزار کے پہلو میں میری قبر بنے گی —— جامی نے کہا صحیح تعبیر یہ معلوم ہوتی ہے کہ سعد الدین سے آپ کا رشتہ ہو جائے گا۔ اور آپ کو ان سے قربت حاصل ہو جائے گی۔ ۸۶۸ھ میں کاشفی کے صاحبزادے فخر الدین پیدا ہوئے اور ۹۰۲ھ میں ان کی شادی خواجہ کلاں نبیرہ پسری سعد الدین کاشغری سے ہو گئی۔ اس وقت کاشفی کو اپنا خواب یاد آیا اور اپنے بیٹے سے ان کے بعد اب خواب کی تعبیر صادق آئی۔

کاشفی نے ہرات میں کافی رسوخ پیدا کر لیا۔ جامی کی بہن سے ان کی شادی ہو گئی، بیٹے کی شادی بھی ممتاز گھرانے میں ہو گئی۔ جامی نے ان کو نقشبندی سلسلے میں منسلک کر لیا۔ صوفیوں کا نقشبندی سلسلہ شیخ بہاء الدین نقشبند بخارائی کی طرف منسوب ہے نقشبند بخارا کا ایک دیہات تھا بہاء الدین وہیں کے باشندے تھے۔ نقشبندی سنی صوفی ہوتے ہیں اور امور شرعی کی پابندی کرتے ہیں اس لئے اہلسنت کے اکثر علماء ظاہر اس سلسلہ سے ارادت رکھتے ہیں۔

قاضی نور اللہ شوستری وغیرہ نے لکھا ہے کہ جامی کا طریقہ حضرت ابو بکر تک پہونچتا ہے لیکن حاجی زین العابدین شیروانی اسے تسلیم نہیں کرتے وہ لکھتے ہیں کہ میں نے فقرا نقشبندیہ میں سے نہ تو کسی سے سنا اور نہ کسی کتاب میں دیکھا (ریاض السیاحہ صفحہ ۲۳۰) کاشفی کی رسائی دربار ہرات تک ہو گئی۔ شاہزادوں کی تعلیم و تربیت ان سے متعلق ہوئی۔ سلطان[1] حسین بایقرا تخت نشین ہوا (۸۷۳ - ۹۱۱ھ) تو اس نے ان کی بڑی قدر کی۔ سلطان حسین کے وزیر نظام[1] الدین امیر علی شیر نوائی ۹۰۶ھ نے بھی کاشفی کو بہت سہارا دیا۔

ہرات میں ان کی خطابت نے دلوں کو مسخر کر لیا میر خواند لکھتے ہیں مولانا کمال الدین حسین علم نجوم و انشا میں وحید العصر تھے۔ تمام علوم میں اپنے امثال و اقران کے برابر تھے۔ آواز دلکش اور صورت دلپذیر تھی وہ معانی آیات بینات و غوامض اسرار احادیث رسالت پناہ ان کے وعظ میں آراستہ ہو کر آتے۔ حاجی زین العابدین شیروانی لکھتے ہیں:۔

فاضل یگانہ و عالم زمانہ بود در علوم نجوم دانش و فنون غریبہ گوئی سبقت از امثال و اقران می ربود ہموارہ بصورت خوش و لحن دلکش با مردم وعظ و خطابی پرلخت معانی قرآن و احادیث را بعبارات لائقہ و اشارات رائقہ بیان می ساخت (ریاض السیاحہ صفحہ ۲۰۹)

---

[1] حسین مرزائے جانانہ: محمد خاوند شاہ و خواندمیر ہروی ۹۰۳ھ نے روضۃ الصفا میں تفصیل سے لکھے ہیں۔ مسلمہ علی شیر نوائی کا تفصیلی تعارف خواندمیر نے مکارم الاخلاق میں اور دولت شاہ سمرقندی نے خاتمہ تذکرۃ الشعراء ص ۵۰۳ مطبوعہ ۱۹۰۱ء میں کیا ہے۔ انجمن تاریخ افغانستان نے نوائی کے حالات میں محمد یعقوب واحدی جوزجانی کی کتاب شائع کی ہے اور بہاء ایرانی کو محض افغانی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے جیسے سید جمال الدین اسد آبادی ایرانی کو افغانی بنانے کیلئے کوشش کی

وہ جمعہ کی صبح کو سلطان کی محل سرا میں وعظ کہتے۔ نماز جمعہ کے بعد امیر علی شیر نوائی کی مسجد میں وعظ کہتے۔ سہ شنبہ کو ان کا وعظ مدرسۂ سلطان میں ہوتا۔ چہارشنبہ کو خواجہ ابوالولید کی آرام گاہ میں وعظ کہتے۔ آخری زمانے میں سلطان احمد میرزا کی آرام گاہ میں بھی وعظ کہنے لگے تھے۔ کاشفی جو مقصد لے کر ہرات گئے تھے وہ پورا ہوا۔ دولت و اثر کے اعتبار سے ہرات میں انھوں نے اونچا مقام پایا۔ شاید سبزوار وغیرہ میں انھیں یہ خوشحالی نصیب نہ ہوتی۔ ان مقامات پر شیعہ عالموں اور خطیبوں کی کمی نہ تھی۔ ہرات کے عوام و خواص علماء و امرا و حکومت سب نے ان کو آنکھوں میں جگہ دی۔ تصوف تشیع اور تسنن کے درمیان ایک پل ہے۔ دونوں ایک دوسرے سے اس راستے پر گھل مل جاتے ہیں اور کبھی کبھی تو اتنے قریب ہو جاتے ہیں کہ شناخت مشکل ہو جاتی ہے۔ کوئی ایسا قطعی ثبوت نہیں ہے کہ کاشفی اثنا عشریت سے دستبردار ہو گئے۔ البتہ یہ محسوس ہوتا ہے کہ ان کا تشیع تصوف سے دبا ہوا ہے۔ اصول و فروع کے اختلافی مسائل میں وہ بڑی حد تک مہر بلب نظر آتے ہیں۔ اہلبیت سے گہری ارادت جو تشیع و تصوف کا مشترک سرمایہ ہے ان کی تحریر و تقریر میں پورے شباب پر ہے خلفاء ثلاثہ کے بارے میں وہ تزکیہ و تنقید دونوں سے کتراتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس طرز سے انھوں نے ہرات کے ماحول میں حبِ اہلبیت کی خوب تخم کاری کی۔

مذہب کاشفی کا مسلک ان کی زندگی ہی میں زیر بحث تھا ہرات اور تمام بلاد ماوراء النہر میں ان کو شیعہ و رافضی کہتے تھے۔ سبزوار اور بلاد خراسان میں وہ سنی و حنفی سمجھے جاتے تھے (ریاض العلماء مرزا عبداللہ آفندی) ——— ہرات وغیرہ ایسے تصوف سے اجنبی تھے جسمیں محبت اہلبیت کا اتنا گہرا رنگ ہو ——— اور سبزوار وغیرہ ایسے تشیع سے نامانوس تھے جو کلام و فقہ کے اختلافی مسائل میں اُن کا ہمزباں نہ ہو۔ ایک عرصہ کے بعد کچھ دنوں کے لیے جب وہ سبزوار آئے تو ان کے مسلک کے بارے میں جو افواہ تھی لوگوں نے چاہا کہ خود ان سے اس کی حقیقت معلوم کریں۔ علماء نے اس موقع پر کیا طرز عمل اختیار کیا اس کا پتہ نہیں چلتا۔ لیکن بعض عوام کے سخت رویّہ کا ذکر آیا ہے۔ جامع سبزوار میں ان کا وعظ ہوا، ایک بڈھا زیر منبر عصا لئے ہوئے بیٹھا۔ کاشفی نے تقریر میں کہا۔ جبرئیل امین جناب رسولؐ خدا کے پاس بارہ ہزار بار آئے۔ سبزواری پوچھ بیٹھا جبرئیل حضرت علیؑ کے پاس کتنی بار آئے۔ اس سوال سے کاشفی کا ایک لمحہ پیچ و تاب میں گزرا۔ اگر وہ یہ کہتے کہ جبرئیل حضرت علیؑ کے پاس آئے تو یہ خلاف واقع تھا۔ اور اگر کہتے کہ نہیں آئے تو سبزواری کا عصا حرکت میں آجاتا۔ ان کی ذہانت اور حاضر جوابی نے اور بہ علامہ شوستری کے الفاظ میں صفائے اعتقاد نے ان کی مدد کی ——— انھوں نے یہ کہہ کر۔ جبرئیل حضرت علیؑ کے پاس ۲۴ ہزار بار آئے اہل مجلس میں تعجب و ابتہاج کی ایک لہر دوڑا دی۔ سبزواری نے کہا آپ ہمیں خوش کرنے کے لئے یہ کہہ رہے ہیں یا اس کا کوئی ثبوت بھی ہے۔ کاشفی نے کہا۔ جناب رسول خدا کی حدیث ہے۔ میں علم کا شہر ہوں اور علیؑ اس کا دروازہ ہیں۔ جبرئیل دروازے سے شہر میں داخل ہوئے پھر اسی دروازے سے واپس ہوئے۔ اس طرح جبرئیل حضرت علیؑ کے پاس ۲۴ ہزار بار آئے گئے۔ (مجالس المومنین علامہ شوستری ۱۰۱۹ھ مجلس اول ص۹ مطبوعہ ۱۳۰۱ھ)

کاشفی کے بعد بھی ان کا مسلک زیر بحث رہا ——— جو ان کو شیعہ کہتے ہیں وہ ان کے اس شعر سے تمسک کرتے ہیں۔

" ذرّیتی سوالِ خلیلِ خدا ۔ بدان
وز لاینال عہد ۔ جوابش بکن ادا
گر ودتراعیاں کہ امامت نہ لائق ست
آنزاکہ ۔ بود بیشتر عمر ۔ در خطا

حضرت ابراہیم نے خدا سے درخواست کی تھی تو نے مجھے جس منصب سے نوازا ہے میری ذریت کو بھی اس سے سرفراز فرما وحیِ الٰہی نے ان سے کہا کہ تمہاری ذریت میں جو لوگ گناہگار ہوں گے انھیں یہ منصب نہیں ملے گا۔ شیعہ امام کے لیے عصمت شرط سمجھتے ہیں اس آیت سے بھی استدلال کرتے ہیں کہ امام کا معصوم و منصوص ہونا ضروری ہے ۔ حضرات اہلسنت فیصلہ کے لیے عصمت کی شرط کے قائل نہیں ہیں ان شعروں میں کہا گیا ہے کہ امام و خلیفہ وہی ہوسکتا ہے جو معصوم ہو جس کی عمر کا بڑا حصہ خطا میں گزرا وہ خلیفہ کیسے ہوسکتا ہے ۔ لہٰذا کاشفی شیعہ ہیں ۔ لیکن اس شعر سے استدلال اسی وقت صحیح ہوگا جب یہ معلوم کہ یہ شعر کس عہد کا ہے ۔ سبزوار سے ہرات آنے سے پہلے کا ہے تو اس عہد میں اُن کا تشیع نزاعی نہیں ہے اور اگر عارضی طور پر سبزوار آنے کے موقع پر کہا تھا تو ہوسکتا ہے کہ اس کا مقصد عوام کو خوش کرنا ہو۔ کاشفی کے تشیع پر اس شعر سے علامہ شوستری نے مجالس المومنین میں مولانا عباس قمی م ۱۳۵۹ھ نے ہدیۃ الاحباب (۲۴۲) وغیرہ میں اور ہمارے شیخ المحدث حجۃ الاسلام آقائے بزرگ طہرانی نجفی دام ظلہ نے الذریعہ وغیرہ میں استدلال کیا ہے ۔ یہ سب حضرات علامہ شوستری کی رائے سے متاثر ہیں اور خود علامہ شوستری اپنی غیر معمولی جلالت کے باوجود شیعہ سازی میں موردِ تنقید ہیں ۔

جن لوگوں کے خیال میں کاشفی کا جھکاؤ تسنن کی طرف ہے وہ اس کا باعث میر علی شیر نوائی اور ملا جامی کی صحبت کو قرار دیتے ہیں ۔ لیکن یہی بے یقینی و تردد جامی کے مسلک کے بارے میں بھی کچھ لوگوں میں پائی جاتی ہے ۔ ایرانی ادیب و ملک الشعرا محمد تقی بہار مرحوم لکھتے ہیں :-

قاضی نور اللہ نے جو کہ ہر فاضل کو ذرا سے بہانے اور معمولی سی گواہی پر شیعہ بنا دیتے ہیں جامی کو مردِ فاضل اور عدوئے اہلبیت قرار دیا ہے (سبک شناسی بہار ۲۲۵) علامہ محمد تقی مجلسی اول اور علامہ محمد باقر مجلسی ان کو سنی کہتے ہیں (سبک شناسی) زین العابدین شیروانی حنفی کہتے ہیں کہ ان کا سلسلہ شیخ بہاء الدین نقشبند تک سنی ہے انھوں نے شواہد النبوۃ میں حضرت ابوطالب کی شان میں جسارت کی (ریاض ص ۲۳۳) ـــــ انھیں کو امیر محمد حسین حسینی خاتون آبادی سبط مجلسی نے ایک مضمون میں ان کے ناصبی ہونے کے تمام دلائل کے باوجود لکھا ہے کہ وہ تقیہ میں تھے اور باطناً شیعہ تھے ۔ سبک شناسی ۲۲۲) ـــــ خود جامی اپنے کو شیعہ و سنی نزاع کے قید و بند سے آزاد ظاہر کرتے ہیں ۔ جامی نے کہا ہے :-

اے مغبچہ از مہر بدہ جام میم را
کاندر ز نزاعِ سنی و شیعہ نیم
گویند کہ جامیا چہ مذہب داری
صد شکر کہ سگِ سنی و خرِ شیعہ نیم

یہ مدنظر رکھنا چاہیے کہ شیعہ و سنی دونوں اپنے اپنے کلامی و فقہی متعین حدود رکھتے ہیں ۔ کسی کو صرف بیانِ فضیلتِ اہلبیت یا کسی جزوی مسئلہ میں موافقت کی وجہ سے کسی خاص فرقہ کا اصطلاحی لقب دینا بے احتیاطی ہے ۔ کاشفی کے دینی مسلک کے تعین میں جو بھی اختلاف ہو ۔ اس پر سب متفق ہیں کہ اُن کو خطابت کو انھوں نے بامِ عروج تک پہونچایا ۔ وہ کافی مشغول و محترم زندگی گزار کر ۹۱۰ھ میں راہی ملکِ بقا ہوئے

ذیل کے شعر سے ان کی تاریخ وفات نکلتی ہے۔

در ہدایت صرف شد ایام عمرش زاں سبب
گشت تاریخ وفاتِ او۔ ہدایت دستگاہ

روضۃ الشہداء کے ۱۲۸۶ھ کے لاہور اڈیشن میں ناشر کتاب نے بھی ایک قطعہ درج کیا ہے جس کا آخری شعر یہ ہے:-

گفت چوں شد۔ بعد ازیں بر منبر عرشم مقام
از پئے تاریخ (نیکو منبرِ باعرش باد)

کاشفی نے اپنی یادگار میں اپنے بیٹے مولانا فخر الدین کاشفی کو چھوڑا ہے جو دربار ہرات میں ان کے بعد جانشین ہوئے۔ وعظ و خطابت ان کا بھی پیشہ تھا ــــ رشحات (حالات مشائخ نقشبندی) لطائف (قصے) رئیس العارفین (مواعظ و تفسیر وغیرہ) حرز الایمان (اسرار حروف) مختصر اسرار فارسی ان کے تصانیف ہیں۔ ۹۳۹ھ میں ان کی وفات ہوئی ــــ

کاشفی نے جو زندہ و پائندہ یادگار چھوڑی ہے وہ ان کے تصانیف ہیں یہ ۳۰ - ۴۰ کتابوں کے مصنف ہیں

مشہور کتابیں

جن کتابوں نے غیر معمولی شہرت پائی وہ یہ ہیں:-

(۱) مواہب علیہ (تفسیر) مولفہ ۸۹۷ھ بمبئی میں بار بار چھپی یہ تفسیر رکیک و بعید تاویلوں کا ایک طومار ہے۔

(۲) لب لباب مثنوی روم مولفہ ۸۷۵ھ بمبئی و طہران میں بار بار چھپی۔

(۳) اخلاق محسنی۔ مولفہ ۹۰۰ھ کلکتہ و بمبئی و طہران وغیرہ میں چھپتی رہی ہے۔

(۴) انوار سہیلی۔ کلیہ و دمنہ کا فارسی ترجمہ ہے۔ ہندوستان و ایران و یورپ میں تیس بار سے زیادہ چھپی۔ اُردو میں بھی ترجمہ ہوا۔

(۵) مخزن الانشاء۔ نویں صدی ہجری کی فارسی مراسلہ نگاری و انشاء پردازی کا نمونہ ہے عرصہ تک اس کی تقلید کی گئی۔

(۶) روضۃ الشہداء۔ اس مقالہ میں کسی قدر اس کے ماله و ما علیہ پر روشنی ڈالی جائے گی۔

روضۃ الشہداء کی مقبولیت

یہ کاشفی کا شاہکار اور کارنامہ زندگی ہے مشرق و مغرب میں ان کی شہرت و مقبولیت کا باعث یہی کتاب ہے ــــ ۹۰۸ھ میں شاہزادہ مرشد الدولہ والدین عبد اللہ سید مرزا ابن صلاح الدولہ موسی حسنی کی فرمائش پر لکھی گئی۔ مرشد الدولہ عبد اللہ سید مرزا باپ کی طرف سے حسنی سید تھے ان کی ماں معزالدولہ بایقرا برادر اعیانی ابو الغازی سلطان حسین کی بیٹی تھیں (روضہ ۳۸۲)

عہد ائمہ طاہرین میں اور غیبت امام کے بعد مصائب اہلبیت پر شعر وغیرہ پڑھ کر دوسروں کو رلانا باعث سعادت و اجر آخرت سمجھا جاتا تھا۔ المیہ کربلا کتب اخبار و مقاتل میں موجود ہیں۔ لیکن ملا حسین واعظ کاشفی سے پہلے اس عمل کا کوئی مخصوص نام نہ تھا۔ ۹۰۸ھ میں جب کاشفی نے روضۃ الشہداء لکھی تو لوگ مجلس عزا میں اسے بڑی رغبت سے سنتے۔ لیکن اس کا پڑھنا ہر شخص کے بس میں نہ تھا۔ لوگوں کو بس کے پڑھنے کی تربیت دی جانے لگی۔ انھیں روضۃ الشہداء خواں کہنے لگے۔ رفتہ رفتہ روضہ خوان کہنے لگے۔ پھر دوسری کتاب بھی پڑھنے لگے۔ پھر زبانی یاد کر کے پڑھنے لگے۔ ان سب صورتوں میں پڑھنے والے کو روضہ خواں ہی کہتے رہے۔ (لولو و مرجان ۸)

فاضل خوانساری نے روضۃ الجنات میں لکھا ہے۔ روضۃ الشہداء فارسی کا پہلا مقتل ہے ــــ ہمارے شیخ المحدث علامہ محقق حضرت آغائے بزرگ طہرانی نجفی دام ظلہ اس کی اولیت کی نفی فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:-

شہید کا مقتل روضۃ الشہدا سے مقدم ہے۔ خود کاشفی کے بیان سے مقتل ابو المفاخر کا روضۃ الشہدا سے مقدم ہونا ثابت ہے (الذریعہ الی تصانیف الشیعہ ص۲۹۵) ــــ لیکن چونکہ شہید اور ابو المفاخر کے مقتل آج ناپید ہیں اس لئے فارسی کے موجودہ مقاتل میں روضۃ الشہدا ہی کو اولیت حاصل ہے۔

روضۃ الشہدا میں دس باب اور ایک خاتمہ ہے۔

(۱) ابتلائے بعض انبیاء (۲) آنحضرت صلعم کو قریش کی ایذا رسانی۔ حضرت حمزہ و جعفر کی وفات (۳) آنحضرتؐ کی وفات (۴) حالات جناب سیدہؑ (۵) حالات امیر المومنین (۶) حالات امام حسنؑ (۷) حالات امام حسینؑ (۸) شہادت حضرت مسلم و فرزندان مسلم (۹) امام حسینؑ کی کربلا میں آمد۔ جنگ۔ اولاد و اقربا و انصار کی شہادت (۱۰) اسیران اہلبیت کی سرگذشت۔ قاتلان امام کا انجام

خلاصے

روضۃ الشہدا کی مجلسیں طویل تھیں ایک مجلس میں ختم نہیں ہو سکتی تھیں۔ اور اس کی خواندگی بھی ضروری تھی اس لئے اس کے بیشمار خلاصے کئے گئے۔ جو خلاصۃ الروضہ یا منتخب الروضہ کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں۔ اکثر خلاصوں پر ملخص یا انتخاب نگار کا نام بھی نہیں ہے ــــ ایرانی لغت نگار علی اکبر دہخدا کے بیان کے مطابق خود کاشفی نے دہ مجلس کے نام سے اس کا خلاصہ کیا تھا (لغت نامہ) خلاصۃ الروضہ کے نام سے علی بن حسین زوداری نے بھی تلخیص کی تھی۔ (نسخہ مخطوطہ علی اکبر کرمانی)

حامد علی خاں نے دہ مجلس کے نام سے تلخیص کی۔

سنہ ۱۲۰۱ھ میں فدا نے دہ مجلس کے نام سے انتخاب کیا۔

نظم میں تلخیص و ترجمہ

غواصی یزدی ایرانی نے سنہ ۹۵۰ھ میں نظم کیا۔ گلبرگہ میں سیوا شاعر نے سنہ ۱۰۹۲ھ میں اردو میں ترجمہ کیا۔

سنہ ۱۱۲۰ھ میں سید احمد علی نے منظوم ترجمہ کیا (مخطوطہ کتب خانہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

سنہ ۱۲۳۸ھ میں میر عالم نے نظم میں انتخاب کیا۔

سنہ ۱۲۴۸ھ میں سید خدا بخش حیدری دہلوی نے گلستان شہدا کے نام سے ریختہ میں ترجمہ کیا۔ سنہ ۱۲۸۶ھ میں گل مغفرت کے نام سے تلخیص کی۔ منشی علی احمد نے گنج شہیدوں کے نام سے منظوم ترجمہ کیا۔ سنہ ۱۳۰۱ھ میں تیسرا ایڈیشن نولکشور پریس لکھنؤ میں چھپا۔ محمد فیاض ولی ویلوری نے وسیلۃ النجاۃ کے نام سے دکنی میں منظوم ترجمہ کیا۔ (مخطوطہ کتبخانہ سالار جنگ حیدرآباد دکن) (مقدمہ کربل کتھا)

ترجمے

محمد فضولی بغدادی شاعر (۹۶۳ - ۹۷۰) نے حدیقۃ السعدا کے نام سے ترکی میں ترجمہ کیا۔ مطبع بولاق مصر میں سنہ ۱۲۵۳ھ/۱۸۶۳ء میں اور استنبول میں سنہ ۱۳۰۳ھ/۱۸۵۷ء میں چھپا۔

حاجی قیصری نے بھی ترکی میں سعادت نامہ کے نام سے ترجمہ کیا۔

سنہ ۱۱۹۰ھ کے سید میر دن خاں مونس نے ریاض الطاہرین و حادثات کربلا کے نام سے اردو میں ترجمہ کیا (مخطوطہ کتب خانہ سالار جنگ)

سنہ ۱۲۰۷ھ میں سید ہدایت علی واسطی بلگرامی نے دہ مجلس کے نام سے ترجمہ کیا۔ (مخطوطہ ذخیرہ احسن مارہروی مسلم یونیورسٹی)

سنہ ۱۲۸۶ھ میں عبد اللہ اور علاء الدین نے مل کر ترجمہ کیا (مقدمہ کربل کتھا)

روضۃ الشہدا کی تقلید

سنہ ۱۱۷۳ھ میں نوازش علی شیدا نے اسی روش پر روضۃ الاطہار لکھی۔

سنہ ۱۲۱۵ھ میں میر حسن جعفر نے روضۃ الشہدا لکھی۔

سنہ ۱۲۳۳ھ میں مرزا علی اکبر نے مختار الاخبار لکھی۔
سنہ ۱۲۸۵ھ میں میر سلطان فخر الدین بادشاہ قادری نے نفحات الشہادۃ لکھی۔
سنہ ۱۲۰۲ھ کا مخطوطہ دہ مجلس کے نام سے مدرسۃ الواعظین لکھنؤ میں ہے۔
محکم دکنی نے نظم میں دوازدہ مجلس لکھی۔
فضل علی فضلی غالباً سنہ ۱۱۳۲ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۱۴۵ھ میں ان کو محمد شاہ بادشاہ کے عہد میں روضۃ الشہدا کے ازاد اردو ترجمہ (کربل کتھا) کا شرف حاصل ہوا۔ فضلی نے یہ کتاب نواب شرف علیخاں کے لئے لکھی تھی فضلی نے لکھا ہے :— نواب شرف علیخاں ہر سال تعزیت حضرت ابو عبد اللہ الحسین علیہ الصلوٰۃ والسلام کا بخلوص نیت اندرون محل مخفی بموجب حدیث شریف "التقیۃ دینی ودین ابائی والتقیۃ جُنّۃ" بوجہ احسن بجالا تھا۔ بندۂ حقیر حسب ارشاد خلاصہ روضۃ الشہدا پڑھتا تھا لیکن معانی اس کے عورتوں کی سمجھ میں نہ آتے تھے، وہ بعد کتاب خوانی ہتیں۔ نہیں کوئی اس کے معنی من وعن سمجھاتا۔ مجھ احقر کی خاطر میں گزرا اس کا ترجمہ کرکے بڑا ثواب لیجیے (کربل کتھا) یہ کتاب جلا وطن ہو کر یورپ پہنچ گئی تھی۔ جناب ڈاکٹر مختار الدین آرزو صدر شعبہ عربی مسلم یونیورسٹی اسے بڑی تلاش کے بعد جرمن سے لائے اور سنہ ۱۹۶۵ء میں ادارۂ تحقیقات اردو پٹنہ نے اسے شائع کیا۔

روضۃ الشہدا کے اڈیشن

روضۃ الشہدا کئی بار بمبئی (۱۲۳۲ھ)

مطبع نول کشور لکھنؤ (سنہ ۱۳۰۳ھ ۱۸۸۶ء) نول کشور کانپور (سنہ ۱۹۱۱ء طبع سوم) لاہور سنہ ۱۲۹۶ھ میں چھپی۔ کانپور اڈیشن بہت غلط ہے لاہور اڈیشن نسبتاً صاف اور صحیح ہے۔ اس اڈیشن کے آخر میں دو صفحہ کا رسالہ تتمہ ذکر خلفاء راشدین مولوی غلام ولد میاں رحیم بخش کے قلم سے شامل کیا گیا ہے۔ اس میں لکھا ہے کاشفی نے آل نبی کے ابتلا کا ذکر شرح سے کیا (وذکر چاریار کبار مطوی ساخت) (۳۹۶)

ان اڈیشنوں میں تحریف وتصحیف کا بھی ارتکاب ہوا ہے۔ مثلاً حضرت علی کو وصی پیغمبر کی جگہ ابن عم لکھ دیا ہے۔ حالانکہ حضرات اہلسنت بھی حضرت علیؑ کو وصی پیغمبر کہتے ہیں۔ عصر اول میں بھی انھیں وصی رسول کہا جاتا تھا۔ ابو الاسود دوئلی کا شعر ہے۔

احب محمدا حبّا شدیدا۔ وعباسا وحمزۃ والوصیا (کامل مبرد ۱۱۲/۲)

اس طرح کی تصحیف وتحریف دوسری کتابوں میں بھی ہو رہی ہے۔

فضل ابن عباس صحابی کا شعر ہے :—

الا ان خیر الناس بعد نبیہم
وصی النبی المصطفیٰ لذی الذکر
(شرح ابو الحدید ۱۳/۲)

کامل ابن اثیر ۱۲/۳ میں بعد نبیہم کی جگہ خلافتہ الکعبہ۔ صحابہ وتابعین میں حضرت علیؑ وصی مشہور تھے البتہ شیعہ وسنی اس اصطلاح کی الگ الگ توجیہ کرتے ہیں۔ سنہ ۱۹۶۵ء میں چار قلمی نسخوں سے تصحیح کرکے محمد رمضان ایرانی نے مطبع قادر طہران سے کسی قدر غنیمت اڈیشن شائع کیا ہے۔ اس میں کاشفی کے بارے میں ایک مقدمہ بھی شامل ہے۔

روضۃ الشہدا ایسی مقبول ومشہور کتاب تحقیقی توجہ کی مستحق ہے۔ اس کے تمام حوالوں کے جائزے اور آیات واحادیث کی تخریج کی ضرورت ہے۔ جہاں جہاں کاشفی نے حوالے نہیں دیے ہیں۔ آوردہ اند۔ در اخبار آمدہ۔ بعضے از کتب تفسیر آوردہ۔ بثبوت پیوستہ۔ بصحت رسیدہ۔ راویان صادق الروایۃ

: مخزن ظاہر الدرایہ اور رد۔ وغیرہ لکھا ہے۔ حاشیہ پر ان کے مصادر درج کر دیئے جائیں۔ نامکمل حوالوں کی تکمیل کر دی جائے۔ اعلام واماکن اور مضامین کی مفصل فہرست شامل کی جائے۔ حاشیہ پر بعض معتبر روایات کی تنقید کر دی جائے۔

روضۃ الشہدا کے بعض مصادر

کاشفی نے روضۃ الصفا میں اپنے بعض مصادر کا ذکر کیا ہے۔ بعض مصادر درج کئے جاتے ہیں:۔

۱۔ اسباب النزول واحدی (شیخ ابوالحسن علی بن احمد واحدی نیشاپوری)
۲۔ تفسیر فاتحہ امام نجم الدین عمر نسفی (نجم الدین ابو حفص عمر بن محمد سمرقندی صاحب عقائد نسفی م ۵۳۷ھ)
۳۔ تفسیر سورۂ یوسف از امام رکن الدین مسعود بن محمد
۴۔ تفسیر معالم التنزیل (محی السنۃ ابو محمد حسین بن مسعود شافعی مفسر و محدث م ۵۱۵ھ
۵۔ تفسیر ثعلبی (ابو اسحاق احمد بن محمد بن ابراہیم نیشاپوری مفسر و محدث صاحب تفسیر کشف البیان م ۴۲۷ھ
۶۔ صحیحین (بخاری و مسلم) صحیح بخاری ابو عبداللہ محمد بن اسمعیل بن ابراہیم بخاری م ۲۵۶ھ صحیح مسلم بن حجاج قشیری م ۲۶۱ھ)
۷۔ صحیح نسائی (احمد بن شعیب نسائی م ۳۰۳ھ)
۸۔ مسند احمد بن حنبل م ۲۴۱ھ
۹۔ سنن ترمذی۔ ابو عیسیٰ ترمذی م ۲۷۹ھ
۱۰۔ حدیقہ
۱۱۔ ترجمہ مستقصی
۱۲۔ شواہد النبوۃ (ملا نور الدین عبدالرحمٰن جامی م ۸۹۸ھ
۱۳۔ معارج النبوۃ (معین الدین فراہی م ۹۰۷ھ تالیف ۸۹۱)
۱۴۔ بشائر المصطفےٰ
۱۵۔ سیر امام شہید اسمٰعیل خوارزمی
۱۶۔ روضۃ الاسلام۔ قاضی سدید الدین جرفتی
۱۷۔ روضۃ الاحباب۔ عطاء اللہ شاہ نیشاپوری تالیف ۸۹۹ھ
۱۸۔ مصابیح القلوب
۱۹۔ تاریخ العالم
۲۰۔ تاریخ اعثم کوفی (محمد بن علی)
۲۱۔ ربیع الابرار زمخشری (محمود بن عمر بن محمد خوارزمی معتزلی جار اللہ م ۵۳۸ھ
۲۲۔ تاریخ تیمور
۲۳۔ زہرۃ الریاض
۲۴۔ عیون الریاض
۲۵۔ تاریخ ابو حنیفہ دینوری
۲۶۔ شرح تعرف
۲۷۔ بحر الرائق
۲۸۔ دلائل ابوالشیخ
۲۹۔ سیر کبیر اسمٰعیل کبیر بخاری
۳۰۔ کنز الغرائب
۳۱۔ کنز العباد
۳۲۔ روضۃ الواعظین
۳۳۔ درج الدرر
۳۴۔ روح الارواح
۳۵۔ کتاب سنن الجامع للطائف البساتین۔ امام سیف النظر ابو بکر طوسی۔
۳۶۔ فردوس الاخبار (ابو شجاع شیرویہ بن شہردار
۳۷۔ مناقب ابو المؤید خوارزمی (موفق بن احمد اخطب خوارزم۔ خطیب و شاعر و فقیہ و محدث م ۵۶۸ھ
۳۸۔ مطالب فی مناقب آل الرسول (کمال الدین محمد بن طلحہ شافعی م ۶۵۲ھ
۳۹۔ نظم درر السمطین (شیخ جمال الدین محمد بن یوسف زرندی م ۷۵۰ھ

۴۰۔ موالید از محمد بدخشی
۴۱۔ موالید از ابو محمد حسام
۴۲۔ گل و ہرمز (مثنوی شیخ عطار م ۶۱۶ھ)
۴۳۔ مناقب ابن مردویہ (حافظ احمد بن موسیٰ صہبانی۔ مفسر و محدث م ۴۱۰ھ)
۴۴۔ فصل الخطاب (خواجہ پارسا (حافظ زاہد محمد بن محمد بخاری م ۸۲۲ھ)
۴۵۔ بکیات امام وقار
۴۶۔ مقتل ابو المفاخر (فخر الشعراء ادیب فاضل و صالح ابو المفاخر بن محمد رازی مداح آل رسول (از اہل آمل جرجانی مجالس المومنین تذکرہ دولت شاہ
۴۷۔ مقتل نور الائمہ
۴۸۔ مقتل دینوری
۴۹۔ عیون الرضا (اخبار عیون الرضا۔ ابو جعفر محمد بن حسن بن موسیٰ بن بابویہ قمی م ۳۸۱ھ مطبوعہ ۱۲۷۵ھ)
۵۰۔ صحیفہ رضویہ
۵۱۔ الال۔ ابن خالویہ
۵۲۔ اعلام الوری طبرسی (امین الملۃ ابو علی فضل بن حسن بن فضل طبرسی فقیہ و مفسر صاحب مجمع البیان م ۵۴۸ھ

یہ مصادر اکثر و بیشتر حضرات اہلسنت کے ہیں صرف تین چار غیبہ مصادر ہیں۔

ذاکری اپنے آغاز سے ملا کاشفی تک

(۱) واقعۂ کربلا سے وفات امام محمد باقرؑ تک

واقعہ کربلا کی پیشنگوئیوں کا سلسلہ انسان کی پیدائش کے دور اولین اور آغاز وحی سے جاری ہے انبیاء کرام قبل وقوع حادثہ اس کا ذکر کرتے رہے۔ اس لئے کہ دین الٰہی کی حفاظت کے لئے یہ سب سے آخری اور سب سے مکمل قربانی پیش ہونے والی تھی۔ توراتؔ زبور و انجیل میں آج بھی وہ پیشنگوئیاں موجود ہیں۔ اس طرح قبل واقعہ انبیاء کرام اپنے اپنے عہد میں اس حادثۂ عظمیٰ کے ذاکر تھے۔ جب خاتم الانبیاء کا زمانہ آیا تو آپ نے بڑے اہتمام سے زبان وحی سے اس کی پیشنگوئیاں فرمائیں اور اشکبار ہوئے اور رہتی دنیا تک اس سانحہ پر اشکباری کا حکم دیا۔ اس طرح ذاکری و قیام مجلس اور گریہ و زاری جناب رسولؐ خدا کی سنت قولی و فعلی ہے ——— امیر المومنینؑ بھی اپنے عہد میں آنحضرت صلعم کی پیشنگوئیوں کا بڑے درد و کرب سے اعادہ فرماتے رہے۔ اس طرح امیر المومنینؑ نے بھی اس ذکر میں شرکت کی۔

۶۱ھ میں یہ غمناک و دلسوز و حشر خیز حادثہ پیش آگیا۔ واقعہ کے پیش آجانے کے بعد ذاکری کی اساس خود ان حضرات نے رکھی جن پر یہ واقعات گذرے تھے اور جو واقعہ کے عینی شاہد تھے۔ نظم و نثر سے بجید موثر و رقت خیز ذاکری کا آغاز ہوا۔

یزید نے سر شہداء اور اہل حرم کی تشہیر کوچہ و بازار اور شہر و دیار اور دربار عام میں اس لیے کرائی تھی کہ عوام میں شہداء اور ان کے وارثوں کی رسوائی ہوگی اور ان کا دل حکومت کے تشدد کی دہشت سے بیٹھ جائے گا اور حکومت ان سے غلاموں کے ایسا برتاؤ کرے گی اور کوئی زبان سے اُف تک کرنے کی جراُت نہ کر سکے گا ——— لیکن نتیجہ اس کے بالکل برعکس نکلا۔ بازار کوفہ میں امام زین العابدینؑ کی خاراشگاف اور حضرت زینبؑ و ام کلثومؑ و فاطمہؑ صغریٰ کی جگر سوز تقریروں نے قیامت برپا کردی۔ (احتجاج طبرسی و لہوف ابن طاؤس)

ان تقریروں نے واقعہ کربلا کا متن تیار

کر دیا۔ طرفین کی نظر میں اُن کے مقاصد الم نشرح کئے۔ قاتلوں کے انجام پر پیشنگوئی کی۔ واقعہ کے اسباب۔ طرفین کے طریق کار اور اس کے قریب و بعید نتائج پر سے پردے اٹھائے ــــ اہل حق کو سرفروش بنایا اُن میں روح انقلاب بھر دی۔ اور رسوائے انسانیت اموی حکومت کی قبر تیار کر دی۔ معاصر مسیحی مورخ حنا فاخوری لکھتا ہے:

کان لمقتله اثر عمیق فی تنمیه روح الشیعة وازدیاد عدد اتباعها. بل کان مقتله من اهم العوامل التی عملت علی دك ركن الاموية

(ص ۲۱۲ الجدید فی الادب العربی وتاریخه)

شیعہ روح کے نمو اور ان کی عددی ترقی میں امام حسینؑ کی شہادت کا گہرا اثر ہے۔ بلکہ جن اسباب نے اموی حکومت کی چولیں ہلا دیں اُن میں امام کی شہادت سب سے بڑا سبب ہے۔

کان للشیعة شعراء یبسطون تعالیمها ویذودون عن حیاضها فی الم یجنّ فی النفس وحزن یحرث القلب (الجدید فی الادب العربی وتاریخه ص ۲۲۳ مطبوعہ بیروت ۱۹۶۳ء)

شیعہ شعراء نے موثر حزن والم سے اپنی تعلیمات کی اشاعت کی اور ان کے مخالف امور سے ان کی حفاظت کی۔

دنیا میں کسی واقعہ کو ایسے مقرر و خطیب ذاکر و واعظ شاعر و ادیب نہیں ملے جن کو ایسے ہولناک حول میں اس آن بان، جرأت و دلیری سے کام کرنا پڑا ہو۔

ــــ پردے اٹھ گئے حقیقتیں ظاہر ہو گئی ہیں۔ اور انقلاب حکومت کے لئے دل و دماغ کی تخلیق ہو گئی ــــ

بازار شام میں ایک پیر مرد کا ناواقفیت کی وجہ سے اسیران آل محمد سے بے ادبی سے خطاب کرنا اور امام زین العابدین کا اس کی غفلت کے پردے کو چاک کرنا اور آیۂ تطہیر پڑھ کر اسے آل محمد سے متعارف کرنا اور اس کا تائب ہو جانا ایک مختصر مجلس تھی جس میں ذاکر امام تھے اور سامع یہ ناواقف کہن سال تھا۔

دربار ابن زیاد کے بعد دربار یزید میں ثانی زہراؑ کا زلزلہ افگن خطبہ ایک ایسا ذکر تھا جو دلائل و براہینؑ تنقید و احتجاج اور کربلا کے حقائق و معارف سے لبریز تھا۔ اس موقع پر یزید سے امام زین العابدینؑ کا مکالمہ ایک نشتر تھا جو تشدد پسند و باطل پرست ارباب اقتدار کے سینوں میں ہمیشہ چبھتا رہے گا۔ یزید نے اپنے درباری خطیب سے کام لیا۔ اس نے اس کے اسلاف کی خوشامدانہ مدح کی اور شہدائے حق کی تنقیص کی۔ اس نازک موقع پر اسیر ظلم امام نے جو برجستہ تقریر فرمائی اس نے حاضرین دربار کے دل ہلا دیئے۔ اور یزید کو رسوا و ذلیل کیا۔ جھوٹے مردہ ضمیر و وظیفہ خوار اور داعی حق اور ذاکر صداقت کا فرق ظاہر ہو گیا۔ منبر حکومت کا تھا لیکن درباری خطیب کی چرب زبانی و دروغ بیانی بے اثر ثابت ہوئی اور ذاکر آل محمدؐ خطیب ائمہ اہلبیتؑ کا بول بالا رہا۔

رہائی کے بعد ــــ خود دمشق میں ثانی زہرا نے سات دن تک مجلسیں کیں (کامل بہائی) ان مجلسوں میں اپنے حال و مقال سے انھیں غمزدوں اور بلاکشوں نے ذاکری کی۔ اس ذکر نے رسوائے عالم دمشق کی فضا میں بجلیاں بھر دیں۔ جن کی کڑک اور گرج کبھی ختم نہ ہوگی۔ جو ہمیشہ باطل کی خرمن پر گرتی رہیں گی اور اسے جلا کر راکھ کا ڈھیر بناتی رہے گی۔

ــــ جب گرفتاران مصیبت رہائی کے بعد اپنے وطن واپس ہونے لگے تو کربلا میں اترے وہاں روشن ضمیر اور پاک دل و حق شناس صحابی حضرت جابر بن عبداللہ انصاری اور ان کے ساتھ بعض اور مخلص مومنین موجود تھے جن کو اُن کا بے پناہ جذبہ عقیدت کربلا میں

کھینچ لایا تھا۔ سوگواروں کی آمد پر کربلا کے گرد وپیش کے ہمدرد بھی جمع ہو گئے ہوں گے۔ شہدا کی داستان اور صحابی مخلص اور مصیبت زدہ اہلبیت کے ذکر نے اس موقع پر جو اثر پیدا کیا ہوگا اسے ہم کسی قدر محسوس کر سکتے ہیں۔
(مقتل ابومخنف)

—— مدینہ کے مسافر کربلا و کوفہ و شام کی مشقتیں جھیل کر اور عزیزوں اور ہمدردوں کے دل پر داغ لے کر مدینہ واپس آئے تو امام زین العابدینؑ نے اپنے لٹے ہوئے قافلے کو بیرون مدینہ ٹھہرایا۔ اہل مدینہ کو اطلاع دی۔ سارا مدینہ خود مصیبت زدہ امام کی زبان سے داستان شہادت درد و داد اسیری سننے کے لئے امنڈ پڑا۔ اس ذکر کے اثر کا اندازہ ہماری قوت اظہار کے بس میں نہیں ہے —— آل رسول مدینہ میں داخل ہوئی۔ ثانی زہراؑ نے روضہ رسولؐ میں رسولؐ خدا کو مخاطب کر کے فریاد کی۔ حرم رسولؐ میں یہ ان کا مختصر ذکر غم میں ڈوبا ہوا ذکر تھا —— حضرت رباب مدینہ میں زنانی مجلسیں کرتی رہیں۔ آنے والوں میں کچھ حصہ بھی تقسیم کرتیں۔ امّ فروہ کی ذاکری رقت خیز ہوتی۔ خون دل آنسوؤں کی شکل میں آنکھوں سے بہتا۔ روتے روتے آنسوؤں کے چشمے خشک ہو جاتے ——

مدینہ میں اور دوسرے مقامات پر شہدا آل ابوطالب اور انصار کے جو متعلقین تھے ان میں ان کے کارنامۂ شہادت اور یزید کے ظلم و ستم کا ذکر ہوتا۔ ہمدان۔ بجیلہ۔ خثعم۔ تغلب۔ جعفی وغیرہ کے قبائل مجلس غم برپا کرتے اور اپنے شہدا کے زندۂ جاوید کارناموں پر فخر کرتے —— بنی امیہ کے خوف سے ان کے مراثی منظر عام پر نہ آ سکے۔ حضرت ام البنین مادر حضرت عباس علمبردار جنت البقیع میں جاتیں اور سوز و حماسیت سے لبریز مرثیے پڑھتیں۔ ان مراثی کو چھپ چھپ کر دشمن بھی سنتے۔ ان میں چھوٹے چھوٹے چند مرثیے ان کے جذبات کے اظہار کے لئے اب تک محفوظ ہیں۔

دارالسلطنت میں ایک عبرت خیز و تاریخی ذکر

سنہ ۶۴ھ میں یزید تمام قوموں اور قبیلوں کے غم و غصہ اور ملامت کے زخم کھا کر ذلت و رسوائی کے ساتھ مر گیا۔ اپنے بیٹے معاویہ کو اپنا ولیعہد چھوڑا۔ جس کا اتالیق عارف و حق شناس و دیدہ ور عمر مقصوص" تھا۔ معاویہ بن یزید اپنے اسلاف کے رسوائے انسانیت اعمال و افعال سے بیزار تھا۔ خاندان کی پوری سیاہ تاریخ اس کے سامنے تھی واقعہ کربلا اس کے زمانہ میں ہوا۔ وہ روشن ضمیر پاک دل اور مضبوط ارادہ کا انسان تھا۔ اس پر واقعہ کربلا کا اتنا شدید ردعمل ہوا کہ اس نے ناپاک ریاست کی انتظامی ذمہ داری قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اس نے اپنی مجلس ذکر میں جو اموی دربار میں منعقد ہوئی تھی اموریت کی پوری تاریخ پر ابتدا سے واقعہ کربلا تک مختصر مگر جامع تبصرہ کیا۔ اپنے دادا اور باپ کے اعمال سے اعلان بیزاری کیا۔ اور بڑے رنج و صدمہ سے کہا۔ جس حکومت کی تعمیر میں ایسے پاکباز انسانوں کا خون شریک ہو کسی طرح میرے لئے قابل قبول نہیں ہے (حیوٰۃ الحیوان دمیری ج ۱ ص ۵۲)

یہ شہدائے کربلا کی ایسی نادر و فکر خیز فتح ہے جس کی مثال تاریخ عالم میں نہیں ملتی —— معاویہ بن یزید کو ترک حکومت اور ظالموں سے بیزاری اور مظلوموں سے ہمدردی کے جرم میں زہر سے ہلاک کر دیا گیا اور عمر مقصوص کو زندہ دفن ہو کر امر ہو گئے۔

معاویہ بن یزید پر آل ابوسفیان کا دور حکومت ختم ہو گیا اور آل مروان ان کے جانشین ہوئے۔

توابین و مختار کا رنج والم غم و غصہ اور جوش انتقام سے بھرا ہوا ذکر

اہل کوفہ میں جن لوگوں نے امام حسینؑ کو کوفہ آنے کی دعوت دی تھی اور حکومت نے

انھیں قید کر لیا تھا اور مسلح ناکہ بندیوں کی وجہ سے وہ امام تک نہیں پہونچ سکے تھے۔ اس کا انھیں بڑا صدمہ تھا۔ انھوں نے اپنا لقب توابین رکھا اور ممکن تلافیٔ مافات کے لئے اپنی جان کی بازی لگا دی۔ سلیمان بن صرد خزاعی صحابی۔ مسیب بن نجبہ فزاری۔ عبد اللہ بن سعد بن نفیل ازدی۔ عبد اللہ بن ۔ رفاعہ بن شداد وغیرہ اس جماعت میں پیش پیش تھے جب یہ اموی حکومت کا تختہ الٹنے اور شہدائے کربلا کے قاتلوں سے قصاص لینے اُٹھے تو ان کی مجلس ذکر میں حسرت و ندامت و عقیدت و خلوص اور جوش و خروش کے طوفان اٹھ رہے تھے۔ اس ذکر میں نظم و نثر ملی جلی ہوتی تھی۔ ۱۶ ہزار توابین پہلے قبر امام پر گئے اور تین روز ذکر و اشکباری میں مصروف رہے۔

سنہ ۶۵ھ میں مقام عین الوردہ میں شامی فوج سے جنگ ہوئی۔ سلیمان بن صرد شہید کر دیئے گئے اُن کی فوج پسپا ہو گئی۔ لیکن عزاداران امام مایوس نہیں ہوئے۔ سنہ ۶۶ھ میں مختار ثقفی نے جب قاتلان شہدا سے قصاص کی مہم کا آغاز کیا تو ان کی مجلس ذکر میں ان کی منقفیٰ نثر نے ذکر کو ایک نیا اسلوب دیا اس ذکر میں ایک سپاہیانہ گرج ہوتی تھی۔ ایک تقریر میں مختار نے کہا:۔

والذی انزل القرآن و بین الفرقان و شرع الادیان، و کرہ العصیان۔ لاقتلن العصاۃ من ازد عمان، و مذحج و ھمدان و نھد و خولان و بکر و ھزان۔ و ثعل و نبھان و عبس و ذبیان، و قبائل قیس عیلان، غضباً لابن بنت نبی الرحمٰن۔

(شرح الثار فی احوال المختار ابن نما حلی)

اس خدا کی قسم جس نے قرآن اُتارا۔ اور حق و باطل کو جدا کیا۔ معصیت کو ناپسند کیا۔ میں ازد و عمان و مذحج و ہمدان و نہد و خولان و بکر و ہزان و ثعل و نبہان و عبس و ذبیان و قبائل قیس عیلان کے سرکشوں کو قتل کروں گا فرزند دختر نبی رحمان کے ساتھ ان کے بُرے برتاؤ سے ناراض ہو کر۔

ایک تقریر میں کہا:۔

اما و رب البحار و النخیل و الاشجار و المھامہ و القفار، و الملٰئکۃ الابرار و المصطفین الاخیار۔ لاقتلن کل جبار بکل لدن خطار و مھند بتار، بجموع الانصار۔ لیسوا بمیل ولا اعمار۔ ولا بعزل اشرار۔ حتی اذا قمت عمود الدین و رأبت صدع المسلمین و شفیت غلیل صدور المسلمین و ادرکت ثار النبیین لم یکبر علیّ زوال الدنیا۔ و لم احفل بالموت اذا اتیٰ

(بلند مقام ذخار فرہاد مرزا مطبوعہ سنہ ۱۳۲۴ھ)

دریاؤں اور کھجور وغیرہ کے درختوں اور صحراؤں اور نیک فرشتوں اور منتخب لوگوں کے رب کی قسم میں ہر جبار کو تیغ بُراں اور ہندی تلوار سے انصار کی مدد سے قتل کروں گا یہ لوگ کمینے نہتے اور شریر نہیں ہیں۔ جب میں دین کا ستون کھڑا کر دوں گا اور مسلمانوں کی پیاس بجھا دوں گا اور نبیوں کا قصاص لے لوں گا۔ (امام حسین کو قتل کرنا گویا انبیا کو قتل کرنا تھا) تو دنیا کا زوال میری نظر میں کوئی بڑی بات نہ ہوگی اور جب موت آئے گی تو کچھ پروا نہ کروں گا۔

مختار نے اپنے مختصر عہد سلطنت میں ذکر کو سوز و ساز اور طاقت و قوت سے مالا مال کیا۔۔۔۔ چند ماہ کی حکومت میں قاتلان امام حسین کو اس دنیا میں عبرتناک سزائیں دیں۔ ان میں سے کوئی نہ بچا جس نے شہدا کے

خون ناحق سے اپنا ہاتھ رنگا تھا۔ مختار کے اس کارنامہ نے انھیں زندہ جاوید بنا دیا ان کا نام ہمیشہ عزت و احترام سے لیا جائے گا۔ یوں تو غم حسین علامت ایمان بن چکا ہے۔ پھر بھی سنہ ۶۱ھ سے سنہ ۶۶ھ تک بنی ہاشم سراپا غم بنے رہے۔ مختار نے جب خون شہدا کا عوض لیا اور قاتل مارے گئے تو ہاشمی عورتوں نے سوگوارانہ فضا میں کچھ تبدیلی کی۔ امام جعفر صادق فرماتے ہیں ہاشمی خاتون نہ تو سروں میں کنگھی کرتی تھیں نہ خضاب استعمال کرتی تھیں یہاں تک کہ مختار نے قاتلان امام کے سر بھیجے (رجال کشی) سنہ ۴۱ھ سے ذکر مقام اہلبیت و مظالم بنی امیہ کا سلسلہ شروع ہوا وہ ہر حال میں جاری رہا۔ سنہ ۴۱ھ سے سنہ ۱۳۲ھ تک یعنی صرف ۹۱ سال تک اس حکومت نے زندگی کے دن پورے کئے، قدم قدم پر ٹھوکریں کھائیں۔ یزید عہد شباب ہی میں ذلت و رسوائی سے مرا۔ اس کے بیٹے معاویہ نے حکومت ٹھکرا دی، ملک میں طوائف الملوکی کا راج ہوگیا۔ نسل ابوسفیان سے حکومت نکل گئی آل مروان میں آگئی انھیں بھی مخالفتوں نے آرام کی نیند نہیں سونے دیا۔ آل مروان نے بھی اس غلطی کا ارتکاب کیا جس کے مجرم آل ابوسفیان تھے انھوں نے بھی دلوں کو مسخر کرنے کے بجائے تشدد و سخت گیری پر اعتماد کیا۔ عوام کو مرعوب و خوفزدہ کرنے کے لیے اپنے نکتہ چینوں کو ایسی بہیمانہ سزائیں دیں جن پر غیر جانبدار مورخ بھی شکوہ سنج ہیں۔ سنّی مورخ حنا فاخوری لکھتے ہیں۔

یہ لوگ محبان اہلبیت کو ذلیل کرنے لگے۔ صرف گمان پر ان کے ہاتھ پاؤں کاٹ ڈالتے۔

کل من عرف بالتشیع سجنوه او نهبوا ماله او هدموا داره ولما جاء الحجاج قتلهم كل قتلة واخذهم بكل ظنة وتهمة حتى ان الرجل ليقال له زنديق او كافر احب اليه من ان يقال له شيعة علی۔

(ص ۲۴۲۔ الجدید فی الادب العربی)

جسے بھی شیعہ جانا اسے قید کیا یا مال لوٹ لیا یا اس کا گھر گرا دیا۔ جب حجاج آیا تو اس نے ان کے قتل کی انتہا کر دی، گمان اور تہمت پر انھیں گرفتار کیا یہاں تک نوبت پہونچی کہ کسی کو کافر یا زندیق کہا جائے تو اسے شیعہ کہنے کے مقابلے میں یہ لقب زیادہ پسند تھے۔

حکومت کی طرف سے ہولناک مظالم کا سلسلہ جاری رہا پھر کربلا کے جذبات ذکر فنا نہیں کئے جا سکے۔ غم و حزن کی آگ کبھی دبی رہتی اور کبھی شعلہ بن جاتی۔ جان و مال و آبرو کے خوف کے باوجود اہل ہمت شاعر مرثیہ کہتے۔ منصور بن سلمہ نمری نے امام حسینؑ کا لامیہ مرثیہ کہا۔ حکومت نے ان کی زبان گُدّی سے کھنچوا لی۔ اور ہاتھ پاؤں کاٹ کے لاش کو سولی دیدی ——

عربی مراثی کی تاریخ نے کوئی ناطق فیصلہ نہیں کیا ہے کہ واقعات کربلا کا پہلا مرثیہ گو کون ہے۔ اس سلسلے میں مختلف نام لئے جاتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے شعرا میں سلیمان بن قتہ تابعی پہلے مرثیہ گو ہیں۔ یہ واقعہ کربلا کے تیسرے دن قتل گاہ میں پہونچے۔ جو دردناک مناظر ان کی آنکھوں سے گزرے اس کی وہ تاب نہ لا سکے۔ اتنی حالت غیر ہوئی کہ قریب تھا کہ روح جسم سے پرواز کر جائے۔ جب ہوش آیا تو بڑا ہی پُرسوز کرب آمیز مرثیہ کہا جس کے کئی شعر تاریخ ادب عربی کی کتابوں میں آج بھی موجود ہے۔ اسی میں ایک شعر یہ بھی ہے:۔

الم تران الارض اضحت مريضة

لفقد حسين والبلاد اقشعرت

وقد اعولت تبكی السماء لفقده

وانجمها ناحت عليه وصلت

کیا تم نے نہیں دیکھا کہ حسینؑ کی شہادت سے زمین بیمار ہو گئی اور فلک کانپ اٹھا۔ اور ان کی موت سے آسمان رونے لگا اور ستارے ان پر نوحہ کرنے لگے اور درود بھیجنے لگے۔

یاقوت نے معجم البلدان (ــــــ) میں ان اشعار کو ابو دہبل جمحی کی طرف منسوب کیا ہے اور دو شعر اور زیادہ لکھے ہیں۔ ہو سکتا ہے دونوں نے اسی بحر و قافیہ میں الگ الگ مرثیے کہے ہوں۔ اور راویوں نے ایک کے شعر دوسرے کی طرف منسوب کر دیے ہوں ــــ بعض روایتوں میں واقعہ کربلا کا پہلا مرثیہ گو شاعر عقبہ بن عمرو سہمی کو بتایا ہے جس کے مرثیہ کا ایک شعر یہ ہے :ــ

مررت علی قبر الحسین بکربلا
ففاض علیہ من دموعی غزیرھا

سراقہ باہلی (تذکرہ سبط ابن جوزی) مسلم بن قتیبہ مولی بنی ہاشم (مروج الذہب مسعودی) اور عبد اللہ بن حر جعفی وغیرہ کے بعض مراثی آج بھی پائے جاتے ہیں۔ اس طرح ذکر کربلا کی شمع آل محمد میں عام عقیدتمندوں اور شاعروں کی دنیا میں برابر روشن رہی۔ امام زین العابدینؑ نے زندگی بھر غم حسینؑ سے کام لیا۔ اس سے سماج کے احساس کمتری کا علاج کیا۔ اس سے دین کی حفاظت کا کام لیا۔ امام زین العابدینؑ کی زندگی کا بڑا حصہ ظالم و سفاک سلاطین کے دور میں گذرا (یزید بن معاویہ (۶۰-۶۴) عبد اللہ بن زبیر (۶۴-۷۳) مروان بن حکم (۶۴-۶۵) عبد الملک بن مروان (۶۵-۸۶) ولید بن عبد الملک (۸۶-۹۶) آخری بادشاہ ولید ہے جس نے امام کو زہر سے شہید کیا۔

اس کے ظلم و جور کا کیا پوچھنا ہے۔ علامہ سیوطی اسے ظالم جابر کہتے ہیں۔ عمر بن عبد العزیز اموی نے ایک موقع پر کہا۔ ولید شام میں۔ حجاج عراق میں۔ عثمان بن حیان حجاز میں۔ قرہ بن شریک مصر میں۔ واللہ زمین ظلم و جور سے بھر گئی۔

امام محمد باقرؑ اور ذکر

امام محمد باقرؑ ۵۷ھ میں پیدا ہوئے۔ ۲۰ سال تک علم و دانش کا آب حیات تشنگان علم میں تقسیم کیا۔ عظیم درسگاہ کی تاسیس فرمائی جسے بعد میں مکتب جعفری کے نام سے شہرت ملی اس میں تمام علوم اسلام کی اعلیٰ تعلیم دی۔ واقعہ کربلا آپ کی انتہائی کمسنی میں پیش آیا۔ کربلا میں اپنے خاندان کے ساتھ آپ نے تکلیفیں اٹھائیں سوگوارانہ ماحول میں آپ کی تربیت ہوئی۔ آپ کے زمانۂ امامت میں اموی حکومت دم توڑ رہی تھی سلاطین خاندانی نزاعوں اور عوام کی بےچینیوں سے بدحواس باختہ تھے، ان حالات نے امام محمد باقرؑ کو کچھ موقع دیا کہ آپ اسلامی افکار کی تطہیر و تدوین و تشریح میں حصہ لیں اور دین الٰہی کو اس شکل میں پیش کریں جیسے وہ رسولؐ خدا پر نازل ہوا تھا۔ واقعہ کربلا کی اشاعت اور ذکر حسینی میں آپ کا خاصہ حصہ ہے۔ دوسروں کو مرثیہ گوئی کی ترغیب دی۔ خود ذکر امام حسینؑ کے فضائل بیان فرمائے اس بارے میں اپنے والد ماجد امام زین العابدینؑ کے ارشادات کی اشاعت کی فرمایا۔ میرے باپ امام زین العابدینؑ نے فرمایا جس مومن کی آنکھوں سے شہادت امام حسینؑ پر آنسو جاری ہوں اور چہرہ تک بہ آئیں اس کے عوض میں خدا اسے جنت کا ایک غرفہ عطا فرمائے گا۔ اور ہماری مصیبتوں پر جو ہمیں دشمنوں سے پہونچیں اگر کوئی اتنا روئے کہ آنسو رخسار تک بہ آئیں تو خدا اس کو درجہ صدق عطا فرمائے گا، اور جس مومن کو ہماری محبت کی وجہ سے ایذا دی گئی ہو اور اس کی آنکھوں سے

آنسو بہ کر چہرہ تک آجائیں تو خدا اُس کے چہرہ سے اذیت کو دفع کرے گا اور قیامت میں اُسے اپنے غضب اور عذاب جہنم سے محفوظ رکھے گا۔

(ینابیع المودہ ا ص۳۴۳ مطبوعہ قسطنطنیہ ۱۳۰۲ھ)

امام کے زمانے میں کمیت بن زید اسدی (۶۰-۱۲۶) کے مراثی قوت استدلال و بلاغت کے لحاظ سے ایک امتیازی شان رکھتے تھے۔ ۱۲۶ھ میں ہشام بن عبدالملک یا ولید بن عبدالملک کے زہر سے آپ کی شہادت ہوئی اور ذکر حسینی کا ایک دور ختم ہوا۔

ذاکری عہد امام جعفر صادقؑ میں

ابو عبداللہ حضرت جعفر بن محمد ۸۳ھ میں پیدا ہوئے۔ ۱۴۸ھ میں منصور کے زہر سے وفات ہوئی۔ ۱۳۲ھ میں اموی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ ۳۴ سال دور امامت میں آپ نے علم و حکمت و اخلاق و فضیلت کے دریا بہائے۔ ملاحدہ کے حملوں سے شریعت اسلام کی حفاظت کی۔ عقائد و احکام و سیرت کی تدوین و تشریح فرمائی۔ اور ذکر حسینؑ و مجلس حسینؑ میں بڑا اہتمام فرمایا۔ خود ذکر فرماتے دوسروں کو ذکر کی ترغیب دیتے۔ مرثیہ کہنے کا ثواب اور رونے رُلانے کا اجر بتاتے۔ عہد عباسی کے آغاز پر ذکر حسینؑ پر کوئی پابندی نہ تھی۔ بلکہ عباسی حکومت کا قیام ذکر حسینؑ کے طفیل میں ہوا تھا۔ اس وقت بنی عباس کو جانتا ہی کون تھا ان کا کام ہی کیا تھا داعی ہر طرف تقریریں کرتے پھرتے کربلا کی داستان ظلم بیان کرتے۔ آل محمدؐ کے ساتھ بنی امیہ کی بربریت کا ذکر کرتے سننے والے غم و غصہ سے بھر جاتے اور بنی امیہ سے نفرت کرنے لگتے۔ جب حکومت قائم ہو گئی تو شروع شروع میں ارباب اقتدار حکومت کو ذکر حسینؑ کا انعام سمجھتے۔ سدلیف شاعر چوراہوں پر کھڑے ہو کر امام حسینؑ کا مرثیہ پڑھتا۔ اب ایسے شاعر پیدا ہو گئے جن کو امام حسینؑ کے مرثیہ گو کی حیثیت سے لوگ پہچاننے لگے۔ ابو ہارون مکفوف نے امام حسینؑ کی مرثیہ گوئی میں شہرت حاصل کی، وہ پُردرد انداز میں مرثیہ پڑھتے بھی تھے۔ ایک دفعہ وہ امام جعفر صادقؑ کی بارگاہ میں باریاب ہوئے امام نے ان سے مرثیہ پڑھنے کے لئے فرمایا۔ ہارون نے سادے لہجہ میں مرثیہ پڑھنا شروع کیا۔ امام نے فرمایا جس پُرسوز لہجہ میں تم پڑھا کرتے ہو اس طرح پڑھو۔ جب ہارون نے مرثیہ شروع کیا۔ "امرر علی جدث الحسین۔ فقل لا عظمہ الزکیۃ" حسینؑ کی قبر سے گذرو اور اس کی پاک ہڈیوں سے کہو —— مرثیہ شروع ہوتے ہی حضرت رونے لگے۔ فرمایا اور پڑھو۔ وہ پڑھتے رہے امام کی آنکھوں سے آنسو جاری رہے۔ پس پردہ خواتین کے رونے کی آواز بھی بلند ہوئی —— جب ہارون کی ذاکری ختم ہو گئی تو خود حضرت نے ذکر فرمایا۔ ہارون۔ جو شخص امام حسینؑ پر ایک شعر کہے اور خود روئے اور دس آدمیوں کو رلائے اُس پر جنت واجب ہو جاتی ہے۔ اور جو ایک شعر کہے اور خود روئے اور ایک ہی آدمی کو رُلائے اس پر بھی جنت واجب ہو جاتی ہے۔ اور جس کے سامنے حسینؑ کا ذکر آئے اور اس کی آنکھوں سے ذرا سا بھی آنسو نکل آئے تو اللہ اسے اس کے ثواب میں جنت عطا فرماتا ہے۔

(کامل الزیارت ابن قولویہ)

یا مریم قومی واندبی مولاک
وعلی الحسین فاسعدی بکاک

مریم اٹھئے اپنے مولا پر رویئے اور سعادت حاصل کیجئے۔

ابو عمارہ دوسروں کے شعر پڑھا کرتے تھے

اس بنا پر ان کو منشد کہتے تھے۔ امام نے ان کو مرثیہ پڑھنے کے لئے فرمایا۔ ابو عمارہ نے چند شعر پڑھے حضرت روتے رہے۔ پس پردہ خواتین تھیں جب ابو عمارہ مرثیہ پڑھ چکے تو خود امام نے ذکر شروع کیا۔ فرمایا جو شخص حسینؑ کا مرثیہ کہے اور پچاس آدمیوں کو رُلائے اُس کا ثواب بہشت ہے۔ جو شخص ایک شعر کہے اور چالیس آدمیوں کو رُلائے اس کے لئے بھی بہشت ہے جو تیس آدمیوں کو رُلائے اس کے لئے بھی بہشت ہے جو بیس یا دس آدمیوں کو رُلائے اس کے لئے بھی بہشت ہے۔

جعفر بن عفان امام کے پاس آئے۔ حضرت نے فرمایا کچھ شعر پڑھو۔ جعفر نے مرثیہ پڑھا۔ امام اتنا روئے کہ داڑھی آنسوؤں سے بھیگ گئی۔ حاضرین بھی روئے۔ جعفر کے بعد خود امام نے ذکر فرمایا۔ ارشاد ہوا۔ فرشتے اس مجلس میں آتے ہیں۔ تمہارے مرثیہ نے انھیں بھی رُلایا۔ خدا تمھیں بخشے۔ پھر فرمایا جس نے ایک ہی شعر حسینؑ پر کہا اور رویا اور رُلایا اس پر جنت واجب ہو جاتی ہے اور اس کے گناہ معاف کر دیئے جاتے ہیں۔

سید اسمٰعیل حمیری (۱۹۰ھ) بھی اس عہد کے بڑے زبردست منقبت سرا و مرثیہ گو تھے۔ شعرا آل محمدؐ میں جن کا ایک مخصوص مقام ہے اموی حکومت کے زوال اور عباسی حکومت کے قیام سے خاندان بدلے لیکن جو لوگ اموی زوال پر حکومت الٰہی کے منتظر تھے وہ مایوس ہوئے۔ عباسی حکومت کا پہلا خلیفہ ہی سفاح کے لقب سے یاد کیا جانے لگا اس کی تلوار نے بنی امیہ کے کشتوں کے پشتے لگا دیئے۔ ان کی قبریں کھود کر ہڈیاں جلائیں۔ بنی امیہ اپنے جرائم کی بنا پر بڑی سخت سزاؤں کے مستحق تھے مگر جس طرح بنی عباس نے ان کے ساتھ برتاؤ کیا مجھے یقین ہے کہ اگر آل محمدؐ کی حکومت قائم ہوتی تو ایسی مکروہ سزائیں وہ نہ دیتے۔ ۱۳۶ھ میں سفاح کا انتقال ہو گیا اور ابو جعفر منصور اس کا جانشین ہوا۔ اس نے اپنی تلوار کی پیاس آل محمدؐ کے خون سے بجھائی۔ اس کے قید خانے بنی فاطمہ اور ان کے عقیدت مندوں سے بھرے رہتے۔ علامہ سیوطی کہتے ہیں منصور پہلا شخص ہے جس نے عباسیوں اور علویوں میں فتنہ ڈالا۔ ورنہ یہ لوگ اس کے پہلے ایک ہی تھے۔

(تاریخ الخلفا ۲۴۳)

شاید اسی زمانے میں کسی حلقے سے یہ آواز اٹھی تھی کہ عاشور کو مخصوص طور پر یوم غم کیوں قرار دیا گیا۔ حضرت رسول خدا۔ سیدہ عالم۔ حضرت علیؑ اور امام حسنؑ کی وفات کے دن کو یہ حیثیت کیوں نہیں دی گئی حالانکہ ان کا مرتبہ امام حسینؑ سے افضل ہے۔ عبداللہ بن فضل کے ذریعہ سے امام تک یہ اعتراض پہونچا۔ امام نے فرمایا اس کی وجہ یہ ہے کہ پنجتن اللہ کو بہت محبوب تھے۔ جب جناب رسولؐ خدا کی وفات ہوئی تو امیر المومنینؑ اور سیدہؑ عالم اور حسنؑ و حسینؑ موجود تھے ان سے لوگوں کو تسلی ہوتی تھی۔ حضرت فاطمہ زہراؑ کے بعد امیر المومنینؑ اور حسنؑ و حسینؑ تسلی کا سرمایہ تھے۔ امیر المومنینؑ کی شہادت کے بعد امام حسنؑ و حسینؑ تسلی کا سہارا تھے۔ جب امام حسنؑ کی وفات بھی ہو گئی تو سب کی یادگار امام حسینؑ رہ گئے اُن کو دیکھ کر سب یاد آ جاتے تھے۔ ان کی شہادت کے بعد اس سلسلے کا کوئی بزرگ نہیں رہ گیا

جس سے لوگ تسلی حاصل کرتے۔ امام حسینؑ کی شہادت کے معنی یہ ہیں کہ اس دن سب اٹھ گئے ــــ امام سے یہ بھی پوچھا گیا کہ دوسرے طبقہ (عامہ) نے عاشور کو روز برکت کا نام کیسے دے لیا ہے۔ امام نے فرمایا! جب امام حسینؑ شہید کر دیئے تو شام میں لوگوں نے یزید کا تقرب حاصل کرنے کے لئے جھوٹی حدیثیں گڑھیں اس پر انھیں انعام دیئے گئے۔ جو حدیثیں گھڑی تھیں ان میں یہ بھی تھا کہ عاشور برکت کا دن ہے تاکہ لوگ فریاد گریہ و مصیبت و غم کے بجائے اس دن کو جشن مسرت اور برکت کا دن قرار دیں ــــ خدا ہمارے اور ان کے درمیان فیصلہ کرے۔

اس مختصر تبصرہ سے کئی باتیں معلوم ہوئیں امام جعفر صادق کو تھوڑا سا وقت ذکر سانحۂ حسینؑ کی تنظیم کا ملا۔ اس عہد میں ذاکری میں مرثیہ گوئی غالب تھی اور خود امام نثر میں ذکر فرماتے تھے۔ پس پردہ خواتین بھی شعرا کے مرثیے سنتیں تھیں اور روتی تھیں۔ مرثیے زیادہ تر مختصر ہوتے تھے۔ یہ مرثیے سادے رقت خیز ہوتے تھے۔ منصور کے زمانہ میں عزاداری اور ذکر کو پھر مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ دنیا والے اس سے نفرت پیدا کرنے کے لئے شکوک و اعتراضات پھیلانے لگے جس کا دفاع امام اپنی مجلس ذکر میں فرمایا کرتے تھے۔

عہد امام موسیٰ کاظمؑ

امام موسیٰ کاظم کا زمانہ مصائب و آلام سے پُر تھا

یہ ہارون رشید کا دور تھا۔ تاریخ اس کی سیرت کا تضاد دکھاتی ہے۔ رسولِ خدا کا ذکر آتا تو صلی اللہ یا سیدی کہتا واعظ کے وعظ پر آبدیدہ ہو جاتا ۔ ابن مبارک کہتے ہیں کہ اپنے باپ کی مدخولہ کنیز کی ہتک حرمت کی۔
(تاریخ الخلفاء سیوطی سنہ ۱۳۱۱ھ مطبوعہ ۱۳۵۱ء لاہور)

بنی فاطمہ و بنی علی پر اس نے دنیا تنگ کر رکھی تھی سادات بیابانوں، پہاڑوں، قصبوں میں چھپے پھرتے لیکن انھیں ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر قتل کراتا۔ حمید بن قحطبہ کا بیان ہے کہ ہارون نے ایک چھوٹی سی کوٹھری میں سادات کو قید کر رکھا تھا صرف ایک شب میں ساٹھ آدمیوں کو قتل کرا دیا۔ تقریباً ۱۴ سال امام موسیٰ کاظمؑ کو قیدخانے میں رکھا۔ قیدخانہ بغداد میں ۵۵ سال کی عمر میں سنہ ۱۸۳ھ میں زہر سے شہید کیا۔

ایسے جابر و ظالم و دشمن وفا کے عہد میں امام حسینؑ کے ذکر کی ترقی کا کیا امکان تھا۔ یہ ہارون ہی تو ہے جس نے امام حسینؑ کی قبر کا نشان مٹانے کی کوشش کی جب امام حسین کی قبر کا نشان اسے گراں تھا تو ان کے ذکر کا رواج کیسے گوارا کرتا۔ قبر امام کے پاس قبر کی پہچان کے لئے بیری کا درخت تھا اس نے اسے کٹوا دیا۔ اس وقت محدثین اس حدیث رسول کے معنی سمجھے۔ "لعن اللہ قاطع السدرۃ"
(تاریخ مفصل اسلام۔ عماد اصفہانی سنہ ۱۳۴۲ھ مطبوعہ ایران)

عہد امام رضاؑ میں ذکر سید الشہداءؑ

ابوالحسن امام علی بن موسیٰ رضا

کی ولادت سنہ ۱۴۸ھ میں ہوئی سنہ ۲۰۳ھ میں مامون کے زہر سے طوس میں شہادت ہوئی۔ ۵۵ سال عمر پائی ۲۰ سال عہد امامت تھا۔ مامون کے وقت تک عربی زبان میں حکمت و فلسفہ و ہیئت کی بہت سی کتابیں ترجمہ ہو کر آ گئیں تھیں۔ امام نے سیاست و اخلاق و حکمت و طب و دین میں نئی راہیں دکھائیں ۳ سال ولیعہدی کے علم و دین کے لئے بڑے ہی بابرکت ثابت ہوئے۔ یہ زمانہ امام حسینؑ کے ذکر و مجلس کے لئے ساز گار رہا۔ مامون نے اپنے سیاسی مصالح کی بنا پر امام رضاؑ کو ولی عہدی کا منصب

قبول کرنے پر مجبور کیا۔ اظہار خیال کی تھوڑی سی فرصت سے دین و ملت کے احیاء و تجدید کا بڑا کام لیا اور واقعہ کی اشاعت و ترویج اور غم حسینؑ کے مؤثر بنانے میں کافی جد و جہد فرمائی۔

آپ نے عہد جاہلیت اور اسلام میں ماہ محرم کا تاریخی مقابلہ کیا فرمایا:۔

قبل اسلام عہد جاہلیت میں کفار بھی محرم کے زمانے میں جنگ حرام سمجھتے تھے۔ اس مہینے میں ہماری خونریزی حلال سمجھی گئی۔ ہماری ہتک حرمت کی گئی۔ ہماری ذریت اور عورتوں کو قید کیا گیا۔ ہمارے خیموں میں آگ لگائی گئی۔ ہمارا سارا سامان لوٹا گیا۔ رسول اللہ کی حرمت کے بارے میں کچھ بھی پاس و لحاظ نہیں کیا گیا

ریان بن شبیب حاضر مجلس تھے حضرت ان سے خطاب فرما رہے تھے۔ فرمایا:۔

ابن شبیب اگر تم کسی بات پر روتے ہو تو حسین بن علیؑ پر رو ؤ۔ وہ اس طرح ذبح کئے گئے جیسے مینڈھا ذبح کیا جاتا ہے۔ ان کے ساتھ ان کے اہلبیت میں اٹھارہ آدمی قتل ہوئے جن کا مثل روئے زمین پر نہ تھا۔ آسمان و زمین ان پر روئے۔ زمین پر ۴ ہزار فرشتے ان کی مدد کو اترے انھیں جنگ کی اجازت نہیں دی گئی وہ قیامت تک ان کی قبر پر سوگوار رہیں گے۔ یہاں تک کہ قائمؑ کا ظہور ہو، وہ ان کے انصار میں شامل ہوں گے۔ ان کا شعار ہو گا یالثارات الحسین۔

اے ابن شبیب مجھ سے میرے باپ نے انھوں نے اپنے باپ سے ان کے باپ نے اپنے دادا سے روایت کی کہ جب میرے دادا حسینؑ شہید ہوئے تو آسمان سے خون اور سرخ مٹی برسی۔ اے ابن شبیب اگر تم حسینؑ پر اتنا روؤ کہ آنسو تمہارے رخسار تک آجائے تو خدا تمہارے چھوٹے بڑے کم یا زیادہ گناہ بخش دیگا ——— اے ابن شبیب اگر تم چاہتے ہو کہ اللہ سے بغیر کسی گناہ کے ملاقات کرو تو حسینؑ کی زیارت کرو۔ اے ابن شبیب اگر تمھیں اس میں خوشی ہو کہ رسول اللہ کے ساتھ جنت میں ہو تو قاتلان حسینؑ پر لعنت کرو۔ اے ابن شبیب اگر تمھیں آرزو ہو کہ وہی ثواب ملے جو ان لوگوں کو ملا ہے جو حسینؑ کے ساتھ شہید ہوئے تو جب حسینؑ کا ذکر کرو تو یہ کہہ لیا کرو یالیتنی کنت معکم فافوز فوزاً عظیماً۔ کاش میں آپ کے لوگوں کے ساتھ ہوتا اور عظیم کامیابی حاصل کرتا ——— اے ابن شبیب اگر تمھیں خوشی ہو کہ ہمارے ساتھ جنت کے اعلیٰ درجات میں رہو تو ہمارے غم پر غم کرو ہماری خوشی پر خوش رہو۔ اور تم ہماری ولایت پر قائم رہو۔ اگر کوئی شخص پتھر سے بھی محبت کرے گا تو اللہ اسے اس کے ساتھ قیامت میں محشور کرے گا۔

(عیون اخبار رضا ابن بابویہ $\frac{192}{1}$)

امام رضا کا ذکر بہت وسیع دامن ہے اس میں تاریخ و سیرت اور اخلاق سے ملا جلا بیان ہے۔ فرماتے ہیں سب سے پہلے شام میں جس نے فقاع (جو کی شراب) استعمال کی وہ یزید بن معاویہ ہے۔ حسینؑ کا سر نیزے پر نصب تھا اور دستر خوان بچھا ہوا تھا اس پر فقاع رکھی ہوئی تھی خود پیتا جاتا تھا اور اپنے ساتھیوں کو پلا رہا تھا۔ کہتا جاتا تھا پیو یہ مبارک شراب ہے میں پہلا شخص ہوں جسے ہم لوگ پی رہے ہیں دشمن کا سر ہمارے سامنے ہے دسترخوان بچھا ہوا ہے ہم کھا رہے ہیں ہمارے دل مطمئن ہیں ——— پس جو ہمارے شیعہ ہیں وہ فقاع کی شراب سے پرہیز کریں۔ یہ ہمارے دشمنوں کی شراب ہے جو اس سے پرہیز کرے گا وہ ہمارے گروہ میں شامل نہ ہوگا۔ ($\frac{19}{2}$ عیون اخبار رضا)

امام نے ذکر کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالی۔ امام حسینؑ کی ولادت کے موقع پر اس ہونے والے واقعہ کے ذکر سے جو ماحول پیدا ہوا اس سے واقف کیا۔ فرمایا اسما بنت عمیس نے جب امام حسینؑ کو رسولؐ خدا کی آغوش مبارک میں لاکر رکھا تو حضرت رو پڑے۔ اسما نے کہا میرے ماں باپ آپ پر فدا ہوں کیوں رو پڑے فرمایا اپنے اس بیٹے پر رو رہا ہوں۔ اسما نے کہا یہ تو ابھی پیدا ہوا ہے۔ فرمایا اسے میرے بعد گروہ باغی قتل کرے گا۔ اللہ انھیں میری شفاعت نصیب نہ کرے۔ پھر فرمایا کہ فاطمہ کو اس کی اطلاع نہ دینا ابھی ولادت ہوئی ہے۔ (عیون اخبار رضا ۲۵)

قاتل امام کے انجام کو بتایا۔ رسولؐ خدا کی حدیث نقل فرمائی:۔

ان قاتل الحسین فی تابوت من نار علیہ نصف عذاب اهل الدنیا۔ وقد شدّ یداہ ورجلاہ بسلاسل من نار فیُرکس فی النار حتی یقع فی قعر جهنم۔ وله ریح یتعوذ اهل النار الی ربهم من شدة نتنه۔ وهو فیها خالد ذایق العذاب الالیم مع جمیع من شایع علی قتله۔

قاتل حسینؑ آگ کے تابوت میں ہے اس پر اہل دنیا کے عذاب کا نصف عذاب ہوگا آگ کی زنجیر سے اس کے ہاتھ پاؤں باندھ کر اسے جہنم میں ڈھکیل دیا جائے گا وہ جہنم کی آخری تہ میں گر جائے گا۔ اس کے جسم سے اتنی سخت بدبو آئے گی کہ اہل جہنم خدا سے پناہ مانگیں گے۔ وہ اس میں ہمیشہ پڑا رہے گا اور دردناک عذاب کا مزا چکھے گا اس کے ساتھ تمام وہ لوگ ہوں گے جو امام کے قتل میں شریک رہے ہوں گے۔

لوگوں نے عاشور کو یوم مسرت بنانے کے لئے جھوٹی حدیثیں گھڑ لی تھیں حکومت نے ان کو پھیلایا تھا یہ حدیثیں اس طرح گھڑی گئی تھیں کہ سادہ دل یہ محسوس نہ کر سکیں کہ اس کی تہ میں امام حسینؑ کی مخالفت مضمر ہے۔ ائمہ اہلبیت ان جھوٹی حدیثوں کے پردہ چاک کرتے رہے امام رضا علیہ السلام نے بھی اس پر روشنی ڈالی ہے۔ فرمایا:۔

من ترك السعي فی حوائجه یوم عاشورا قضی الله له حوائج الدنیا والاخرة۔ ومن کان یوم عاشورا یوم مصیبته وحزنه وبکائه جعل الله یوم القیمة یوم فرحه وسروره وقرّ عینه بنا فی الجنان۔ ومن سمّی یوم عاشورا یوم برکة وادّخر فیه شیئاً لم یبارک له فیما ادّخر وحشر یوم القیمة مع یزید وعبید الله بن زیاد وعمر بن سعد الی اسفل درك من النار (۲۹۴ عیون اخبار)

جو عاشور کے دن دنیا کے کام کے لئے کوشش نہ کرے گا اللہ اس کی دنیا و آخرت کی ضرورتیں پوری کرے گا۔ جو عاشور کے دن کو مصیبت و حزن و بکا کا دن قرار دے گا اللہ قیامت کے دن کو اس کے لئے ہمارے ساتھ فرحت و سرور کا دن قرار دے گا۔ اور جو عاشور کے دن کو یوم برکت کہے گا اور اپنے گھر کے لئے کچھ سامان مہیا کرے گا تو اللہ اس میں اسے برکت نہ دے گا اور قیامت میں یزید و عبید اللہ بن زیاد اور عمر بن سعد کے ساتھ جہنم کے آخری طبقہ میں ہوگا۔

قیامت یعنی یوم عدل اکبر تک اس سانحہ کے اثرات پر امام نے روشنی ڈالی۔ جناب رسولؐ خدا کی حدیث کو اپنے ذکر میں روایت کی:۔

تحشر ابنتی فاطمة یوم القیمة ومعها ثیاب
مصبوغة بالدم۔ فتعلق بقائمة من قوائم
العرش ۔ فتقول یا عدل الحاکمین احکم
بینی و بین قاتل ولدی قال رسول اللّٰہ۔
فیحکم اللّٰہ لابنتی ورب الکعبة فان اللّٰہ
یغضب لغضب فاطمة ویرضی لرضاھا۔
(عیون اخبار)

میری بیٹی فاطمہ قیامت میں اس طرح اٹھے گی
کہ اس کے ساتھ خون آلود کپڑے ہوں گے۔ وہ قائمہ
عرش کو پکڑ لے گی اور فرمائے گی اے سب سے عادل تر
حاکم میرے اور میرے فرزند کے قاتل کے درمیان
فیصلہ فرما۔ رسولؐ خدا نے فرمایا کعبہ کے خدا کی قسم
اللہ میری بیٹی کے حق میں فیصلہ کرے گا۔ اللہ فاطمہ
کے غضب سے غضبناک ہوتا ہے اور ان کی رضا سے
رضامند ہوتا ہے۔

جس وقت امام اپنی مجلس ذکر میں اپنے سوگوارانہ
تاثرات کے ساتھ ان امور کو بیان فرماتے ہوں گے
سامعین غم و حزن میں ڈوب جاتے ہوں گے۔ امام
موسی کاظمؑ تک ائمہ اہلبیت کو ہر قوم و فرقے سے تعلق
رہا۔ لیکن عرب میں قیام کی وجہ سے دوسروں کی بہ نسبت
عرب ان سے زیادہ قریب تھے۔ لیکن ولیعہدی کے
تین سال امام رضاؑ کے ایران میں گذارے۔ مرو
میں آپ کا قیام تھا جو مشہد مقدس سے قریب تھا
یہاں امام علیہ السلام نے عزاداری امام حسینؑ کی ترویج
اور ذکر بیان کی اور مصائب اہلبیت کے نشر کے
ثواب پر کافی روشنی ڈالی ـــ کبھی فرمایا:۔

من ذکر مصابنا فبکی او ابکی لم تبک
عینه یوم تبکی العیون ـــــ

جو ہماری مصیبتوں کو یاد کرے اور روئے یا دوسروں
کو رُلائے تو اس دن اس کی آنکھ نہ روئے گی جس دن
سب آنکھیں روتی ہوں گی۔

کبھی فرمایا:۔ ـــــ

من تذکر مصابنا و بکی لما ارتکب منا کان
معنا فی درجتنا یوم القیمة ـــــ

جو ہماری مصیبت یاد کرے اور ہمارے ساتھ جو
برتاؤ کیا گیا اس پر روئے تو قیامت میں ہمارے
درجہ میں ہوگا۔

کبھی واقعہ کربلا کی سنگینی بیان کر کے فرمایا یہ غم
قیامت تک ہمارے دلوں کو متاثر کرتا رہے گا۔ فرمایا:۔

ان یوم الحسین اقرح جفوننا واسبل دموعنا
واذل عزیزنا بارض کرب وبلا ـــــ
واورثنا الکرب والبلاء الی یوم القیمة

حسینؑ کے دن نے ہماری پلکوں کو زخمی کر دیا ہمارے
آنسو بہائے، زمین کرب و بلا میں ہمارے معزز لوگوں کو ذلیل کیا
اور قیامت تک کے لئے ہمیں کرب کا وارث بنایا۔

اس کے بعد فرمایا:۔

فعلی مثل الحسین فلیبک الباکون ۔

حسینؑ کے ایسے انسان پر رونے والوں کو رونا چاہیئے۔

اس دور میں کئی قابل فخر مرثیہ نگار پیدا ہوئے۔
ان میں دعبل بن علی خزاعی۔ دعبل کا شمار علماء متکلمین اور
ماہرین ادب و تاریخ۔ عارفین لغت و ایام عرب و
روایت و احوال میں تھا۔ اسے شاعر علما اور عالم شعرا
کہتے تھے۔ تین اماموں کا زمانہ پایا۔ امام موسی کاظمؑ
(۱۲۸-۱۸۱) امام رضاؑ (۱۴۸-۲۰۳) امام محمد تقیؑ
(۱۹۵-۲۲۰) (معالم العلماء شہر بن آشوب) عباسی سلاطین
میں ہارون و مامون و معتصم و واثق و متوکل کا عہد
پایا۔ ۲۰ سال کی عمر سے شعر گوئی میں حصہ لیا۔ ائمہ اہلبیت
کا شاعر تھا۔ عباسی عہد پر اس کی تنقید میں اُن کی نیند کو

حرام کئے ہوئے تھیں۔ اِدھر اُدھر مارا مارا پھرتا۔ خوفؒ قاتل نے آخری دم تک ساتھ نہ چھوڑا یہاں تک کہ ۲۴۶ھ میں قتل کر دیا گیا۔ زندگی مصائب و آلام سے پُر تھی اس کے اشعار۔ اس کے عہد۔ اور اس کے رجحانات اور سیاسی و دینی حالات کے عکاس ہیں۔ سیاسی زیادہ خوشامد کا دشمن تھا ائمہ اہلبیت کی طرف سے دفاع اور ان کے ساتھ زیادتیوں پر احتجاج اور ان کے حقوق کا مطالبہ دعبل نے بڑی جرأت اور طیش سے کیا۔ ایسے مرثیہ کہے جن کی سیاسی و ادبی لحاظ سے بڑی اہمیت ہے۔ "تائیہ مرثیہ" ایک زندہ جاوید مرثیہ ہے۔ دعبل کو خود اس پر ناز تھا۔ اسے کپڑے پر لکھا۔ اس میں احرام باندھا اور وصیت کی کہ اسے میرے کفن میں رکھ دینا۔

(اغانی و معجم الادباء یاقوت حموی)

دور ائمہ کا یہ سب سے طویل و پُرسوز و اثر خیز مرثیہ ہے جو ہم تک پہونچا ہے۔ یہ دعبل کا شاہکار ہے جب یہ مرثیہ تیار ہوا تو دعبل امام رضاؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا میں نے ایک مرثیہ کہا ہے اور قسم کھائی ہے کہ آپ سے پہلے کسی کو نہ سناؤں گا۔ اس مرثیہ کا یہ شعر ہے :-

مَدَارِسُ آیَاتٍ خَلَتْ مِنْ تِلَاوَةٍ
وَمَنْزِلُ وَحْيٍ مُقْفِرُ الْعَرَصَاتِ

دعبل جب اس شعر پر پہونچے :-

إِذَا وُتِرُوا مَدُّوا إِلَىٰ وَاتِرِيهِمْ
أَكُفًّا عَنِ الْأَوْتَارِ مُنْقَبِضَاتِ

امام اتنا روئے کہ بیہوش ہو گئے۔ خادم نے اشارہ کیا رُک جاؤ۔ امام جب ہوش میں آئے تو مرثیہ کو جاری رکھنے کا حکم دیا۔ دعبل نے مرثیہ پڑھا پھر امام پر غشی طاری ہو گئی جب غش سے افاقہ ہوا تو پھر آگے پڑھنے کو فرمایا۔ مرثیہ بہت طویل ہے۔ اس میں ایک سو اکیس شعر ہیں پُرسوز لہجہ میں ٹھہر ٹھہر کر مرثیہ پڑھا گیا ہوگا۔ اور کافی وقت لگا ہوگا۔ آخر وقت تک امام بڑے ہی انہماک اور غیر معمولی توجہ سے سنتے رہے۔ جب مرثیہ ختم ہوا تو تین بار تعریف کی اور فرمایا روح القدس نے تمہاری مدد کی ہے اُس سکّہ میں سے جس پر آپ کا نام مبارک نقش تھا دس ہزار درہم دعبل کو دیئے۔ دعبل نے لینے سے انکار کیا اور گزارش کی کہ میں نے رضائے الٰہی کے لئے یہ مرثیہ کہا ہے مگر امام نے اصرار فرمایا اور دعبل کو یہ رقم لینی پڑی۔ یہ درہم شیعوں کی نظر میں اتنے گراں قدر تھے کہ ایک ایک درہم کو اصرار سے دس دس درہم سے خریدا۔

امام رضا علیہ السلام نے عزاداری کی ترویج اور ذکر امام میں جس قدر دلچسپی لی اس کا اندازہ اس مختصر تبصرے سے نہیں ہو سکتا۔

ذکر امام محمد تقیؑ سے امام عصرؑ کی غیبتِ کبریٰ تک

امام محمد تقیؑ نے صرف ۲۵ سال عمر پائی۔ اس عہد میں ذکر حسینؑ میں کوئی خاص ترقی نہیں ہوئی۔ خاندان علوی و فاطمی مامون و معتصم و واثق کے زمانے میں نسبتہً محفوظ رہا۔ اگرچہ مامون نے امام رضاؑ اور معتصم نے امام محمد تقیؑ کو زہر دیا مگر عموماً آلِ علیؑ کو کسی ناقابل برداشت سانحے سے سابقہ نہیں ہوا۔

عباسی خلفاء میں متوکل سب سے زیادہ بدسیرت و خونخوار، متعصب و ناصبی تھا۔ امام حسینؑ کے زائروں کے ہاتھ پاؤں کاٹے۔ ۲۳۶ھ میں اس نے امام حسینؑ کی قبر منہدم کرا دی۔ اس کے گرد و پیش جو مکانات تھے گروا دیئے۔ اس جگہ ہل چلوا دیا۔ اس پر

مسلمانوں کو جس قدر رنج و صدمہ ہوا اس کا اندازہ کیا ہو سکتا ہے۔ اہل بغداد نے دیواروں مسجدوں پر اُسے بُرا بھلا لکھا۔ شعرا نے اس کی ہجو کی۔ غم و ملال تنقید احتجاج و شدت تاثر سے بھرے ہوئے ان ذیل کے شعروں سے کچھ اس واقعہ سے رنج و غم کا اظہار ہو سکتا ہے:-

باللہ ان کانت امیۃ قد اتت قتل ابن بنت
نبیھا مظلوما فلقد اتاہ بنو ابیہ بمثلہ ھذا
لعمری قبرہ ھدما وما اسفوا علی ان لا یکونو
اشارکوا فی قتلہ فتتبعوہ میما۔

(تاریخ الخلفا سیوطی مطبوعہ مصر صفحہ ۲۳)

بخدا اگر بنی امیہ نے فرزند بنت رسولؐ کو مظلوم قتل کیا تو ان کے باپ کے بیٹے (بنی عباس) نے بھی وہی کیا۔ حسینؑ کی قبر منہدم کر دی گئی ہے ان کو اس بات پر افسوس تھا کہ ان کے قتل میں کیوں نہ شریک ہوئے تو ان کی موت کے بعد ان کی لاش کو ایذا دینے کے لئے ڈھونڈھا۔

ایسے بے بصیرت ننگ بنی ہاشم و رسوائے انسانیت شخص کے عہد میں ذکر حسینؑ کے تمام راستے بند تھے۔ متوکل کو دنیا ہی میں اپنی بد اعمالی کی سزا مل گئی۔ اس کا بیٹا منتصر اس کے احمقانہ تصورات سے عاجز آگیا تھا۔ اس نے پہلے انتہائی لجاجت سے باپ سے درخواست کی کہ اس رویہ کو ترک کر دے۔ جب اس کی بے ادبیاں جنون کا درجہ اختیار کر گئیں تو اس نے اسے قتل کر دیا۔

امام علی نقیؑ کا زمانہ بھی بڑی بڑی پریشانیوں میں گزرا۔ آپ کو ۶ عباسی خلفاء سے سابقہ ہوا۔ ان سب نے حضرت کو اذیت دی۔ ۲۵۴ھ میں معتز باللہ عباسی کے زہر سے امام نے شہادت پائی۔

امام حسن عسکریؑ کا زمانہ بھی بڑے کرب و بےچینی سے گزرا۔ آپ کے آبا و اجداد کی طرح آپ کو بھی مدینہ منورہ سے سامرا میں نظر بند کیا گیا۔ آپ کو جانی و مالی نقصانات پہونچائے گئے۔ سنہ ۲۶۰ھ میں سامرا میں معتمد باللہ عباسی کے زہر سے آپ کی شہادت ہوئی۔ آپ کا زمانہ بڑی پریشانی کا زمانہ تھا۔ ذکر و بیان کی راہیں بند تھیں۔ ۲۵۵ھ میں امام عصر کی ولادت ہو چکی تھی۔ مصلحت الٰہی کا تقاضا ہوا کہ امام حسن عسکری کی وفات کے بعد ۲۶۰ھ میں امام عصر غیبت صغریٰ اختیار کر لیں۔ ۷۰ سال تک غیبت صغریٰ کا دور رہا۔ آپ کے وکیلوں اور سفیروں کے ذریعہ سے آپ سے ہدایت حاصل کی جاتی تھی۔ آپ کے سفیروں میں یہ چار آدمی مشہور تھے۔

۱۔ عثمان بن سعید عمری
۲۔ محمد بن عثمان سعید عمروی
۳۔ حسین بن روح
۴۔ ابوالحسن علی بن محمد سمری۔

۳۲۹ھ تک غیبت صغریٰ کا دور رہا۔ اس کے بعد سفارت کا سلسلہ ختم ہو گیا اور غیبت کبریٰ ہو گئی سفرا کے دور میں عزاداری پر بعض شبہات سامنے آئے جن کے جوابات ان سے مل گئے کہا گیا قرآن مجید میں ہے لن یجعل اللہ للکافرین علی المومنین سبیلا۔ اللہ کافروں کو مومنین پر غلبہ نہیں دیتا۔ یزید اگر کافر تھا تو اس نے امام حسینؑ پر کیسے قابو پایا۔ جناب حسین ابن روح نے فرمایا۔ اگر انبیا کو مطلقاً غلبہ رہتا تو بہت سے لوگ ان کو خدا سمجھنے لگتے۔ اس لئے وہ مصائب میں مبتلا کئے گئے تاکہ ان کی عبدیت کا اثبات ہو۔

∴

غیبتِ کبریٰ کے بعد ذکر و عزاداری

لطف الٰہی
بر ہندمیں

اپنے دین کی حفاظت کرتا رہا۔ غیبت کبریٰ کے قریب ہی زمانے میں ایسے ایسے عظیم و جلیل عالم و محدث پیدا کر دیئے اور ان کے دلوں کو خلوص سے بھر دیا جنھوں نے بڑی وسیع النظری اور غیر معمولی جوش، وایثار اور محنت سے تحفظ دینی کی خدمت انجام دی۔ علامہ صدوق ابن بابویہ قمی۔ محمد بن جعفر بن قولویہ اور ابن نما کے کارنامے ہمیشہ خراج تحسین وصول کرتے رہیں گے۔ ان حضرات نے عزاداری اور ذکر و بیان میں بھی شاندار حصہ لیا۔ علامہ صدوق تو پہلے شخص ہیں جنھوں نے نثر میں مسلسل مواعظے فرمائے اور ان میں واقعہ کربلا کا ذکر کیا۔ ان کی "کتاب الامالی" میں یہ منثور مجلسیں موجود ہیں۔ منثور مجلسوں کا یہ پہلا نمونہ ہے۔

غیبت کبریٰ میں دیلمی سلاطین اور مصر کے فاطمی خلفاء نے عزاداری اور ذکر و بیان میں بڑا شاندار حصہ لیا۔ ۳۵۲ھ میں عاشور کے دن بغداد میں یوم غم منایا گیا۔ بازار بند کر دیئے گئے۔ سڑکوں سے ماتمی جلوس گذرا۔ (تاریخ الخلفاء ص۲۷۲)

۳۶۲ھ میں مصر کے بنی فاطمہ نے محرم کے دسویں دن کو سرکاری طور پر یوم غم قرار دیا۔ ذکر و مجالس سے سارے مصر کی فضا سوگوار بن گئی۔ خطبہ سے بنی عباس کا ذکر خارج کیا گیا اور اللھم صل علی محمد المصطفیٰ وعلیٰ علیؑ المرتضیٰ وعلی فاطمہ البتول وعلی الحسن وعلی الحسین سبط الرسول پڑھا جانے لگا۔

(۲۶۷۔ تاریخ الخلفا سیوطی)

جب تک مصر میں فاطمی حکومت رہی عزاداری وذکر کا شباب رہا۔ جب فاطمی عہد کا زوال ہو گیا اور اور بنی ایوب مصر پر مسلط ہوئے تو عاشور کو یوم مسرت قرار دیا جشن منایا جاتا۔ (خطط و آثار تقی الدین مقریزی)

عباسی قلمرو میں خلفاء وسلاطین کے افتاد مزاج اور ان کے گرد و پیش کے رویّہ پر حسینیت سے دلچسپی اور دوری کا اتار چڑھاؤ بنا رہا ـــــ آل ابوطالب بنی فاطمہ اور ان کے مخلص عباسی دور میں ایک حالت پر نہیں رہے۔ کبھی شدت کم ہو جاتی تھی اور کبھی انتہا کو پہنچ جاتی اور دنیا کے مختلف حصوں میں جا جا کر پناہ لیتے پھرتے۔ اور اس قلمرو میں زندگی کے ادنیٰ حقوق سے بھی محروم ہو جاتے۔ عزاداری اور ذکر حسینؑ کو ان حالات کے ماتحت مختلف مرحلوں سے گزرنا پڑا۔ سنہ ۴۲۰ھ میں عین عاشور کے دن شیعوں پر حملہ کیا گیا۔ کوفے میں آگ لگا دی گئی۔ مجموعی طور پر عہد بنی عباس میں شہدائے کربلاؑ، امام جعفر صادقؑ اور امام رضاؑ کے زمانہ میں محسوس طور پر ہوا۔ زیادہ تر زمانہ ناموافق رہا۔ شدید پابندیوں اور ہیبت ناک مظالم سے عباسی تاریخ وحشی درندوں کی تاریخ معلوم ہوتی ہے۔ حالانکہ اس عہد کی تاریخ خود خلفاء عباسی کے زیر اثر لکھی گئی پھر بھی اس میں ایسے اخلاق سوز و اسلام دشمن حالات ملتے ہیں جن کے مطالعہ سے اس سلسلہ کی تاریخ سے کراہت محسوس ہوتی ہے۔

مولانا وحید احمد حنفی اپنی کتاب "اسلام مشرق میں" میں لکھتے ہیں:ـــ

" اسلامی تاریخ عہد عباسی میں لکھی گئی۔ لکھنے والوں کے دماغ پر عباسیت چھائی ہوئی تھی۔ اگر اسلامی تاریخ کو روایت کے معیار پر جانچا جائے تو واضح ہو گا کہ اس میں سقم ہے حقیقت مشکوک ہے۔ خلا موجود ہے۔ تضاد پایا جاتا ہے۔ اور سب سے زیادہ نقص یہ ہے کہ شخصیتوں کے حالات واحوال ان کے اصل

کیر کثیر سے نہیں ملتے ——— آل رسولؐ اتقا کے لحاظ سے ہمارے لئے ہدایت و نمونہ اور قرآن کی بہترین تفسیر تھے۔"

(اسلام شرق میں ص ۴۵-۹۴ مطبوعہ کراچی ۱۹۶۸ء)

معتصم باللہ بنی عباس کا آخری خلیفہ ہے ۶۵۶ھ میں عدل الٰہی نے تتار کے ذریعہ سے ان کے بے پناہ مظالم کا انتقام لیا۔ جس عاشور کو یہ یوم مسرت میں تبدیل کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور صرف کر رہے تھے وہی عاشور ان کے لئے یوم غم بن گیا ———

عباسی حکومت کی طرف سے عزا داری میں جو مزاحمتیں ہوتی تھیں اور ذکر حسینؑ میں جو رکاوٹیں ڈالی جاتی تھیں زوال بغداد کے بعد اس طرح کی کسی بڑی منظم مخالفت کا امکان نہیں رہا۔ جہاں جہاں فضا موافق تھی امام کا ذکر ہوتا تھا۔ مرثیے نظم ہوتے تھے۔ مواعظ کہے جاتے تھے۔ سانحۂ کربلا پر اشکباری ہوتی تھی ———

ملا حسین واعظ کاشفی

نویں صدی ہجری کے آخر اور دسویں صدی ہجری کے اوائل میں ملا حسین واعظ کاشفی ایسا طلیق اللسان، عذب البیان خطیب دوران سحبان عصر حسان دہر ذاکر پیدا ہوا جس نے تفسیر و حدیث و سیرت و تاریخ و ادب و اخلاق کی مدد سے واقعہ کربلا کی خطابت و ذاکری کو دلکش بنایا۔ فنی خوبیوں سے آراستہ کیا۔ اور قبولیت کے آسمان پر پہنچایا اور ایک ایسا سرمایہ چھوڑا جو مسلمانوں کے ہر مکتب خیال کے لئے قابل اطمینان ہے۔

ملا حسین واعظ کاشفی سے خطابت و ذاکری کی شاندار تاریخ کا آغاز ہوتا ہے۔ ان سے پہلے اور ان کے زمانہ میں ذکر شہدائے کربلا میں مقاتل بھی تیار ہوئے اور تاریخ کے سیکڑوں صفحات بھی اس کیلئے وقف ہوئے اور ہر حلقۂ خیال نے اپنا اپنا فریضہ انجام دیا لیکن اس عہد تک روضۃ الشہداء سے بہتر سوز و رقت اور گرم جوشی اور شدت تاثر و حسن بیان کے ساتھ سیرت انبیاء و ابتلاء اولیاء اللہ و اصحابؓ کسا اور واقعۂ کربلا پر کوئی دوسری کتاب نہیں ملتی۔

روضۃ الشہداء آیات و احادیث فضائل۔ اخبار و قصص امثال و شعر و مناقب و مصائب کا ایک دلکش گلدستہ ہے۔ نثر کی جزالت و روانی میں سیلاب کا زور ہے۔ جس سے حاضرین مجلس کی توجہ بیدار رہتی ہے۔ آتشیں و طوفانی نثر کا اثر اس وقت شباب پر ہوتا ہے جب شعر سے اس کی تاثیر دوچند ہو جاتی ہے اور آیات و احادیث کی تضمین سے اس کی آرائش انتہا پر پہونچ جاتی ہے۔ عرصۂ دراز تک روضۃ الشہداء مجالس عزا پر حاوی رہی۔ روضہ خوانی مجلس کا ضروری جز بنی رہی۔ تلخیص و تکلم و ترجمہ تقلید سے اس کی بے پناہ مقبولیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ بڑے بڑے عالم و فقیہ و ذاکر و واعظ اس طرز کے گرویدہ ہوئے۔ اسے منبر پر پڑھتے اور آرزو کرتے کہ ان کے بیان میں یہ دلکشی پیدا ہو جائے اور وہ اپنے علم و استعداد و ذوق خطابت و بلاغت سے کام لے کر خود ایک کامیاب طرز خطابت و ذاکری کے پیش کرنے کا شرف حاصل کریں،

انھوں نے اپنی ساری صلاحیتیں اور تمام علوم و فنون کو اس فن کے استحکام و جذابیت میں صرف کر دیا۔ اور محنت و کوشش، مشق و تربیت سے اپنا ایک مخصوص طرز پیدا کیا۔

علامہ فقیہ شیخ جعفر بن حسین تستری م ۱۳۰۳ھ

صاحب منبع الرشاد (فقہ) بڑے پایہ کے عالم تھے نجف اشرف میں معقول و منقول میں تحصیل کی۔ اپنے وطن میں ترویج دین میں مشغول ہو گئے۔ ذکر فضائل و مصائب اہلبیت سے انھیں خاص شغف تھا۔ ان کے زمانے میں مجالس عزا میں روضۃ الشہدا کا سکہ چل رہا تھا۔ روضۃ الشہدا پڑھنے کی ذاکرین و واعظین کو تربیت دی جاتی تھی شیخ جعفر بھی شروع میں روضۃ الشہدا ہی سے مجلسیں پڑھتے تھے۔ یہ خود باخبر وسیع النظر عقلیات و نقلیات کے ماہر تھے ایک دن ان کو یہ خیال ہوا کہ کب تک میں روضۃ الشہدا کا رہین منت رہوں گا۔ اس خیال میں محو تھے کہ ان کی آنکھ لگ گئی۔ خواب میں دیکھا کہ میں کربلا کے محلے میں ہوں۔ اور امام حسینؑ کے اقارب و انصار موجود ہیں حضرت حبیب بن مظاہر نے کھانا تیار کیا ان کو بھی کھلایا۔ اس کے بعد ان کی آنکھ کھل گئی اس کی برکت سے ان کی گویائی کا چشمہ پھوٹ نکلا۔ فن خطابت و ذاکری میں سرآمد روزگار قرار پائے۔

(فوائد رضویہ مولانا شیخ عباس قمی ص۶۸)

روضۃ الشہدا سے انھوں نے الگ رستہ بنایا۔ اور ذاکری کو نیا طرز دیا۔ روضۃ الشہدا زیادہ تر سوز و رقت خیزی اور سیرت کے واقعات پر مشتمل تھی۔ شیخ جعفر نے موعظہ و اخلاق و تزکیہ نفس اور فقیہانہ و عالمانہ تشریح و توجیہ سے دلوں پر حکومت کی اور مجلس ذکر کے حدود وسیع کئے اور معیار بلند کیا۔ موصوف شاگردوں کے جم غفیر کے ساتھ شہروں کا دورہ کرتے۔ نجف و کربلا و کاظمین و سامرا و قم و مشہد میں ان کی خطابت کا جھنڈا لہرانے لگا۔ ان کے بعد ان کے شاگردوں نے ان کا طرز اختیار کیا۔ موصوف نے ذاکری کی نئی کتابیں لکھیں۔ ان کتابوں نے بڑی مقبولیت حاصل کی۔ ان کی کتاب خصائص حسینیہ سے شاید ہی کوئی ذاکر ناواقف ہوگا۔ حکیم احمد حسین صاحب مرحوم نے ۱۳۱۴ھ میں اس کا ترجمہ "نور العین ترجمہ اُردو خصائص" کے نام سے شائع کیا۔ (۲) مجالس المواعظ والبکا و مواعظ فوائد المشاہد لکھی

مشاہیر واعظین و ذاکرین میں فقیہ متکلم جامع معقول و منقول عارف فقہ و اصول فدائے اہلبیت رسولؐ جناب اخوند ملا آقا ابن عابدین رمضان دربندی شیروانی م ۱۲۸۶ھ بھی تھے۔ موصوف نے عزائے حسینؑ میں بڑے انہماک و شغف سے حصہ لیا۔ خطابت و ذاکری میں مقام رفیع حاصل کیا۔ آپ کی کتاب اسرار الشہادۃ اور سعادت نامہ ناصری ذاکری کی مشہور و معروف کتابوں میں شمار ہوتی ہے — فاضل مذکور اگرچہ مشاہیر علما میں ہیں خامس آل عبا سے ان کا اخلاص بھی بے نظیر تھا۔ لیکن کتاب اکسیر العبادات علمائے فن اور نقادان احادیث و سیر کی نظر میں بے وقعت و بے اعتبار ہے۔ (لؤلؤ و مرجان علامہ محقق مرزا حسین نوری متوفی ۱۳۲۰ھ مطبوعہ لکھنؤ) اگر ان کی کتاب سے ناقابل قبول باتوں کو حذف کر دیا جائے تو آج بھی اس سے بیش بہا فوائد حاصل ہو سکتے ہیں۔

بعض محاسن و مسامحاتِ روضۃ الشہدا

روضۃ الشہدا فضائل و مصائب کا ایک دریا ہے
اس دریا میں موتی بھی ہیں اور سیپ بھی۔ اس میں محاسن زیادہ ہیں۔ اور مسامحات کم ہیں۔ آیات فضائل اور احادیث فضائل اس میں اُبل رہے ہیں۔ حدیث سفینہ حدیث ثقلین۔ حدیث ولایت۔ حدیث منزلت۔ حدیث مدینۃ العلم۔ اور اللھم ادر الحق معہ حیث کان۔ حدیث نجوی۔ جناب رسول خدا کا حضرت علیؑ کو زندگی کے آخر لمحہ میں ایک ہزار باب علم کا تعلیم فرمانا اور اس کے علاوہ منقبت کے بیشمار لالہ وگل سے فضائل کا صدابہار گلدستہ تیار کیا ہے ——
پھر بھی بار بار اپنے عجز و قصور کا اعتراف کیا ہے ——

ایک جگہ حضرت علیؑ کے ذکر میں لکھا ہے:—
شمائل و فضائل وے ازاں بیشتر است کہ بتقریر زبان و تحریر بیان استقصاء آں تواں کرد۔
(ص۱۳۲ روضۃ الشہدا)

ایک جگہ لکھا ہے۔ صفاتِ حمیدہ و سمات پسندیدہ آنحضرت رضی اللہ عنہ از قیاس فہم افزوں واز حیّز ادراک وہم بیروں ست (ص۱۳۱ روضہ)
کتاب کا اصل موضوع ذکرِ احوال شہدا اہلبیت ہے (ص۱۲ روضہ) اس لئے مصائب زیادہ لکھے ہیں انبیاء کرام کے ابتلاء و مصائب کا ذکر بھی اسی لئے کیا ہے کہ ان سے اہلبیت کے مصائب کی شدت کا اظہار ہو ——

وہ کتاب کے آغاز میں لکھتے ہیں:——
وہ کون دل ہے جس کا جسم آتش بلا کے شعلوں سے پگھلا ہوا نہیں ہے۔ وہ کونسا دل ہے جس کا دل تیرِ بلا کا نشانہ نہیں بنا۔ حضرت آدم صفی حسرت میں مبتلا ہوئے۔ نوحؑ بھی نوحہ خواں رہے۔ خلیلؑ آگ میں ڈالے گئے۔ اسمٰعیلؑ کی قربانی میں آزمائش ہوئی۔ یعقوبؑ بیت الاحزان میں اشکبار رہے۔ یوسفؑ نے کنوئیں اور قیدخانے کی تکلیف اٹھائی۔ موسٰیؑ سرگرداں رہے۔ ایوبؑ نے بیماری کے دُکھ جھیلے۔ مظلوم زکریاؑ پر آرہ چلا۔ یحیٰیؑ قتل کئے گئے۔ رسالتمآب کے لب و دندان کو دکھ پہونچا۔ حضرت حمزہؑ کا جگر پارہ پارہ کیا گیا۔ خانوادۂ عصمت و طہارت مصائب میں مبتلا رہا۔ بتول عذرا اشکبار رہیں۔ علیؑ مرتضیٰ کا سر شگافتہ ہوا۔ امام حسنؑ کو زہر دیا گیا۔ امام حسینؑ شہید کئے گئے۔ کاشفی نے سفر ابتلا، کا میر کارواں سید الشہدا حضرت امام حسین علیہ السلام کو قرار دیا ہے اور جس آہ و بکا درد و دلسوز و رقت سے ان کے مصائب بیان کئے ہیں اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان روح فرسا مصائب کے تصور سے ان کا دل تڑپ رہا تھا۔ وہ لکھتے ہیں۔
خاکدان دنیا میں کسی نے ایسی مصیبت نہیں دیکھی۔ اور کسی کان نے کسی زمانے میں ایسی مصیبت نہیں سُنی۔
(ص۳۵ روضہ)

تا دہر ہست واقعہ زیں صعب تر ندید
ہر کس خبر شنید۔ بکشش باخبر ندید

چشم زمانہ بر ورقِ چرخ قصۂ
پُرسوز تر ز حال شبیرؑ و شبرؑ ندید

کاشفی لکھتے ہیں۔ اہل آسمان حسینؑ کو ابوعبداللہ مقتول کہتے ہیں۔ زمین کے فرشتے ابوعبداللہ مذبوح کہتے ہیں۔ دریا کے فرشتے حسینؑ مظلوم کہتے ہیں۔ ملائکہ ہوا حسینؑ شہید کہتے ہیں۔ کاشفی

اس موقع پر یہ رباعی لکھتے ہیں :-

برقتل حسینؑ ارض وسماں گریند
از عرش معلا تا بہ ثرا می گریند
ماہی در آب و مرغ در روئے ہوا
در ماتم شاہِ شہدا می گریند

کاشفی لکھتے ہیں ـــــ امام رضی بخاری نے بیان کیا ہے کہ خاک کربلا میں شہادت کی تخم پاشی ہوئی ہے اسے دوستوں اور عقیدت مندوں کے آنسوؤں کی ضرورت ہے ۔ حدیث میں ہے "من بکی علی الحسین" پس جو شخص جو بار چشم سے خاک کربلا پر اشک افشانی کرے گا تو اس سے تخم سعادت کی نشو ونما ہوگی اور یہ اُسے آخرت میں جنت کی شکل میں ملیں گے ۔

یہی وجہ ہے کہ ہر سال جب ماہِ محرم آتا ہے محبان اہلبیت مصیبت شہدا کربلا کی یاد کو تازہ کرتے ہیں ۔ اور لارسالتمآبؐ کو پرسہ دیتے ہیں

(ص۶ روضۃ الشہدا)

روضۃ الشہدا کے فضائل و مصائب پر ایک طویل مضمون کی ضرورت ہے جس سے ان کی ائمہ اہلبیت سے حسن عقیدت ۔ ان کی وسعت اطلاع ۔ ان کا زور قلم ۔ ان کی بلاغت اور فضائل و مصائب کے گوشوں پر ان کی نظر کی ترجمانی ہوسکے ـــــ

ہم نے لکھا ہے کہ روضۃ الشہدا اگر عقیدت و منقبت کا گلستاں ہے تو اس میں بعض مسامحات بھی ہیں ۔ ان مسامحات میں سے صرف ذیل کی چند فروگزاشتوں پر سرسری نظر ڈالی جاتی ہے ۔ ان مسامحات سے کاشفی کی محنت و عقیدت کی اہمیت نہیں گھٹ سکتی ۔ قابل مذمت وغلطی ہے جس کا باعث بدنیتی اور تعصب وعناد و حق پوشی ہے ۔

ان میں سے بعض مسامحات وہ ہیں جن کا ارتکاب دوسروں سے بھی ہوا ہے ۔ لکھا ہے :-

(۱) جناب رسولؐ خدا نے وفات کے قریب ایک تقریر میں فرمایا ۔ اگر میں نے کسی کو کوئی تکلیف پہونچائی ہو تو مجھ سے قصاص لے لے ۔ اس موقع پر عکاشہ بن محصن (خزاں) اسدی اُٹھ کھڑے ہوئے اور کہا آپ تبوک کا سفر فرمارہے تھے ۔ آپ نے اپنے اونٹ کو تازیانہ مارا وہ میرے لگ گیا اس وقت میری پیٹھ بھی برہنہ تھی ۔ مجھے سخت تکلیف پہونچی ۔ رسولؐ خدا نے قصاص کے لئے تازیانہ منگوایا ۔ اور اپنے دوش مبارک سے لباس ہٹایا ۔ عکاشہ نے مُہر نبوت کا بوسہ لے لیا ۔ اور کہا میری نیت قصاص کی نہ تھی ۔ میں تو مہر نبوت کا بوسہ لینا چاہتا تھا ۔ (خلاصہ روضہ ص۹۶)

بعض علماء کو اس واقعہ کی صحت میں شک ہے ۔ ابن حجر عسقلانی نے اصابہ ص۵۷ ج۲ میں عکاشہ کا ذکر کیا ہے مگر اس قصہ کی طرف کوئی اشارہ بھی نہیں کیا ۔

(۲) کاشفی نے حضرت امام حسنؑ کی زہر سے شہادت کے بیان کے موقع پر ایک طویل داستان لکھی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے :-

مروان حاکم مدینہ امام حسنؑ کی ہلاکت کے درپے تھا ۔ مدینہ میں ایک رومی کنیز "الیسونیہ" تھی جو دلالی کا پیشہ کرتی تھی ۔ اور ہر گھر میں اس کا آنا جانا تھا ۔ اس کے ذریعہ سے اس نے امام حسنؑ کی بیوی جعدہ سے سازش کی ۔ اس نے وعدہ کیا کہ اگر امام حسنؑ کو تم زہر سے ہلاک کردوگی تو یزید سے تمہارا عقد ہوجائیگا ۔

مروان نے زہر بھیجا اسما جس کا نام جعدہ بھی تھا امام حسنؑ کو پانی میں زہر دے دیا جس سے آپ کی شہادت ہوگئی ۔ مروان نے اسما کو معاویہ کے پاس دمشق بھیج دیا ۔ اسما نے معاویہ سے کہا میں نے حسنؑ کو آپ کی

خوشی اور یزید کی محبت میں ہلاک کیا۔ معاویہ نے کہا
جب تم نے حسنؑ کے ساتھ غداری کی تو یزید سے کیا
وفا کروگی۔ معاویہ نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ اسے
جزیرۂ فیل میں لے جاکر دریا میں غرق کردو۔ یہ لوگ
اسے لے گئے بادوباراں کا ایک طوفان آیا اور اُسے
اُٹھالے گیا۔ (روضہ صفحہ ۱۸)

خود کاشفی نے لکھا ہے کہ امام حسنؑ موصل میں
ایک شخص کے مہمان تھے۔ معاویہ نے اسے مال دنیا
کا فریب دے کر اسے امادہ کیا کہ امام حسنؑ کو زہر
کھلادے۔ معاویہ نے زہر قاتل بھیجا اس نے امام کو
کھلا دیا۔ زہر نے اثر کیا لیکن امام کو صحت ہوگئی۔
(روضہ صفحہ ۱۷)

یہ صحیح ہے کہ جعدہ بنت اشعث زوجہ امام حسنؑ
کے ذریعہ سے حضرت کو زہر دیا گیا۔ لیکن اس بے وفا کا
جزیرۂ فیل میں لیجایا جانا اور طوفان باد باراں کا اسے
بہا لیجانا افسانہ ہی افسانہ ہے۔ کسی معتبر سند کسی
معتبر مصدر میں اس کا پتہ نہیں ہے۔

(۳۰) کاشفی نے امام حسینؑ سے یزید کی عداوت
کی دو وجہیں بتائی ہیں۔ صوری و معنوی۔ صوری
کی بھی دو قسمیں ہیں۔ اصلی و فرعی۔ عداوت فرعی کے
دو سبب بتائے ہیں (۱) امام حسینؑ کا یزید کی بیعت
سے انکار کرنا (۲) عبداللہ بن زبیر کی حسینۂ روزگار
بیوی سے، یزید کا نادیدہ عشق۔ حیلہ و تدبیر سے ابن
زبیر سے اسے طلاق دلوانا اور ابو موسیٰ اشعری کو
اس کے پاس اپنا وکیل بنا کر عقد کا پیام دینا۔ اسے
طلاق دلوانا اور ابو موسیٰ کا مدینہ آنا۔ عبداللہ بن عمر
اور امام حسینؑ سے ملنا۔ اور ان دونوں کا ابو موسیٰ
کو اپنا وکیل بنانا اور مطلقہ ابن زبیر سے پیام دینا۔
خود ابو موسیٰ کا اسے اپنا اور ابن عمر اور امام حسینؑ کا
پیام پہونچانا اور اس کا امام حسینؑ کو پسند کرنا اور عقد
ہوجانا۔ اس واقعہ سے یزید کا امام حسینؑ سے برہم ہونا
اور ان کی ہلاکت کا عزم کرلینا۔ (روضہ صفحہ ۲۰)

یہ بے اصل افسانہ مختلف شکلوں اور ناموں کے
ساتھ نقل ہوتا رہا ہے۔ کتاب الامامت و سیاست ابن
قتیبہ میں اس عورت کا نام بنت اسحاق لکھا ہے اور
اس کے شوہر کا نام عبداللہ بن سلام گورنر عراق بتایا ہے۔
یزید کا اس سے نادیدہ عشق اور سازش کرکے ابن
سلام سے اسے طلاق دلوانا اور امام حسینؑ کا اس عورت
سے عقد کرکے پھر طلاق دے کر اسے ابن سلام کے
عقد میں دے دینا لکھا ہے۔ فرہاد مرزا نے قلزم زخار
میں لکھا ہے یہ روایت اشکال سے خالی نہیں ہے۔
(ص۲۴۲ قلزم زخار) احمد بن محمد میدانی نیشاپوری
نے مجمع الامثال میں اس عورت کو عبداللہ بن عامر کی
بیوی لکھا ہے۔ اور یزید کا اس سے نادیدہ عشق اور
سازش کرکے ابن عامر سے اسے طلاق دلوانا لکھا ہے
اور امام حسنؑ کا اس سے عقد کرلینا اور یزید کا ناکام
رہنا لکھا ہے۔

سبط ابن جوزی نے تذکرۂ خواص الامہ میں مطلقہ
کا نام بنت سہیل بن عمرو لکھا ہے اور شوہر کا نام ابن عامر
لکھا ہے اور امام حسنؑ کا اس مطلقہ سے عقد کرلینا
لکھا ہے۔

یہ روایت بے سروپا ہے۔ مطلقہ اور طلاق دینے والے
اور طلاق کے بعد اس سے نکاح کرنے والے مختلف
دکھائے گئے ہیں۔ اس روایت کے گھڑنے کا مقصد
یہ تھا کہ کربلا کی جنگ کا باعث ایک عورت تھی جس
سے یزید محبت کرتا تھا اور امام حسینؑ حائل ہوگئے۔
اس سے عقد کرلیا اور یزید ناکام رہا۔ جس کا انتقام
اس نے امام حسینؑ پر لشکر کشی کرکے لیا۔

اس قصہ کے گھڑنے والے نے چالاکی یہ کی ہے کہ اسے اس طرح پیش کیا ہے جس سے مظلوموں کے ساتھ امام حسینؓ کی ہمدردی ظاہر ہوتی ہے۔ امام حسینؓ نے اس نیت سے اس مطلقہ سے عقد کر لیا کہ اگر وہ یزید کے نکاح میں چلی گئی تو پھر کبھی اپنے محبوب شوہر تک نہ پہونچ سکے گی۔ حسینؓ سے یزید نے دھوکا دے کر طلاق دلوائی ہے۔ امام حسینؓ نے صرف اس لئے عقد کیا تھا کہ اسے طلاق دے کر اس کے سابق شوہر کو واپس کر دیں۔

اس افسانہ گھڑنے والے کے فریب کے جال میں امام حسینؓ کے بعض مخلص سیرت نگار بھی آگئے اور امام کی انسانی ہمدردی پہلو پر ان کی نظر رہی اور انھیں یہ توجہ نہ ہوئی کہ روایت کے مقصد کو معرکۂ کربلا کو حق و باطل کی جنگ کے بجائے ایک عورت سے اس کے دو محبت کرنے والوں کی جنگ قرار دینا ہے۔ میں نے اپنے ایک مطبوعہ مضمون میں اس بے اصل روایت پر اصول درایت سے کافی تنقید کی ہے۔

(۴) کاشفی نے لکھا ہے منقول ہے امام حسنؓ نے وفات کے وقت قاسم کا ہاتھ پکڑ کر امام حسینؓ کے ہاتھ میں دیا اور فرمایا اے بھائی میں تمھاری فلاں بیٹی کو قاسم سے نامزد کرتا ہوں۔

(ص۹۰ روضۃ الشہدا)

کاشفی نے بیان شہادت حضرت قاسم میں بغیر کسی حوالے کے لکھا ہے کہ کربلا میں حضرت قاسم نے امام حسینؓ سے جہاد کی اجازت چاہی حضرت نے فرمایا تم میرے بھائی کی یادگار ہو میں کیسے اجازت دے سکتا ہوں۔ مادر قاسم دوڑتی ہوئی خیمہ سے باہر آگئیں اور قاسم کا دامن کھینچتی ہوئی فریاد کرنے لگیں۔ قاسم خیمہ میں چلے آئے۔ انھیں یاد آیا کہ امام حسنؓ نے ان کے بازو پر ایک تعویذ باندھا تھا اور فرمایا تھا جب تم پر بیشمار اندوہ و ملال کا غلبہ ہو تو یہ تعویذ کھول کر پڑھنا۔ جناب قاسم نے تعویذ کھولا تو اس میں لکھا تھا۔ جب میرے بھائی حسینؓ کربلا میں مبتلائے مصیبت ہوں تو تم ان پر اپنی جان فدا کر دینا۔ قاسم نے یہ تعویذ امام حسینؓ کو دکھایا۔ حضرت نے فرمایا مجھ سے بھائی حسنؓ نے ایک وصیت فرمائی تھی ـــــ امام، قاسم کو لے کر خیمہ میں آئے اور انھیں قیمتی جامہ پہنایا ان کے سر پر دستار باندھی اور اس لڑکی کا ہاتھ پکڑا جو قاسم سے نامزد تھی۔ اور قاسم سے فرمایا یہ تمھارے باپ کی امانت ہے۔ جو آج تک میرے پاس تھی۔ اب تمھارے حوالے ہے۔ حضرت نے قاسم کا اس لڑکی سے عقد کر دیا۔ حضرت قاسم جب میدان جنگ میں جانے لگے تو دلہن نے ان کا دامن پکڑ لیا اور کہا کہاں جاتے ہو۔ قاسم نے کہا اب قیامت میں ہم دونوں ملیں گے۔ دلہن نے کہا قیامت میں آپ کو کہاں ڈھونڈوں گی اور کیسے پہچانوں گی۔ قاسم نے کہا مجھے باپ اور دادا کے پاس پاؤ گی۔ اور اپنی آستین پھاڑ کر دی اور کہا اس پھٹی ہوئی آستین سے پہچان لینا ـــــ پھر قاسم کا میدان جنگ میں آنا اور ازرق شامی اور اس کے بیٹوں کو قتل کرنا لکھا ہے۔ اور آخر میں حضرت قاسم کا شہید ہو جانا لکھا ہے۔

(خلاصہ ص۳۱۲ روضۃ الشہدا)

کاشفی نے یہ بھی لکھا ہے کہ امام حسنؓ کے چار یا چھ فرزند تھے۔ اور دو صاحبزادیاں۔

(ص۳۸۴ روضۃ الشہدا)

کاشفی نے لکھا ہے کہ فاطمہ امام زین العابدینؑ کی بہن تھیں دونوں کی ماں شہر بانو تھیں۔ فاطمہ کا عقد حسن مثنیٰ سے ہوا تھا۔ (ص۳۸۴ روضۃ الشہدا)

کاشفی نے لکھا ہے حسن مثنیٰ نے امام حسینؑ کی صاحبزادی سے عقد کا پیام دیا۔ امام نے اپنی دونوں بیٹیوں فاطمہ و سکینہ کا نام لیا اور فرمایا ان دونوں میں سے جس سے چاہو میں عقد کردوں۔ حسن مثنیٰ شرم سے کچھ نہ کہہ سکے۔ تو امام نے فاطمہ سے اُن کا عقد کر دیا۔ (روضہ ص۳۰۶)

کاشفی کی روایتِ عقد قاسم پر یہ تنقید کی گئی ہے کہ انھوں نے اپنا کوئی ماخذ نہیں بتایا۔ انھوں نے امام حسینؑ کی صرف دو صاحبزادیاں بتائی ہیں ایک کا نام فاطمہ دوسری کا سکینہ لکھا ہے۔ یہ بھی لکھا ہے کہ فاطمہ کی شادی حسن بن حسن سے ہوئی تھی۔ کاشفی نے امام کی اس صاحبزادی کا نام نہیں بتایا۔ جس سے کربلا میں عاشور کو حضرت قاسم کا عقد لکھا ہے نہ کاشفی نے حضرت سکینہ سے ان کا عقد لکھا ہے۔ اور نہ کسی دوسرے مورخ نے۔

کاشفی نے جب امام کی دو ہی صاحبزادیاں بتائی ہیں ایک کی شادی حسن بن حسنؑ سے ہو گئی تھی دوسری صاحبزادی حضرت سکینہ تھیں اُن سے حضرت قاسم کا عقد نہیں ہوا تو پھر کس سے ہوا۔ کاشفی نے امام کی کسی تیسری صاحبزادی کا ذکر ہی نہیں کیا۔ کاشفی سے یہ مسامحہ بھی ہو گیا ہے کہ فاطمہ کو جناب شہر بانو کے بطن سے لکھدیا ہے حالانکہ فاطمہ تو امّ اسحاق بنت طلحہ بن عبد اللہ تمی کے بطن سے تھیں ـــــ اور یہ اس وقت امام حسنؑ کے عقد میں تھیں۔ امام حسنؑ نے اپنی شہادت کے وقت امام حسینؑ سے وصیت فرمائی کہ میرے مرنے کے بعد امّ اسحاق سے عقد کر لینا۔ امام حسنؑ نے بھائی کی وصیت کے مطابق ان سے عقد کر لیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ فاطمہ دختر امام حسینؑ کی امام حسنؑ کے زمانہ میں ولادت بھی نہیں ہوئی تھی اُن کی ماں اس وقت خود امام حسنؑ کے عقد میں تھیں۔ لہذا امام حسنؑ وفات کے وقت فاطمہ کو حضرت قاسم سے نامزد نہیں کر سکتے تھے۔

کاشفی کے اس سلسلہ کے تمام بیانات کو سامنے رکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان سے کئی مسامحے ہو گئے ہیں اور اس واقعہ کو درج کرنے میں ان سے تساہلی ہوئی ہے۔ انھوں نے تحقیق و تفحص سے کام نہیں لیا۔ کہیں کچھ لکھدیا کہیں کچھ۔ جس سے ایک ہی واقعہ کے مختلف حصوں میں بے ربطی پیدا ہو گئی ہے مشہور و معروف متقدمین و متاخرین کی تصانیف میں اس قصۂ عقد کا ذکر نہیں ملتا۔ کافی، کلینی۔ مقتل ابو مخنف۔ مروج الذہب مسعودی۔ تاریخ طبری۔ تاریخ ابن اثیر۔ امالی صدوق۔ ارشاد شیخ مفید۔ لہوف سید ابن طاؤس مثیر الاحزان ابن نما۔ بحار الانوار مجلسی۔ مقتل عوالم۔ حبیب اسیر۔ روضۃ الصفا۔ ناسخ التواریخ وغیرہ میں قصۂ عقد کا ذکر نہیں ہے۔ بلکہ بعض علماء و فضلا نے اس کی نفی کی ہے۔

(۱) علامہ مجلسی نے جلاء العیون میں لکھا ہے۔ یہ روایت معتبر مصادر میں میری نظر سے نہیں گذری۔

(۲) علامہ نوری نے اس واقعہ پر سخت تنقید کی ہے۔ لکھا ہے۔ قصۂ عروسی قاسم روضۃ الشہداء کے پہلے کسی کتاب میں نہیں دیکھی گئی۔ عہد شیخ مفید سے اس وقت تک ہر طبقہ کی کتابیں موجود ہیں۔ کبھی ان کتابوں میں اس کا ذکر نہیں آیا۔ (لؤلؤ و مرجان)

(۳) مرزا محمد حسن اعتماد السلطنت محشی ماثر و آثار نے لکھا۔ اس قصۂ دراز کی کوئی اصل نہیں ہے۔ مورخوں و محدثوں میں سے کسی نے اسے نہیں لکھا

(۴) سپہر کاشانی نے ناسخ التواریخ میں اس پر سخت تنقید کی ہے۔

نقاد کہتے ہیں کاشفی نے کسی مجہول مصدر کا بھی پتہ نہیں دیا ـــــ البتہ ملا حسین یزدی نے انوار الشہادۃ مولفہ ۱۲۸۵ھ میں مقتل ابن عربی اور حزن الایمان کا حوالہ دیا ہے۔ اس پر یہ کہا گیا کہ علماء اہلسنت میں ابن عربی دو شخص ہیں (۱) ابن عربی مالکی م ۵۴۳ھ (۲) محی الدین ابن عربی طائی م ۶۳۸ھ ملا یزدی نے یہ نہیں بتایا کہ مقتل ان دونوں میں سے کس کا ہے فہرست مطبوعات و مخطوطات اور تراجم ابن عربی میں کہیں اس مقتل کا نام نہیں آیا۔ ساتویں صدی سے آج تک سوا ملا یزدی کے کسی نے کبھی ان کا نام بھی نہیں لیا۔ علماء رجال ابن عربی طائی اس کی توثیق نہیں کرتے۔ محی الدین ابن عربی کی کل تصانیف عربی میں ہیں۔ فارسی میں ان کی کوئی تصنیف نہیں ہے یزدی نے اس کی بھی صراحت نہیں کی کہ مقتل ابن عربی کی زبان کیا تھی۔ جب یہ مقتل ناپید ہے تو اس کے اعتبار یا عدم اعتبار کے بارے میں کیا رائے دی جا سکتی ہے۔ وہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس طرح ہر پھر کے روضۃ الشہدا ہی قصۂ عقد کا ماخذ رہ جاتی ہے۔ حزن الایمان ایک مجہول کتاب ہے۔ نہ تو یہ کتاب ملتی ہے اور نہ اس کے مصنف و کتاب کے اعتبار کے بارے میں علماء کی کوئی نص نہیں ہے۔

بہت عرصہ ہوا عقد قاسم پر لکھنؤ کے دو خاندانوں میں نظم و نثر میں سخت معرکہ آرائی ہوئی تھی۔ علماء و عوام اس نزاع میں تقسیم ہو گئے تھے۔ دونوں فریق کی طرف موافقت و مخالفت میں بہت سی کتابیں نکلی تھیں جن میں سے بعض کے نام یہ ہیں:۔

دق الخیشوم لنافی الملوم ۔ حجج قاطعہ مولوی ابوالحسن شاہ ۔ طلب الثار منفک منہج العلماء الاخیار ۔ مولوی محمد سجاد ۔ سفک المہج ۔ تقریر حاسم ۔ گوہر شہوار رسالہ قاسمیہ ۔ القول الجازم فی قطع التقریر الحاسم ۔ حکیم ممتاز حسین عثمانی ۔ مہندی قاسم ۔ حکیم ابوابراہیم نعیم آبادی وغیرہ ـــــ سب سے آخری کتاب ہمارے حبیب قدیم مولانا آغا مہدی صاحب کی کتاب غبار الانوار ہے جو دو جلدوں میں موصوف نے اثبات عقد میں بیس تیس سال کی محنت شاقہ سے اسے تالیف کیا ہے۔

(۵) کاشفی نے کربلا میں پسر عم عمر بن سعد ہاشم بن ابی وقاص مرقال صحابی کی جنگ فوج یزید کے ایک سردار سمعان بن مقاتل ابرحلب سے لکھی ہے (روضہ ص ۲۸۲) حالانکہ ہاشم بن عتبہ مرقال جنگ صفین میں شہید ہو چکے تھے۔ (اسد الغابہ ص ۴۹)

(۶) کاشفی نے لکھا ہے۔ نورالائمہ نے جار اللہ علامہ سے نقل کیا ہے۔ کہ جب امام حسینؑ تنہا رہ گئے تو ایک غبار اٹھا اور ایک مہیب شخص گھوڑے پر سوار آیا اور امام حسینؑ کو سلام کیا اور اپنا نام زعفر زاہد بتایا۔ کہا آپ کے باپ کے ہاتھ پر چاہ بیر العلم کے واقعہ کے موقع پر ہم لوگ اسلام لائے تھے مجھے حکم دیجئے کہ اپنی فوج سے ان دشمنوں کو تباہ کر دوں۔ امام نے فرمایا تم قوم جن سے ہو تمہاری لڑائی بنی آدم سے ظلم ہو گی تم واپس جاؤ۔ مجبوراً زعفر جن واپس چلے گئے۔

(روضہ ص ۳۲۲)

علامہ نوری لو لو و مرجان میں تحریر فرماتے ہیں اس قصہ کی کوئی اصل نہیں ہے۔ (لولو و مرجان ص ۱۴۵)

(۷) کاشفی نے لکھا ہے جناب شہر بانو نے کربلا میں امام حسینؑ سے کہا۔ مجھے اندیشہ ہے دشمن آپ کے بعد میری توہین کریں گے۔ امام نے فرمایا۔ میرے بعد ایک گھوڑا آئے گا اس پر سوار ہو کر چلی جانا محفوظ ہو جاؤگی۔ اصح یہ ہے کہ شہر بانو قید ہو کر شام گئیں (ص۳۲۳ روضہ)

کاشفی کا یہ بیان کسی تاریخ سے ثابت نہیں ہے حضرت شہر بانو کی وفات امام زین العابدینؑ کی ولادت کے موقع ہی پر ہو گئی تھی۔ وہ واقعہ کربلا سے بہت پہلے وفات پا چکی تھیں۔

(۸) کاشفی نے لکھا ہے۔ دشمنوں نے نساء وجواری امام حسینؑ کو محمل میں سوار کرنے گئے۔ بعض کتابوں میں جو یہ لکھا ہے کہ انھیں سر و پا برہنہ بے کجاوہ اونٹوں پر بٹھا کر لے گئے یہ قول ضعیف ہے۔ یہ صحیح نہیں ہے (روضہ ۳۴۴ باب دہم)

(۹) کاشفی نے لکھا ہے کہ جناب شہر بانو اپنے عقد کے موقع پر اپنے ساتھ ساٹھ کنیزیں لائی تھیں سب کو آزاد کر دیا۔ اُن میں شیریں بھی تھی اسے بھی آزاد کر دیا۔ وہ انھیں کے ساتھ رہتی تھیں۔ کربلا میں موجود تھیں۔ اسیر ہو کر شام جاتے ہوئے حوالی حلب کے ایک پہاڑ پر قافلہ رکا۔ وہاں عزیز بن ہارون رہتا تھا۔ اس سے وہ ملیں۔ وہاں کے سب باشندے اس وقت ہو گئے۔ شیریں سے عزیز بن ہارون کا عقد ہو گیا۔ (تلخیص۔ روضہ ص۳۵)

اس قصہ کی کوئی قابل توجہ اصل نہیں ہے۔

(۱۰) کاشفی نے کنز الغرائب کے حوالے سے لکھا ہے ایک یہودی کی ایک حسین لڑکی بیماری سے آنکھوں اور ہاتھ پاؤں سے بیکار ہو گئی۔ خون حسینؑ سے ایک پرندہ اپنے پر آلود کر کے ادھر آگیا تھا۔ وہ خون اس لڑکی کی آنکھوں اور ہاتھ پیر پر پڑا وہ بالکل تندرست ہو گئی اس معجزہ سے یہودی کا سارا خاندان مسلمان ہو گیا۔ (روضہ ص۳۴۱)

علامہ مجلسی نے جلاء العیون میں تحریر فرمایا ہے۔ روایت غراب غریب است۔

بعض اہم مصادر بحث

روضۃ الشہدا کے مختلف اڈیشن

ریاض السیاحہ زین العابدین شیروانی۔ تاریخ نامہ ہرات، سیف الدین ہروی۔ ریاض العلماء، عبداللہ آفندی۔ سبک شناسی، ملک الشعراء بہار۔ الذریعہ، آغا بزرگ (رام ظلہ)۔ احتجاج طبرسی، لہوف ابن طاؤس۔ التجدید فی الادب، حنا فاخوری۔ حیٰوۃ الحیوان دمیری۔ تاریخ الخلفا، سیوطی۔ شرح المنار، ابن نما۔ کامل الزیارت، ابن قولویہ۔ عیون اخبار، رضا ابن بابویہ۔ معجم البلدان، حموی۔ تذکرہ سبط، ابن جوزی۔ ینابیع المودہ، قندوزی۔ اسلام مشرق میں، وحید احمد۔ فوائد رضویہ، عباس قمی۔ اصابہ، ابن حجر۔ لؤلؤ مرجان، نوری۔ کربل کتھا۔

قصبہ مبارک پور ضلع اعظم گڈھ کی تاریخ عزاداری

(ابوالحسن ترابی متولی منتظم روضہ پنجہ شریف (پنجہ شاہ) مبارک پور ضلع اعظم گڈھ)

وجود آبادی اور وجہ تسمیہ

پندرہویں صدی عیسوی میں ایک بزرگ درویش صفت مسمٰی بہ راجہ مبارک علی شاہ قصبہ مانک پور کڑا ضلع الہ آباد سے مع اپنے مریدوں کے جنگلوں کی خاک چھانتے اور صحرا نوردی کرتے ہوئے مشرقی اتر پردیش ضلع اعظم گڈھ کے صدر مقام شہر اعظم گڈھ سے تقریباً دس کلومیٹر شمال و مشرق اور دریائے ٹونس سے تقریباً دو کلومیٹر مشرق و جنوب ایک نیم جنگلی مقام پر پہونچے اور اس جگہ کو پسند فرماکر اپنا مستقر بنایا۔ موصوف کے ہمراہ ہندو مسلم ہر قوم و برادری کی اچھی خاصی تعداد تھی اور پھر آپ کو دیکھ کر قرب وجوار کے لوگ بھی آکر وہاں آباد ہونے لگے اس لئے تھوڑے ہی دنوں میں اس مقام نے ایک گاؤں کی شکل اختیار کر لی اور بزرگ موصوف کی نسبت سے "مبارک پور" کے نام سے موسوم ہوا۔ بزرگ موصوف نے یہاں ایک مسجد تعمیر کرائی جو "مسجد راجہ مبارک شاہ" کے نام سے اب تک مشہور اور موجود ہے۔

روضہ قدم رسولؐ

بزرگ موصوف اور ان کے معتقدین کو عزائے امام سے خاص شغف تھا۔ چنانچہ فروغ عزاداری کے پیش نظر عزاداران امام مظلوم نے بہ مراعات شاہ اودھ ایک روضہ تعمیر کرا کے اس میں ایک پتھر (جس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پائے اقدس کا نقش بنایا جاتا ہے) نصب کرایا جو قصبہ کے وسط اور بازار میں زیارت گاہ خاص وعام ہے۔

روضہ پنجہ شاہ

کچھ عرصہ بعد جب آبادی نے ترقی کی تو عزاداری نے بھی فروغ پایا اسی زمانے میں ایک پنجابی بزرگ مسمی بہ چراغ علی شاہ تشریف لائے اور آپ نے عزاداری کے تقاضائے وسعت کے سبب ایک روضہ تعمیر کرایا اور اس میں ایک پتھر (جو موصوف اپنے ساتھ لائے تھے جس پر نقش پنجہ بنا ہوا ہے) نصب کرایا یہ روضہ قصبہ کے جانب مغرب تھوڑے فاصلے پر ۵ - ۶ بیگھہ پُر فضا زمین پر زیارت گاہ خلق اور روضہ پنجہ شاہ کے نام سے مشہور ہے۔ روضہ سے متصل ایک وسیع مسجد ہے اور احاطہ میں قبور مومنین ومسلمین ہے۔

امام باڑہ (مکان)

تقریباً دو سو برس قبل پنجاب سے دو بزرگوار سیف علی شاہ اور رمضان علی شاہ صاحبان تشریف لائے اور قصبہ کے شمال و مشرق میں قدرے فاصلہ پر ایک ایک امام باڑہ تعمیر کرایا جو مکان کے نام سے مشہور ہوا۔ لیکن افسوس کہ سیف علی شاہ کا امامباڑہ متولیان کی بے توجہی کا شکار ہو کر عرصہ ہوا کہ منہدم ہو گیا اب سوائے کھنڈرات کے کچھ باقی نہ رہا۔ مگر رمضان علی شاہ کا امام باڑہ اب بھی موجود ہے جس پر سنہ تعمیر ۱۲۰۹ھ کندہ ہے اور دیوار پر آیات قرآنیہ و احادیث نبویہ منقش ہیں نیز ایک گوشہ میں ایک پتھر (جس پر نقش پنجہ شیر خدا بنایا جاتا ہے) نصب ہے جس پر سنہ تعمیر ۱۲۱۶ھ کندہ ہے۔ اور حسب ذیل قطعات منقش ہیں:۔

(۱)

یا علی کیست کہ شرمندہ احسان تو نیست
بر سر خوان کرم نیست کہ مہمان تو نیست
چہ دبیر است یا شفیع روز محشر
ہمیں پنجہ ہمین است حوض کوثر

(۲)

مقصد کون و مکاں ..... اینجاست
منبع جود و کرم عین عنایت اینجاست
مطلب ہر دو جہاں حاجت دل خواہ از او
پنجہ شیر خدا شاہ ولایت اینجاست

اسی تاریخی عمارت راجہ سورج پور سے جنگ ہوئی تھی جس میں راجہ نے شکست کھائی اور بہت سے محبان وطن نے جام شہادت نوش کیا جس کی یادگار ایک قبر گنج شہیدان ہے۔ اسی امام باڑہ سے ملحق ضلع اعظم گڈھ کے شیعوں کا واحد مدرسہ باب العلم واقع ہے جو جامعہ کی منزل کے قریب ہے۔

روضہ کٹرہ

قصبہ کے مشرقی محلہ کٹرہ میں ایک قدیم روضہ موجود ہے۔ مگر اس کے بانی و سنہ تعمیر کا پتہ نہیں چلتا عمارت قدیم اور شاہی ہے۔

تسبیح خاک شفا

یہاں تبرکات میں ایک تسبیح خاک شفا ہے سُنیوں کے امام باڑوں میں ایک امام باڑہ محلہ پورہ رانی میں واقع ہے امام باڑہ مذکور میں ایک تسبیح ہے شب عاشور سے اس کا رنگ بدلنا شروع ہوتا ہے اور روز عاشور بالکل سرخ ہو جاتا ہے ہر دانے پر خون کے قطرے معلوم ہوتے ہیں۔ راقم الحروف بھی کئی بار اس کی زیارت سے مشرف ہو چکا ہے۔

فروغ عزاداری

قصبہ مبارک پور میں ابتدائے آبادی سے ہی عزاداری ہوتی چلی آتی ہے اور ہند و مسلم، شیعہ سنی برابر حصہ لیتے چلے آئے ہیں خصوصاً اہل اودھ کا زمانہ عروج عزاداری کا زمانہ تھا اس زمانہ میں عزاداری نے کافی ترقی کی اور عزاداروں کو کافی مراعات حکومت سے ملتی رہیں ایک سربرآوردہ شخص حکومت سے امداد لے کر چوک و امام باڑہ تعمیر کرتا تھا جس میں کچھ لوگ مل کر عزاداری کرتے تھے شخص مذکور ان امام باڑوں کا متولی یا سردار کہلاتا تھا اسی طرح ایک ایک محلہ اور گاؤں میں متعدد چوک اور امام باڑے ہو گئے لیکن حکومت برطانیہ کی پالیسی نے جس طرح دیگر چیزوں کو

نقصان پہونچایا اسی طرح عزاداری کو بھی کافی نقصان پہونچایا، چنانچہ ہندو دستی حضرات رفتہ رفتہ کنارہ کش ہوتے گئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے چوک وامامباڑے متولیوں کی بے توجہی کا شکار ہو کر منہدم ہو گئے نیز کچھ لوگوں نے چوک منہدم کرا کے امامباڑوں کو اپنی ملک بنالیا پھر بھی ابھی بہت سے ایسے چوک اور امام باڑے موجود ہیں جن میں سنی حضرات اب بھی عزاداری کرتے ہیں۔ دیہاتوں کی بھی یہی حالت ہے زمانہ قدیم سے بارہ ۱۲ دیہات کے غیر شیعہ تعزیئے ایام محرم میں گشت کے لئے قصبہ میں آتے تھے جن کو یہاں " بارہ ۱۲ گھیاں " کے تعزیئے کہا جاتا ہے مگر اب اس میں کافی کمی آچکی ہے پہلے ایک دیہات سے متعدد تعزیئے آتے تھے مگر اب شاید کچھ دیہاتوں سے آتے ہی نہیں اسی طرح اب غیر مسلم بھی بہت کم حصہ لیتے ہیں شیعوں اور سنیوں کے امامباڑے قصبہ میں سیکڑوں کی تعداد میں ہیں شیعہ امامباڑوں میں ایام محرم میں بارہ ۱۲ دنوں تک روزانہ شب و روز مجلسیں برپا ہوتی ہیں اور سنیوں کے امامباڑوں میں بھی ۳، ۴ دنوں تک مجلسیں ہوتی ہیں۔

جلوس عزا

۷ محرم کو بھی امام باڑوں سے جلوس علم نکل کر روضہ پنجہ شاہ میں جاتے ہیں ۹ محرم کو دن میں تعزیئے چوک پر رکھے جاتے ہیں اور شام تک نذر و نیاز کے سلسلے جاری رہتے ہیں جس میں کچھ غیر مسلم حضرات بھی حصہ لیتے ہیں شام کو تمام تعزیئے اٹھ کر گشت کے لئے جاتے ہیں جو قصبہ کی شاہراہوں سے گذرتے ہوئے روضہ قدم رسولؐ واقع گولا بازار ہوتے ہوئے محلہ شاہ محمد پور پہونچ کر بڑے امامباڑہ تک گشت ختم ہو جاتے ہیں۔ پوری رات گشت ہی میں ختم ہو جاتی ہے ۱۰ محرم بعد فراغت اعمال عاشورہ ہر امام باڑہ سے تعزیئے نکل کر گشت کے لئے جاتے ہیں جو اپنے قدیم راستوں سے ہوتے ہوئے قریب شام روضہ پنجہ شاہ میں پہونچتے ہیں اور سہرے دفن ہونے کے بعد اپنے اپنے امام باڑوں میں واپس ہوتے ہیں اور بعد نماز مغرب متعدد امام باڑوں میں شام غریباں کی مجلسیں برپا ہوتی ہیں۔ نیز ۱۱ محرم کو بعد نماز مغرب امام باڑہ برتلے واقع محلہ پورہ باغ میں آگ پر ماتم ہوتا ہے۔ ۲۰ صفر کو تمام امامباڑوں میں مجلسیں برپا ہوتی ہیں۔ ۲۱ صفر کی شام کو تمام امامباڑوں سے جلوس علم اور انجمن انصار حسینی کا شبیہ تابوت برآمد ہو کر گشت کیلئے روانہ ہوتا ہے جو قصبہ کی شاہراہوں سے ہوتا ہوا روضہ قدم رسولؐ واقع گولا بازار پہونچتا ہے وہاں کچھ دیر ٹھہر کر پھر روانہ ہوتا ہے اور ۱۱-۱۲ بجے رات کو روضہ پنجہ شاہ پہونچتا ہے اور وہاں سہرے دفن کئے جاتے ہیں۔ ان جلوسوں میں مقامی انجمنیں نوحہ خوانی و سینہ زنی کرتی ہیں۔

لڑکوں کا محرم

ماہ صفر شروع ہونے پر کمسن لڑکے تمام امامباڑوں میں عشرہ کرتے ہیں اور ۷، ۹، ۱۰ صفر کو مثل ایام محرم ہر امامباڑہ سے چھوٹے چھوٹے علم و تعزیئے اٹھا کر امامباڑہ رمضان علی شاہ (مکان) میں لیجاتے ہیں جس میں کافی مجمع ہوتا ہے اور متعدد انجمنیں نوحہ خوانی اور سینہ زنی کرتی ہیں۔ جس کو یہاں لڑکوں کا محرم کہا جاتا ہے۔

جلوس ۲۸ صفر

امام باڑہ حجرہ محلہ شاہ محمد پور سے بوقت سہ پہر بعد ختم مجلس عزا شبیہ تابوت برآمد ہو کر گشت کیلئے جاتا ہے اور صدر راستہ سے ہوتا ہوا امام باڑہ رمضان علی شاہ میں پہونچکر ختم ہوتا ہے اور سہرے دفن کئے جاتے ہیں۔

جلوس ۸ ربیع الاول

۸ ربیع الاول کو بعد نماز صبح امان اللہ صاحب پہلوان محلہ شاہ محمد پور کے دولتکدہ پر مجلس عزا برپا ہوتی ہے بعدہٗ شبیہ تابوت و علم برآمد ہو کر محلہ پورہ باغ و شاہ محمد پور کے تمام امامباڑوں میں جاتا ہے جہاں مختلف ذاکرین اختصار کے ساتھ مصائب سید الشہداء اور اسیران کربلا بیان کرتے ہیں اور راستوں میں مختلف مقامی انجمنیں نوحہ خوانی و سینہ زنی کرتی ہیں دوپہر کے وقت جلوس امام باڑہ رمضان علی شاہ میں پہونچ کر ختم ہوتا ہے۔

جلوس ۲۱ رمضان

امامباڑہ حجرہ محلہ شاہ محمد پور میں سہ پہر کو مجلس عزا برپا ہوتی ہے بعدہٗ شبیہ تابوت امیر المومنینؑ برآمد ہو کر اپنے سابقہ راستوں سے ہوتا ہوا امام باڑہ رمضان علی شاہ میں پہونچ کر اختتام پذیر ہوتا ہے۔

موضع امیا دیوریہ متّصل قصبہ اترولہ

ضلع گونڈہ کا عشرہ محرّم

ڈاکٹر سیّد فیاض حسین ہاشمی (علیگ) تین پوری

عزاداری کی ابتداء

جد بزرگوار جن کا اسم گرامی سید پیر بھیلے تھا میران پور تحصیل جانسٹھ ضلع مظفرنگر سے تقریباً ۲½ سو پہلے آکر اس موضع میں آباد ہوئے تھے۔ سادات بارہہ میں سے تھے اور جو بھی کاغذات ہم لوگوں تک پہونچے ہیں اُن میں ہمیں "نقیب المومنین" کا لفظ ان بزرگوں کے نام کے آگے ملتا ہے۔ اس کے بارے میں بزرگوں کا کہنا ہے کہ یہ خطاب نوابین کی طرف سے ملا تھا۔ عزاداری ہی کے سلسلہ میں کئی مواضعات نوابین کی طرف سے ملے تھے جن کے کاغذات اب تک موجود ہیں۔ ایک قدیمی امام باڑہ اُس زمانہ کی یادگار اب بھی قائم ہے عزاداری سید الشہداء کی بنا سب سے پہلے انہی بزرگ نے کی۔ ان سے کئی اولادیں ہوئیں جنھوں نے اس نیک کام میں ان کا ہاتھ بٹایا۔ پابندی کے ساتھ تعزیہ رکھتے تھے اور مجالس کرتے تھے اُس زمانہ میں کسی جلوس کی اطلاع ہم لوگوں کو نہیں ملتی ہے۔ صرف ۱۰ محرم کو جلوس کی شکل میں تعزیہ کربلا میں لیجا کر دفن کر دیا کرتے تھے۔

اہم تغیرات

ان چالیس برسوں میں جو تغیرات اور تبدیلیاں عزاداری سید الشہداؑ میں واقع ہوئیں بس مولا ہی کی برکتوں کا نتیجہ ہے۔ اس موضع کی عزاداری کو فروغ دینے میں جو کارنمایاں جناب سید مہر علی صاحب کربلائی، جناب ڈاکٹر سید کرامت علی صاحب کربلائی، جناب ڈاکٹر سید محمد اسرائیل صاحب نے انجام دیئے ہیں قابل ستائش ہیں۔ اب تو ماشاءاللہ یہ موضع روزافزوں ترقی پر گامزن ہے اور امی عزاداری کے صدقہ میں ایک سے ایک بڑھ کر شخصیت کے بر چم کا ضامن ہے۔ یہ بھی امر فراموش نہیں کیا جاسکتا کہ اس موضع کے لئے قبلہ و کعبہ مولانا سید علی صاحب مقیم اترولہ کی ذات گرامی شمع ہدایت ہے۔ قابل افتخار رہے کہ ایک عالم کی سرپرستی اس موضع کو حاصل ہے۔

مخصوص تاریخیں اور اہم اجتماعات

۵ محرم الحرام شب میں جلوس تابوت حضرت قاسمؑ جناب طاہر حسین صاحب کے امام باڑہ

سے اٹھتا ہے۔ نوحہ خوانی نیز ماتمی دستوں کا خاصا انتظام رہتا ہے۔

۶ محرم الحرام - ضریح مبارک کا جلوس

مومنین بعد مغرب قصبہ اترولہ جا کر وہاں سے ضریح مبارک جلوس کی شکل میں لاتے ہیں۔ یہ جلوس پورے قصبہ اترولہ کی سڑکوں سے گزرتا ہوا موضع میں پہونچتا ہے۔ ضریح مبارک ڈاکٹر سید کرامت علی صاحب کے امام باڑے میں رکھ دی جاتی ہے۔ ضریح مبارک کی زیارت کے لئے بے پناہ ہجوم سڑکوں پر منتظر رہتا ہے۔

۶ - جلوس مہندی

۱۲-۱ بجے شب میں جناب سید مہر علی صاحب کربلائی کے امام باڑے سے اٹھتا ہے یہ جلوس موضع کا قدیم ترین جلوس ہے اس کی زیارت کے لئے دور دراز سے عوام آتے ہیں جن میں اہل ہنود حضرات و اہل سنت حضرات بھی کثیر تعداد میں شریک ہوا کرتے ہیں۔ انجمن حسینی ایپا کی طرف سے نوحہ خوانی، ماتمی دستوں نیز زنجیری ماتم کا نہایت ہی عمدہ انتظام ہوتا ہے۔ موضع کا انتہائی اہم اور مشہور ترین جلوس ہے۔ اس شب کی نوحہ خوانی خصوصاً جناب علی حسن صاحب ہاشمی وکیل کی پُر درد آواز اور مخصوص نوحہ پڑھنے کا لہجہ دلوں کو برما دیتا ہے۔ جیسے ہی موصوف نوحہ شروع کرتے ہیں سوگواروں میں کہرام مچ جاتا ہے۔

۷ محرم الحرام! "آگ پر ماتم"

اس کی ابتدا ۱۹۵۵ء میں ڈاکٹر سید شرافت علی صاحب کی کوششوں سے ہوئی۔ یہ ماتم شب میں ڈاکٹر سید کرامت علی صاحب کربلائی کے امام باڑے کے صحن میں ہوا کرتا ہے۔ نزدیک و دور سے جوق در جوق عوام اس مخصوص ماتم کو دیکھنے آتے ہیں۔ یہ بھی موضع کا اہم ترین اجتماع ہے جس سے عزاداری سید الشہداءؑ کی نشر و اشاعت ہوتی ہے اور جو حقیقی معنوں میں دلوں کو متاثر کرتی ہے اور کیوں نہ ہو جب کہ یہ جیتا جاگتا حسینی معجزہ ہے۔

۸ محرم الحرام - جلوس علم حضرت عباسؑ

یہ جلوس ۴ بجے دن میں جناب سید قاسم علی صاحب کے یہاں سے اٹھتا ہے جو کہ ماتمی دستوں کے ساتھ پورے موضع میں گشت کرتا ہوا جناب سید احمد رضا صاحب کے یہاں پہونچتا ہے جہاں پر ایک قدیم تاریخی مجلس منعقد ہوا کرتی ہے اس مجلس میں مخلوط مجمع ہوا کرتا ہے۔ قبلہ و کعبہ مولانا سید علی صاحب رونق افروز منبر ہوا کرتے ہیں۔

۹ محرم الحرام - مجلس شبیہ

۱۰ بجے دن میں ڈاکٹر سید کرامت علی صاحب کے امام باڑے میں منعقد ہوتی ہے جس میں قرب و جوار کے مومنین کا کثیر اجتماع رہتا ہے۔ اس مجلس میں مخصوص طور پر مصائب سید الشہداء بیان کئے جاتے ہیں اور امام عالی مقام کے اسپ وفادار کی شبیہ نکالی جاتی ہے۔ یہ موضع کی کامیاب ترین مجلس ہے جس کا انتظار سال بھر سے مومنین کیا کرتے ہیں تاکہ وہ اپنے مظلوم آقا کو خراج عقیدت پیش کر سکیں اور دل کھول کر آنسو بہا سکیں۔

فاطمی علم کا جلوس

اسی نہم محرم کی شب میں ۱۲ بجے جناب سید مہر علی صاحب کربلائی کے امام باڑے سے اٹھتا ہے۔ اس جلوس میں روشنی کا قطعی انتظام نہیں ہوا کرتا۔ یہ جلوس رات کی تاریکی میں پورے موضع میں گشت کرتا ہے۔ نہم محرم الحرام کی شب بیداری کی تکمیل اس جلوس سے ہوتی ہے۔ یہ جلوس تقریباً ۴ بجے ڈاکٹر سید محمد اسرائیل صاحب کے یہاں پہونچتا ہے جہاں پر ایک قدیمی مجلس ہوتی ہے۔ اس جلوس کا مخصوص نوحہ "صدا میں آتی تھیں ان شہیدوں سے حسین حسین" جو کہ جناب مقبول حسین صاحب اپنے مخصوص انداز میں پڑھا کرتے ہیں کافی پُر اثر ہے [illegible] یہ جلوس دیکھنے سننے اور [illegible] ایک عجیب منظر پیش کرتا ہے۔

دہم محرم الحرام - ۵ بجے [illegible] علم تابوت و ذوالجناح [illegible] جلوس کی شکل میں کربلا پہونچتا ہے۔ انجمن حسینی ایپا کی طرف سے زنجیری ماتم [illegible] کا بہت ہی اچھا انتظام رہتا ہے ضریح مبارک دفن کر دی جاتی ہے اور مومنین

قصبہ اورنگ آباد سریّا کا محرّم

(الحاج جناب سیّد محمّد رضا صاحب)

یہ قصبہ جس کا نام اورنگ آباد عرف سریّا ہے ضلع شاہ آباد (آرہ) بہار میں ریلوے اسٹیشن ڈیہری آن سون (
) سے ۱۱ میل دکھن اور تاریخی قلعہ رہتاس سے ۱۴ میل جانب شمال دریائے سون اور کیمور کی پہاڑیوں کے درمیان واقع ہے۔ یہاں متعدد مسجدیں ہیں اور جامع مسجد جو اورنگ زیب کے زمانہ میں بنی تھی اسلام کی عظمت شیعیت کی مظہر ہے۔

پہلے اس قصبہ اور گرد و نواح کی جائدادیں زیادہ تر شیعیان ریچھ آبادی کی ملکیت تھیں، بہت سے شیعہ تجارت پیشہ بھی تھے۔ اب زیادہ تر نوکری پر گذر بسر ہے۔ مگر اب وہ بات نہیں رہی ہے بہت سے لوگ پاکستان چلے گئے ہیں۔

اس بستی میں دو کربلائیں ہیں ایک پرانی کربلا اور اسی کے دراق کے نزدیک چھوٹے حضرتؑ کا روضہ ہے اور باہر ایک بڑی مسجد ہے دوسری کربلائی کربلا کے نام سے مشہور ہے۔ یہ دونوں کربلائیں آبادی سے جنوب میں دریائے سون کے کنارے جنگل کے نزدیک چھوٹے قریہ کے پاس واقع ہیں۔ اس کے علاوہ تین عزاخانے سلطان باڑہ، امام باڑہ اور عزا خانہ تکیہ ہیں۔ روضہ کے نگران و ناظم متعلق محلہ کے حضرات ہیں۔ اس کے علاوہ زنانہ ماتم خانہ ہے جس میں روضۂ فاطمین بھی ہے ایک خاص نوعیت رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک مخصوص عزاخانہ میر خوب علی صاحب جناب قراء کا اور دو وقفی عزاخانہ میر غلام حسین تھا اور مسماۃ جاسو بی بی مرحومہ کے ہیں اسکے علاوہ متعدد امام چوک ہیں۔

بیس برس قبل قرب و جوار کے تعزیوں کے علاوہ صرف اس بستی میں قریباً پچاس ساٹھ تعزیئے بنتے تھے۔ جس میں شیعوں، سنیوں اور ہندوؤں کے تعزیئے بھی ہوتے تھے اس وقت بھی قریب قریب تیس چالیس تعزیئے رکھے جاتے ہیں۔ اب ہندوؤں نے ہندو مسلمان فسادات ہونے کے بعد تعزیہ داری چھوڑ دی تھی۔ گرچہ اس اطراف میں کوئی فساد نہ ہوا تھا۔ وہابی طبقہ نے بھی تعزیہ داری بند کرانے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگایا لیکن کامیاب نہ ہو سکے ۱۹۳۲ء میں سنی شیعوں کے درمیان عزاداری پر فساد بھی ہوا اور مقدمہ بھی چلا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اتحاد بین المسلمین کا خون ہوا اور تعزیوں کے دو جلوس ہو گئے۔ تعزیئے رانگا ابرق، مینا کاری اور کاغذ کے بنتے ہیں۔ ہر شخص تعزیہ خود بناتا ہے۔ تعزیہ ہشت پہل حضرت کے روضہ کی شبیہ ہوتا ہے اس کے اندر دو تربتیں ہوتی ہیں ایک سرخ دوسری سبز اور دستار و پھول و سہرا اس پر رکھا جاتا ہے۔ سامنے در کے چاندی کے پھول وغیرہ جات کے سہرے ہوتے ہیں۔ ہر تعزیہ کے ساتھ روضہ و علم بھی ہوتے ہیں۔ قریب قریب ہر تعزیہ کا امام چوک بھی ہے۔ عزاخانہ تکیہ اور وقفی امام باڑہ للاّن صاحب اور جاسو بی بی اور خوب علی صاحب مرحوم کے عزاخانہ میں پہلی محرم کو تعزیہ رکھا جاتا ہے اور یہ سب تعزیئے سوائے خوب علی صاحب مرحوم کے تعزیہ کے اربعین میں دفن ہوتے ہیں۔

تعزیہ داری چاند رات سے شروع ہوتی ہے اسی شب کو ایک جلوس کے ساتھ جس میں چودھری صاحب کے یہاں کے ذوالجناح نشان ہوتے ہیں کربلا جاتا ہے اور وہاں سے مٹی لائی جاتی ہے اور ان کے چوک پر جو جامع مسجد کے متصل ہے نذر ہوتی ہے یہ ان کے تعزیہ کی بنیاد ہے۔ دوسری سے چوتھی محرم تک اس عنوان سے روز جلوس کربلا جاتا ہے اور مٹی لاتا ہے اور پھر امام چوک پر نذر دی جاتی ہے۔ یہ نذریں مغرب کے بعد چوک پر نشان رکھ کر ہوتی ہیں اس طرح اس بات کو یاد دلایا جاتا ہے کہ محرم ۶۱ھ میں حضرت امام حسین کا ورود کیسے ہوا اور دشمن کی فوجیں کس طرح آتی رہیں۔

آٹھویں محرم کی شب کو چھوٹی چوکی یعنی چودھری صاحب کے چوک پر تربت رکھی جاتی ہے اس کو چھوٹی چوکی کہتے ہیں یعنی اسی ساتویں کو نہر فرات پر یزیدی فوج نے چوکی پہرہ بٹھا دیا تھا۔ شب نہم کو بڑی چوکی ہوتی ہے جس میں ہر تعزیہ دار اپنے اپنے چوک پر تربت رکھ کر نذر کرتا ہے۔ اسکا تاریخ میں نہر فرات پر یزیدی فوج نے اپنا پہرہ اور بھی سخت کر دیا تھا۔ ہماری یہ رسمیں اسی کی یاد تازہ کرتی ہیں۔ ساتویں اور آٹھویں محرم کو سُنیوں کے جلوسوں میں اکھاڑہ ہوتا ہے اور فنون سپہ گری کا مظاہرہ کیا جاتا ہے مگر ان میں بھی حسینؑ حسینؑ کا نعرہ برابر بلند ہوتا رہتا ہے شب عاشورہ کُل تعزیئے اپنے اپنے چوک پر رکھدیئے جاتے ہیں۔ سابق میں پبلک جس میں زیادہ تر ہندو ہوتے تھے ہر تعزیہ کو اپنی زبان میں نوحہ پڑھ کر پھل سے مس کرتے تھے۔ اب یہ چیز نہیں رہی ہے۔ قبل صبح صادق کُل تعزیئے جامع مسجد کے نزدیک چودھری صاحب کے تعزیہ کے پاس جمع ہوتے ہیں اس کو تعزیہ کا ملنا بولتے ہیں۔ تعزیوں کا ملنا اس بات کی یاد تازہ کرتا ہے کہ حضرت امام حسین علیہ السلام نے شب عاشورا اپنے اعزا و رفقا کو جمع کر کے ان کو کربلا سے چلے جانے کی کس طرح خواہش کی تھی اور پھر ان حضرات نے اپنے امام کو چھوڑ کر چلے جانے سے کس طرح پُرزور الفاظ میں انکار کیا تھا۔

آخر میں ایک خاص منظر پیش کیا جاتا ہے وہ یہ کہ اُن میں سے دو تعزیئے باجوں اور حربوں کے جھنکار میں بستی کے طرف ٹھہرے ہوئے نظر آتے ہیں اور ادھر سے دو تعزیئے جاکر ان سے بالکل ملحق ہو کر اپنے ساتھ لاتے ہیں اور پھر جامع مسجد سے اللہ اکبر کی صدا بلند ہوتی ہے کہ اس کا مظاہر ہے کہ کس طرح حضرت حُرؑ اپنے صاحبزادے کے ساتھ فوج یزیدی سے برآمد ہو کر حضرت امام حسین کی طرف آئے اور ادھر سے حضرت عباسؑ علمبردار اور حضرت علی اکبرؑ ان کے استقبال کو روانہ ہوئے اور اپنے ساتھ امام کی خدمت میں لائے۔ یہ وہ سماں ہوتا ہے کہ عالم رکھنے والے گریہ کو روک نہیں سکتے۔ اس کے بعد ہر تعزیہ اپنے اپنے چوک پر واپس جاتا ہے۔ سہ پہر کو پھر کل تعزیئے اسی مسجد کے نزدیک چودھری صاحب کے تعزیہ کے پاس جمع ہوتے ہیں اور جلوس کی شکل میں یہاں سے روانہ ہوتے ہیں۔ آگے آگے مرثیہ خوانی ہوتی ہے۔ قبل مغرب تک کربلا پر یہ جلوس پہنچتا ہے وہاں کُل تبرکات اور وہ مٹی جو کربلا سے بنیادی طور سے لائی گئی تھی بعد نذر کربلا کے اندر تربت میں دفن کر دی جاتی ہے۔

عزاداری کا سلسلہ چاند رات سے شروع ہوتا ہے محرم کا چاند نظر آنے کے ایک ہفتہ قبل ہی سے ہر عزا خانہ اور کربلا کی صفائی شروع ہو جاتی ہے اور سارے عزاداری انتظامات کر لئے جاتے ہیں۔ رات میں تین مجلسیں بالترتیب عزا خانہ سلطان باڑہ، امام باڑہ اور عزا خانہ تکیہ میں ہوتی ہیں بستی میں شیعوں کے تین محلے ہیں۔ ہر محلہ کا ایک عزا خانہ ہے جس کی دیکھ بھال مشترکہ طور سے اہل محلہ کرتے ہیں۔ کُل انتظامات مشترکہ ہوتے ہیں۔ صرف تبرک ہر مجلس کرنے والا کا الگ الگ ہوتا ہے۔

زنانہ مجلسیں زنانہ ماتم خانہ میں ہوتی ہیں۔ یہ مجلسیں تقریباً

۱۲ بجے شب میں ختم ہوتی ہیں۔ دن میں آٹھ بجے صبح سے قبل دوپہر تین مجلسیں عزاخانہ تکیہ میں پھر عزاخانہ محبوب علی صاحب میں، اس کے بعد وقفی عزاخانہ بناسو بی بی میں ہوتی ہیں۔ سہ پہر کو ایک مجلس وقفی عزاخانہ الطاف حسین میں اور دوسری پرانی کربلا میں ہوتی ہیں۔ ذاکرین لکھنؤ وغیرہ سے بھی آتے ہیں اور یہاں کے مومنین بھی ذکر کرتے ہیں۔ یہاں دو ماتمی انجمنیں ہیں اور دونوں اتحاد کے ساتھ مجلسوں میں نوحہ خوانی اور ماتم کرتے ہیں۔ الحمدللہ کہ اورنگ آباد کی ماتمی انجمنوں میں اتحاد ہے ورنہ ہماری قوم کی بدقسمتی ہے کہ ہر ماتمی انجمنوں میں رقابت ——— ہی پائی جاتی ہے۔ کاش دوسری شیعہ بستیاں اورنگ آباد کی مثال سے سبق لیں۔ یہاں شب کی مجلسوں میں متعدد حصے تقسیم ہوتے ہیں ہر تاریخ میں ایک کسی خاص آدمی کی طرف سے یا اس کے خاندان کی طرف سے مجلس ہوتی ہے تاہم دیگر متعدد حصے بھی تقسیم ہوتے ہیں۔ منشا یہ ہے کہ ان حصوں کے تقسیم کرانے والے بھی شریک مجلس ہوں۔

یہاں کا ساتویں محرم کا علم و ذوالجناح اور مہندی کا جلوس بہت مشہور ہے اور قریب ڈیڑھ سو میل کے اندر اپنی خصوصیات کے ساتھ یکتا اور واحد ہے۔ کوئی دو سو برس سے یہ سلسلہ جاری ہے۔ متفرق جگہ کے لوگ اس میں شرکت اور اس کے دل ہلانے والے منظر کو دیکھنے کے لئے آتے ہیں۔ اس میں ہر قوم کے لوگ ہوتے ہیں اور قریب تین چار ہزار کا مجمع ہوتا ہے۔ یہ جلوس شیعوں کی عقیدت کا منظر و آئینہ دار ہے۔ قریب تین بجے دن میں بیشتر مومنین غسل کرکے برہنہ پا و برہنہ سر کربلا جاتے ہیں اور وہاں حضرت عباس علمبردار کا علم و مشکیزہ وغیرہ نذر کرتے ہیں اور وہیں سے بھشتی کی شکل میں آتے ہیں اور جلوس کا انتظام کرتے ہیں۔ جلوس کا گشت قریب پانچ بجے سہ پہر میں شروع ہوتا ہے اور قریب ۱۱ بجے شب میں ختم ہوتا ہے علم اور ذوالجناح کو عزاخانہ تکیہ میں کلاہی کے حضرات سجاتے ہیں اور وہیں نوحہ و ماتم کرتے مومنین سر و پا برہنہ سبز و سیاہ لباس میں ملبوس جلوس کے ساتھ ہوتے ہیں۔ جلوس عزاخانہ الطاف میاں و بناسو بی بی سے ہوتے ہوئے عزاخانہ امام باڑہ میں پہونچتا ہے۔ اس درمیان میں سخت ماتم و نوحہ ہوتا ہے۔ یہاں سے روشنی کا بھی کافی انتظام ہوتا ہے۔ امام باڑہ سے ایک اور علم و ذوالجناح کا اضافہ ہوتا ہے ۱۹۳۲ء میں آپس کے اختلاف کے باعث اس محلہ کے حضرات نے یہ اضافہ کیا۔ یہاں سے جلوس بہت بڑا ہو جاتا ہے اور نوحہ و ماتم کرتا ہوا زنانہ ماتم خانہ میں جاتا ہے۔ وہاں مرد نہیں جاتے وہاں مہندی کا تبرک ساتھ کیا جاتا ہے۔ راہ میں زنجیری ماتم بھی ہوتا ہے۔ یہاں سے سلطان باڑہ پہونچتے ہوئے نئی کربلا اس کے بعد پرانی کربلا جلوس پہونچتا ہے ماتمی انجمنیں بڑے خلوص سے نوحہ پڑھتی اور ماتم کرتی ہیں۔ ۱۹۳۲ء میں یہاں سنی شیعہ بلوہ ہو گیا تھا اور مقدمہ بھی چلا تھا جس کا فیصلہ شیعوں کے حق میں ہوا تھا لیکن اتحاد بین المسلمین کی خاطر حق تبرا سے رضاکارانہ طور پر دستبردار ہو گئے۔

جلوس جب پرانی کربلا پہونچتا ہے تو اطراف کے بالخصوص کریا موضع کے برادران ملت مالیدہ وغیرہ ذوالجناح کے پاس نذر کرتے ہیں۔ کربلا کے صحن میں اور اندر خوب ماتم و نوحہ ہوتا ہے پانچ سال سے آگ پر بھی ماتم ہوتا ہے جلوس میں خالص شیعوں کا مجمع رہ جاتا ہے علم، دُلدُل تکیہ اور باڑہ میں واپس آتا ہے جہاں بعد نذر کے ٹھنڈا کیا جاتا ہے جلوس کے ساتھ انجمن کی طرف سے سبیل بھی ہوتی ہے۔

آٹھویں محرم کو حضرت علم مبارک کا جلوس عزاخانہ باڑہ سے قریب ۷ بجے شام کو روانہ ہوتا ہے اور ۱۲ بجے شب میں پرانی کربلا پہونچ کر ٹھنڈا ہوتا ہے۔ اس میں زیادہ مجمع نہیں ہوتا۔ مگر کل مومنین ننگے پاؤں اور ننگے سر

ہوتے ہیں اور ماتم کرتے اور نوحہ پڑھتے ہوئے جاتے ہیں آٹھویں کو بھی عام حاضری ہوتی ہے۔ صبح عاشور عزاخانہ تکیہ سے تبرکات کے ساتھ ایک جلوس چلتا ہے یہ جلوس عزاخانہ باڑہ اور سلطان باڑہ اور زنانہ ماتم خانہ کے تبرکات اپنے ساتھ لیتا ہوا نئی کربلا پر قریب ۸ بجے پہونچتا ہے اور وہاں ختم ہو جاتا ہے اور تبرکات دفن ہوتے ہیں اس کے بعد مومنین مختلف جگہوں پر اعمال روز عاشورہ میں مشغول ہو جاتے ہیں۔

چار بجے دن میں فاقہ شکنی ہوتی ہے اور اس کے بعد تعزیہ کا جلوس ہوتا ہے جس کی تفصیل اوپر ہو چکی ہے شام کو مجلس شام غریباں عزاخانہ تکیہ میں ہوتی ہے جس میں تاریکی میں سخت سینہ زنی اور نوحہ خوانی ہوتی ہے اس کے بعد ریڈیو پر لکھنؤ اور کراچی کی مجالس شام غریباں سنتے ہیں۔

شب میں قریب بارہ بجے تک سُنیوں کے متعدد اکھاڑوں کا شور و غوغا اور ہتھیاروں کی جھنکار کربلا کا ہولناک منظر پیش کرتا ہے اور حسین حسین کی صدائیں بلند ہوتی رہتی ہیں۔

اس نمونہ اور ڈھانچہ کی کربلا اس صوبہ میں نہیں ہے اس کا گنبد کربلا معلیٰ کے مناسبت سے بنایا گیا ہے اور رواق کا نقشہ بھی وہی ہے جو کربلائے معلیٰ میں رواق کا ہے۔ پرانا کربلا کے اندر پختہ صحن ہے ______________

مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ ان کربلاؤں کی بلا تفریق مذہب و ملت عوام زیارت کرتے ہیں۔ نذر دیتے ہیں اور روشنی کرتے اور منتیں مانتے ہیں۔ اس دربار سے اُن کی مرادیں بھی پوری ہوتی ہیں۔ چاند رات ہی سے مرد و عورتوں کی قطاریں لگی رہتی ہیں مگر ساتویں اور دسویں کی رات کو چراغاں ہوتا ہے اور لوگوں کی اتنی کثرت ہوتی ہے کہ چلنے میں کندھے سے کندھا چھلتا ہے اور تین چار بجے شب کے پہلے اطمینان سے مجلس و ماتم نہیں ہو سکتی۔ نئی کربلا پر تو ہر شب جمعہ ہندو

عورتوں کا مجمع رہتا ہے وہ روضہ کا طواف کرتی ہیں، نذر دیتی ہیں اور منتیں مانتی ہیں۔ بارہ محرم کو ہر عزاخانہ میں قرآن خوانی اور مجلس ہوتی ہے اس کے بعد پھول اور پان استعمال ہوتا ہے۔ اسی تاریخ کو قریب چار بجے دن میں ایک مجلس عظیم میاں کی پھلواری میں قبرستان میں ہوتی ہے۔ عزاخانہ تکیہ سے مہندی، ذوالجناح اور علم وغیرہ کے جلوس کی ابتدا اسی محلہ کے حضرات کرتے ہیں۔ یہاں ضریح پہلی تاریخ کو رکھی جاتی ہے اور ۳۰ صفر کو جلوس کے ساتھ کربلا پر لیجا کر دفن ہوتا ہے۔ یہاں اربعین میں تابوت بھی رکھا جاتا ہے اور ۸ ربیع الاول کو بھی تابوت حضرت سکینہ رکھا جاتا ہے۔

چہلم میں بھی متعدد تعزیے رکھے جاتے ہیں اور ۲۰ صفر کی رات کو چوک پر نکال کر رکھ دیئے جاتے ہیں قریب ۴ بجے دن میں جلوس کی شکل میں مرثیہ خوانی کے ساتھ کربلا پر جاتے ہیں۔ شاہ صاحب کا تعزیہ پرانے کربلا میں اور بقیہ تعزیہ نئی کربلا میں دفن ہوتے ہیں۔

اس وقت قریب چالیس برس سے ۱۰ صفر تک حکیم طاہر صاحب کے وقف کی طرف سے عشرہ شروع ہوتا ہے اور تا ۱۹ صفر رہتا ہے۔ باڑہ میں مجلسیں ان تاریخوں میں قریب پچیس برس سے ہو رہی ہیں۔ حاجی غلام حیدر صاحب طاب ثراہ نے ۱۹۲۵ء سے تابوت معدنشان وغیرہ پندرہ[15] صفر کو اپنے سکونتی مکان پر رکھا تھا اور برابر بڑے پیمانہ پر مجلسیں ہوتی تھیں۔ ان کی وفات کے بعد چند سال بعد یعنی ۱۹۴۳ء میں یہ تابوت و مجلسیں عزاخانہ تکیہ ان کے ورثہ کرتے ہیں۔ اور ۱۹ صفر کو تابوت باہر لایا جاتا ہے جس میں نوحہ و ماتم ہوتا ہے۔ اسی عزاخانہ تکیہ میں ۱۴ صفر کی رات سے محلہ کی انجمن کی طرف سے مجلسیں ہوتی ہیں۔ ۲۰ صفر کی رات کو بھی محلہ والوں کی طرف سے مجلس ہوتی ہے جس میں حصہ وغیرہ رکھا جاتا ہے اور اس کو توشہ کا حلوہ کہتے ہیں اور صبح کو جب تبرکات کے ساتھ

نئی کربلا جاتا ہے تو وہاں یہ تقسیم ہوتا ہے۔ یہ توشہ
دوست محمد صاحب مرحوم اور حاجی غلام حیدر صاحب مرحوم
کی طرف سے آتا ہے۔

بیسویں کی صبح کو تبرکات و تعزیہ الطاف میاں
کے عزاخانہ کا اور تکیہ کے عزاخانہ کا جو شب ہی میں حجرہ سے
نکال کر باہر رکھا جاتا ہے۔ ورنذر و نیاز ہوتا ہے اور تبرکات
تابوت کے ساتھ ایک جلوس کی صورت میں نوحہ خوانی
و ماتم کے ساتھ تکیہ سے روانہ ہوتا ہے۔ عزاخانہ بنا شوفیق
کے بھی تبرکات و علم راستہ میں ساتھ لے لئے جاتے ہیں
یہ جلوس نئی کربلا تک جاتا ہے اور وہاں تبرکات دفن
ہوتے ہیں۔ بڑے امام باڑہ پر بھی زائرین کی بھیڑ ہوتی
ہے۔ اس کے بعد واپسی میں سلطان باڑہ میں مجلس ہوتی
ہے۔ اور الطاف میاں کے عزاخانہ میں تبرک کھلایا جاتا ہے۔
کئی مجلسوں کے بعد ۲ بجے دن میں تعزیوں کا جلوس ہوتا ہے
جس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔

۲۷-۱۹۲۶ء میں شاہ مرتضیٰ حسن صاحب مرحوم گدی نشین
تکیہ خانو شاہ نے جھولا حضرت علی اصغرؑ و تابوت امام حسنؑ کی ابتدا
کی۔ شاہ صاحب ۱۹۳۲ء میں زیارات عتبات سے مشرف ہوئے
تھے اور خاص اوصاف کے انسان تھے وہ پرانی کربلا کے متولی
بھی تھے انھوں نے اپنی ذاتی کوشش سے حضرت عباس علمبردار کا
پرانی کربلا کے احاطہ میں تعمیر کرایا تھا۔ ۱۹۳۳ء میں ان کا انتقال
ہوا۔ اس کے بعد شیعہ سنی میں سخت فساد ہو گیا اور مقدمہ بازی کی
نوبت آئی جسمیں شیعوں کو کامیابی ہوئی۔ مولوی عبدالغنی صاحب
اس تکیہ اور پرانی کربلا کے متولی ہوئے اور یہ اور ان کے لڑکے
تمام رسوم عزاداری اور نگرانی مرمت کربلا بڑی محنت اور شوق
سے کرتے ہیں۔

یہ جلوس جھولا و تابوت ۲۸ صفر کو بعد مجلس تکیہ
خانو شاہ سے روانہ ہوتا ہے۔ دور دور کے لوگ اس
میں شرکت کرتے ہیں۔ قریب ایک بجے دن میں یہ جلوس
پرانے امام باڑہ پر ختم ہوتا ہے۔

قریب ۴ بجے دن میں ۸ ربیع الاول کو عزاخانہ تکیہ
میں تابوت رکھا جاتا ہے اور بعد مجلس نوحہ و ماتم کے ختم ہوتا ہے۔

مراسم عزا میں اصلاح

تعزیہ داری کا وجود ہندوستان میں بہت پہلے سے تھا۔ دکن کے عاشور خانے، سندھ کے اماباڑے، یوپی کے اماباڑے قدیم زمانہ سے چلے آرہے ہیں۔ ان میں علم، پنجے اور تعزیئے رکھے جاتے تھے، مبکی نظمیں تنہا یا چند آدمی مل کر راگ سے پڑھتے تھے۔ موجودہ زمانہ کی سوزخوانی اور نوحہ خوانی اسی زمانہ کی یادگار ہے۔ اس سے بجز حصول ثواب کے اور کوئی افادیت نہ تھی وہ بھی جبکہ حدود شرعیہ میں ہو۔ جلوس بھی نکلتے تھے جنمیں شہنائی، روشن چوکی، طبل، تاشہ، جھانجھ بجتے اور ماہی مراتب (مچھلی اور چوپاؤں کی شکل چاندی اور پیتل کے بالشتوں پر لگے ہوئے) کے ساتھ براق اور گنبد تعزیوں کی جگہ ہوتے تھے۔ کچھ کچھ دور پر ٹھہر ٹھہر کے بانکا اور پٹے کا فن دکھاتے اور یاحسین کی آواز بلند کرتے جاتے تھے۔ ان مراسم کی بجا آوری میں سب مسلمان یکساں طور پر شریک ہوتے تھے البتہ عاشور خانے اور اماباڑے شیعہ ہی تعمیر کرتے تو مگر ان میں مرثیہ گوئی اور پڑھنے کی کوئی تخصیص نہ تھی۔

حضرت غفرانمآب (اعلی اللہ مقامہ) نے روشن چوکی اور شہنائی کو آلات غنا ہونے کی وجہ سے حرام اور طبل تاشے کو جنگی باجہ ہونے کے سبب جائز قرار دیا۔ جھنڈیوں اور ماہی مراتب کے بدلے علم، گنبد کی جگہ تعزیئے اور براق کے بدلے ذوالجناح کو، بانک اور پٹے کا فن دکھانے کے عوض نوحہ خوانی اور سینہ کوبی کو رواج دیا۔ حاضری، مہندی، نذر و نیاز ایسے مراسم قائم کئے۔ محرم کے دس دنوں [illegible] ایک شہید کے ذکر سے مخصوص کیا۔ مجلسوں میں عراق کی روضہ خوانی کے طرز پر ذاکری شروع کی جس میں اہلبیت کے فضائل میں حدیثیں بھی مصائب کے ساتھ بیان کی جانے لگیں اس طرح مجلس کی افادیت بڑھ گئی ان میں تبلیغی پہلو پیدا ہوگیا اور ان مراسم کو تمام [illegible] گھر گھر مجالس ہونے لگیں تعزیئے اٹھنے لگے۔ اسی لئے [illegible] شیعوں کی تعزیہ داری کو ایک نئی شکل دیکر [illegible]

(از: سید اسلام حسین صاحب زیدی، محلہ گلاب باغ، مین پوری)

شیخ فیض الحسن صاحب مرحوم متوطن قصبہ ڈبائی ضلع بلند شہر بسلسلۂ وکالت تقریباً ۱۸۸۰ء میں مین پوری تشریف لائے۔ یہاں وکالت میں خوب کامیابی حاصل ہوئی اور چوٹی کے وکلا میں ان کا شمار ہونے لگا۔ ان کے چار صاحبزادے ضیاء الحسن، فیاض الحسن، رضاء الحسن اور بدر الحسن تھے۔ اول الذکر تین صاحبزادے اپنے والد کی طرح مذہب حقہ اختیار کئے رہے۔ لیکن بدر الحسن نے اپنی ماں کا مذہب حنفی اختیار کیا۔ شیخ فیض الحسن کی بیوی مسماۃ عصمت النساء عرف بوا جی پہلے اپنے آبائی مذہب حنفیہ پر قائم تھیں لیکن شوہر کی روش سے متاثر ہو کر مذہب اثنا عشری اختیار کر لیا تھا۔

شیخ ضیاء الحسن نے محلہ چھپٹی میں احاطے کے اندر ۱۸۹۵ء میں ایک مسجد تعمیر کرائی اور احاطہ کے پھاٹک کے اوپر کے حصہ میں امام باڑہ قائم کر کے علم وغیرہ نصب کئے۔ عشرہ محرم میں روزانہ مجالس منعقد ہوتی تھیں جن میں سوز خواں، مرثیہ خواں اور حدیث خواں حضرات کو کثرت سے مدعو کیا جاتا تھا۔ شیخ فیض الحسن کا دائرہ احباب کافی وسیع تھا چنانچہ بلا تفریق مذہب و ملت شیعہ سنی اور اہل ہنود حضرات نمایاں تعداد میں شریک مجالس ہوتے تھے۔ شیخ فیض الحسن کے انتقال کے بعد علم کے پٹکے وغیرہ کسی بدعنوانی سے جل کر خاکستر ہو گئے۔ اس کے بعد موجودہ امام باڑہ از سر نو احاطہ کے اندر شیخ فیاض الحسن نے تعمیر کرایا اور اس میں کافی اہتمام کے ساتھ عزاداری ہونے لگی۔

شیخ فیاض الحسن نے ۱۰ نومبر ۱۹۲۵ء کو ایک وقف نامہ تحریر کیا جس میں مسجد و امام باڑہ کی مرمت اور دیگر مصارف کے لئے دو مکانات وقف کئے۔ بعدہٗ ۱۷ اگست ۱۹۲۶ء کو دوسرا وقف نامہ تحریر کیا جس میں مزید دو مکانات وقف کئے گئے۔ وقف نامہ کی تحریر کے مطابق یہ شرط قرار پائی کہ تولیت مذہب امامیہ میں رہے گی۔ واقف کے فرزند شیخ ریاض الحسن وغیرہ نے مذہب حنفی اختیار کر لیا تھا کیونکہ ان کی ماں حنفی مذہب تھیں اور وہ شیخ مبارک پور معافی ضلع ایٹہ کی تھیں۔ اس وقت یہاں ایک انجمن "انجمن امامیہ" تھی جس کی خدمات کو دیکھ کر واقف نے جملہ انتظام امام باڑہ و مسجد انجمن کے سپرد کر دیا۔ انجمن نے باقاعدہ وقف کا نظم و نسق ۱۹۳۲ء تک کیا۔ غیر مقامات کے حضرات بسلسلہ ملازمت سبکدوش ہونے پر یہاں کی سکونت ترک کر کے اپنے اپنے وطن کو چلے گئے۔ اور انجمن شکست ہو گئی۔ ۱۹۳۲ء سے ۱۹۵۰ء تک یہ خدمت شیخ ریاض الحسن کے سپرد رہی۔ ۱۹۵۰ء میں اس وقف کے متولی جناب سید آل موسیٰ صاحب نقوی ریٹائرڈ ڈپٹی مجسٹریٹ

ہر مقرر ہوئے۔ جو بفضلہ تعالیٰ اب تک خدمات وقف بحسن و خوبی انجام دے رہے ہیں۔

امام باڑہ موقوفہ میں عزاداری ۲۹ رذی الحجہ سے شروع ہوتی ہے۔ اور ۱۴ رمحرم تک روزانہ شب میں مجالس ہوتی ہیں۔ ۱۹۴۲ء میں بہ سلسلۂ ملازمت محکمہ بندوبست چند حضرات اثنا عشری یہاں موجود تھے۔ جنھوں نے باقاعدہ کلکٹر ضلع سے منظوری حاصل کر کے چہلم کے دن ایک علم اس امام باڑہ سے بہ ہمراہی جلوس حضرات اہل تسنن کربلا تک لے جانے کا انتظام کیا۔ جس میں آگرہ اور شکوہ آباد سے ماتمی انجمن آکر نوحہ خوانی و سینہ زنی کرتی تھیں اور گشت کی رونق میں اضافہ کرتی تھیں۔ ہر دو انجمن کا انتظام خورد و نوش بذریعہ چندہ ہوتا رہا۔ ۱۹۴۷ء میں تقسیم ملک کے نتیجہ میں یہاں سے لوگ چلے گئے اور کوئی شخص ایسا نہیں رہا جو علم لے کر اہل سنت کے جلوس تعزیہ و علم کے ہمراہ جا سکے۔ اس لئے چہلم کا گشت بند کر دیا گیا۔ اب صرف علم مسجد میں سجا دیا جاتا ہے۔ اور چہلم میں ذکر مصائب کے بعد امام باڑہ میں برآمد ہوتا ہے۔

وقف کی مجالس کے علاوہ یکم محرم سے ۱۰ رمحرم تک روزانہ شب میں جناب سید آل موسیٰ صاحب نقوی کے دولت خانہ پر امام باڑہ کی مجلس کے بعد مجلس عزا منعقد ہوتی ہے۔ یہ سلسلہ ۱۹۴۵ء سے برابر جاری ہے۔ ۱۰ رمحرم کو مومنین کی فاقہ شکنی بھی آپ ہی کے یہاں ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ سیوم، دہم، بستم اور چہلم کی مجالس بھی جناب سید آل موسیٰ صاحب نقوی کے ذاتی عزا خانہ میں ہوتی ہیں۔ عاشورہ محرم کو علی الصباح علم وغیرہ بڑھانے کے بعد مومنین کربلا جاتے ہیں اور وہاں تعزیہ دفن کر کے اعمال وغیرہ سے فراغت کر کے ۱۱ بجے واپس آتے ہیں۔

جناب نقوی صاحب موصوف کی ذات سرزمین مین پوری میں بہت غنیمت ہے اور آپ عزاداری سید الشہداء میں بہت اولوالعزمی اور فراخدلی سے کام لیتے ہیں۔ عالم پیری میں وقف کی عزاداری اور ذاتی عزاخانہ کے انتظامات کو انجام دینا آپ ہی کا حصہ ہے۔

عشرہ محرم میں پابندی سے مذکورہ بالا دو مجالس روزانہ ہوتی ہیں۔ ان کے علاوہ ایک مجلس آٹھویں محرم کو شب میں راقم کے غریب خانہ پر عرصہ ۵ سال سے برابر ہوتی ہے۔ دو سال سے ایک مجلس سید حفاظت حسین صاحب زیدی محافظ دفتر کے دولتخانہ پر عشرہ کے بعد ہوتی ہے۔ ان مجالس میں بھی دلی خلوص کا مظاہرہ ہوتا ہے۔

مجالس میں سوزخوانی ڈپٹی سید آل موسیٰ صاحب نقوی سید انوار علی صاحب، سید محمد سبطین صاحب اور سید نسیم حیدر صاحب کرتے ہیں۔ حدیث خوانی میں بھی ڈپٹی سید آل موسیٰ صاحب نقوی کو خاصا شغف ہے۔ موصوف فریضۂ حج سے فارغ ہو چکے ہیں، زیارات عتبات عالیات سے مشرف ہو چکے ہیں، عزادار بھی ہیں اور ذاکر بھی، مختصر یہ کہ صحیح معنوں میں مومن کامل ہیں۔ آپ کی ذات سے مین پوری میں شیعیت قائم ہے۔

مومنین مین پوری کی عین خوش قسمتی ہے کہ سال گذشتہ جناب سید خورشید حیدر صاحب جائسی صدر قانون گو اندری سے تبدیل ہو کر یہاں تشریف لائے۔ آپ کے قیام سے امور دین میں زیادہ انہماک کا مظاہرہ ہونے لگا۔ چنانچہ ۱۰ ر نومبر ۱۹۶۸ء کو مین پوری میں حسینی ڈے کا انعقاد ہوا۔ جس میں عالیجناب سید العلماء والحاج مولانا سید علی نقی صاحب قبلہ مجتہد نے بصیرت افروز تقریر فرمائی۔ اتنا کامیاب جلسہ مین پوری کی تاریخ میں کبھی نہیں ہوا۔

جناب خورشید صاحب جائسی اچھے حدیث خواں ہیں۔ آپ کا طرز ذاکری اہل سنت کو بیحد پسند ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب سے آپ کا قیام یہاں ہوا مجالس عزا

میں کافی رونق رہتی ہے اور حضرات اہل سنت کافی تعداد میں شریک مجالس ہوتے ہیں۔ موصوف تقریباً سبھی مجالس میں ذاکری کرتے ہیں۔ شب عاشور، صبح عاشور، اور شام غریباں کی مجالس میں آپ نے سال گذشتہ اس عنوان سے ذاکری کی کہ در و دیوار مرقع غم نظر آتے تھے اور نالہ و زاری اور گریہ و بکا کی آواز دور تک سنی جاتی تھی۔

موصوف کی اہلیہ محترمہ کو بھی حدیث خوانی میں بڑا انہماک ہے۔ چنانچہ سال گذشتہ سے ڈپٹی سید آل موسیٰ صاحب نقوی کے ذاتی عزاخانہ میں مردانی مجلس کے بعد زنانی مجلس کا انعقاد کیا گیا جس میں ستّرہ بہر موصوفہ نے ذاکری فرمائی۔

شہر مین پوری میں ایک اور امام باڑہ آگرہ روڈ پر واقع ہے جس کا نظم و نسق حضرات اہل سنت سے متعلق ہے۔ کہا جاتا ہے کہ غدر ۱۸۵۷ء کے بعد ایک شاہ صاحب موسوم بہ "مودی شاہ" یہاں آکر مقیم ہوئے۔ وہ خود اپنے ہاتھ سے سال بھر تک تعزیہ بناتے رہتے تھے اور چہلم کے دن تعزیہ اٹھاتے تھے۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے گلے میں ایک تعویذ دیکھا گیا۔ جس سے معلوم ہوا کہ ان کا تعلق اودھ کے شاہی گھرانے سے تھا۔ یہاں مسلمانوں کے مختلف گروہ کنجڑے، بھٹیارے وغیرہ تعزیوں کا اہتمام کرتے ہیں۔ ہر محلہ میں امام چوک ہے۔ جہاں تعزیہ رکھا جاتا ہے۔ کسی زمانہ میں ایک ڈپٹی کلکٹر مامون حسن صاحب یہاں تشریف لائے تھے جنھوں نے جلوس عزا رائج کیا۔ اس امام باڑہ میں عزاداری کے انتظام کے لئے ایک کمیٹی کی تشکیل ابتدا سے ہوتی رہی ہے۔ چنانچہ دور حاضر میں کمیٹی کے ممبران عبدالقیوم صاحب، حمید اللہ خانصاحب، نیاض احمد صاحب صدیقی، محمد سلام خانصاحب، سید بدرالحسن صاحب، امنے خانصاحب، عبدالوہاب خانصاحب میونسپل کمشنر اور ڈاکٹر سید اسرار نبی صاحب ترمذی ہیں۔ چاند رات سے ۸ محرم تک روزانہ شب میں گشت نکلتا ہے ۵ محرم کو دن میں مولا الکوں کا علم نکلتا ہے۔ ۶ محرم کو شب میں علم کا گشت نکلتا ہے۔ ۷ محرم کو دن میں گشت نکلتا ہے۔ ۸ محرم کو رات میں پھندن کھتری کے نام سے مہندی کا جلوس نکلتا ہے۔ ۹ محرم کو تعزیے امام چوک پر رکھے جاتے ہیں۔ جہاں سے بشکل گشت سلامی امام باڑہ آتے ہیں اور وہاں کے تعزیوں کو لے کر پورا جلوس چوراہے پر پہونچتا ہے جہاں رات بھر اکھاڑہ ہوتا ہے۔ اور شہر کی پوری پبلک بلا لحاظ مذہب و ملت وہاں مجتمع ہوتی ہے۔ صبح ۴ بجے تعزیے اپنے اپنے امام چوک پر واپس لائے جاتے ہیں۔ ۱۰ محرم کو ۲ بجے دن سے جلوس کا آغاز ہوتا ہے۔ اور دس بجے شب میں دفن سے فراغت ہوتی ہے۔ جہاں سے ۴ بجے تعزیوں کو لیکر بشکل جلوس کربلا روانہ ہوتے ہیں اور دس بجے شب میں دفن سے فراغت ہوتی ہے۔

عاشور محرم کو ایک تعزیہ موضع گورا بازار (جو مین پوری سے ۳ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔) سے آکر جلوس میں شامل ہوتا ہے۔ یہ سرکاری تعزیہ کہلاتا ہے۔ اور جلوس کے تعزیوں سے چالیس قدم آگے رہتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ واجب الارض میں اس تعزیہ کا ذکر "گارڈ تعزیہ" کے نام سے آیا ہے۔ موضع گورا بازار میں کسی زمانہ میں انگریزی فوج کا بڑا اڈہ تھا اسی مناسبت سے اس کا نام گورا بازار رکھا گیا۔ اسی طرح چہلم کے دن بھی جملہ تعزیے امام باڑہ میں یکجا ہوتے ہیں اور دوسرے دن ۲ بجے سے جلوس نکلتا ہے اور دس بجے شب کو کربلا میں ختم ہوتا ہے۔ امام باڑہ میں مجلس صرف ۲ محرم کو منعقد ہوتی ہے جس میں نیر و زار بار و سینہ پڑھنے والے بلائے جاتے ہیں۔ مین پوری کی یہ خصوصیت ہے کہ یہاں عزاداری کے نام پر ہندو مسلم یا شیعہ سنی اختلافات کبھی نہیں ہوئے۔ بلکہ ہمیشہ اتفاق و اتحاد کے ساتھ مراسم عزا انجام دئے گئے ہیں۔

———

حیدرآباد دکن کی عزاداری

(از سید علی اصغر صاحب بلگرامی حیدرآبادی مرحوم)

ریاست حیدرآباد دکن میں عزاداری کا بانی قطب شاہیہ کا پہلا تاجدار سلطان قلی ہمدانی تھا جو ابتداءً سلاطین بہمنیہ دکن کی جانب سے سمت تلنگانہ کا طرفدار (صوبہ دار) از سلطان محمود شاہ بہمنی (۸۸۷ھ تا ۹۲۴ھ) کی وفات کے بعد ۹۲۴ھ سے ۹۵۰ھ تک سرحد گولکنڈہ سے دریائے شورنگ کے علاقہ کا خود مختار بادشاہ رہا تھا۔ اگرچہ سلطان قلی شاہان صفویہ ایران کا ہم عصر تھا لیکن شاہ اسمٰعیل صفوی کے ایران میں مذہب امامیہ کی ترویج سے قبل ہی دکن کے علاقہ تلنگانہ میں خطبۂ اثنا عشری ۹۱۸ھ سے اس بادشاہ نے رائج کر دیا تھا چنانچہ تاریخ مرغوب القلوب میں صدر جہاں نے سلطان قلی کی زبانی حسب ذیل عبارت نقل کی ہے:-

"الحال قریب شصت سال باشد کہ شب و روز با کافران غزا نمودہ بہ توفیق اللہ تعالیٰ از سرحد ورنگل تا بندر مچھلی پٹن و راجبندری قریب شصت ہفتاد قلعۂ رفیع بضرب شمشیر آبدار بہ تصرف اولیائے دولت ابد پیوند در آوردہ ام و ازیں فتوحات از برکت آنست کہ روزیکہ ابتدائی تسخیر ممالک کفار نمودیم با خود نذر شرعی کردم کہ اگر حق تعالیٰ مارا بخدمت تؤتی الملک من تشاء مشرف گرداند خطبۂ دوازدہ امام علیہم السلام در تمام قلمرو خود اجرا نمودہ مذہب حق اثنا عشریہ را درین مملکت رواج دہم۔ و قوع ایں حال قبل از ظہور شاہ اسمٰعیل و رواج مذہب جعفری در مملکت ایران است تا کسے را ایں طرز بسر کردن تقلید آں شاہ غفران پناہ کردہ ام بلکہ در زمان سلطنت سلطان یعقوب صفوی خاطر را بمہر ائمۂ اثنا عشر ملوک گردانیدہ ام و مذہب شیعہ و مذہب آبا و اجداد عظام ما ست۔"

پہلے سلطنت قطب شاہی کا پایۂ تخت قلعہ گولکنڈہ (محمد نگر) میں تھا جہاں سلطان قلی (۹۲۴ھ تا ۹۵۰ھ) نے پہلا عاشور خانہ بنوایا تھا اس کے بعد سلطان ابراہیم قطب شاہ (۹۵۷ھ تا ۹۸۸ھ) نے لنگر دوازدہ امام گولکنڈہ میں بنوایا جس میں غرباء کو کھانا تقسیم ہوتا تھا۔

کوہ مولیٰ علیؑ

سلطان ابراہیم قطب شاہ کے عہد سے ۱۷ رجب کو عرس کوہ مولیٰ علی کا آغاز ہوا۔ جہاں ہر پنجشنبہ اور شب جمعہ کو باوجود شہر حیدرآباد سے تو میل دور ہونے کے مجالس عزا منعقد ہوا کرتی ہیں۔ تزک قطب شاہی میں اس پہاڑ کا واقعہ اس طرح مندرج ہے کہ ایک شب کو یاقوت حبشی خواجہ سرائے سلطان ابراہیم قطب شاہ نے جب کہ وہ نواح کوہ مولیٰ کے ایک باغ میں مقیم تھا، خواب دیکھا کہ ایک عرب سبز لباس پہنے ہوئے اس سے کہہ رہا کہ تجھے جناب امیرؑ نے یاد کیا ہے۔ یاقوت اس عرب کے ایک پہاڑ پر جا کر جناب امیرؑ کے سامنے کھڑا کر دیا گیا۔

اسی پہاڑ پر گیا تو جس مقام پر اس نے جناب امیرؑ کو تشریف فرما دیکھا تھا وہاں دست مبارک کا نقش موجود تھا اُتو نے پتھر کے اس حصہ کو ترشوا کر ایک رواق تعمیر کرا کر اسکے طاق میں اس کو نصب کرا دیا اور سترہویں رجب کو حضرت کی نیاز کرائی اسی طرح ہر سال عرس ہونے لگا اس واقعہ کی شہرت ہوئی تو سلطان ابراہیم قطب شاہ نے زیارت کر کے مسجد و عمارات تعمیر کرائیں۔ شاہان آصفی ہی کے دور میں ہندو مسلم امرائے ملک نے بالائے کوہ اور دامن کوہ میں متعدد عمارتیں بنوائیں اور یہاں کی رونق میں اضافہ ہوتا رہا۔ حضرت آصفجاہ ثانی غفرانمآب نے اس پہاڑ کے مصارف عود و گل و نقارخانہ و خادمین کے لئے ایک موضع بعنوان جاگیر مقرر فرمایا۔

اعلیٰحضرت آصفجاہ سابع نے بصرف زر کثیر پہاڑ پر زائرین کی سہولت کے لئے نفیس سیڑھیاں بنوائیں اور برقی روشنی کا انتظام فرمایا اور بادصف پیرانہ سالی ہر سال ۱۳ رجب کو بہ نفس نفیس پہاڑ پر زیارت کو تشریف لاتے ہیں۔

کوہ امام ضامنؑ

یہ پہاڑ شہر سے ۱۱ میل کے فاصلہ پر واقع اور امام رضا علیہ السلام سے منسوب ہے یہاں کے مصارف کے لئے شاہان آصفیہ نے انعامی اراضیات عطا کی ہیں۔

عاشورخانہ شاہی

سلطان محمد قلی قطب شاہ (۹۸۸ھ تا ۱۰۲۰ھ) نے گولکنڈہ کی آبادی گنجان ہو جانے کی وجہ سے شہر حیدرآباد کو متعدد شاہی محلات عمارات، مساجد و حمام بنا کر آباد کیا۔ چارمینار جو وسط شہر میں ہے اس کے تعمیر کی تاریخ یا حافظ (۱۰۰۰ھ) ہے۔ دولتخانہ شاہی سے متصل سلطان محمد قلی قطب شاہ نے سنہ ۱۰۰۰ھ میں بصرفہ سات ہزار روپیہ یہ عاشورخانہ تعمیر کرایا تھا اس کی چھت اور دیواروں پر سبز و سیاہ مخمل کے پردے آویزاں رہتے تھے اور امام بارہ میں (۱۴) طلائی علم مرصع بجواہر استادہ ہوا کرتے تھے۔

قطب شاہی عہد میں عشرہ محرم میں عوام کو دو وقت کھانا تقسیم ہوتا تھا اور بارہ (۱۲) شربت روزانہ پلایا جاتا تھا اور سالانہ عشرہ محرم میں بارہ (۱۲) ہزار ہون (سکہ طلائی) جس کو (زر عاشوری) کہتے تھے بطور خیرات تقسیم ہوا کرتے تھے۔ سلطان عبداللہ قطب شاہ (۱۰۳۵ھ تا ۱۰۸۳ھ) نے اس عاشورخانہ کی دیواروں پر کار کاشی کرایا تھا جو ہنوز محفوظ حالت میں ہے۔ دور قطب شاہی میں محرم کا چاند دیکھ کر بادشاہ اور درباری دس روز تک سیاہ لباس میں ملبوس رہا کرتے تھے اور بازار میں گوشت اور پان کی فروخت بالاعلان نہیں ہوا کرتی تھی اور نوبت نوازی بھی موقوف رہا کرتی تھی۔ نواب آصف جاہ نے اس عاشورخانہ کے مصارف کے لئے بارہ (۱۲) ہزار روپیہ سالانہ کی جاگیر مقرر فرمائی تھی۔ عشرہ محرم میں یہاں علم اب بھی استادہ ہوتے ہیں اور زائرین کا ہجوم رہتا ہے۔

عاشورخانہ حسینی علم

سلطان محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں علی آقا نامی ایک علم دیار عرب سے لے کر آئے تھے۔ یہ علم دو رخی سیف کی وضع کا ہے جس میں بجائے زبانِ علم کے امام جعفر صادقؑ کی سیف دستی نصب ہے۔ سلطان وقت نے بڑی عقیدت سے اس کا استقبال کر کے جس مکان میں اس وقت یہ علم استادہ ہوتا ہے وہ علی آقا کو عطا کر کے اس علم کی خدمت گذاری بھی انہی کے سپرد کی اور مصارف عشرہ کے لئے ماہوار مقرر کر دی چنانچہ انہی کے ورثا یہاں کے خادم ہیں۔

عاشورخانہ الاوہ یتیمان

محلہ دبیر پورہ میں یہ عاشورخانہ واقع ہے جہاں عشرہ محرم میں علم استادہ ہوا کرتے ہیں۔

الاوہ بی بی

حیات بخشی بیگم مادر سلطان عبداللہ قطب شاہ نے اس علم کو محرم میں استادہ کرنا شروع کیا تھا روز عاشورہ اس علم کو ہاتھی پر سوار کر کے ماتمی گروہ

کے ساتھ شہر میں گشت کرا کر بوقت عصر موسیٰ ندی میں اس کو ٹھنڈا کیا جاتا ہے۔

الاوہ سر طوق عمارت دارالشفاء کے ایک حجرہ میں یہ غیر معمولی بڑا علم سال بھر استادہ رہا کرتا ہے، اس کو عہد قطب شاہی میں آقا محسن ایرانی دمشق سے لائے تھے اس علم کے وسط میں امام زین العابدینؑ کے طوق سلاسل کا ایک ٹکڑا نصب ہے اعلیٰحضرت آصف جاہ سابع نے عمارت دارالشفاء کے وسط میں ایک جدید عمارت تعمیر کرا دی ہے جس میں اب یہ علم استادہ رہتا ہے۔

نعل صاحب عہد سلطان ابراہیم قطب شاہ میں بیجاپور سے یہ علم لایا گیا تھا اس میں امام حسینؑ کے گھوڑے کا ہلال جو بشکل نعل ہے اس کا ایک ٹکڑا نصب ہے۔ پہلے یہ قلعہ گولکنڈہ میں بزمانۂ محرم استادہ کیا جاتا تھا نواب آصف جاہ ثانی کے عہد سے شہر ہی کے پاس سرکاری عمارت میں استادہ ہوا کرتا ہے۔ اس پر صندل چڑھا ہوا ہے۔ شب عاشور اس علم کی سواری تزک و احتشام کے ساتھ شہر میں گشت کرائی جاتی ہے۔

پنجۂ شاہ اسی نام کے محلہ میں یہ پنجہ جو غیر معمولی طور پر بڑا ہے استادہ ہوا کرتا ہے اور عاشورہ کے دن شہر میں اس کو گشت کرایا جاتا ہے۔

درگاہ حضرت عباسؑ نواب سالار جنگ مرحوم کی ڈیوڑھی کے ایک حصہ میں یہ علم جس پر صندل چڑھا ہوا ہے استادہ ہوا کرتا ہے ہر پنجشنبہ و جمعہ کو عقیدت مند کثرت سے زیارت کو آیا کرتے ہیں بروز عاشور صبح کے وقت اس کو ڈیوڑھی کے صحن میں گشت کرایا جاتا ہے۔

عزا خانۂ زہرا ۱۳۶۰ھ میں اعلیٰحضرت آصف جاہ سابع نے یہ عالیشان عاشور خانہ تعمیر کرایا ہے جس میں طلائی علم استادہ ہوا کرتے ہیں اور اعلیٰحضرت بڑی عقیدت کے ساتھ یہاں کی مجالس عشرہ میں شرکت فرماتے ہیں۔

شہر حیدرآباد کی مجالس عشرہ میں اہل السنت و برادران ہنود بھی عقیدت کے ساتھ شریک ہوا کرتے ہیں چنانچہ چند سال قبل تک راجہ راؤ رنبھا کی ڈیوڑھی میں اہتمام کے ساتھ علم استادہ ہوا کرتے تھے۔ فی زمانہ نواب عنایت جنگ بہادر کے خسلیہ۔ نواب شمشیر جنگ مرحوم کی ڈیوڑھی۔ مسجد جعفری اور مسجد اثنا عشری میں عشرۂ محرم اور نواب تراب یار جنگ بہادر کی ڈیوڑھی میں عشرۂ صفر خاص اہتمام کے ساتھ ہوا کرتا ہے اس کے علاوہ محلہ دارالشفاء و ایرانی گلی و بابا نور خاں و حسینی محلہ میں متعدد مجالس مردانہ اور یادگار حسینی کی عمارت میں زنانہ مجالس منعقد ہوا کرتی ہیں۔

عزاداری موضع سرائے راہ عرف کورالی پرگنہ نواب گنج
تحصیل سورام ضلع الہ آباد

جناب سید محمد احمد صاحب کورالوی (ریکارڈ کیپر کلکٹریٹ الہ آباد)

موضع سرائے راہ عرف کورالی سادات کے تیس گھروں کی ایک چھوٹی سی آبادی ہے۔ یہ بہت قدیم بستی ہے۔ یہاں سادات کے علاوہ دیگر قومیں بھی آباد ہیں۔ جب سے سادات یہاں آباد ہوئے اسی وقت سے عزاداری کا سلسلہ شروع ہوا۔ پہلے معمولی طرح سے عزاداری ہوتی رہی۔ لیکن بعد میں کافی ترقی ہوئی۔ جس میں سید شریف احمد صاحب مرحوم نے کافی حصہ لیا۔ صبح سات بجے سے مجلسوں کا سلسلہ شروع ہوکر تمام دن رہتا ہے۔ اور بعد نماز مغربین پھر مجلسیں شروع ہو جاتی ہیں۔ اور یہ سلسلہ کوئی ۲ بجے رات تک رہتا ہے۔ زنانی مجلسیں دن کے ۱ بجے سے شام کے ۵ بجے تک متواتر ہوتی رہتی ہیں۔ کچھ لوگوں کے پاکستان چلے جانے سے مجلسوں میں کمی ہوگئی ہے۔ دوسری محرم سے علاوہ مقررہ مجلسوں کے شب میں حاضری کی مجلسیں شروع ہو جاتی ہیں۔ اور ۵ محرم تک یہ سلسلہ رہتا ہے۔

۵ محرم کو حضرت عباس کی "چوکی" شب میں سید اطہر مرحوم کے امام باڑہ سے اٹھتی ہے اور مرثیہ و نوحہ خوانی کے ساتھ گشت ہوتا ہے۔ اور یہ گشت صبح تک رہتا ہے۔

۶ محرم کو حضرت علی اصغرؑ کا گہوارہ امام باڑہ سید اختر حسین صاحب سے شب میں اٹھتا ہے۔

۷ محرم کو چوکی (مہندی) کا جلوس پھر سید اطہر حسین صاحب کے امام باڑہ سے شب میں نکلتا ہے۔ اور تمام رات مرثیہ و نوحہ خوانی کے ساتھ موضع کا گشت رہتا ہے۔ یہ جلوس بھی صبح کو ختم ہوتا ہے۔

۸ محرم کو پانچ بجے شام میں جلوس ذوالجناح امام باڑہ جناب اختر حسین صاحب سے نکلتا ہے۔ اور موضع کا گشت نوحہ و ماتم کے ساتھ ہوتا ہے۔

۹ محرم کو شب میں سات امام چوک پر تعزیہ رکھے جاتے ہیں۔ تعزیہ رکھنے کے بعد اہل ہنود زن و مرد جوق در جوق آتے ہیں اور منت و مرادیں مانتے ہیں۔ اور چڑھاوا چڑھاتے ہیں۔

۴ بجے قبل الصباح صبح عاشورہ سید اطہر حسین صاحب مرحوم کے امام باڑہ میں الوداع کی مجلس ہوتی ہے اور اس کے بعد ہی آگ کا ماتم ہوتا ہے۔ جس کے دیکھنے کے لئے دور دور سے لوگ آتے ہیں۔

اہل سنت حضرات عزاداری میں برابر کا حصہ لیتے ہیں اور تعزیہ رکھتے ہیں۔ مجالس برابر کرتے ہیں۔

دسویں محرم کو ایک بجے دن سب اطراف سے اہل سنن کے

تعزیہ آنا شروع ہو جاتے ہیں۔ تقریباً دس بارہ مواضعات سے ہمارے یہاں تعزیے آتے ہیں۔ تعزیوں کے ساتھ اہل سنن کے مرد و زن سب ہی ہو آتے ہیں۔ ۴ بجے شام تک اطراف کے تعزیے آجاتے ہیں پھر اپنے یہاں کے ہر چوک کے تعزیے اٹھائے جاتے ہیں۔ اور ساتھ میں حضرت عباسؑ کا علم اٹھایا جاتا ہے۔ جو بہت بڑا علم ہوتا ہے۔ اسے فتح نشان بھی کہتے ہیں اس کو تین یا چار آدمی سنبھالے رہتے ہیں۔

نوحہ و ماتم کے ساتھ ایک بڑا جلوس کربلا جاتا ہے۔ اور بعد عصر یہ جلوس ختم ہوتا ہے۔ کربلا میں روٹی، کھچڑا، ملیدہ، پلاؤ وغیرہ تقسیم کیا جاتا ہے۔

تعزیے کربلا میں دفن کئے جاتے ہیں اس جلوس میں سید منظور حسین صاحب نقوی و سید زائر حسین صاحب کی نوحہ خوانی رہتی ہے۔ شام غریباں کی مجلس بعد نماز مغرب امام باڑہ سید اختر حسین صاحب میں ہوتی ہے۔ ۱۱ محرم سے چالیسویں تک مجلسوں کا سلسلہ رہتا ہے۔ چالیسواں میں بھی تعزیہ تابوت اٹھائے جاتے ہیں۔ ۱۰ محرم کو شب میں مستورات میں جناب سکینہؑ کا تابوت علی امام صاحب کے یہاں اٹھتا ہے۔

ہندوستان میں پہلا شیعہ

خاندان رسالت کی ایک فرد ابو طالب حمزہ نے بنی عباس کی سخت گیریوں سے تنگ آکر اپنے پردادا حضرت امام علی نقی اور حضرت امام حسن عسکری علیہم السلام کے وطن کو چھوڑ کر ایران کا رخ کیا۔ جہاں وہ دوسری ربیع الاول ۲۹۲ھ کو نیراز میں انتقال کر گئے۔ ان کے بیٹے سید ابو العلی محمد سبزوار میں جاکر مقیم ہوئے اور وہاں علوم اہلبیتؑ کی اشاعت اس طرح کی کہ وہ دار الایمان مشہور ہو گیا۔ ۲۸ صفر ۳۳۳ھ کو انھوں نے وفات پائی۔ مگر ان کی اولاد نے وہاں علمی و روحانی مرکزیت حاصل کر لی۔ سبکتگین کا بیٹا محمود غزنوی جس وقت ہندوستان پر حملہ کر رہا تھا اس زمانہ میں سید ابو العلی محمد کے پوتے سید نجم الدین اپنے متبعین کی ایک جماعت کے ساتھ ہندوستان آئے اور روپا نگر کو فتح کر کے "جائے عیش" نام رکھا۔ جو کثرت استعمال سے جائس ہو گیا۔ اس وقت سے یہ قصبہ سادات نقویہ کا مسکن ہوا۔

چند دن کے بعد ان کی اولاد نے قریب کی ایک ریاست ٹھاک پور کو فتح کر کے نصیر آباد میں علمی و روحانی مسند بچھائی جس کی روشنی دور دور تک پہونچی۔

حکومت وقت نے بھی اس خاندان کے افراد کو تالیقی، معلمی، قضا، اور صدارت کے عہدوں پر سرفراز کیا اور علمی حیثیت سے جائس کا بھی ایک درجہ سمجھا جانے لگا۔

چنانچہ اس خاندان کی ایک فرد سید عبد القادر کو اورنگ زیب نے ولی عہد کی معلمی پر مامور کیا تھا۔ اور انھوں نے شہزادے کو شیعیت سے روشناس کیا۔ یہاں تک کہ بہادر شاہ بننے کے بعد انھوں نے اپنے تشیع کا بالکل اعلان کر دیا۔ جس پر ہنگامہ ہوا۔

(ہندوستان میں شیعیت کی تاریخ۔ مصنف مولانا سید محمد باقر صاحب شمس لکھنؤ)

عزاداری
قصبہ دارا نگر ضلع الہ آباد

سید اسد اصغر صاحب و سید علی حسین صاحب۔ بی۔ اے، محلہ سید واڑہ۔ دارا نگر ضلع الٰہ آباد۔

دارا نگر تاریخی قصبہ کڑا سے جانب جنوب ایک میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ ایک تجارتی قصبہ ہے۔ یہاں پر اہل ہنود کی اکثریت ہے۔ مسلمانوں میں صرف سولہ گھر شیعوں کے ہیں یہاں صرف دو مجالس یومیہ زمانہ عشرہ محرم میں ہوتی تھیں پہلے چونکہ دو مجلسوں کے بعد بھی وقت کافی ملتا تھا اس لئے قصبہ کڑا کی مجالس و گشت میں شرکت کرتے تھے۔ اب بفضلہٖ یہاں پر یکم تا ۹ر محرم دس مجالس یومیہ ہوتی ہیں۔ جبکی وجہ سے اب ہم لوگ کڑا کی مجالس و گشت میں شرکت نہیں کر سکتے۔ ۶ر محرم کو شب کی ایک مجلس میں جناب علی اصغرؑ کے گہوارہ کی زیارت ہوتی ہے۔ ۶ر تا ۹ر محرم متعدد نذریں ہوتی ہیں۔ پہلے یہاں پر کوئی گشت و جلوس شیعوں کا نہیں ہوتا تھا۔ ۸ر محرم سنہ ۱۳۵۹ھ، مطابق ۱۷ر فروری سنہ ۱۹۴۰ء سے بہ تحریک جناب سید ریاست علی صاحب رضوی مرحوم رئیس قصبہ دارا نگر ایک گشت ذوالجناح قائم ہوا۔ جو کہ منجانب انجمن اسدیہ زیر اہتمام جناب سید مظفر علی صاحب رضوی صدر انجمن ۲ بجے دن میں اٹھ کر ۷ بجے شام کو ختم ہوتا ہے۔ اس جلوس میں مانک پور ضلع پرتاب گڈھ، ندورہ ضلع الہ آباد اور علیہ پور ضلع الہ آباد کے ماتمی شریک ہو کر نوحہ و ماتم کرتے ہیں۔ زنجیر و قمع کا ماتم بھی ہوتا ہے اور ہندی میں تقریریں ہوتی ہیں۔ اس گشت میں غیر اقوام کے لوگ بھی بہت دلچسپی کے ساتھ شرکت کرتے ہیں۔ شب عاشور تابوت حضرت امام حسینؑ کی زیارت ہوتی ہے جو کہ محلہ میں گشت تمام ہونے کے بعد واپس امام باڑہ جاتا ہے۔ عاشور محرم کو بعد ختم الوداع ۸ر بجے صبح کو ہم لوگ مع تعزیہ و تابوت دفن کرنے اور اعمال عاشورہ بجالانے کے لئے بصورت گشت کربلا جاتے ہیں۔ تعزیہ داران اہلسنت کے جلوس کے واپس جانے کے بعد شب میں مجلس شام غریباں منعقد ہوتی ہے۔

زنانی انجمن کی جانب سے دن میں سنہ ۱۳۷۱ھ سے یکم تا ۹ر محرم مجالس اور ۸ر محرم کو تابوت جناب سکینہؑ کی زیارت ہوتی ہے۔

اندرون عشرۂ محرم اہل سنت بھی متعدد مجالس کرتے ہیں جن میں خصوصیت سے صرف شیعہ ذاکری کرتے ہیں۔ یکم، ۳ر و ۵ر محرم کو اہلسنت عَلَموں کا گشت نکالتے ہیں اور ۸ر محرم کو ذوالجناح اور مہندی کا گشت نکالتے ہیں پھر شب عاشور کو تعزیوں کا گشت (جس میں کڑہ دچوک اور موضع سورن پور کے تعزیے ہوتے ہیں) نکالتے ہیں۔ یہ گشت شیعوں کے امام باڑوں تک آکر واپس جاتا ہے۔ عاشور محرم کو شیعوں سے الوداع پڑھوانے کے بعد سنی حضرات مع تعزیوں کے ۳ر بجے دن میں گشت نکالتے ہیں اور دس بجے شب میں اپنی کربلا جاتے ہیں۔ گشت میں شیعہ نوحہ خوانی اور ماتم کرتے ہیں۔

شہر سنبھل کی شہرۂ آفاق عزاداری

(از جناب معجز سنبھلی)

بھلا یوں بھی کسی کی یاد عالمگیر ہوتی ہے ∴ ہر اک ملت شریک ماتم شبیرؑ ہوتی ہے

ابھی ماہ عزا نمودار بھی نہیں ہونے پایا کہ ۲۸ ذی الحجہ ہی سنبھل کے جسیم ڈھول عاشقان حسینؑ کو بانگ دہل باخبر کر رہے ہیں کہ چاند کی پیشوائی کے لئے تیار ہو جاؤ۔ سامان عزا کو اپنے عزاخانوں میں مجالس برپا کرنے کے لئے ترتیب دے لو۔ ذاکرین سے وعدے لے لو۔ سنبھل کے بازار کا وہ حصہ جو کنگروں اور آتشبازوں کا بازار کہا جاتا ہے مدتوں پہلے سے تعزیے اور مہندیاں بنانے میں مصروف ہے۔ جس قدر زمانہ قریب آتا جاتا ہے بازار تعزیوں مہندیوں اور تاشوں وغیرہ سے بھرتا چلا جاتا ہے۔

سنبھل میں یہ سب کچھ کتنے زمانہ سے ہو رہا ہے اس کی تاریخ اس طرح نہیں ملتی جس طرح خود شہر سنبھل کے آباد ہونے کی تاریخ معلوم نہیں ہوتی۔ لوگوں کو کہتے سنا ہے کہ سنبھل میں عزاداری عہد مغلیہ سے ہی چلی آ رہی ہے۔

لیجئے! سوگوار چاند آسمان کی صف ماتم پر نمودار ہوا اور شہر میں مجالس کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ شہر بھر میں کتنی مجالس ہوتی ہیں صحیح تعداد بتانا ممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ جس محلے سے گذریئے کہیں سوز ہو رہا ہے کہیں تحت اللفظ، میر [illegible] زیارت پڑھی جا رہی ہے تو کہیں تقریر کا سلسلہ جاری ہے۔ کہیں سبیل ہو رہی ہے تو کہیں نیاز تقسیم ہو رہی ہے۔ سیکڑوں کی تعداد میں ڈھول ہیں کہ جن کی آوازیں رات کے بارہ بارہ بجے تک شہادت عظمیٰ کا اعلان کر رہی ہیں اور عزاداروں سے کہہ رہی ہیں کہ یہ راتیں سونے کی نہیں ہیں۔

تاریخیں گذر رہی ہیں اور روزانہ ایک خاص تاریخ کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ شہر اور اطراف شہر میں علموں کو سجایا جا رہا ہے۔ ڈھولوں کو زیادہ سے زیادہ آوازوں کا بنایا جا رہا ہے، تاشوں کو تیز سے تیز آواز دینے والا بنانے کی تدبیریں کی جا رہی ہیں۔ بچے بچے بوڑھوں کے بھی سبز کرتے رنگے جا رہے ہیں۔ آخر وہ تاریخ آ گئی یہ تاریخ ۷ محرم ہے جسے شہر کے عوام علموں کا دن کہتے ہیں۔ دور دراز سے لاکھوں کی تعداد میں عورت، مرد، بوڑھے، بچے سنبھل میں علموں کا جلوس دیکھنے آتے ہیں۔ گھڑی میں دن کے گیارہ بجے کہ محلہ میاں سرائے سے پہلا علم اٹھا (اگر یہ علم کسی وجہ سے نہ اٹھے تو شہر کا کوئی علم نہ اٹھے گا) جس کے اٹھنے کی خبر تمام شہر میں بجلی کی طرح دوڑی اور ہر محلے سے علم اٹھنا شروع ہوئے۔ شہر کے آس پاس دو دو تین تین میل سے علم بھی آنا شروع ہو جاتے ہیں۔

ہزاروں کی تعداد میں علم اور سیکڑوں کی تعداد میں ڈھول ایک خاص مقام پر جمع ہوئے اور جلوس کی صورت میں آگے آگے علم اور پیچھے پیچھے گاڑیوں اور ٹھیلوں پر ڈھول شہر کے مقررشدہ مختلف راستوں سے گزرنے لگے جلوس جتنا بڑھ رہا ہے مجمع بڑھتا جاتا ہے جہاں تک نظر کیجئے ایک جم غفیر نظر آئے گا۔ ایک مقام آیا کہ یہ لاکھوں کا جلوس ایک بہت ہی تنگ سڑک پر پہونچا یہ وہ سڑک ہے جس کے دونوں طرف دور تک برادران ہنود کی دوکانیں، مکانات اور مندر واقع ہیں جلوس کو گذرنے میں کیوں رکاوٹ ہو رہی ہے اس لئے کہ برادران ہنود اور مندر کے پجاریوں کا تقاضا ہے کہ ہمیں اپنے کچھ مراسم عزاداری ادا کرنے دو اور حسینؑ کو یہاں سے لیجانے میں جلدی نہ کرو۔ یہ بھاٹے پر ہجوم کیوں ہے کیا کوئی خطرہ ہے نہیں۔ نہیں شہر کے کوتوال نے حسب دستور سابق سبیل لگائی ہے۔ یہ سبیل کسی زمانہ میں بجاگو پرکاش کوتوال نے قائم کی تھی۔ لیجئے اب یہ جلوس دیپا سرائے کے چوک میں ہے۔ ایک کنوئیں پر اس قدر مجمع کیوں ہے کیا خدانخواستہ کوئی عزادار کنوئیں میں تو نہیں گر گیا نہیں نہیں عاشقان حسینؑ نے اس کنوئیں میں شکر کی بوریاں ڈلوادی ہیں جس کی وجہ سے کنوئیں کا پانی شربت ہو رہا ہے اور شام تک ایسا ہی ہوتا رہے گا.....

یہاں تو شہر کا ہر محلہ عشرہ تک اسی عزاداری میں منہمک رہتا ہے۔ خصوصاً میاں سرائے، دیپا سرائے، کوٹ اور چودھری سرائے میں بڑی بڑی شاندار اور کامیاب مجالس ہوتی ہیں۔ حقیر اکثر مجالس میں شریک ہوتا اور متعدد مجالس پڑھتا ہے۔ محرم کی ۷ تاریخ کو محلہ کوٹ غربی میں ایک نہایت شاندار اور کثیر مجمع کی مجلس ٹھیکیداران محمد حسین و اختر حسین کے یہاں ہوتی ہے جس میں غالباً دو مرتبہ حضرت مہذب لکھنوی نے بھی خواندگی فرمائی ہے اور اب کئی سال سے یہ خادم پڑھ رہا ہے۔ ٹھیکیدار اختر حسین امامیہ مشن کے دائمی ممبر بھی ہیں۔

چودھری سرائے کی عزاداری الحاج چودھری خورشید علیخاں اور ان کے برادرزادہ الحاج کنور عشرت علیخاں خاص طور سے حصہ لیتے ہیں۔ وہاں بھی اکثر مجالس پڑھنے کا اتفاق ہوتا ہے۔ حسینؑ کے شیدائیوں کا جوش و خروش دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

سنبھل کے جلوس عزاداری میں ایک تو ۷ تاریخ کا جلوس جس کا تذکرہ ہو چکا اور دوسرا عشرہ (۱۰ تاریخ) کا جلوس ہے یہ جلوس بھی ایسے ہی مجمع کا ہوتا ہے فرق صرف یہ ہوتا ہے کہ اس دن جلوس کے ہمراہ ہزاروں کی تعداد میں تعزیئے ہوتے ہیں۔ سنبھل کے وہ فلک بوس تین تعزیئے جو دور دور تک مشہور ہیں اور ہر سال زر کثیر اور مدت مدید صرف کرکے تیار ہوتے ہیں شہر میں گذرتے ہوئے مقام دفن پر پہونچتے ہیں ان تعزیوں کے گذرنے کے لئے ان کی گذرگاہوں پر لگے ہوئے بجلی اور ٹیلیفون وغیرہ کے تار ۹ محرم کی شام تک کھول دیئے جاتے ہیں۔ ان تعزیوں کے بنانے والوں کو سنبھل کی معزز مالدار پبلک بلاتفریق مذہب و ملت انعامات دیتی ہے ضلع کے حکام اور کوتوال شہر بھی انعامات دینے میں حصہ لیتے ہیں۔

پرانے زمانہ سے ماہوشیام لال اور زابازی طوائف کی مہندی ان کے جانشین اب بھی اٹھاتے ہیں جو سنبھل کی مشہور مہندیاں ہیں۔ سنبھل محلہ محمود خاں سرائے میں میرے ایک مخلص عبدالرحیم صاحب نور اپنے محلہ میں عزاداری کی روح رواں ہیں ذاتی امام باڑہ رکھتے ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ سنبھل کی اس شہرۂ آفاق عزاداری میں برادران ہنود بھی جوش و خروش سے شریک رہتے ہیں۔ یہ ہے سنبھل کی عزاداری کا مختصر اور مجمل خاکہ جو برادران اہلسنت کے ہاتھوں ان کے اپنے محلوں میں ہوتا ہے۔

اور جس کو دیکھ کر کہنا پڑتا ہے کہ ؎

والله کر اسے حسینؑ کا رکردی

نوریوں سرائے کی عزاداری

نوریوں سرائے شہر سنبھل کے جانب شرق ایک میل پر سادات کی پرانی بستی ہے۔ جس کی عزاداری کی تاریخ اُس کی آبادی کی تاریخ ہی کا ہے میں نے اپنے بزرگوں اور انھوں نے اپنے بزرگوں سے سنا ہے کہ نوریوں سرائے میں حسینؑ کی یاد اس وقت بھی منائی جاتی تھی جب محلے کے عورت مرد ایک مخصوص مقام پر جمع ہو کر رہ رو تے تھے۔ آج کل محلے میں چار امام باڑے ہیں ان کے علاوہ اکثر مجلسیں مکانوں میں بھی ہوتی ہیں۔

اب سے پچیس ۲۵ برس پہلے اور اس کے بعد کی عزاداری کا میں اس بستی نے جو ترقی کی خدا نگاہ بد سے بچائے اگرچہ اس ترقی کا ہیرو (مرحوم رحمن حسن) پاکستان جا کر نذر اجل ہو گیا لیکن بحمد اللہ عزاداری سے متعلق اس کی تمام ایجادات اس کا بھانجہ سید قربان حسین اسی انہماک اور جوش و خروش سے انجام دے رہا ہے جس جوش و خروش سے مرحوم نے شروع کی تھیں۔ اس امام باڑہ میں ہر محرم سے کوئی نہ کوئی زیارت (گہوارہ تابوت) ہوتی ہی رہتی ہے۔

۷ محرم کو مہندی کا بے پناہ جلوس امام باڑہ سید محمد عباس سے شروع ہو کر اور شام رات کا گشت کرکے ذوالجناح کے ساتھ جو راستہ میں امام باڑہ سید صغیر حسن سے نکلتا ہے اسی امام باڑہ پر ختم ہوتا ہے۔

عشرہ (۱۰ تاریخ کا جلوس) کا جلوس ذوالجناح، تابوت اور گہوارے وغیرہ کے ساتھ امام باڑہ سید صغیر حسن سے شروع ہو کر بستی کا گشت کر کے پانچ بجے شام کربلا پہونچتا ہے:

بستی میں چار مردانی اور چار مستورات کی مجالس ہوتی ہیں۔ ہر مجلس اور ہر جلوس کے ساتھ بستی کے نوجوان لڑکوں کی انجمن بہت ہی جوش و خروش اور ذوق و شوق سے ماتم کرتی اور نوحہ خوانی کرتی ہے۔ محلہ حسین خاں سرائے نوریوں سے کچھ ہی فاصلہ پر چند گھروں لیکن خالص شیعوں کی بستی ہے یہ بھی اپنے تمام مراسم عزا اسی طرح ادا کرتی ہے جس طرح نوریوں سرائے صرف ۷ محرم کے جلوس اور عشرہ میں نوریوں سرائے کے ساتھ شامل ہو جاتی ہے۔ حسین خاں سرائے وہ چھوٹی سی بستی ہے جس نے علامہ مولانا تفضل حسین صاحب جیسے عالم اور خان بہادر سید جعفر حسین بارایٹ لا جیسے نامی گرامی اشخاص پیدا کئے افسوس کہ انقلاب زمانہ نے اس بستی کے بہت مفتخر حضرات کو ہم سے دور کر دیا لیکن بقیہ حضرات قابل تعریف ہیں کہ عزاداری مظلوم میں اسی طرح منہمک ہیں جیسے اب سے بیس سال پہلے منہمک رہتے تھے۔

ذمہ داران افسران کی طرف سے خاص خاص تاریخوں پر بہت اچھا انتظام رہتا ہے۔ محرم کے علاوہ دونوں بستیاں ولادت و وفات آئمہ معصومین پر جلسوں اور تابوتوں کی صورت میں سوگ مناتے رہتے ہیں۔ دونوں بستیاں چہلم سید الشہداء بھی اسی طرح مجالس و ماتم کے ساتھ انجام دیتی ہیں۔

کشمیر میں شیعیت و عزاداری

سید محمد باقر بن احمد الموسوی الصفوی، بڈگام

تقریباً ساتویں صدی ہجری تک سرزمین کشمیر میں قدرت نے اشاعتِ اسلام کا انتظام نہیں کیا گو یہ دل پذیر خطہ اس وقت جغرافیائی اور تمدنی لحاظ سے اپنے ہمسایہ ملکوں سے ممتاز مانا جاتا تھا، اور اس کی شہرت بین الاقوامی حیثیت اختیار کر چکی تھی، لیکن خدا کے آخری پیغام کی آواز اس ملک میں مذکورہ صدی تک نہیں پہونچ پائی تھی اللہ تعالیٰ جب کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو اس کے لئے ویسے ہی مقدمات اور اسباب کو وجود کا لباس عطا فرماتا ہے۔ ساتویں صدی کے آغاز کے بعد ترکستان کے ایک ولی صفت بزرگ کے دل میں کشمیر آنے کا ولولہ پیدا ہوا۔ چنانچہ انھوں نے اپنے مرزبوم سے حرکت کی۔ سفر کے مرحلے طے کر کے وارد کشمیر ہوئے ان کا نام سید عبدالرحمٰن تھا اور بلبل شاہ کے نام سے بعد میں مشہور ہو گئے۔

اس زمانہ میں رینچن شاہ کشمیر کا راجہ تھا وہ ہندو دھرم کا قایل تھا اور رعایا بھی اسی مسلک پر گامزن تھی۔ بلبل شاہ نے یہاں پہونچ کر سب سے پہلے بادشاہ کو اسلام کے حلقہ میں داخل کیا، جس کے سبب وزیر اعظم اور دوسرے ارکین سلطنت نے بھی دین اسلام قبول کیا اور تبلیغ اسلام کا دائرہ روز بروز بڑھتا گیا ظاہر ہے کہ لوگ اپنے فرماں رواؤں کے مسلک پر چلتے ہیں، بادشاہ کے مسلمان ہونے سے لوگوں نے بھی اسلام اختیار کیا۔ بادشاہ نے پھر اپنا لقب صدرالدین رکھا اور اپنے رہبر بلبل شاہ کی سکونت کے لیے ایک خوشنما خانقاہ تعمیر کروائی، جو اس وقت بلبل لنگر کے نام سے مشہور ہے۔ اسی خانقاہ میں سید صاحب نے وفات پائی اور وہیں سپرد خاک ہوئے۔ بادشاہ بھی اسی کے احاطے میں دفن ہوا۔

بلبل شاہ کی تبلیغ اسلام سے کچھ عرصہ بعد جناب میر سید علی ہمدانیؒ کشمیر آئے۔ اُنھوں نے اشاعت دین میں تجدید کی اور جو خامیاں بلبل صاحب کے عہد میں رہ گئی تھیں وہ دور کر کے تبلیغی تحریک میں نئی رُوح پھونک دی۔

تاریخ کشمیر نے یہ حقیقت اجمالی طور پر لکھی ہے کہ ان دونوں بزرگوں نے مذہب سُنّی کی سطح پر تبلیغ کی یہی وجہ ہے کہ ان ادوار میں کہیں شیعوں کا واضح تذکرہ نہیں ملتا۔ اگرچہ جناب میر شمس الدین عراقی رحمۃ اللہ علیہ کے ورود تک کئی سادات یہاں آئے اور اکثر نے اسی خطے میں انتقال کیا،

جو مذہباً شیعہ تھے۔ لیکن انھوں نے علانیہ طور پر شیعہ مذہب کی تبلیغ نہیں کی یا ماحول نے ان کو اس قسم کی تحریک چلانے نہیں دی۔ لہذا مؤرخین کشمیر نے بالاتفاق تسلیم کیا ہے کہ جس شخص نے کشمیر میں مذہب اہلبیت کی بنیاد ڈالی ہے وہ میر عراقیؒ صفوی کی ذات ہے اور کشمیر میں شیعیت و عزاداری کی تاریخ انھیں سے باضابطہ شروع ہوتی ہے۔ میر عراقی نسبی اعتبار سے صفوی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ جناب صفی الدین اردبیلی ان کے جداعلیٰ ہیں۔ صفی الدین پر میر عراقی اور ایران کے سلاطین صفویہ کا نسب جا ملتا ہے۔

میر عراقیؒ ایران میں پیدا ہوئے اور وہیں تحصیل علم بھی کی، علم اور ریاضت کے اعلیٰ مراتب پر فائز ہو کر ان کی شہرت دُور دُور تک پھیلنے لگی۔ کشمیر کے مورخین نے ان کو تعصب کی بنا پر انتہائی گھناؤنے خدوخال میں پیش کر دیا ہے۔ اس کے باوجود ان کی علمی قابلیت کو ہر جگہ سراہا ہے۔ مؤرخ حسن نے ان کے بارے میں لکھا ہے "عالم اجل و دانائے بے بدل بود" بہر حال قدرت کو اسی بزرگوار کی ذات سے کشمیر میں شیعہ مذہب کی اشاعت کا کام لینا منظور تھا چنانچہ زمانہ کی ناسازگاری کے باوصف اس کے لیے اسباب کی فراہمی کی۔ میر عراقی دو دفعہ کشمیر آئے۔ پہلے ۸۹۲ھ میں سلطان حسین مرزا حاکم خراسان کی طرف سے بحیثیت سفیر تشریف لائے۔ یہ کشمیر میں سلطان حسن شاہ کی حکومت کا زمانہ تھا۔ یہاں پہونچ کر سفارت کے مراسم کو مضبوط کر کے اس کے مقاصد کو تکمیل کا جامہ پہنایا، لیکن تبلیغ مذہب کا ارادہ جو ان کے دل میں تڑپ رہا تھا اور جو خاندان صفوی کا خاصہ تھا کشمیر میں تحریک کی شکل اختیار کر گیا چونکہ بادشاہ اور رعیت حنفی مذہب تھے۔ اس لیے اس نوع کی تحریک کھلے بندوں چلانا مناسب نہ تھا۔ لہذا انھوں نے نہایت ہوشمندی اور دُور اندیشی سے کام لے کر مخفی طور سے تبلیغ شروع کی اور کشمیر کے بعض رئیس اور معتبر اشخاص کو مذہب اہلبیت کا پیرو بنا دیا ــــــــ آٹھ سال کے بعد مراجعت فرمائے وطن ہوئے دوسری مرتبہ سلطان فتح شاہ کے عہد فرماں روائی میں محض تبلیغ مذہب کی غرض سے آئے۔ اس دفعہ ان کے ہمراہ علماء، فضلاء اور دو ہزار ارباب کمال تھے۔ یہاں پہونچنے کے بعد ملک خاندان اور چک گھرانے کو شیعہ بنا دیا۔ اور شیعیت کے ساتھ عزاداری کی ترویج بھی ہوتی رہی۔ یہ دونوں گھرانے اس وقت زبردست اقتدار اور سیاسی اہمیت کے لحاظ سے بڑے امتیاز کے حامل تھے، آگے چل کر چک خاندان میں سے کچھ کشمیر کے تخت و تاج کے مالک بن گئے۔ ملک خاندان نے وزارت کا قلمدان سنبھالا۔ ملک حیدر چاڈورہ جہانگیر کے عہد میں رئیس الملک بنا۔ ان برگزیدہ افراد کی کمک سے میر عراقیؒ کے تبلیغی کام نے حیرت انگیز کامیابی حاصل کی۔ اور اچھے نتائج رونما ہوئے۔ میر عراقیؒ نے کشمیر کے معتدبہ حصے میں شیعہ مذہب کا پرچار کیا

اور کامیاب رہے مدارس کھولے اور مسجدیں بنوائیں - لیکن مخالف گروہ جو اس وقت حکومت کی زمام دار تھا - اس تحریک کی ترقی میں مزاحم ہوا اور اس کو آگے بڑھنے نہیں دیا - ایسا نہ ہوتا تو کشمیر کی تاریخ کچھ اور ہوتی ! -

میر عراقی پھر تبت اسکردو کے لیے روانہ ہو گئے - وہاں بھی امامیہ مذہب کی بنیاد ڈالی اور کامرانی حاصل کی، ماحول کو جب ذرا موافق پایا تو پھر کشمیر آئے یہاں جڈی بل میں ایک تاریخی خانقاہ بنائی اور تبلیغی سرگرمیوں میں خاصا انہماک دکھایا - آخر میں مخالفوں کے ہاتھوں شربت شہادت نوش کر کے ابدی زندگی سے ہم کنار ہوئے اور اپنی خانقاہ میں دفن ہو گئے، تھوڑے عرصہ کے بعد ان کا لاشہ وہاں سے نکال دیا گیا اور چاڈورہ میں آخری آرامگاہ قرار پائی -

میر عراقیؒ کے انتقال کے بعد ان کے فرزند میر سید دانیال باپ کے جانشین ہوئے، علمی اور روحانی کمالات نے اپنے باپ کی زندہ تصویر تھے - انھوں نے بھی مذہب حق کی اشاعت و تحفظ کی خاطر بیش بہا قربانیاں دیں - جن میں ان کا بقول مؤرخ حسن شاہ تین سال محبوس رہنا ہے - یہاں تک کہ ان کو اپنے اجداد طاہرین کی طرح جام شہادت پینا پڑا -

کشمیر، کرگل اور اسکردو میں جو شیعیت و عزاداری کی بہار نظر آتی ہے دراصل یہ میر عراقیؒ اور ان کے اولاد و احفاد کی انتھک کوششوں کا ثمر ہے - اس میں شک نہیں کہ ان مقامات میں اس باغ کی بنیاد انھوں نے ڈالی ہے اور اس کے پودوں کو اپنے لہو سے سینچا ہے - جس کا پتا پتا ______ جس کا بوٹا بوٹا ______ جس کی ڈالی ڈالی، رہتی دنیا تک اپنی دلفریب بہاریں دکھاتے رہیں گے -

نوحہ

(خدائے سخن میر انیس اعلی اللہ مقامہٗ)

شبیر نے خیمہ کی یہ ڈیوڑھی پہ پکارا، مارے گئے اکبرؑ
گھر لٹ گیا، اے بانوئے ناشاد تمہارا، مارے گئے اکبرؑ

ہم بیکس و تنہا ہوئے واحسرت و دردا، واحسرت و دردا
جینے کا ہمارے نہ رہا کوئی سہارا، مارے گئے اکبرؑ

زینبؑ سے یہ کہہ رو کر کے چاک گریباں پیٹے بصد افغاں
نیزے سے ترے لال کا دل چھد گیا سارا، مارے گئے اکبرؑ

چاہا تھا کہ ہم پہلے گلا اپنا کٹائیں، بیٹے کو بچائیں
تقدیر سے لیکن نہ چلا زور ہمارا، مارے گئے اکبرؑ

اٹھارہ برس کی مری دولت ہوئی برباد، فریاد زفریاد
تنہا ہوا اب حیدرِ کرار کا پیارا، مارے گئے اکبرؑ

اب ذبح کریں گے ہمیں خنجر سے ستمگار، اے بانوئے ناچار
لاشہ بھی اُٹھانے کا نہیں کوئی ہمارا، مارے گئے اکبرؑ

نکلی ہوئی تھی سوکھی زباں ہونٹوں سے باہر، میں پیاسا تھا کیونکر
دو بار کیا ہاتھ سے پانی کا اشارا، مارے گئے اکبرؑ

دنیا سے گئے سینے پہ پھل برچھی کا کھا کر، اے وائے مقدر
کیوں مجھکو نہ پہلے ستم ایجاد نے مارا، مارے گئے اکبرؑ

غل ہوتا تھا خیمے میں انیسؔ آہ و بکا کا، ساماں تھا عزا کا
جب کہتا تھا رو کر اسد اللہ کا پیارا، مارے گئے اکبرؑ

نوحہ

(میر مونس اعلی اللہ مقامہ)

زنداں میں حرم کرتے تھے رو رو کے یہ زاری، نادان سکینہؑ
ہے ہے گئی بابا کے لئے جان تمھاری، نادان سکینہؑ

کُرتا ہے پھٹا، کان ہیں مجروح مری جان اور زلف پریشان
غربت ہے عجب چھوٹی سی میت پہ تمھاری، نادان سکینہؑ

کیا خلد گئیں کھینچ کے اک نالۂ جاں کاہ، شبیرؑ کے ہمراہ
لینے کو تمھیں آئی تھی بابا کی سواری، نادان سکینہؑ

صدقے گئی پردیس میں بہنوں کو بھی چھوڑا، منھ ماں سے بھی موڑا
اب پیار سے آتی نہیں گودی میں ہماری، نادان سکینہؑ

اس پھول سے عارض پہ طمانچوں کے نشاں ہیں، مادر کسے دکھلائے
بن باپ کی بچی تری صورت کے میں واری، نادان سکینہؑ

مادر بھی نہیں سر پہ، کفن دے تمھیں کیونکر۔ یہ بیکس و مضطر
نادار ہے، محتاج ہے ماں درد کی ماری، نادان سکینہؑ

نوحہ

میر انیس اعلی اللہ مقامہٗ

رو کے چلاتی تھیں زینبؑ مرے ماں جائے حسینؑ
ذبح دو روز کے پیاسے ہوئے تم ہائے حسینؑ

اب تلک سوتے ہو بے گور و کفن مقتل میں
صدقے بہنا تری مظلومی کے ہو جائے حسینؑ

لئے جاتے ہیں لعیں باندھ کے بازو مجھ کو
کس طرح فاتحہ زینبؑ ترا دلوائے حسینؑ

دم بدم بالی سکینہؑ تمھیں کرتی ہے طلب
تم کو کس جا سے بہن ڈھونڈھ کے لے آئے حسینؑ

میں تڑپتی رہی اور پھول سے تن پر ہے ہے
زخم تیر و بتر و تیر و سناں کھائے حسینؑ

گھر لٹا، خیمہ جلا، چھن گئی سر پر سے ردا
آ کے اس دشت میں کیا کیا نہیں دکھ پائے حسینؑ

تم تو جنت میں گئے، فاطمہ زہرا کے حضور
نیل بازو کے یہ زینبؑ کسے دکھلائے حسینؑ

قید زنداں کی مصیبت میں ہوں کچھ بس نہیں اب
کس طرح قبر میں زینبؑ تمھیں دفنائے حسینؑ

اب نہ قاسمؑ ہیں نہ اکبرؑ ہیں نہ عباسؑ علی
کون رسی مرے بازو سے یہ کھلوائے حسینؑ

انیسؔ کی ہے یہ تمنا کہ ہو جب حشر کا دن
اپنے ہمراہ مجھے خلد میں لے جائے حسینؑ

سرفراز
لکھنؤ
ہفتہ وار
جلد ۴۷، ۱۷ مارچ سنہ ۶۹ء، نمبر ۱

شیعہ مفتی اعظم ہندستان کا انتقال پُرملال

۷ مارچ کو سہ پہر کے ساڑھے پانچ بجے شیعہ مفتی اعظم ہندستان مولانا سید احمد علی صاحب قبلہ علم و عمل کی دنیا کو ہمیشہ کے لئے سُونا کر گئے۔ یوں تو آپ عرصہ سے صاحب فراش تھے اور آپ کی جانبری سے کچھ مایوسی سی ہو گئی تھی لیکن یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ ممدوح کے انتقال پُر ملال کی خبر اچانک سُننے میں آجائے گی۔

مفتی اعظم اعلی اللہ مقامہ بظاہر تو امراض قلب میں مبتلا تھے لیکن اصل مرض بڑھاپا اور ضعف تھا۔ آپ ۸۵ سال کی عمر کو پہونچ چکے تھے اور ہندستان و پاکستان کے سارے علماء میں سب سے زیادہ کبیر السن تھے۔

علمائے برصغیر کو اگر تین طبقوں میں تقسیم کیا جائے تو طبقۂ اول کے علمائے کبار میں مولانا سید سبط حسین صاحب قبلہ جائسی جونپوری، مولانا سید محمد حسین صاحب قبلہ الہ آبادی، شمس العلماء مولانا سید ناصر حسین صاحب قبلہ، شمس العلماء مولانا سید نجم الحسن صاحب قبلہ، مولانا سید باقر صاحب قبلہ، مولانا سید ظہور الحسن صاحب قبلہ وغیرہ کا شمار کیا جا سکتا ہے۔ مفتی اعظم مرحوم نے صفِ اول کے علماء کا دور بھی گزارا اور صفِ دوم کے علماء کا بھی جواب اس دنیا میں باقی نہیں ہیں اور تیسری صف کے علماء کا دور بھی دیکھا جو ماشاء اللہ اس وقت بقید حیات ہیں۔

اس وقت برصغیر ہندستان و پاکستان میں ان کے طبقہ کا کوئی عالم موجود نہیں تھا اور سن و سال کے اعتبار سے سب سے زیادہ معمر تھے۔ موجودہ دور کے علماء میں صلاحیت و استعداد اور انداز فکر و نظر کے اعتبار سے خاص درجہ رکھتے تھے۔ وہ بلاشبہ اس برصغیر میں بڑے بلند پایہ مدرس تھے۔ آپ کی ساری زندگی درس و تدریس میں گزری۔ آپ نے تقریر اور تصنیف و تالیف سے کوئی غرض نہیں رکھی بلکہ مرحوم کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ آپ چالیس بیالیس برس اونچے درجہ کے طلباء کو اصول فقہ کی تعلیم دیتے رہے۔ فقہ میں اپنا نظیر نہیں رکھتے تھے اور اسی لئے آپ مفتی اعظم کے لقب سے مشہور تھے۔ عربی شاعری پر بھی پورا عبور حاصل تھا اگرچہ کم گو تھے مگر عربی زبان میں بڑی روانی سے شعر و شاعری کر لیتے تھے۔

مفتی اعظم صاحب قبلہ ہندستان کے عظیم مجتہد و عالم مفتی میر محمد عباس صاحب قبلہ کے چھوٹے صاحبزادے تھے۔ آپ بالکل صغر سنی ہی میں یتیم ہو گئے تھے۔ شمس العلماء مولانا سید نجم الحسن صاحب قبلہ اعلی اللہ مقامہ نے آپ کو بچپن ہی سے اولاد کی طرح پرورش کیا تھا اور تعلیم و تربیت دی تھی۔ پھر اپنی والدہ کے ہمراہ حصول تعلیم کے لئے عراق تشریف لے گئے اور وہاں کے مستند اور جید علماء سے کسب فیض کیا اور گیارہ سال قیام کے بعد سند اجتہاد حاصل کر کے وطن واپس تشریف لائے۔ شمس العلماء مولانا سید نجم الحسن صاحب قبلہ نے آپ کو امروہہ کے مدرسہ سید المدارس کا پرنسپل مقرر کر دیا۔ پھر اپنی زندگی ہی میں شمس العلماء اعلی اللہ مقامہ نے جو ہندستان کی وسیع و بلند پایہ درس گاہ مدرسہ ناظمیہ کے بانی تھے مفتی صاحب مرحوم کو اپنی زندگی ہی میں اپنا نائب مقرر کر دیا اور نجم العلماء کی وفات کے بعد مفتی صاحب مدرسہ کو ۷ مارچ سنہ ۶۹ء تک کامیابی کے ساتھ چلاتے رہے۔ آپ کے کوئی اولاد نرینہ

نہیں ہے صرف ایک صاحبزادی ہیں آپ کے خویش کا نام سید تقی رضا صاحب ہے جو صاحب اولاد ہیں۔

اس سلسلے میں مرحوم کا ایک کارنامہ یہ بھی تھا کہ ملک کی تقسیم خاتمہ زمینداری اور سقوط ریاست حیدرآباد کے بعد مدرسہ کے زندہ و باقی رکھنے کے لیے آمدنی کے سارے سرچشمے خشک ہو چکے تھے لیکن یہ مرحوم ہی کا دم خم تھا کہ ۱۹۴۷ء کے بعد سے اب تک وہ مدرسہ کے اخراجات کے لئے کسی نہ کسی طرح سرمایہ فراہم کرتے رہے اور اس سرچشمہ علم کو خشک نہ ہونے دیا۔

آپ کے انتقال کی خبر رات ہی کو سارے شہر میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی تھی۔ صبح کو جنازہ غسل خانہ دریائے گومتی لے جایا گیا جس کے ہمراہ ہزاروں کا مجمع موجود تھا۔ غسل کے بعد میت ناظمیہ کالج کی عمارت میں لائی گئی۔ اور اس حجرہ میں دفن کیا گیا جہاں آپ کے استاد و سرپرست اور مربی سرکار نجم العلماء مولانا سید نجم الحسن صاحب قبلہ مدفون ہیں نماز جنازہ جناب تاج العلماء مولانا سید محمد ذکی صاحب قبلہ نے پڑھائی۔

مفتی اعظم صاحب قبلہ مرحوم کا سانحہ ارتحال قوم کے لئے تو یکے از روز صدمہ ہے ہی لیکن ناظمیہ کالج کے لیے واقعی سب بڑا سانحہ عظیم ہے۔ اور آپ کے انتقال کے بعد سوال پیدا ہوتا ہے مدرسہ کی پرنسپلی کا۔ ناظمیہ کالج کا پرنسپل ایسا ہونا چاہیئے جو نہ صرف علوم دینیہ ہی میں بلند درجہ رکھتا ہو بلکہ اس میں یہ خصوصی صلاحیت بھی ہو کہ وہ اس مشکل زمانہ میں مدرسہ کو سابقہ روایات کے تحت خوش اسلوبی کے ساتھ چلاتے رہنے کے لئے ضروری سرمایہ بھی فراہم کر سکے۔

یوپی میں کانگریس بھرپور اقتدار

یوپی لیجسلیٹو اسمبلی کی ۴۲۶ نشستوں میں سے ابھی ۴۲۴ نشستوں کا اعلان ہو چکا ہے۔ ایک سیٹ کا الکشن باقی ہے اور ایک ممبر کی نامزدگی گورنر کو کرنا ہے۔ ان ۴۲۴ سیٹوں میں سے کانگریس ۲۰۹ سیٹوں پر قابض ہو چکی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ایوان کے اندر اکثریت میں تو ہے مگر ایسی اکثریت میں نہیں ہے کہ صرف اپنے دست و بازو کی قوت پر کسی اور سہارے کے بغیر پائیدار حکومت بنا سکتی لیکن اس صوبہ کے مرد آہن کہلائے جانے والے نیتا شری سی' بی گپتا نے

یہ بزم ہے یہاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی
جو بڑھ کے خود اٹھالے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے

ہمت سے کام لے کر صوبہ میں اپنی وزارت بنا لی۔ ان کی سیاسی سوجھ بوجھ سے امید ہے کہ وہ جہاں ابتدا ہی میں ۲' ۵ آزاد ممبروں کو اپنی طرف ملانے میں کامیاب ہوگئے ہیں وہاں اور ممبروں کو بھی کانگریسی حکومت کی تائید پر آمادہ کر لینے میں کامیاب ہو سکیں گے اور وہ موجودہ مدت کی میعاد میں کانگریس کے ہاتھ سے اقتدار کو نہ نکلنے دیں گے۔

کانگریس کو سب سے زیادہ نقصان اس کی آپس کی پھوٹ نے پہنچایا ہے جس کی وجہ ہے صوبہ کے مجموعی مفاد کے مقابلہ میں اپنے ذاتی مفاد کو ترجیح دینا۔ ظاہر ہے کہ کبھی کے ۴۲۶ ارکان کو تو منسٹریاں نہیں مل سکتیں' وزارتوں کی تعداد بہرحال گنی چنی ہوتی ہے۔ اب جس کسی بارسوخ و مقتدر کانگریسی کو کابینہ میں جگہ نہیں ملی وہی روٹھ گیا اور اس نے اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ کھڑی کر لی۔ کانگریس کے اثر و اقتدار والے ارکان اس بنا پر بغاوت کر کے کانگریس کے مقابلہ میں اپنی جداگانہ تنظیم کر لیتے ہیں کہ ہمیں کرسی کیوں نہیں ملی یا وزیر اعلیٰ ہمیں جو ملنا چاہیئے تھا یا ہمارے فلاں منظور نظر کو وزارت میں نہیں لیا گیا یا یہ کہ وزیر اعلیٰ ہمارے اشارہ چشم و ابرو پر کام کیوں نہیں کرتے۔ چودھری چرن سنگھ کی ناراضی کا سبب بھی ایسی ہی باتیں تھیں جس سے بددل ہو کر انھوں نے علیحدگی اختیار کر لی اور سنکیت دردھاٹک دل بنا کر تمام مخالف پارٹیوں کو متحد کر لیا اور کانگریس کے بے دخل کر کے

اپنی حکومت بنالی اور دس مہینے راج پاٹ کا مزہ لوٹ لیا۔

اب کی بھی مسٹر سی' بی' گپتا نے اپنی کابینہ میں بہت سے پرانے اور پختہ کار کانگریسیوں کو نظر انداز کرکے نئے چہروں کو شامل کر لیا ہے۔ جس کی وجہ سے اندیشہ ہے کہ کہیں مستقبل قریب میں اقتدار سے محرومی بعض پرانے کانگریسی نیتاؤں کو کانگریس سے علیحدگی پر مجبور نہ کر دے۔ جب کوئی پرانا کانگریسی جس کی عمر ہی کانگریس کے اندر رہ کر گزری ہے جب اس سے الگ ہوتا ہے تو وہ اس میں ہزاروں کیڑے ڈالنے لگتا ہے جیسے کہ جب تک وہ خود کانگریس کے اندر تھا کانگریس ہر قسم کی برائیوں سے پاک و صاف تھی اور جیسے ہی وہ اس سے الگ ہوا اس میں دنیا کی ساری برائیاں اچانک پیدا ہو گئیں اور وہ اس قابل نہیں رہی کہ عوام اس کی طرف توجہ کریں۔

گپتا جی کی ۱۶ رکنی کابینہ سے بھی گپ، اسنگھ جی جیسے کانگریسی نیتا مطمئن نہیں ہیں۔ ڈر ہے کہ کہیں یہ عدم اطمینان غیر مطمئن کانگریسی لیڈروں کو بھارتیہ کرانتی دل میں شامل ہو جانے یا اپنی کوئی الگ تنظیم کھڑا کر لینے پر آمادہ نہ کر دے۔ گپتا جی کا اس وقت سب سے بڑا سیاسی کارنامہ یہ ہوگا کہ وہ کانگریس میں پھوٹ پڑنے کی نوبت نہ آنے دیں۔

گپتا جی کے موجودہ دور حکومت کو ڈگ قدر کی نگاہ سے دیکھیں گے اگر وہ اپنے صوبہ کو سختی سے کام لے کر فرقہ وارانہ بلوؤں سے پاک و صاف رکھیں اور سابق ادوار کی طرح میرٹھ اور الہ آباد کے ایسے بلوے ظہور پذیر نہ ہونے پائیں۔ گپتا جی کی توجہ کے لیے دوسری خاص بات یہ ہے کہ صوبہ میں غلے اور اشیائے خوردنی کے دام پھر چڑھنے لگے ہیں اور ان کے برسر اقتدار آنے کے وقت ہی سے جو آٹا ایک سیر چار چھٹانک بک رہا تھا وہ ایک کیلو کا رہ گیا۔

اگر سستے غلے کی سرکاری دوکانوں پر فی کس راشن کی مقدار بڑھا کر زیادہ نہیں صرف تین چھٹانک ہی کر دی جائے تو بازار کا بھاؤ خود بخود گر جائے گا۔

سرفراز کا تاریخ عزاداری نمبر

ہم نے ارادہ تو یہ کیا تھا کہ محرم نمبر ۹ مارچ ہی کو شائع ہو جائے تاکہ عشرہ شروع ہونے سے بہت پہلے یہ پرچہ ناظرین کے ہاتھوں تک پہنچ جائے لیکن بہتر مضامین کے تاخیر سے آنے کی وجہ سے ایسا کرنا ناممکن ہو گیا اور اب یہ نمبر ۲۰ مارچ کو شائع کیا جا رہا ہے جب کہ ذی الحجہ کی ۲۰ تاریخ ہوگی۔

ابکی محرم نمبر کا موضوع ہم نے ایسا مقرر کیا تھا جو ایک حیثیت سے بڑا دلچسپ پرکشش معلوماتی اور افادیت کا حامل تھا لیکن ہمیں جو مضامین موصول ہوئے انھیں پڑھ کر مایوسی ہوئی۔ زیادہ تر حضرات نے اپنے یہاں کی عزاداری کے ایسے حالات قلم بند کرکے بھیج دیئے جیسے ہر سال عشرۂ محرم کے بعد سرفراز میں عزاداری کی رپورٹوں کی شکل میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ اصل میں ہمارا مطلب تو یہ تھا کہ ہر شیعہ بستی کی تاریخ اور جغرافیائی حیثیت دی جائے' یہ بتایا جائے کہ وہاں شیعہ کب سے آباد ہیں وہ کب آئے' کیسے آئے انھوں نے عزاداری کے سلسلے میں کیا کیا کام انجام دیئے اور ان کی عزاداری کن کن مرحلوں سے گزر کر موجودہ حالات میں آئی ہے۔ بعد میں موجودہ طریقۂ عزاداری مختصر طور پر بتا دیئے جاتے مگر سارا زور ماضی کے حالات پر دیا جاتا۔

بس کمتر مضامین ایسے ہیں جن میں کسی بستی کی تاریخ عزاداری سے بحث کی گئی ہے۔ ان میں سے ہم صرف اتنے مضامین لے رہے ہیں جو وقت سے آ گئے تھے جن کی کتابت آسانی سے ہو سکی اور جو مجوزہ نمبر کے مقررہ صفحات کو پر کر سکے۔

بس ایک جامع و بسیط مضمون الحاج علامہ سید سبط الحسن صاحب فاضل ہنسوی مدظلہ کا اس مبارک نمبر میں شائع کیا جا رہا ہے

یہ محرم نمبر کی جان و روح سمجھنا چاہیئے۔ اس میں مستند حوالوں سے واقعی تاریخ عزاداری بیان کی گئی ہے۔ یہ مضمون بڑا معیاری، معلوماتی اور عالمانہ ہے اور اس کو پڑھ کر فاضل جلیل کی وسعت نظر و مطالعہ کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ ہم دست بدعا ہیں کہ خدا ممدوح کو طول عمر عطا کرے اور وہ تندرست و توانا رہیں تاکہ مذہب کی اسی طرح خدمات بجا لاتے رہیں۔ ہمیں اس کا علم ہے کہ موصوف کو اپنے فرائض منصبی کی انجام دہی کے بعد تصنیف و تالیف کے لئے موقع بہت کم ملتا ہے لیکن پھر بھی مذہبی مفاد اس کا متقاضی ہے کہ ممدوح کے دماغ میں علوم و افکار اور معلومات کے جو بیش بہا ذخیرے محفوظ ہیں وہ کسی طرح صفحہ قرطاس پر آسکیں تاکہ دنیا والے ان سے آئندہ ہمیشہ مستفید ہوتے رہیں تقریر سے کہیں زیادہ مفید تحریر ہوتی ہے اس لئے کہ اول الذکر کا مفاد وقتی اور محدود اور آخرالذکر کا فائدہ غیر محدود و ابدی ہوتا ہے۔

علامہ ہندی کا یہ مقالہ اس قابل ہے کہ اسے بہترین کتابت و طباعت اور بہترین گیٹ اپ کے ساتھ کتابی شکل میں شایع کیا جائے۔

جن مضامین میں تاریخ عزاداری سے بحث کی گئی ہو ان میں جونپور، جلالی، سیتاپور، مبارک پور، کشمیر اور کندرکی سے متعلق مضمون قابل ذکر ہیں۔

شیعوں کی بہت سی قدیم بستیوں سے کوئی بھی تاریخی مضمون موصول نہیں ہوا۔ مثلاً امروہہ، نوگانواں، فیض آباد جائس وغیرہ۔ ان بستیوں میں آجکل عزاداری کے جو طریقے رائج ہیں ان کے بیان کرنے سے کوئی فائدہ نہیں اصل میں ہر بستی کی تاریخ عزاداری سے بحث ہونا چاہیئے تھی۔ امروہہ سے ایک مضمون آیا بھی لیکن اس میں امروہہ کی تاریخ عزاداری اور تاریخ شیعیت سے کوئی بحث نہیں کی گئی ہے۔ یہ مضمون امروہہ جیسی اہم اور قدیم بستی کے شایان شان نہیں ہے جو قرنوں سے ہندستان میں شیعوں کا اہم گڑھ خیال کیا جاتا رہا ہے۔

جلالی، پتور وغیرہ سے کئی کئی مضمون مختلف حضرات نے بھیجے ہیں۔ جن میں "تاریخیت" بہت کم ہے اور موجودہ عزاداری کے حالات زیادہ۔ پھر ہمارے لئے یہ طے کرنا دشوار ہو گیا کہ ان میں سے کونسا مضمون دیا جائے اور کونسا نہ دیا جائے۔ یہی حال خود ہمارے قصبہ کندرکی کا تھا جہاں دو صاحبوں نے اپنے اپنے طور پر مضامین قلم بند کر کے بھیجے تھے لیکن چونکہ وہ ہمارے وطن کا معاملہ تھا اس لئے ہم نے ان دونوں مضامین کو اپنے طور پر ملا کر ایک مضمون بنا دیا لیکن دوسری بستیوں کے متعلق ہم ایسا نہیں کر سکتے تھے۔ ہمیں نہ اس کا حق تھا اور نہ ہم اصل مقامی حالات سے ناواقفیت کی بنا پر اس پوزیشن میں تھے کہ ہم کئی مضمونوں کو ملا کر ایک بنا دیں۔ جلالی کا مضمون چونکہ تاریخی حیثیت بھی رکھتا ہے اور وہ ایک ذمہ دار بزرگ کا علامہ جونپوری صاحب کی سفارش کے ساتھ آیا تھا اس لئے اسے ہم نے دے دیا ہے۔

تاریخ عزاداری کا یہ موضوع بڑا وسیع ہے جو ایک سال میں مکمل بھی نہیں ہو سکتا تھا یہ بسیط موضوع تو کئی سال کے محرم نمبروں ہی میں آسکتا ہے۔ بشرط حیات ہم آئندہ بھی اسی موضوع پر نمبر نکال سکتے ہیں لیکن اس کے لئے ہر بستی کے حضرات کو چاہیئے کہ وہ اپنے میں سے کسی ایک اہل قلم کو اپنی بستی کی تاریخ عزاداری قلم بند کرنے کا کام سپرد کر دیں اور باقی دوسرے حضرات مشورہ میں شریک رہیں۔ ہر بستی سے ایک ہی ذمہ دارانہ مضمون آنا چاہیئے۔ آئندہ محرم نمبر میں ابھی ایک سال کا وقت باقی ہے اگر سارے ہندستان کی شیعہ بستیاں اس کام کو اپنے اپنے یہاں ابھی سے محنت کے ساتھ شروع کر دیں تو آئندہ سال کا تاریخ عزاداری نمبر بڑا جامع اور وقیع نکل سکتا ہے

پہلے سے مضامین بھی آ سکتے ہیں۔ ان کی کتابت اور طباعت بھی رفتہ رفتہ کرائی جا سکتی ہے اور کسی مضمون کے متعلق ہمیں اگر کچھ پوچھنا ہو یا وضاحت ضروری ہو تو اس کے لئے خط و کتابت بھی کی جا سکتی ہے۔

علامہ سید مجتبیٰ حسن صاحب قبلہ کامونپوری مرحوم ہندستان کی تاریخ عزاداری کتابی شکل میں مرتب کرنا چاہ رہے تھے جس کے لئے موصوف نے ۱۹۶۸ء میں کچھ مواد بھی جمع کیا تھا ہماری درخواست پر ممدوح نے وہ سارا مواد ہمیں بھیج دیا جس کے لیے ہم ان کے شکر گزار ہیں مگر افسوس ہے کہ اس سارے ذخیرہ میں سے صرف تاریخ عزاداری [illegible] پر ہم کام میں لا سکے باقی مضامین ایسے ہیں جن پر [illegible] کا عارضہ ہو چکا ہے اور وہ اس وقت چھپ سکتے ہیں جب کہ ان کو سامنے رکھ کر کوئی محقق واقف کار از سر نو ہر مضمون کو ترتیب دے۔ بہر حال ہم علامہ موصوف کے شکر گزار ہیں۔

اس موضوع پر محترم فاضل مضمون نگار کی طرح بعض اور بلند پایہ اہل قلم حضرات کے مضامین بھی ملنا چاہیئے تھے جیسے مورخ اعظم علامہ کامونپوری، سرکار سید العلماء، [illegible] مولانا سعادت حسین خاں صاحب قبلہ اور ایسے ہی دوسرے افراد جن کے پاس استفادہ کے لیے ایسے گرانقدر کتب خانے موجود ہیں جو ایشیا کے بڑے کتب خانوں میں شمار ہوتے ہیں۔

جو مضامین ہمارے پاس باقی رہ گئے ہیں اور جو سب [illegible] اس اسپشل نمبر میں جگہ پا سکتے تھے مگر وقت اور گنجائش کی قلت کی وجہ سے وہ اس میں شامل نہ کئے جا سکے۔

اگر افراد ملت کو تاریخ عزاداری کے موضوع سے واقعی دلچسپی ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ آئندہ سال پھر اسی موضوع پر محرم نمبر نکالا جائے تو وہ ہمیں اپنے مشورہ سے آگاہ کریں اور ابھی سے کام کرنا شروع کر دیں۔

جب محرم نمبر کے سب مضامین لکھے جا چکے تھے اس وقت بالکل

آخر میں علامہ کامونپوری صاحب مد ظلہ نے اپنا عالمانہ مضمون ارسال کیا جس کو نہ معلوم کن دشواریوں اور دقتوں سے لکھوا کر نمبر میں شامل کیا گیا ہے۔

عمدۃ العلماء میموریل سوسائٹی کا قیام

لکھنؤ کے کچھ بیدار مغز [illegible] افراد اپنے جوش ایمانی سے مجبور ہو کر سرکار عمدۃ العلماء مولانا سید کلب حسین صاحب قبلہ طاب ثراہ کی یادگار میں کچھ مفید اور اہم کام انجام دینے کیلئے ایک سوسائٹی کا قیام عمل میں لائے ہیں جس کا بنیادی جلسہ جناب [illegible] صاحب محمود آباد (قیصر باغ منزل) کی صدارت میں ہوا۔

جلسہ میں لکھنؤ کے مختلف محلوں کے نمائندوں نے کثیر تعداد میں شرکت کی۔ سوسائٹی نے سب سے اہم کام اپنے ذمہ یہ لیا ہے کہ امام باڑہ غفرانمآب کی عمارت کو جسے اس کی پشت پر بہنے والا نالہ برابر نقصان پہنچا رہا ہے مضبوط و مستحکم بنانے کی ضرورت ہے۔ اس سلسلے میں ایک کام یہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ دونوں دالانوں کے درمیان کے دروازوں کے پاٹ نکال ڈالے جائیں تاکہ دونوں دالان ایک ہال کی شکل اختیار کر لیں اور اس کے [illegible] جا سکے۔

ایک تجویز یہ ہے کہ ہر پانچ سال بعد کسی مناسب [illegible] تاریخ [illegible] اور ہر پانچ سال [illegible] جایا کرے۔

مولانا مرحوم کے [illegible] سید [illegible] ایڈوکیٹ [illegible] منتخب کئے گئے [illegible] ہیں۔

تفصیل کا [illegible] عشرہ محرم کے بعد ہی دی جا سکے گی۔

زائرین عراق و ایران کی مشکلات

زائرین عراق و ایران کے مشکلات میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے: اب سال میں صرف ایک بار قرعہ اندازی ہونے لگی ہے جو جنوری میں ہو چکی۔ اس کے معنی ہیں کہ اب دسمبر تک کوئی زائر نہیں جا سکتا۔ اسی طرح کی دوسری مشکلات بھی ہیں۔ سرفراز نے بھی اور دوسرے شیعہ اداروں نے وقتاً فوقتاً ان پابندیوں کے خلاف احتجاج کیا اور چند سال پہلے جناب ابو محمد صاحب جے پی بمبئی نے اس سلسلے میں بڑی کدوکاوش کی۔ لکھنؤ میں عظیم پیمانے پر زائرین کانفرنس بھی منعقد ہوئی لیکن ابھی تک ہماری آواز صدا بصحرا ثابت ہوئی ہے بلکہ اُلٹا اثر ہو رہا ہے۔ جو کمیٹی نہ زائرین کے مسائل سمجھ سکتی ہے نہ اسے ہمدردی ہو سکتی ہے۔ لہٰذا ضرورت ہے کہ اس مسئلہ پر ملک گیر پیمانے پر احتجاج منظم کیا جائے۔ اس سلسلے میں سرفراز ہر ممکن خدمت کے لیے تیار ہے۔ مگر ضرورت ہے کہ حاجی ابو محمد صاحب جے پی اور دوسرے مومنین بمبئی اپنی پچھلی دلچسپی میں زیادہ سے زیادہ اضافہ فرمائیں۔

محرم نمبر کیلئے گرانقدر عطیہ

ہماری قوم کے محترم ہستی اور صوبہ بہار کے ممتاز ترین طبیب عالی جناب حکیم محمد صالح صاحب قبلہ مدظلہ آف پٹنہ نے سرفراز محرم نمبر کے لئے مبلغ پچاس روپیہ کا گرانقدر عطیہ مرحمت فرمایا ہے جو موصول ہو گیا ہے۔ ادارہ جناب ممدوح کا تہ دل سے شکر گزار ہے اور ان کے طول عمر اور صحت و عافیت کے لئے دست بدعا ہے۔

قومی سانحہ

اخبارات سے یہ پڑھ کر بڑا صدمہ ہوا کہ جناب مرزا بہادر مرزا محمد جعفر صاحب کا انتقال ہو گیا۔ مرحوم جناب مغفرت مآب آغا محمد علی خاں صاحب (ناظم صاحب) لکھنؤ کے بڑے پوتے تھے جو مرحوم اپنے دادا کے جانشین تھے۔ جامعہ ناظمیہ لکھنؤ کے سرپرست اعلیٰ اور امام باڑہ ناظم صاحب کے سینیئر متولی تھے۔ شہر کے بہت سے قومی اور مذہبی ادارے ان کی ذات سے مستفیض ہوتے تھے۔ موصوف ایثار پسند، مذہب دوست اور قوم پرور تھے۔ آپ نے اپنی سب جائیداد دینی امور کے لئے وقف کر دی تھی۔ مجھے بہ حیثیت ناظمیہ عربی کالج کے آنریری جنرل سکریٹری اور شخصی طور پر مرحوم کے انتقال پُر ملال کا بڑا رنج و غم ہے۔ خداوند کریم مرحوم کو ائمہ طاہرین کے جوار رحمت میں جگہ دے۔

(خادم دین و ملت) مجتبیٰ حسن کامونپوری
آنریری جنرل سکریٹری ناظمیہ عربی کالج لکھنؤ و ناظم دینیات شیعہ
مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

لکھے ہوئے مضامین کا سلسلہ

تاریخ محرم ۱۰ ویں نمبر کے سلسلے میں بہت سے لکھے لکھائے مضامین باقی رہ گئے جو جامہ ندارم دامن از کجا آرم کے بمصداق جگہ نہ ہونے کی وجہ سے نمبر کی ضخامت کو زیادہ نہیں بڑھایا جا سکا۔ اگر روپیہ ہوتا تو دل چاہتا تھا کہ یہ سارے بچے کھچے مضامین اسی نمبر میں دے دیئے جاتے۔ بہرحال آئندہ ہم ہر ماہ کی اشاعت میں ان میں سے آٹھ صفحے دیتے رہیں گے

اس سال [illegible] ... جامعہ امام [illegible] ... لکھے ہوئے مضامین بچ گئے ہیں، انہیں کو دیکھتے رہیں گے۔

۱۳ رجب کی ریسٹرکٹڈ چھٹی منظور

دہلی کی ایک اطلاع مظہر ہے کہ انجمن حسینی رجسٹرڈ دہلی کی کوششوں سے گورنمنٹ آف انڈیا نے ولادت حضرت علی علیہ السلام کے سلسلے میں ۱۳ رجب کو اس سال ریسٹرکٹڈ (RESTRICTED) چھٹی منظور کر لی ہے۔ حکومت کے اس فیصلے پر نہ صرف انجمن حسینی حکومت ہند کا شکر گزار ہے بلکہ وہ ہندوستان کے تمام شیعوں کے شکریہ کی مستحق ہے۔

حسینیۂ غفرانمآب کا یادگار پھاٹک

مجدد شریعت حضرت مولانا سید دلدار علی صاحب قبلہ طاب ثراہ (جو دنیائے شیعیت میں جناب غفرانمآب کے نام سے متعارف ہیں) کا بنوایا ہوا امام باڑہ جو اب تمام دنیا میں شہرت حاصل کر چکا ہے تقریباً منہدم ہو چلا تھا کہ سرکار صفوۃ العلماء طاب ثراہ نے بروقت [illegible] کر اس کو نئی زندگی دیدی۔ سرکار (مرحوم) کی خواہش تھی کہ اس عظیم الشان حسینیہ کا پھاٹک بھی شایان شان بن جائے اور اسی لئے اپنے دست مبارک سے اس کا سنگ بنیاد بھی رکھ گئے تھے لیکن زندگی نے وفا نہ کی اور ان کی یہ خواہش ان کی زندگی میں پایۂ تکمیل کو نہ پہونچ سکی۔

سرکار مرحوم کے بڑے صاحبزادے آقائے شریعت سرکار صفوۃ العلماء مولانا سید کلب عابد صاحب قبلہ مجتہد دام ظلہم نے بالآخر اس خواہش کو عملی جامہ پہنا دیا اور الحمد للہ کہ یوم عید قربان یعنی ۱۰ ذی الحجہ یوم جمعہ حسینیۂ غفرانمآب کے عظیم الشان پھاٹک کا کام جو ابھی پایۂ تکمیل کو نہیں پہونچا ہے [illegible] افتتاح حضرت آیۃ اللہ جناب سید [illegible] ظہیر صاحب دام اقبالہ کے دست مبارک سے ہو گیا۔ پھاٹک کا نام "باب دار الغفران" رکھا گیا ہے جو ایک تاریخی حیثیت کا حامل ہے [illegible]۔

ایک سادہ مگر پر وقار اجتماع میں تقریباً ۱ بجے سہ پہر اس پھاٹک کی رسم افتتاح عمل میں آئی۔ اس کے بعد جلسہ ہوا جو جناب مہاراجکمار صاحب محمودآباد کی صدارت میں ہوا۔ سب سے پہلے سرکار مرحوم کے چھوٹے صاحبزادے مولانا سید کلب صادق صاحب ایم اے نے معزز مہمانوں کا استقبال ایک مختصر مگر جامع تقریر میں کیا۔ موصوف کے بعد علاوہ دیگر مقررین کے [illegible] ترلوکی سنگھ صاحب، جناب دیویندر کمار صاحب، جناب اعجاز حسین صاحب ایم ایل اے، جناب [illegible] اعزاز رضوی صاحب، جناب سبط رضی صاحب نے سرکار مرحوم کی زندگی کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کے دینی خدمات کا تذکرہ کیا۔ جناب صدر نے اپنی مختصر مگر پُر مغز تقریر میں سرکار مرحوم کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے اس امر کا بھی اظہار فرمایا کہ لوگ ان کی سیرت کو مشعل راہ بنائیں تو باہمی اختلافات اور تنگ نظری کی لعنت ختم ہو سکتی ہے۔ آخر میں سرکار مرحوم کے بڑے صاحبزادے آقائے شریعت نے مہمانوں کا شکریہ ادا فرمایا۔ اور اپنی تقریر سرکار مرحوم کے اس مشہور فارسی قطعہ پر ختم کی۔

شادم کہ من گزشتم و ذکرم گزشتنم
قائم ز این حسینیہ نام و نشان من
کلب حسین بودم و نازاں بخود منش
غافل نہ شد ز ذکر حسینہ زبان من

جناب آہر لکھنوی اور حیدر صاحب نے اپنی نظمیں بھی پڑھیں جو بے حد پسند کی گئیں۔

اس موقع پر سرکار مرحوم سے متعلق لٹریچر نیز سرکار کے قلمی مسودات کی نمائش بھی ہوئی۔ (ایم۔ ایم غلام حسین)

Phone 23435
Regd. No. L 770 ***17th March 1969*** **Regd. of News Paper No. 1228/57**

THE SARFARAZ WEEKLY
LUCKNOW

سرفراز نیشنل ہندوستان پرنٹنگ پریس فون نمبر ۲۵۰۲۰ گولہ گنج لکھنؤ میں چھپا